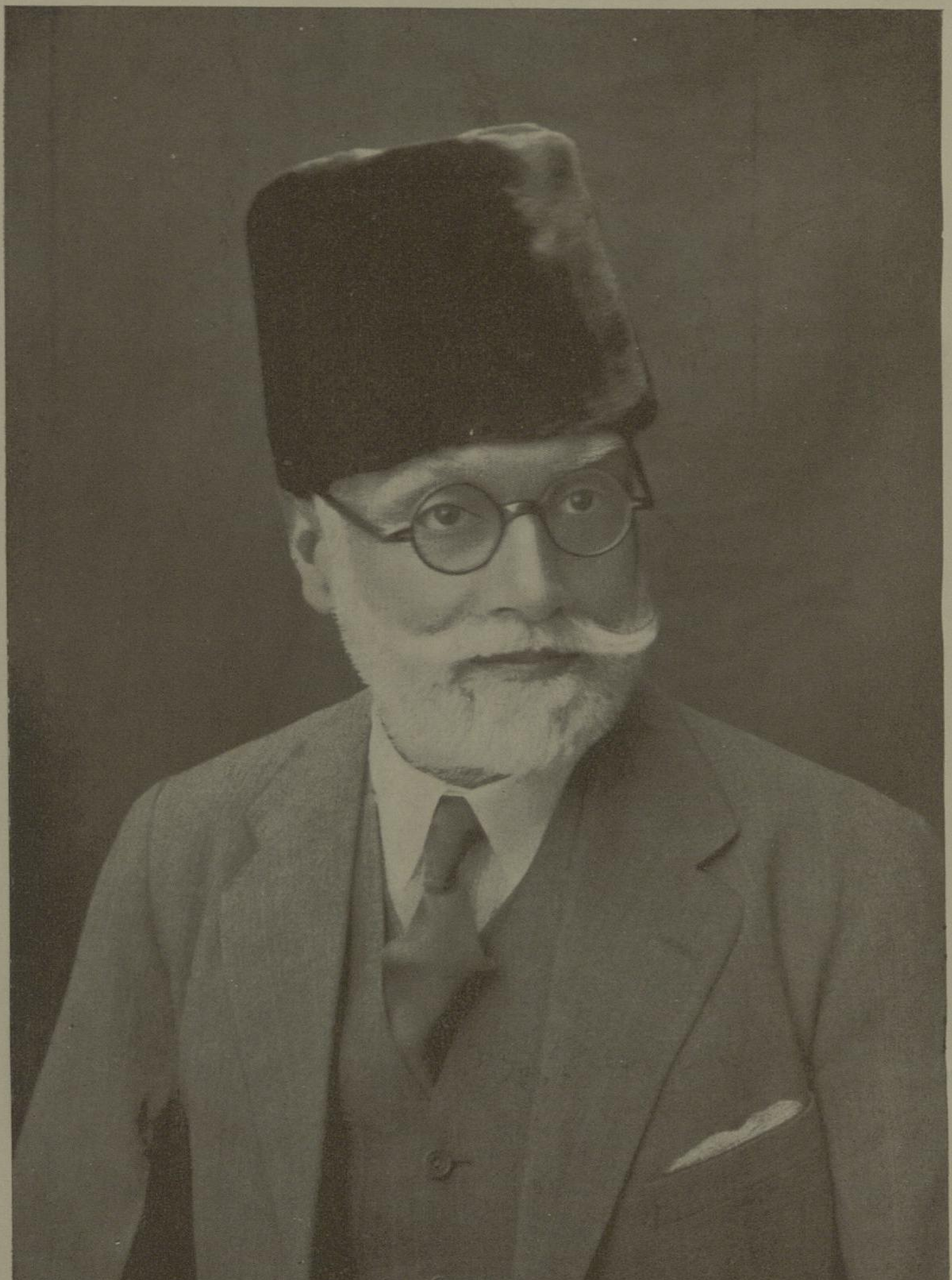
حیات و کلیات اسمٰعیل

باتصویر

مصنف حیات و مرتب کلیات محمد اسلم سیفی



شبیہ مصنّف حیات اسمٰعیل۔

مقابل سرورق

حیاتِ و کلیاتِ اسمٰعیل

باتصویر

مصنف حیات و مرتب کلیات | محمد اسلم سیفی

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No. 59402
★ MAILSI ★

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

حیاتِ اسمٰعیلؒ

مُصنّفہٗ

محمد اسلم سیفی (خان بہادر) چیرمین میونسپل بورڈ میرٹھ

مع

کُلّیاتِ اسمٰعیلؒ

مُصنّفہٗ

مولانا محمد اسمٰعیلؒ رئیس میرٹھ

مُختارِ تجارت

مکتبۂ جامعہ مِلّیہ اسلامیہ دہلی

مطبوعۂ

دیال پرنٹنگ پریس دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء

طبع اوّل جلد ۱۰۰۰ ایک ہزار

قیمت فی جلد مجلّد و مصوّر

عہ دس روپیہ

(کاپی رائٹ محفوظ ہے)

فہرست مضامین حیاتِ اسمٰعیل

تمت

فہرست تصاویر حیاتِ اسمٰعیلؒ

دیباچہ حیاتِ اسمٰعیلؒ

حیاتِ اسمٰعیلؒ کے لکھنے کا خیال مُدّت سے میرے دِل میں تھا۔ بہت سے واقعات خود مولانا سے دریافت کئے۔ مثلاً اُن کے اُستادوں اور ابتدائی صحبتوں کا حال۔ اِن حالات کو سپردِ قلم بھی کیا۔ مگر برسوں یہ نوٹ کی صورت میں الماری کے اندر بند رکھے رہے۔

جب کہ ۸ر جنوری ۱۹۳۷ء کو میرے برادرِ مکرم مولوی محمد محمود سیفی (مرحوم و مغفور) کا اِنتقال ہُوا تو خیال ہوا کہ میرے تساہل کے باعث کہیں یہ کام ناتمام ہی نہ رہ جائے۔ اِتّفاق وقت سے مولانا کا بِنا کردہ مدرسۂ بناتُ المسلمین رفتہ رفتہ آٹھویں جماعت تک ترقّی کر گیا تو جی چاہا کہ اِس کو کم از کم ہائی اسکول کے مرتبہ تک تو پہنچایا ہی جائے اِس کے لئے درکار تھا رُوپیہ۔ اور قوم ہے نادار، تو یہ گُتھی سُلجھے تو کس طرح۔ میں اگر ذاتی منفعت کی خاطر مولانا کا کلام طبع کراتا تو اِس وقت تک متعدّد اڈیشن شائع ہو چکے ہوتے۔ اور لاکھوں نہیں تو ہزاروں کی تعداد میں کُلّیات کی جلدیں مختلف خاندانوں کی پرائیویٹ لائبریریوں میں موجود ہوتیں۔ اِس تساہل کی تلافی میں نے اِس طرح سوچی کہ کُلّیات کا نیا اڈیشن مُرتّب کیا جائے اور اِس کے ساتھ ہی "حیاتِ اسمٰعیل" کو بھی شائع کیا جائے۔

"کُلّیاتِ اسمٰعیل" کے پہلے اڈیشن کا خیر مقدم مُلک کی جانب سے جس گرم جوشی کے ساتھ ہُوا تھا وہ میرے علم میں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ مُلک ہر وقت اِن جواہر ریزوں کا طلب گار ہے تو پھر دیر کیوں کی جائے۔

مدرسہ کی ضروریات کو ازبس ضروری جان کر میں ہمہ تن "حیاتِ اسمٰعیل" کی تصنیف اور "کلیّاتِ اسمٰعیل" کی جدید ترتیب میں مصروف ہو گیا۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء سے اِس شغل میں مصروف ہوں اور اب تک اُس کا سلسلہ جاری ہے۔ کتابت اپنے سامنے کرائی۔ طباعت میں ضرورت سے زیادہ دِقّتیں پیش آئیں۔ خدا خدا کر کے یہ کام اب ختم کے قریب آیا ہے جب کہ آخیر دسمبر ۱۹۳۸ء ہے۔

میری نیّت تو یہ ہے کہ بجائے بلڈنگ فنڈ کھولنے کے مولانا کے کلام کے قدردانوں سے جو رُوپیہ "کلیّات" اور "حیات" کی فروخت پر وصول ہو وہ "محمد اسمٰعیل گرلز اسکول" بلڈنگ فنڈ کی نظر کروں اور اگر قُدرت کو منظور ہے تو انشاء اللہ اگلے سال سے تعمیر عمارت کا کام شروع ہو جائے گا۔

حیاتِ اسمٰعیل کے سلسلہ میں بہت سے واقعات جو مجھے اپنے برادرِ بزرگ سے معلوم ہوتے۔ افسوس ہے کہ وہ دروازہ بند ہو گیا۔ ع "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند"۔ اِختصار کے خیال سے میں نے بہت سی تفصیل حذف کر دی ہے شاید آیندہ اڈیشن میں کچھ اضافہ کیا جائے بشرطیکہ اہل الرائے نے اِس سعیٔ خام کو ازراہِ پسندیدگی دیکھا۔

حیاتِ اسمٰعیل میں اگر کمی ہے تو اُن قصص کی جو ایسے مصنّفِ باکمال کی ذات سے تعلّق رکھتے ہیں۔ اُن کی بذلہ سنجی، اُن کی گفتگو، برجستہ تقریر، اُن کے کلام کی تاثیر، یہ سب باتیں مجھے پیش کرنی چاہئے تھیں، افسوس ہے اِن واقعات کو میں نے بالالتزام نہیں لکھّا اور حافظہ میں یہ سب محفوظ نہیں۔ میری یہ پہلی کوشش ہے اور اِس موقعہ پر یہ لکھنا اظہارِ امرِ واقعی ہے کہ حیاتِ اسمٰعیل کے اصلی محرّک میرے

فاضل دوست مولانا حسرت موہانی ہیں جنہوں نے اوّل اڈیشن کی اشاعت پر اِس کمی کی طرف توجّہ دِلائی تھی اور ہم جماعت ہونے کے خیال سے بے تکلّف ہو کر اِس کمی کا خود مجھ ہی کو موردِ الزام گردانا تھا۔

فارسی میں مثل تو ہے کہ "دیر آید دُرست آید"۔ مگر میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کام مجھ سے ٹھیک انجام پایا یا نہیں۔

نام بنام اُن حضرات کا شُکریہ ادا کرنا جنہوں نے اِس کام میں اِمداد فرمائی ہے باعثِ طوالت ہوگا، اِس لئے یک جائی شُکریہ اُن صاحبوں کا جنہوں نے اپنا بیش قیمت وقت اِن مسوّدات کے دیکھنے میں صرف کیا ہے اور مجھے اپنے مشورے سے مُستفید فرمایا ہے، اِس موقعہ پر ادا کرتا ہوں ؂

۲۸ ر دسمبر ۱۹۳۸ء
اورنٹیل ہاؤس
میرٹھ

محمد اسلم سیفی

التماس

خُدا کا بے حد شُکر ہے کہ حیات و کُلیاتِ اسمٰعیل کی طِباعت بالآخر اختتام پر آ پُہنچی۔ مجھے اُن دُشواریوں کا کوئی اندازہ ہی نہ تھا۔ جو طباعت کی راہ میں پیش آنے والی تھیں، ورنہ ابتدا ہی سے یہ کام اپنے پبلشر کے سپُرد کرتا۔ اشاعت کے مُتعلّق نول کشور پریس لکھنؤ اور مکتبۂ جامعۂ اسلامیہ سے مراسلت اور گفتگو رہی، افسوس کہ مُعاملہ دونوں میں سے ایک کے ساتھ بھی طے نہ پا سکا۔ بہرحال مکتبہ کو میں نے فروختِ حیات و کُلّیات کے لئے ٹریڈ اجنٹ مقرر کرنا پسند کیا ہے۔

کتابت:۔ جنابِ کاتب صاحب نے چھ سو صفحات کی کتابت میں پورے آٹھ ماہ صرف فرمائے۔ تبدیلئ خط کے خوف سے میں پابند تھا کہ ایک ہی صاحب کتابت کا کام انجام دیں۔

طباعت:۔ اصل تکلیف دلّی پرنٹنگ پریس سے پُہنچی ہے۔ یہ ایک مشہور اور پُرانا کارخانہ تھا۔ اِسی گمان میں ۸ر اپریل ۱۹۳۸ء کو اُس کے ساتھ مُعاملہ طے کر لیا گیا۔ بیشتر روپیہ پیشگی ارسال کر دیا گیا۔ تاکہ کاغذ کی خریداری میں آسانی ہو۔ کچھ عرصہ کے لئے طباعت بند کرا دی گئی تھی کہ مکتبۂ جامعہ کے ساتھ مُعاملہ محکم طور پر طے پا جائے۔ جب میں نے یہ طے کر لیا کہ اِس ایڈیشن کی صرف ایک ہزار جلدیں طبع ہوں گی اور میں خود طبع کراؤں گا تو ستمبر میں پریس سے چاہا کہ طباعت کا کام جلد ختم کیا جائے۔ لیکن وہاں سے نومبر تک صدائے برنہ خواست۔ آخر پتہ چلا تو یہ کہ

شرکاء میں سخت اختلافات درپیش ہیں۔ اب نہ کتاب ہی طبع ہوسکتی ہے نہ روپیہ ہی واپس ملتا ہے۔ مجبور ہو کر عدالتِ خفیفہ دہلی میں نالش رجوع کی اور ۲۴ فروری ۱۹۳۹ء کو ڈگری حاصل ہوگئی۔

۲۲ رم جو دتی پرنٹنگ ورکس میں طبع ہوچکے تھے وہ واپس لئے اور باقی کتاب کی چھپائی کا انتظام دیال پرنٹنگ پریس کے سپرد کیا۔ میں اس مطبع کے مالک کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے نہایت ہمدردی اور دل چسپی کے ساتھ کام کیا اور باقی ۵۳ رم ۱۲ جنوری اور ۱۶ مارچ کے درمیان طبع کردئے۔ ان کا برتاؤ نہایت مخلصانہ رہا۔ اور اس کی بنا بجائے تجارت کے شرافت پر مبنی تھی۔

بلاکس:۔ اس کتاب میں گیارہ بلاکس فوٹو سے بنائے گئے ہیں۔ یہ کُل کام مراری فائن آرٹ ورکس دتی نے کیا ہے۔ اس کارخانہ کے مالک ایک شاستری جی ہیں۔ اُن کا بھی میں نہایت شکر گذار ہوں کہ بہت دِل چسپی کے ساتھ اُنہوں نے کام کیا ہے۔

فوٹوگرافی:۔ یہ سارا کام جناب سیّد محمود صاحب آرٹسٹ میرٹھ نے کیا ہے۔ ان کے کام کی تعریف یوں ضروری نہیں کہ کام اپنی خوبی خود ظاہر کر رہا ہے مگر میرے اوپر اُن کا شکریہ ضرور واجب ہے۔

کاپیوں کی تصحیح:۔ یہ کام دو صاحبِ علم حضرات کی سپرد کیا تھا اور اُنہوں نے گہرے انہماک اور دل چسپی کے ساتھ یہ خدمت انجام دی اُن کا شکریہ کسی دوسرے مقام پر ظاہر بھی کرچکا ہوں۔ افسوس اس امر کا ہے کہ املاء کی بہت سی غلطیاں باقی رہ گئیں اس کا سبب ایک ہی ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ کاتب صاحب نے اِن غلطیوں کو درست کرنے میں تحمل فرمایا۔ بہر حال اِس فروگذاشت کا مجھے سخت افسوس ہے اور گو ایک تصحیح نامہ کتاب کے آخر میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ تاہم قابل ناظرین سے میں مؤدبانہ ملتمس ہوں کہ وہ ازراہِ عنایت کرم اِس ناگوار غلطی کی جانب سے چشم پوشی فرمائیں گے۔

میرٹھ ۱۱ اپریل ۱۹۳۹ء

محمد اسلم سیفی

تصحیح نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
		دیباچہ حیات اسمٰعیل	
۶	۹	تو یہ گتھی	پھر یہ گتھی
۷	۱۱	آل قدح بشکست	آں قدح بشکست
۷	۱۳	اہل الرائے	اہل الرّائے
		حیات اسمٰعیلؒ	
۳	۴	سو ویٹ	سُووِیئٹ
۴	۶	کی	کے
۵	۴	عالم	اعلم
۵	۱۱	مستعفےٰ	مستعفی
۸	۱۱	شرلف	شریف
۹	۱۴	اُستادی	شاگردی
۱۱	۱	پُرانی	پُرانے
۱۴	۱۴	سیقی	سیفی
۲۷	۱۳	صویہ	صوبہ
۲۹	۷	ذخامت	ضخامت
۳۷	۱۱	کیا	لیا
۴۱	۱۵	پے	پہ
۴۸	۱۳	دورمردراز	دُور و دراز
۸۵	۱۹	حامع	جامع
۱۰۴	۲	اُلفرم	اِنفرم
۱۱۰	۵	بڑھا سوا ہے چنانچہ	بڑھا ہوا ہے چنانچہ
۱۱۸	۱۰	حالات	حالت
۱۱۹	۳	قرماتے	فرماتے
۱۱۹	۱۱	لے گئے	لے جائے گئے
۱۱۳	۵	ورو / ہم	درو / ہم
۱۲۴	۵	ہم	ہم
۱۲۶	۸	شیوۂ بیاں	شیوہ بیاں
۱۲۷	۱۳	میں	سے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۳۴	۶	قبول عام	کو قبولِ عام
۱۳۴	۱۲	شگفتہ	شگفتہ
۱۳۷	۶	ہمارے	تمہارے
۱۵۲	۹	ذخیم	ضخیم
۱۵۲	۲۰	پیش کرتی	پیش کرتی ہیں

کُلیاتِ اسمٰعیلؒ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۱	۷	قُنود	قُعود
۲۳	۱۷	نیرنگِ	نیرنگِ
۵۳	۸	معاذُ اللہ	مَعاذَ اللہ
۵۳	۱۲	مُعاذُ اللہ	مَعاذَ اللہ
۵۹	۱۰	کردی	کرہی دی
۵۹	۱۷	طَلَسم	طلِسم
۷۸	۷	چیں بابرو	چیں بہ ابرو
۸۰	۱	پے	پہ
۸۱	۵	پے	پہ
۸۴	۱	ڈور	دَوڑ
۸۵	۱۳	پے	پہ
۸۸	۴	دعویٰ	دعوائے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۹۵	۱	ڈانکو	ڈاکو
۹۵	۲	ڈانکو	ڈاکو
۹۹	۶	جونہیں	جوں ہی
۹۹	۸	یونہیں	یوں ہی
۱۰۰	۴	جہاں	جہاں
۱۰۴	۵	پے	پہ
۱۰۴	۱۶	اپک	ایک
۱۰۴	۱۶	پے	پہ
۱۰۵	۵	تول میرے	تول ہیں میرے
۱۱۳	۱	پے	پہ
۱۱۸	۹	کِلولیں	کُلیلیں
۱۱۸	۱۵	جگایا	اُٹھایا
۱۲۰	۴	پے	پہ
۱۲۳	۹	پے	پہ
۱۲۵	۱۲	پے	پہ
۱۳۲	۱۴	پے مجموعہ	پہ مجموعۂ
۱۳۳	۱۳	پے	پہ
۱۳۳	۱۴	فتنۃ	فتنہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۳۷	۱۶	تاَبل	تاَمّل
۱۴۱	۷	گندہ دلوں میں تری الفت کی فرا ہیں	گندہ ہیں دلوں میں تری الفت کے فرا ہیں
۱۴۶	فٹ نوٹ	اڈیشنس	اڈیشن
۱۴۸	۱	حیراں	حیران
۱۴۸	۷	یونہیں	یوُں ہی
۱۵۱	۱۵	یوہیں	یوُں ہی
۱۵۴	۳	بزدل	بُزدِل
۱۵۴	۱۲	پے	پہ
۱۵۵	۴	اِمارت	اُمارَت
۱۵۷	۳	مسلکِ	مَسلکِ
۱۵۷	۱۳	پے	پہ
۱۵۸	۲	بوحی محرم شہِ مسلّم	بہ وحیِ محرم شہ مُسلّم
۱۵۸	۷	صلوٰہ	صلوٰۃ
۱۶۴	۱۲	پے	پہ
۱۶۴	۱۳	عجب	عجیب
۱۶۵	۴	فنون پے	فنون پہ
۱۶۵	۸	فائده	فائدہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۶۶	۵	دُرِ شہ سوار	دُرِ شہوار
۱۶۶	۸	معنی رنگیں	معنیِٔ رنگیں
۱۶۸	۱۰	کاغذیں	کاغذی
۱۶۸	۱۴	صورتِ حرام	صُورَت حرام
۱۶۹	۲	پورانے	پُرانے
۱۶۹	۱۲	چو	جو
۱۶۹	۱۷	دماغ خشک	دماغِ خشک
۱۷۰	۷	باد تجارت	بادِ تجارت
۱۷۰	۷	متصل	مُتّصِل
۱۷۱	۱	پے	پہ
۱۷۳	۹	موثر	موثّر
۱۷۴	۱	خلق	خُلق
۱۷۶	۸	لہو	لَہُو
۱۸۲	۱۰	مژگل	مِژگاں
۱۹۰	۱۱	کی ورزش	کی ہے ورزش
۱۹۱	۸	پنسل	پینسِل
۱۹۶	۷	طالب علم	طالبِ علم
۲۰۲	۱۰	یوہیں	یوُں ہی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۰۲	۱۲	پے	پہ
۲۰۵	۲	دائقہ	ذائقہ
۲۰۸	۹	چپراس	چپڑاس
۲۰۸	۱۴	پے	پہ
۲۰۹	۵	پے	پہ
۲۰۹	۱۱	باندازِ	بہ اندازِ
۲۱۱	۱۴	جسم شکوہ	جَم شِکُوہ
۲۱۲	۱۵	اُٹّھا	اُٹھا
۲۱۵	۶	جہاں آباد	جہان آباد
۲۱۸	۹	رشتا	رِشتا
۲۲۶	۶	ڈُھندی	دھندلی
۲۳۳	۸	آحر	آخر
۲۳۳	۱۳	خیر مقدم	خَیر مَقدَم
۲۴۱	۹	خُلق	خَلق
۲۴۲	۴	پے	پہ
۲۴۲	۸	پے	پہ
۲۴۵	۸	خوں	خوؔن
۲۴۶	۶	ڈھِل	ڈھیل

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۵۰	۱۶	یادشہا	یاماوشہا
۲۵۵	فُٹ نوٹ	مافی امداد	مالی امداد
۲۵۶	۱۳	الحاج	الحاح
۲۵۶	۱۴	ے	ہے
۲۵۷	۳	اعتیار	اعتبار
۲۵۹	۱۲	کہلائیں	کِھلائیں
۲۶۲	۳	پے	پہ
۲۶۵	۲	ہند	ہِند
۲۶۷	۹	آہ روشن قیاس و دانشو	آہ روشن قیاس و دانشور ۰۰ ہجرے ۱۳
"	۱۰	آہ دانش ور و بلند خیال ہجرے ۱۳	آہ دانشور و بلند خیال ۰۰ ہجرے ۱۳
۲۶۹	۶	گُل ہے اور	گُل ہے وہ اور
۲۷۰	۳	خصوصت	خصوصیّت
۲۷۰	۳	دعوئی	دعوائے
۲۷۰	۷	مقالاتِ طرقت	مقالاتِ طریقت
۲۷۳	۱۱	پے	پہ
۲۷۴	۱	پے	پہ
۲۷۹	۱۳	شائگاں	شائگاں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۸۳	۶	کوتگ	کوتک	۳۴۳	۶	جُوہیں	جُوں ہی
۲۸۷	۲	پے	پہ	۳۴۸	۷	پے	پہ
۲۹۴	۱۳	بہت	بَہت	۳۵۰	۱۰	گز بسنجی	گر بسَنجی
۲۹۴	۱۶	پے	پہ	۳۵۱	۳	حی وقائم	حیّ وقائم
۳۰۰	۱	پے	پہ	۳۵۱	۸	جان توجان جان	جان تو خود جان جان
۳۰۰	۵	نہیں	نَہیں	۳۵۲	۵	سخن	سخُن
۳۰۰	۱۶	فردردی	فردِ رَدِی	۳۵۵	۷	شارہ اکن	شارہ کُن
۳۰۳	۱۳	لاف وعدو	لافِ عَدُو	۳۵۸	۴	ارغنائے تو	ازغنائے تو
۳۰۴	۳	دید محض	دیدِ مَحْض	۳۵۸	۶	آگندہ جہل	آگندۂ جہل
۳۰۵	۳	بری	بَری	۳۵۸	۱۴	ہن وتو	من وتو
۳۰۵	۱۵	پے	پہ	۳۵۹	۵	بسوزد	بسوزو
۳۰۸	۲	ضیبت	غَیبَت	۳۶۱	۸	حسن	حَسَن
۳۰۸	۱۴	اتنا پسند	اِستغنا پسند	۳۶۱	۹	حسن	حَسَن
۳۱۷	۳	کھلاری	کِھلاڑی	۳۶۲	۱۷	اینجا	اینجا
۳۱۹	۱۵	مگر کہ جیمس میٹن	مگر کہ سر جیمس مَیسٹن	۳۶۳	۶	گردوجہاں	گرددجہاں
۳۲۶	۱۵	ادراک چاہئے	ادراک چاہیے	۳۶۴	۴	بدعوی	بدعوائے
۳۳۳	۸	عیّاری بھی	اور عیّاری بھی	۳۶۵	۵	بیارد	ببارد
۳۳۶	۲	کاہوجو	کاہواجو	۳۶۸	۱۲	حد	بہ حد

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
٣٧٣	٩	دعوئ	دعوائے
٣٧۴	٣	بجزطوم	بخرطوم
٣٧۴	٩	جنبد	لغزد
٣٧۵	٦	اوش	اَوَّلش
٣٧٦	١۵	عزم یاری	غمگساری
٣٧٦	١٦	بکشندش	بکُشَندش
٣٩٣	۵	اوُبرِ رُخ	اوبَرِرُخ
٣٩۴	١٣	فرُدمِ	فَرُدمِ
٣٩۵	١	خم لعوئے تو	خمِ ابروئے تو



مکان مسکونہ - جائے پیدائش بھی یہی ہے - ۱۲ر نومبر سنہ ۱۸۴۴ء - مقابل صفحہ ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

سوانح حیات

مولانا محمد اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ

پہلا باب

ولادت۔ خاندان۔ والدین۔ تربیت۔ تعلیم

حضرت مولانا ۱۲ر نومبر ۱۸۴۴ء کو شہر میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ جس مکان میں پیدا ہوئے اُسے والدِ بزرگوار نے اپنی زندگی ہی میں اُن کو عطا فرما دیا تھا۔ اس مکان کا نمبر ۲۶۷ ہے۔ محلّہ مشائخان میں واقع ہوا ہے۔ یہ محلہ حلقۂ اندرکوٹ کا ایک جزو ہے۔ اِسی مناسبت سے اِس محلہ کو اندرکوٹ اور بالائے کوٹ بھی کہتے ہیں۔ محلہ مشائخان کے نام کی وجہ تسمیہ شاید یہ ہو کہ اِس مقام پر حضرت مخدوم شیخ شہاب الدین علی اصغر چشتی اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار مبارک موجود ہے۔ آپ کے زمانۂ حیات میں سلسلۂ طریقت جاری ہوگا۔



مکان مسکونہ - جائے پیدائش بھی یہی ہے - ۱۲ / نومبر ۱۸۴۴ء

مقابل صفحہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

سوانح حیات

مولانا محمد اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ

پہلا باب

ولادت۔ خاندان۔ والدین۔ تربیت۔ تعلیم

ولادت مولانا ۱۲ر نومبر ۱۸۴۴ء کو شہر میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ جس مکان میں پیدا ہوئے اُسے والدِ بزرگوار نے اپنی زندگی ہی میں اُن کو عطا فرما دیا تھا۔ اُس مکان کا نمبر ۲۶۷/۲ ہے۔ محلّہ مشائخان میں واقع ہوا ہے۔ یہ محلہ حلقۂ اندر کوٹ کا ایک جز ہے۔ اِسی مناسبت سے اِس محلہ کو اندر کوٹ اور بالائے قلعہ بھی کہتے ہیں۔ محلہ مشائخان کے نام کی وجہ تسمیہ شاید یہ ہو کہ اِس مقام پر حضرت مخدوم شیخ شہاب الدین علی اصغر چشتی اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار مبارک موجود ہے۔ آپ کے زمانۂ حیات میں سلسلۂ طریقت جاری ہوگا۔

عُلما و فُضلا و فقرا کی آمد و رفت سے ایک اجتماعِ خاص رہتا ہوگا۔ رفتہ رفتہ محلہ کا نام ہی مشائخان پڑ گیا۔

میرٹھ ایک تاریخی مقام ہے پُرانے زمانہ میں یہ راج دھانی تھا۔ ایک راج پوت خاندان کا راجہ مائی دنت نام یہاں کا حُکم راں تھا۔ تاریخ میں مذکور ہے کہ امیر تیمور کا لشکر جب میرٹھ سے گذرا ہے تو یہاں کا راجہ اُس سے برسرِ پیکار ہوا۔ راجہ کی فوج امیر کے ہراول سے جا بھڑی جب رنگ اُلٹا دیکھا تو راہِ فرار لی۔ چنانچہ امیر کے حُکم سے میرٹھ میں قتلِ عام ہوا تھا۔ جس مقام پر راجہ کا قلعہ تھا وہ اب محلّہ اندر کوٹ کہلاتا ہے۔ یہ ایک مرتفع و وسیع مقام ہے فی الحال اِس رقبہ میں چھ محلّے اور دو بازار آباد ہیں۔ مولانا کا مکان کوٹ کی شمالی حد کے متّصل ہے۔ محلہ مشائخان مُدّتِ مدید سے شرفاء کی بستی ہے مولانا کے اعزّا اور اقارب کی زیادہ تعداد اِسی محلہ میں آباد ہے۔

نسب | نسباً مولانا حضرت محمدؐ ابن ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں ہیں آپکے مورثِ اعلیٰ مولانا قاضی حمید الدین خوجندی رحمۃ اللہ علیہ بابر بادشاہ کے ہمراہ ہندوستان میں تشریف لائے تھے۔ بابر تین بار ہندوستان پر فوج کشی کر چکا تھا۔ لیکن ہر دفعہ پنجاب ہی سے واپس ہوگیا۔ ۱۵۲۵ء میں اِس مصمّم ارادہ سے چلا کہ اب کی بار ہندوستان کو ضرور ہی فتح کروں گا۔ اِسی موقع پر مولٰنا قاضی حمید الدین خجندیؒ اُس کے ہمراہ آئے ہیں۔ مولانا قاضی حمید الدینؒ کے آنے کا ذمّہ دار آیا اُن کا کمالِ علم و فضل تھا۔ یا کمالِ فنون حرب اِس کا پتہ بابرنامہ سے صاف طور پر نہیں چلتا۔

بزرگوں کا ترکِ وطن | مکّہ معظمہ سے ہجرت کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اُن کی اولاد نے مدینہ منوّرہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ اِس خاندان کے کِس بزرگ نے ترکِ وطن کیا۔ کِن حالات میں کیا۔ کِن اغراض سے کیا۔ اور کِس زمانہ میں کیا۔ خاندانی روایات اِس بارے میں بالکل خاموش ہیں۔ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ وطن سے رخصت ہو کر کِن کِن مقامات پر پہونچے۔ سفر میں کیا کیا واقعات پیش آئے اور بالآخر خوجند تک پُہنچے۔ اور وہاں قیام کرنے کے کیا اسباب پیدا ہوئے۔ اِس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم کہ اِس خاندان کے کسی بزرگ نے خوجند کو جو ترکستان کا ایک قدیم شہر ہے۔ مستقل قیام کے لئے اِنتخاب فرمایا۔

سلطنتِ فرغانہ | تاریخ اِس امر کی شاہد ہے کہ بابر کا باپ سلطان شیخ عمر مرزا سلطنتِ فرغانہ کا خود مختار سُلطان تھا۔ باپ کی وفات کے بعد بابر دس سال تک اِس سلطنت پر حکمراں رہا۔ لیکن چاروں طرف سے نرغہ میں گھِر چکا ہے کوئی تدبیر کارگر نہ دیکھ کر ناچار فرغانہ کو "خیرباد" کہتا ہے اور بطورِ نعم البدل کابُل کی حکومت کو کمزور دیکھ کر جا دباتا ہے بابر کے زمانہ میں فرغانہ کا دارالسلطنت خوقند تھا۔ فی الحال یہ مُلک جمہوریۂ اُزبیک کے نام سے ممالکِ روس میں شامل ہے۔ نظامِ سلطنت سوویٹ جمہوریہ ہے یعنی مُلکِ روس جیسا۔ شہرِ خوجند کی موجودہ آبادی ۳۷۰۰۰ ہزار ہے سَیر دریا پر یہ شہر واقع ہے۔

ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ نے بابر نامہ کے اندر خوجند کا تذکرہ بھی کیا ہے اور اِس شہر کے دو بزرگوں کے نام لکھے ہیں یعنی خواجہ مصلحت اور خواجہ اکمال الدین کہ صاحبِ دیوان بھی تھے۔ یہ دونوں بزرگ خوجند میں نام آور تھے۔ آگے چل کر لکھتا

ہے کہ مولانا قاضی نہایت بزرگ شخص ہیں۔ یہ بابر کے باپ سلطان شیخ عمر مرزا کے مرشد سے تربیت یافتہ تھے۔ مولانا قاضی کا نام ایک مقام پر خواجہ عبید اللہ ظاہر کیا ہے۔ مولانا قاضی حمید الدین کا تعلّق اِسی خاندان سے تھا۔

مولانا قاضی حمید الدین کا ہندوستان میں ورود

تاریخی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا قاضی حمید الدین خوجندی رحمۃ اللہ علیہ بابر کی ہمراہ ہندوستان تشریف لائے اور یہ واقعہ ۱۵۲۵ء میں پیش آیا۔ بابر کی ہمراہ کُل ۱۲۰۰۰ بارہ ہزار فوج تھی۔ تھا تقدیر کا دھنی۔ شاید کسی تاج دار کو اِتنے نشیب و فراز کا مقابلہ کرنا پڑا ہو۔ کبھی تو ایک شاندار سلطنت کا خود مختار بادشاہ ہے۔ کبھی ایک چپّہ بھر زمین بھی قبضہ میں نہیں ہے۔ دشمنوں کے نرغہ میں پھنسا ہے اور راہِ فرار کی جستجو میں مصروف۔ بابر ایک مختصر مگر منتخب فوج ساتھ لایا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہر سردار بلکہ ہر سپاہی بابر کے ساتھ ذاتی وابستگی رکھتا ہوگا۔ اِس صورت میں یہ قیاس بے جا نہ ہوگا کہ مولانا قاضی حمید الدین رح کو بھی بابر کی ذات سے خاص تعلّق ہوگا۔ چنانچہ کُتبِ سیر میں مذکور ہے کہ وہ منصبِ یک ہزاری سے معزّز و ممتاز ہوئے۔ ہندوستان کی فتح کے بعد قصبہ سیکری ضلع مظفر نگر کی چودھرائی بطور انعام قاضی صاحب کو عطا ہوئی تھی۔

ہندوستان میں سکونت

یہ وجہ تھی کہ مولانا قاضی حمید الدین خوجندی رحمۃ اللہ علیہ نے قصبہ سیکری ضلع مظفر نگر میں قیام فرمایا۔ خاندانی روایات سے معلوم ہوا کہ آپ کے ایک بھائی یا فرزند ضلع بجنور تشریف لے گئے۔ اِس سے زیادہ پتہ نہیں چلتا۔ جو بزرگ بجنور تشریف لے گئے۔ اُن کا نام اور یہ کہ بجنور میں کس مقام پر تشریف لے گئے

اور کس تقریب سے مثلاً بہ سلسلۂ ملازمت یا بہ سبیلِ تجارت۔ خاندانی کُتب اور ہر امکانی ذریعہ کو خوب چھانا مگر حقیقتِ حال ظاہر نہ ہو سکی۔ مُسلسل تجسُّس کے بعد زبانی پتہ چلتا ہے کہ نگینہ میں جو شیوخ کا خاندان ہے۔ شاید اِسی خاندانِ دودمان کی شاخ ہے۔ واللہ عالم بالصّواب۔

قصبہ لاوڑ ضلع میرٹھ میں قیام۔

مولانا قاضی حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے مولانا احمدؒ ضلع میرٹھ کو منتقل ہو گئے اور قیام کے واسطے قصبہ لاوڑ انتخاب فرمایا۔ مولانا محمدؐ اسمٰعیل مولانا احمد کی اولاد میں ہیں۔ مولانا قاضی حمید الدینؒ کے فرزند مولانا احمد بھی مثلِ والدِ بزرگوار دولتِ بابری کے منصب دار تھے۔ شیر شاہ کے زمانہ میں عاملِ مظفر نگر اور مولانا احمد کے درمیان مخالفت پیش آگئی تھی۔ چنانچہ مولانا احمد اور اُن کے فرزند مولانا داؤد کہ باپ کی طرح وہ بھی منصب دار تھے۔ مناصب سے مستعفٰی ہو کر قصبۂ سیکری کی سکونت ترک کرنے پر مجبور ہوئے اور قصبۂ لاوڑ ضلع میرٹھ کو مستقل سکونت کے لئے پسند فرما لیا۔

فرامینِ شاہی

اِس میں کچھ کلام نہیں ہے کہ اِس خاندان کے افراد فنونِ سپہ گری کے علاوہ اپنے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کی بنا پر ممتاز مرتبہ رکھتے تھے۔ چنانچہ یہ حقوق فرامینِ شاہی میں تسلیم کئے گئے ہیں۔ خاندان کی مددِ معاش کے واسطے شیر شاہ بادشاہ اور جلال الدین محمدؐ اکبر بادشاہ غازی نے فرامین جاری فرمائے تھے۔ دو فرمان ہماری نظر سے گذرے ہیں۔ دونوں جلال الدین محمدؐ اکبر شہنشاہِ ہندوستان کے حکم سے جاری ہوئے ہیں۔ ایک کی تاریخ ۷ شہر ربیع الثانی ۹۸۶ھ ہے اِس فرمان میں بہت سے نام درج ہیں منجملہ اُن کے مولانا داؤد اور مولانا یوسف

اور مولانا بایزید کے اسماء گرامی ہیں۔ مولانا داؤد مولانا قاضی حمید الدینؒ کے پوتے تھے۔ مولانا یوسف اور مولانا بایزید مولانا داؤد کے بیٹے تھے۔ اِس فرمان کے ذریعہ ۵۶۰ بیگہ زمین قصبۂ لاوڑ میں جس کا تعلّق پرگنہ میرٹھ سے تھا عطا کی گئی تھی یہ زمین اب بھی اِس خاندان کے پاس موجود ہے۔

دوسرے فرمان کی تاریخ شہر جمادی الثانی ۹۶۶ھ ہے اُس کے مطابق ۴۰۰ بیگہ زمین موضع شمس پور میں ج لاوڑ کا ایک پٹّہ تھا عطا ہوئی تھی۔ یہ زمین بھی مولانا کے ورثا کو پہونچی ہے۔ اِس مقام پر شجرۂ خاندانی اقتباساً درج کیا جاتا ہے:-

شجرۂ خاندانی

مولانا قاضی حمید الدین خجندی الصّدیقی متوطن قصبہ سیکری ضلع مظفر نگر

مولانا احمد

مولانا داؤد

مولانا یوسف

مولانا عبد اللطیف

مولانا محمدؐ شاکر

مولانا محمدؐ افضل
مولانا غلام جمال الدین
شیخ محمدؐ اعظم
شیخ محبوب بخش
بی بی نعیم النساء

مولانا محمدؐ عاقل
مولانا محمدؐ باقر
شیخ غلام احمد
شیخ پیر بخش
مولانا محمدؐ اسمٰعیل

خاندان کے حالات خاندان کی تاریخ میں کوئی خاص واقعات قابلِ ذکر نہیں ملتے۔ اِس کی وجہ زیادہ یہ ہے کہ پُرانی کتب ہنگامۂ غدر میں تلف ہوگئیں۔ جو حضرات اب موجود ہیں وہ ایسی مبالغہ آمیز روایات سُناتے ہیں کہ جن کا بلا تاریخی شہادت کے باور کرنا ایک امرِ دُشوار ہے۔ فوجی یا سیاسی خدمات جو اِس خاندان کے بزرگوں نے انجام دی تھیں۔ کُتبِ سیر و تواریخ میں باوجود تلاش کے اُن کا صاف تذکرہ نہیں ملتا۔ لیکن حق الامر یہ ہے کہ آلِ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زیادہ تر تعلیم و تعلّم ہی سے شغف رکھا ہے۔ اور اُمتِ محمّدی صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی اور تعلیمِ دین کو اپنے حق میں موجبِ ثواب گردانا ہے۔ اِسی اُصول پر یہ خاندان بھی کاربند رہا ہے۔ اِس خاندان کے ایک بزرگ تھے خواجہ نوراللہ منصب پنج صدی رکھتے تھے۔ کسی مُہم پر فوج کے ہمراہ تھے۔ ایک بزرگ نے دورانِ ملاقات میں معانقہ کیا۔ کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ معاً تعلّقات سے علیحدگی اختیار کرلی جبسِ دم کی مشق میں اُن کو کمال حاصل تھا۔ قصبہ لاوڑ میں اُن کا مزار ہے۔ ایک اور بزرگ تھے عبداللہ سیفی وہ منصب یک صدی پر مامور تھے۔

مولانا کے والد کا قیام میرٹھ میں ایک تحریر سے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے والد بزرگ وار ۱۴ر جولائی ۱۸۳۸ء کو مستقل طور پر میرٹھ تشریف لائے ہیں۔ مولانا کے دو بھائی اور ایک ہمشیر تھیں۔ تینوں آپ سے عُمر میں بڑے تھے۔ اور تینوں لاوڑ ہی میں پیدا ہوئے تھے میرٹھ میں سکونت اختیار کرنے کا باعث آپ کے والد بزرگ وار کے خالو حافظ شیخ میڈھو مرحوم ہوئے تھے۔ یہ صاحب لاولد تھے اور صاحبِ جائداد، بھانجے کے ساتھ بہت اُنس رکھتے تھے۔ اِس لئے مجبور کیا کہ وہ اُن کے پاس آکر رہیں۔ مولانا کے بڑے

بھائی شیخ غلام نبی مرحوم آپ سے عمر میں ۲۲ سال ہمشیرہ ۱۶ سال۔ اور مولانا عبدالحکیم جوشؔ ۱۴ سال بڑے تھے۔ اہلِ لاوڑ میں سے یہ پہلا خاندان تھا کہ جس نے میرٹھ میں اقامت فرمائی۔ اگرچہ میرٹھ والوں سے اِس خاندان کے تعلّقاتِ قرابت بہت پہلے سے تھے۔

والدہ کا خاندان آپ کی والدہ حضرت مخدوم شیخ فخرالدین اصفہانی چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھیں۔ یہ بزرگ جلال الدین محمد اکبر غازی بادشاہ ہندوستان کے زمانہ میں تشریف لائے تھے۔ آپ کے فرزند شیخ شہاب الدین علی اصغر چشتی اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ مولانا کی نشست گاہ کے بہت متصل ہے۔ خانقاہ اور نشست گاہ کے درمیان صرف ایک راستہ ہے۔ حضرت مخدوم شیخ شہاب الدین علی اصغر چشتی اصفہانی کو بذریعہ فرمانِ شہنشاہِ جہاں گیر جاگیر عطا ہوئی تھی۔ آپ کی مسجد درگاہ شریف کے برابر جانبِ جنوب ہے اور مخدوم صاحب کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔

ابتدائی تعلیم زمانہ قدیم کا دستور تھا کہ ابتدائی تعلیم گھر میں شروع ہوتی تھی۔ مولانا کے والد بزرگوار نے یہ کام خود انجام دیا تھا۔ مولانا چونکہ خاندان میں سب سے چھوٹے تھے۔ سب گھر والوں کے چہیتے تھے۔

تعلیم القرآن ابتدا میں زبانِ فارسی کی تحصیل پر متوجہ رہے۔ دس سال کی عمر میں قرآنِ مجید کی تعلیم شروع ہوئی۔ آپ نے پانچ مہینہ میں پورا کلام پاک ناظرہ ختم کرلیا اِس واقعہ سے اُس خداداد ذہانت اور حافظہ کا پتہ چلتا ہے جو قدرت نے آپ میں ودیعت کیا تھا اور اُس کے کمالات آئندہ نمودار ہوئے۔

مرزا رحیم بیگ مرحوم جب کچھ اور بڑے ہوئے تو فارسی زبان کی اعلیٰ تعلیم کی غرض سے

مرزا رحیم بیگ صاحب کی شاگردی میں سپرد کئے گئے۔ مرزا رحیم بیگ مرحوم ابتدائً پولیس میں سپاہی تھے۔ مگر شوقِ علم اِس درجہ غالب تھا کہ زمانۂ ملازمت میں برابر کُتب بینی کا شغل جاری رہتا تھا۔ آخر کار ملازمت سے مستعفیٰ ہو کر مُعلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔ میرٹھ میں اُن کے بہ کثرت شاگرد تھے۔ ذوقِ سخن سے بھی بہرہ ور تھے۔ کثرتِ مطالعہ سے بینائی جاتی رہی تھی۔ اُس زمانہ کا ذکر ہے کہ مرزا غالب نے قاطع بُرہان کے خلاف ایک رسالہ بُرہانِ قاطع کے نام سے شائع کیا تھا۔ یہی وقت تھا کہ مرزا رحیم بیگ صاحب کے مکتب میں مولانا متعلّم تھے مرزا رحیم بیگ نے مرزا غالب کی قاطع بُرہان کے جواب میں ایک رسالہ ساطعِ بُرہان کے نام سے تصنیف کیا تھا۔ مولانا کے سپرد یہ خدمت تھی کہ مختلف کُتبِ لغات سے الفاظ تلاش کرتے اُن کے معانی سُناتے رہیں۔ اور کبھی کبھی مسودات بھی تحریر کیا کریں یہ مشق آیندہ چل کر آپ کے حق میں بہت سود مند ثابت ہوئی۔ مرزا رحیم بیگ مرحوم کا منظوم کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ لیکن خود مولانا سے سُنا تھا کہ ایک بار قلق میرٹھی نے مرزا رحیم بیگ مرحوم کے کلام پر ایک نظم میں نکتہ چینی کی تھی۔ مولانا نے باوجود قلق کی دوستی کے حقِ اُستادی ادا کیا۔ اور قلق کے اعتراضات کا جواب ایک نظم میں لکھا۔ شاگرد کی یہ خدمت اُستاد کے نزدیک موجب تحسین و آفریں قرار پائی۔ چنانچہ خوشنودی کا اظہار اُستاد نے اپنی زبانِ فیض ترجمان سے خود فرمایا تھا۔

ہنگامۂ غدر ۱۸۵۷ء | ہنگامۂ غدر کی کیفیت مولانا نے بچشمِ خود دیکھی تھی۔ یہ دس مئی ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے۔ ماہ رمضان المبارک کی ۱۴ تاریخ اُس دن تھی۔ پڑوس میں دعوتِ روزہ

افطاری تھی۔ مولانا اور دیگر اعزّا اُس میں شریک تھے۔ یکایک ہولناک شور و غل کی آوازیں بلند ہوئیں معلوم ہوا کہ جیل خانہ توڑ دیا گیا ہے اور قیدی بھاگ رہے ہیں۔ لوہار اُن کی ہتکڑیاں اور بیڑیاں کاٹنے میں مصروف ہیں۔ شہر کے لوگ سراسیمہ ہر طرف رواں دواں نظر آرہے تھے۔ کثیر التعداد آدمی جیل خانہ کی سمت دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ مولانا کے قلب پر اِس ہنگامہ کا بہت گہرا اثر ہوا۔ اِس عظیم الشان ہنگامۂ دار و گیر کا تلاطم۔ دہلی کی تباہی کا نقشہ اہلِ دہلی کا حالِ پریشان، اِن باتوں نے مولانا کے دِل و دماغ پر بچپن ہی میں ایسا گہرا اثر بٹھایا کہ آیندہ زندگی میں فلاح و بہبودِ خلائق کے لئے بلا لحاظ دین و ملّت یا ذات پات مصروفِ کار رہے۔

نارمل اسکول کا داخلہ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ ہنگامۂ غدر ۱۸۵۷ء میں اُن کی عمر ۱۴ سال کی تھی۔ حساب سے تیرہ ۱۳ سال پانچ مہینے چھبیس ۲۶ دن ہوتی تھی۔ عرفِ عام میں چودہ سال کہنا بجا تھا۔ کیونکہ عُمر کا چودھواں ۱۴ سال ہی تھا۔ گلستان و بوستاں و شاہ نامہ اور دیگر ضروری کُتب درسیہ فارسی ختم کرنے کے بعد یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ آیندہ تعلیم کن مضامین میں اور کس مقصد سے حاصل کی جائے۔ میرٹھ میں نارمل اسکول قایم ہو چکا تھا۔ ایم کینز بن ہیڈ ماسٹر تھے۔ انگریزی حکومت کا نظم مستحکم ہو چکا تھا۔ والدِ ماجد کے ارشاد پر نارمل اسکول میں داخل ہوئے۔ شاید اُس وقت یہ منشا پیشِ نظر ہو کہ آیندہ سرکاری ملازمت ملنے میں آسانی ہوگی۔ بہر حال نارمل اسکول میں فیس دے کر ایک خاص طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے اور امتحان پاس کیا۔

منشی ایسری پرشاد آنجہانی نارمل اسکول میں منشی ایسری پرشاد آنجہانی علم ہندسہ کے اُستاد

تھے۔ پُرانی بریلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ وہ علم ہندسہ میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ مولانا کو اِس مضمون سے قدرتی لگاؤ تھا۔ اِس شفیق اُستاد سے فزیکل سائنس اور اسٹرانومی یعنی (علم ہئیت) کے مضامین اپنے فطری شوق کی بنا پر سیکھے۔ یہ اُن مضامین کے علاوہ تھے جو اُس وقت نصاب نارمل اسکول میں داخل تھے مولانا علم ہندسہ میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ اپنے فرزند اصغر کو جب کہ وہ آگرہ کالج میں ایف۔ اے کلاس کا طالب علم تھا ٹرگنامیٹری اور کانکسیکشن بآسانی پڑھا دیا کرتے تھے۔

رُڑکی کالج کا داخلہ

نارمل سکول سے فارغ ہوکر اہلِ خاندان کے مشورہ سے رُڑکی کالج میں اوورسیری کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ اِمتحانِ داخلہ میں شریک ہوئے۔ علم ہندسہ کے اندر ممتاز درجہ حاصل کیا۔ کچھ عرصہ تو سلسلۂ تعلیم وہاں جاری رہا۔ لیکن وطن کی یاد اور والدین کی جُدائی نے پریشان کیا۔ قیامِ رُڑکی میں اجنبی طلباء کے ساتھ رہنا پڑا۔ جب بہت ہی جی گھبرایا تو واپس چلے آئے ادب اُردو کا یہ گوہرِ نایاب ممکن تھا کہ نہر گنگ کے پوتِر پانی میں گُم ہو جاتا۔ محکمۂ انجنیرنگ یا نہر گنگ کی ملازمت میں اِس بات کی توقع کب ممکن تھی کہ تصنیف و شاعری کے واسطے فرصت نصیب ہو گی۔ مولانا کے ہم وطن اور عزیز اور ہم جماعت قاضی فصیح الدین لاوڑی تھے۔ وہ بھی اُن دنوں رُڑکی کالج میں طالب علم تھے۔ بعدِ تعلیم محکمۂ نہر میں ملازم ہوئے۔ عُہدۂ ڈپٹی مجسٹریٹی تک پہنچ کر پنشن لی اور خطاب خان بہادری سے معزّز و ممتاز ہوئے۔ بچپن سے جب تک کہ خان بہادر قاضی فصیح الدین صاحب حیات رہے۔ نہایت بے تکلّف اور مخلصانہ تعلقات ان کے ساتھ جاری رہے۔

مولانا کا عقد ۱۸۶۲ء

مولانا کا عقد بی بی نعیم النسا کے ساتھ جو شیخ محبوب بخش صاحب کی صاحب زادی تھیں ۱۸۶۲ء میں ہوا۔ جیسا کہ شجرۂ خاندانی سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ نیک سیرت بی بی مولانا قاضی حمید الدین خجندی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھیں مولانا کے خاندان سے چھ پُشت کا فصل ہو گیا تھا۔ اگرچہ مولانا کی اہلیہ تعلیم یافتہ نہ تھیں مگر شوہر اور بی بی کے درمیان مُکمّل اتّفاق و اتّحادِ خیال تھا۔ مولانا کی عادت تھی کہ صُبح چار بجے اُٹھتے۔ مولانا کی اہلیہ کا دستور تھا کہ اُٹھنے سے پہلے اپنے ہاتھ سے حُقّہ بھر کر تیّار رکھتی تھیں۔ مولانا کی اہلیہ کے دادا شیخ محمد اعظم رحمۃ اللہ علیہ اہل اللہ میں سے تھے۔ مولانا کی اہلیہ نے صبر و سکون، بردباری و تحمل کے اوصاف اپنے دادا سے ورثہ میں پائے تھے۔ اپنی ماں کے یہاں سے ایک چراغ لائی تھیں۔ جب ایسا اتّفاق پیش آتا کہ سکّہ رائج الوقت پاس نہ ہوتا تو یہ چراغ اُلٹ کر رکھ دیا جاتا۔ تھوڑی دیر بعد اُٹھا کر دیکھتیں تو اُس کے اندر سے حسب ضرورت روپیہ، دوّنی، چوّنی اٹھنّی نکل آتی۔ یہ چراغ پیتل کا تھا۔ اور مدّتوں آپ کے پاس رہا۔ آپ کے انتقال کے بعد جو یکم دسمبر ۱۸۹۹ء کو آگرہ میں واقع ہوا۔ یہ چراغ بھی غائب ہو گیا۔ ایک اور تبرک اپنے دادا صاحب سے اُن کو ملا تھا۔ وہ شیخ محمد اعظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ٹوپی تھی مولانا کے فرزند اصغر کے خاندان میں یہ تبرک اب تک موجود ہے۔

والد ماجد کا انتقال ۱۸۷۶ء

مولانا کے والد ماجد کا انتقال ۷، دسمبر ۱۸۷۶ء کو ہوا۔ مولانا کی اُلفت کے باعث آپ کے والد ہمیشہ مولانا کے مکان میں سکونت رکھتے تھے۔ بظاہر کوئی خاص شکایت نہ تھی۔ نہ کسی مرض کے آثار بیّن طور پر نمایاں ہوئے تھے۔ البتّہ غذا ترک ہو گئی تھی۔ انتقال سے دو روز قبل بڑے صاحب زادے شیخ غلام نبی صاحب کے

مکان میں آپ کی والدہ صاحبہ کے ایما سے تشریف لے گئے۔ اور وہیں اٹھتّر سال کی عمر میں رہ گرائے عالمِ بقا ہوئے۔ آپ کا مدفن حضرت شیخ فخرالدین اصفہانی چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک کی چہار دیواری کے اندر جانبِ جنوب ہے۔

آپ کے اوصاف کا تذکرہ کسی اور مقام پر بھی آیا ہے۔ آپ کے ممیز اوصاف میں خاموشی عزلت پسندی بردباری اور انکسار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اُمراء کی صحبت سے گریزاں اور غرباء کی امداد پر خاموشی کے ساتھ مصروف رہتے۔ چونکہ مولانا کی والدہ ماجدہ خاندانِ چشتیہ کی بیٹی تھیں۔ اِس بنا پر آپ کے والدِ بزرگوار کی تدفین اُس درگاہ کے اندر ہوئی تھی۔

مولانا کی اولاد | جب مولانا کی شادی ہوئی سن شریف اٹھارہ سال کا تھا۔ شادی سے دو سال بعد ۱۸۶۴ء میں دختر پیدا ہوئیں۔ نام اُن کا قیوم النساء رکھا گیا۔ عزیزوں میں بیاہی گئیں۔ ان کا انتقال ۱۹۳۵ء مطابق ۵ رجب المرجب ۱۳۵۴ھ بمقام مرسان ضلع علی گڈھ ہوا۔

۱۸۶۶ء میں محمد محمود فرزند اکبر پیدا ہوئے۔ پیدائش اُن کی لاوڑ میں ہوئی۔ اور اٹھوانسے ہوئے تھے۔ سُنا گیا ہے کہ ایسا بچہ عموماً زندہ نہیں رہتا مگر بفضلہ یہ تندرست رہے۔ بڑے ہو کر مدرستہ العلوم علی گڈھ میں بغرض تعلیم گئے۔ مسٹر عنایت اللہ بی۔ اے کے کلاس فیلو تھے۔ اُن کے ایک لڑکی تھی۔ اُس کی شادی ہو گئی تھی۔ اِس کا انتقال ۱۹۱۹ء میں ہوا۔ اور مولانا کے مزار کے قریب دفن ہوئی۔ محمد محمود سیفی صاحب کا انتقال ۸ جنوری ۱۹۳۷ء کو بعمر ستر سال میرٹھ میں ہوا۔ اور اپنے والد کے مزار کے احاطہ میں دفن کیے گئے۔

سنہ ۱۸۷۰ء میں مولانا کے گھر میں دوسرے فرزند تولد ہوئے اُن کا نام محمد حامد تھا۔ ضلع اسکول میرٹھ سے میٹریک پاس کیا تھا۔ سینٹ جانس کالج آگرہ میں ایف اے تک تعلیم پائی۔ پھر ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ کالج چھوڑ کر ملازمت اختیار کی مگر بعارضۂ دِق وسِل چھبیس ۲۶ سال کی عُمر میں ۲۱ / اکتوبر سنہ ۱۸۹۵ء کو بمقام میرٹھ داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کی شادی ہوگئی تھی مگر اولاد نہیں ہوئی تھی۔

سنہ ۱۸۷۶ء میں دوسری دختر پیدا ہوئی۔ اُس کا نام امت الاعلیٰ ہے اُسکی شادی سید اقبال احمد صاحب کے ساتھ ہوئی۔ یہ نوجوان مولانا کے بہنوئی سید ظفریاب علی مرحوم کے بھتیجے تھے۔ یہ عزیز نہایت ہونہار۔ ذہین۔ شایستہ۔ تعلیم یافتہ خوشرو۔ خوش وضع تھے۔ لیکن اچانک بعارضۂ اسہال سنہ ۱۸۹۳ء میں انتقال کیا۔

مولانا کے سب سے چھوٹے فرزند محمد اسلم ۷ / اگست سنہ ۱۸۸۰ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے اُن کی شادی سید مظفر علی صاحب مرحوم کی دختر سے ہوئی۔ اور اِس اہلیہ سے پانچ اولادیں ہوئیں۔ تین لڑکے (۱) محمد مُسلم سیفی۔ (۲) اسلام احمد سیفی (۳) اکرام احمد سیفی اور دو بیٹیاں سلیمہ خاتون اور عالیہ خاتون۔ دونوں کی شادیاں ہوگئی ہیں۔

(۱) محمد مسلم سیفی کے تین لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ محمد اکرم سیفی۔ محمد سرور سیفی محمد اکمل سیفی۔ محمودہ بیگم۔

(۲) اسلام احمد سیفی کے دو بچے ہیں۔ حامدہ بیگم اور سردار احمد سیفی۔

(۳) اکرام احمد سیفی کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔

(۴) سلیمہ خاتون کی شادی مسٹر محمد مرتضیٰ صدیقی کے ساتھ ہوئی۔

(۵) عالیہ خاتون کی شادی مسٹر صلاح الدین صدیقی کے ساتھ ہوئی۔



گروپ فوٹو۔ اولاد ذکور مولانا محمد اسمٰعیل

مقابل صفحہ ۱۴

۱۸۷۰ء میں مولانا کے گھر میں دوسرے فرزند تولد ہوئے اُن کا نام محمد [illegible] تھا۔ ضلع اسکول میرٹھ سے میٹریک پاس کیا تھا۔ سینٹ جانس کالج آگرہ میں بی۔ اے تک تعلیم پائی۔ پھر ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ کالج چھوڑ کر ملازمت اختیار کی مگر بعارضۂ دِق وسِل چھبیس سال کی عمر میں ۲۱ اکتوبر ۱۸۹۶ء کو بمقام میرٹھ داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کی شادی ہوگئی تھی مگر اولاد نہیں ہوئی

۱۸۷۶ء میں دوسری دختر پیدا ہوئی۔ اُس کا نام امت الاعلیٰ ہے ان کی شادی سیّد اقبال احمد صاحب کے ساتھ ہوئی۔ یہ نوجوان مولانا کے ہمزلف سید ظفریاب علی مرحوم کے بھتیجے تھے۔ یہ عزیز نہایت ہونہار۔ ذہین۔ شائستہ تعلیم یافتہ خوشرو۔ خوش وضع تھے۔ لیکن اچانک بعارضۂ اسہال ۱۹۰۳ء میں انتقال کیا

مولانا کے سب سے چھوٹے فرزند محمد اسلم ۷ اگست ۱۸۸۰ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے اُن کی شادی سیّد مظفر علی صاحب مرحوم کی دختر سے ہوئی۔ اور ان [illegible] پانچ اولادیں ہوئیں۔ تین لڑکے (۱) محمد مُسلم سیفی۔ (۲) اسلام احمد سیفی (۳) اکرام احمد سیفی اور دو بیٹیاں سلیمہ خاتون اور عالیہ خاتون۔ دونوں کی شادیاں ہو گئیں

(۱) محمد مسلم سیفی کے تین لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ محمد اکرم سیفی۔ محمد اسعد سیفی
محمد اکمل سیفی۔ محمودہ بیگم۔

(۲) اسلام احمد سیفی کے دو بچے ہیں۔ حامدہ بیگم اور مسرور احمد سیفی

(۳) اکرام احمد سیفی کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔

(۴) سلیمہ خاتون کی شادی مسٹر محمد مرتضیٰ صدیقی کے ساتھ ہوئی

(۵) عالیہ خاتون کی شادی مسٹر صلاح الدین صدیقی کے ساتھ ہوئی



گروپ فوٹو - اولاد ذکور مولانا محمد اسمٰعیل

مقابل صفحہ ۱۴

سوانح عمریوں کے اندر خاندان کے تفصیلی حالات بیان کرنے میں عموماً خسّت برتی جاتی ہے۔ اِس تقلید میں مولانا کی اولاد کا تذکرہ نہایت اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے۔ البتّہ اِس کتاب میں ایک گروپ فوٹو دیا گیا ہے۔ جس میں اولاد ذکور کی تصویریں مولانا کے پڑپوتوں تک دی گئی ہیں۔

سیّد اقبال احمد کا انتقال پُر ملال ۲۱ سال کی عُمر میں

سیّد اقبال احمد سے مولانا کی دخترِ اصغر اَمَتُ الاعلیٰ منسوب ہوئی تھیں۔ اس ہونہار عزیز کے انتقال نے مولانا کے صبر وتحمل کے جام میں بڑی زبردست ٹھیس لگائی۔ اس عزیز کی ناگہانی موت کی خبر بذریعہ تار برقی موصول ہوئی تھی۔ اِس صدمہ نے مولانا کے قلب پر گوناگوں نقوش بنائے اُس کا اندازہ اِن چند بیتوں سے ہوتا ہے جو دستیاب ہوئیں۔ واللہ اعلم۔ بقیہ مرثیہ کس طرح گُم ہوا۔ باوجود تلاش کہیں پتہ نہ چلا۔ ادبی نقطۂ نظر سے یہ مرثیہ رنج وغم کے جذبات کی مُکمّل تصویر ہے وہ چند بند جو زبانی یاد تھے اِس جگہ نقل کیے جاتے ہیں:۔

مرثیہ سیّد اقبال احمد مرحوم

شب کہ تھی تپ کے سبب سے مجھے آشفتہ سری — جب سحر ہونے کو آئی تو ہوئی بے خبری
ناگہاں آئی صدا کان میں وحشت کی بھری — برقِ جاں سوز تھی وہ تار کی پیغامبری
ہائے اقبال تیرے نام کے تھے سطر لکھے
ایسے الفاظ کہ کٹ جائے اگر ہاتھ لکھے

آنکھ اے کاش نہ آتے تجھے وہ حرف نظر — کان بہرا نہ ہوا کیوں کہ نہ سُنتا یہ خبر
عقل کھوئی نہ گئی کیوں کہ نہ کرتی باور — دل ہی اے کاش نہ ہوتا تو نہ ہوتا مضطر

ہائے اقبال! سُنا گو کہ ترے مرنے کو
جی نہیں چاہتا زنہار یقیں کرنے کو

تیرے بچّوں کو نہیں حادثۂ غم کی خبر — گو کہ سیلابِ بلا سر سے گیا اُن کے گزر
جب بڑے ہوں گے کڑھائے گی اُنھیں یادِ پدر — تو ہی بتلا! کہ تسلّی اُنھیں ہوگی کیوں کر

اِس مصیبت کی نہیں ہے اُنھیں پہچان ابھی
پوچھتا پھرتا ہے سب سے تجھے احسان[۱] ابھی

تیری کشتی میں کئی ایک مسافر تھے غریب — حیف! پہنچا نہ گیا اُن کو تو ساحل کے قریب
کشتی ٹوٹی ہوئی اور جوش پہ طوفان مُہیب — ڈھونڈتے ہیں تجھے گھبرا کے وہ برگشتہ نصیب

آہ منجدھار میں چھوڑا ہے سفینہ تو نے
کئی بدبختوں کا کُٹوایا ہے سینہ تو نے

(یہ دو شعر دستیاب نہیں ہوئے)

جو ابھی حلقۂ ماتم کو سمجھتے ہیں برات
اُن کے چہرے پہ جمی گردِ یتیمی ہیہات

سینہ کہتا ہے کہ شعلے مجھے بھڑکانے دو — آہ کہتی ہے کہ مجھ کو بھی نکل جانے دو
آنکھیں کہتی ہیں کہ آنسو ہمیں برسانے دو — دل کی خواہش ہے کہ چُپ چاپ ہی غم کھانے دو

صبر کہتا ہے کہ لو میں تو چلا ہاتھوں سے
مُنہ کو آتا ہے کلیجہ مرا اِن باتوں سے

شیخ محمد حامد فرزند کا انتقالِ پُرملال بعمر ۲۶ سال ۲۱ اکتوبر ۱۸۹۵ء کو

یہ مولانا کے منجھلے فرزند تھے۔ ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے مولانا کو اس فرزند سے علاوہ اُلفت پدری کے اِن کے

---

[۱] سید احسان الحق دختر زادۂ مولانا۔ بعد یتیمی مولانا کے یہاں پرورش پائی۔ مولانا نے پندرہ ہزار کی جائداد اُن کے نام منتقل کردی تجارت میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ پاتھے انڈیا کے مالک ہیں، بمبئی میں قیام ہے۔

عقیل و فہیم ہونے کی بنا پر بھی ایک دلی لگاؤ تھا۔ مدرسۃ العلوم علی گڈھ سے
واپسی پر اِن کے خیالات میں یکایک تغیّر پیدا ہوا۔ کچھ عرصہ سیر و سفر میں مصروف
رہے۔ فقراء کی خدمت میں حاضر ہونے کا شوق تھا۔ شادی ہو چکی تھی۔ ملازمت
کا تعلق بھی ہو گیا تھا۔ اُنھیں دنوں آگرہ آئے ہوئے تھے۔ وہاں حضرت حاجی
وارث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف فرما تھے۔ اُن کی خدمت میں حاضری کا
اتّفاق ہوا کرتا تھا۔ ایک دن کچھ ایسی توجہ فرمائی کہ دل اِس عالم کی رونق سے
سرد ہو گیا۔ رفتہ رفتہ جسم پر بھی اثر نمودار ہونے لگا۔ نہایت قوی الجثّہ جوان تھے۔
مگر پہلے سِل کا عارضہ لاحق ہوا اور پھر دِق کا۔ اِس طرح تین سال تک بیمار رہے۔
آگرہ میں بہترین یونانی اور انگریزی اطبّاء کا علاج رہا۔ لیکن جب تندرستی کی توقّع
باقی نہ رہی تو مولانا نے ماہ اگست ۱۸۹۵ء میں اُن کو میرٹھ روانہ کر دیا۔ انتقال سے
قبل مولانا میرٹھ تشریف لے گئے تھے اور فرزند عزیز سے رخصت ہو آئے تھے۔ ۲۲ر
اکتوبر ۱۸۹۵ء کو اُن کے انتقال کی خبر بذریعہ خط آگرہ میں موصول ہوئی۔ آخر تو باپ
کا دِل تھا جب تک ضبط ہو سکا خاموش رہے۔ جب آنسوؤں کا چشمہ اُبل چلا تو
پھر اُس کا رُکنا محال تھا۔ عین اِس بے قراری اور اضطراب کی حالت میں کچھ اشعار
موزوں فرماتے جاتے تھے۔ یہ جگر گوشہ کا مرثیہ تھا۔ شاعرانہ حیثیت سے یہ مرثیہ بے نظیر
کلام ہے یہ ایک اور پہلو بھی رکھتا ہے جس کا نفسیات سے تعلق ہے۔ ایک انسان علم و
فضل سے بہرہ مند۔ شریعت اور طریقت سے آگاہ۔ ایک رُوح فرسا صدمہ سے متاثر ہوتا
ہے۔ کیسے کیسے جذبات دل میں موج زن ہوتے ہیں۔ اُس کا قلب رنج و غم کی تاریک
وادی میں کن خیالات سے متاثّر ہو کر سکون پاتا ہے۔ اِس مرثیہ کو گہری نظر سے پڑھا

جائے۔ تاکہ نفسیات کے ارتقاء کی حقیقت تک رسائی ہو سکے۔ وہ مرثیہ یہ ہے:۔

مرثیہ شیخ محمدؐ حامد صاحب مرحوم

حامد کہاں! کہ دوڑ کے جاؤں خبر کو میں
کس آرزو پہ قطع کروں اِس سفر کو میں

مانا بُری خبر ہے پہ تیری خبر تو ہے
صبر و قرار نذر کروں نامہ بر کو میں

یہ سنگ و خشت آہ دلاتے ہیں تیری یاد
روتا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں

ہے تیری شکل یا تیری آواز کا خیال
کرتا ہوں التفات یکایک جدھر کو میں

افسوس! ہائے ہائے کی آتی نہیں صدا
پوچھے تو کیا بتاؤں تیرے چارہ گر کو میں

کیا ہو گیا اِسے! کہ تجھے دیکھتی نہیں
جی چاہتا ہے آگ لگادوں نظر کو میں

اچھّا جو تو نے گوشۂ مرقد کیا پسند
اب اپنے حق میں گور بناؤں گا گھر کو میں

ترے سرِ عزیز کی بالش ہو خاک سے
بالینِ غم سے اب نہ اُٹھاؤں گا سر کو میں

دیکھی نہ تھی بہار ابھی تیرے شباب کی
بھولا نہ تھا ابھی تیرے عہدِ صغر کو میں

تقدیر ہی نے ہائے! نہ کی کچھ مساعدت
کیا روؤں اب دُعا و دوا کے اثر کو میں

حُکمِ خدا یہی تھا کہ بیٹھا کیا کروں
ماتم میں تیرے اشک فشاں چشمِ تر کو میں

جز دردِ داغ تو نے نہ چھوڑا نشاں حیف!!
رکھوں گا میہمان انھیں عُمر بھر کو میں

کرنے دو آہ و نالہ کہ آخر رہوں گا بیٹھ
تسلیم کر کے حُکمِ قضا و قدر کو میں

کیا فکرِ آب و نان! کہ غم کہہ رہا ہے اب
موجود ہوں ضیافتِ دل اور جگر کو میں

تُجھ کو جوارِ رحمتِ حق میں جگہ ملے
مانگا کروں گا اب یہ دُعا ہر سحر کو میں

جنسِ دوام تو نہیں دُنیا کہ مر رہوں
کاہے کو گھر خیال کروں رہ گزر کو میں

خود ہم سے بھی زیادہ ہو جو ہم پہ مہرباں — وہ جامِ زہر دے۔ تو نہ چکھوں شکر کو میں
وہ جانے اور اُس کی رضا جو پسند ہو — سب کام سونپتا ہوں اُسی دادگر کو میں
ہوتا نہ دل میں درد۔ تو کرتا نہ ہائے ہائے
دیتا نہ طول یوں سخنِ مختصر کو میں

مولانا کی والدہ ماجدہ کا انتقال سنہ ۱۹۰۱ء

مولانا کی والدہ ماجدہ نے ستو سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ اگرچہ اَن پڑھ تھیں لیکن نہایت ذہین اور قوی الخیال تھیں۔ اُن کے شوہر کی وفات کے بعد سے جائداد کی کُل آمدنی اُن کے تصرف میں آتی تھی۔ اپنی مرضی سے جس قدر مناسب جانتیں اپنی اولاد میں تقسیم فرماتیں۔ وفات سے پانچ سال پہلے تک قویٰ مضبوط تھے۔ اور بآسانی چلتی پھرتی تھیں۔ آخر پانچ سال میں چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی تھیں۔ بڑے صاحب زادے شیخ غلام نبی صاحب مرحوم کے ساتھ رہتی تھیں۔ اپنے تینوں صاحب زادوں اور ایک صاحب زادی کو جُداگانہ مکانات عطا فرما دئے تھے۔ یہ تقسیم مولانا کے والدِ بزرگوار کی حیات ہی میں عمل میں آ چکی تھی۔ مولانا والدہ کے ارشادات کا بہت احترام کرتے تھے۔ کبھی اُن کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کرتے۔ اُن کا دل دُکھانا گناہ سمجھتے تھے۔ وہ بھی مولانا کے حال پر نہایت مہربان تھیں۔ سنہ ۱۸۷۹ء میں مولانا کے شیخ سے بیعت بھی ہوئی تھیں۔

دوسرا باب

ملازمت اور احباب

(محکمہ تعلیم میں تعلق ملازمت) رڑکی کالج سے واپسی پر عربی فارسی کی اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ جاری رہ سکتا تھا مگر ایسا ہوا نہیں۔ ایسے کیا اسباب حائل ہوئے کہ جن کے باعث اس کم سنی میں ملازمت کرنے پر مجبور ہوئے۔ انسب تو یہ تھا کہ ایسے ذکی، ذہین، اور ہونہار طالب علم کو بہترین اساتذہ کے سپرد کیا جاتا اور اُس کی اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا جاتا۔ بہرحال قُدرتی کشش اِس محکمہ میں لے آئی جہاں یہ گوہرِ نایاب ایک روز چمکنے والا تھا۔ قُدرت کو یہ علم تھا کہ ایک دِن یہ ہونہار طالب علم خود نارمل اسکول کے مُدرّس فارسی کی حیثیت سے چار دانگِ ہند میں اپنی اُستادی کا سکہ جمائے گا۔ فنِ شعر میں ایک طرزِ خاص کا موجد ہوگا۔ اور سعدیٔ ہند کے لقب سے مشہور و معروف۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسپکٹر مدارس سرکل میرٹھ کے محکمہ میں بطورِ کلرک ملازم ہوئے۔ ابتدائے ملازمت ۱۰ر جولائی ۱۸۶۰ء سے ہوئی ہے۔ اُس وقت مولانا کی عُمر صرف سولہ سال کی تھی۔

(احباب کا دائرہ) بچپن کا زمانہ والد بزرگوار کے سایۂ عاطفت میں گذرا۔ یہ بزرگ نہایت نیک سیرت۔ خلیق۔ حلیم اور تنہائی پسند تھے۔ مولانا میں یہ اوصاف بدرجہ اتم پائے جاتے تھے۔ اور یقیناً والد بزرگوار کی صحبت اور تربیت کا نتیجہ تھے بچپن کے ساتھیوں اور کھیل کود کے مشاغل کا پتہ نہیں چلا۔ لیکن اِس میں کچھ شک نہیں کہ مولانا نے نہایت عُمدہ تربیت پائی تھی کہ جوان ہو کر ہمیشہ نیک صحبت کے متلاشی رہے۔

محلہ مشائخان میں حکام کی سکونت

چونکہ صدر تحصیل اور کوتوالیٔ شہر مولانا کے مکان سے بہت متصل ہیں اور محلہ بالائے قلعہ میں شرفاء کی بستی تھی۔ اِس لئے اکثر حکام اِس محلہ یا اِس کے قرب وجوار میں سکونت رکھنے کو ترجیحاً پسند فرمایا کرتے تھے۔

منشی نجم الدین صاحب ڈپٹی انسپکٹر مدارس

چنانچہ ۱۸۶۰ء میں منشی نجم الدین صاحب بجنور سے ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوکر میرٹھ تشریف لائے اور محلہ مشائخان میں قیام فرمایا۔ تاحیات اُسی مکان میں فروکش رہے۔ حتّٰی کہ آپ کا مدفن بھی میرٹھ ہی میں بنا ہے آپ کا وطنِ ثانی دہلی تھا۔ دلّی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ میرٹھ میں آپکا دولت کدہ بہترین سوسائٹی کا مرکز اور مرجع تھا۔ مولانا کے مکان سے ڈپٹی صاحب کا مکان کوئی ڈیڑھ سَو قدم کے فاصلہ پر واقع ہوا تھا۔ مولانا اور ڈپٹی صاحب میں ایسا اتحاد وارتباط پیدا ہوا کہ حضرت منشی صاحب کا وصال ۱۹۰۶ء میں مولانا کی گود میں ہوا منشی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اگر اسمٰعیل کا انتقال میرے سامنے ہوا تو میں اُس کے بغیر ایک گھڑی زندہ نہ رہ سکوں گا۔ منشی صاحب کے حالات مولانا نے اپنے قلم سے تحریر فرمائے ہیں۔ اُن کو اِس موقع پر نقل کیا جاتا ہے:۔

حالات منشی نجم الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ

آپ کا نام نجم الدین تھا۔ اور والدِ ماجد کا اسم گرامی مولوی قمر الدین جو نسباً شیخ فاروقی تھے۔ مولد و مسکن خیرآباد (اودھ) اور وطنِ ثانی دہلی۔

آپ کے والد نے اسی شہر میں تاہّل اختیار کیا تھا چنانچہ آپ کی والدہ شریفہ نواحِ دہلی کے ایک خاندانِ شرافت سے تھیں۔ جن کی بود و باش قصبہ کاٹھ باغپت اور دہلی تھی۔

آپ کی ولادتِ باسعادت ۱۲۵۲ھ میں بمقام دہلی محلہ کشمیری دروازہ میں ہوئی آپ فرمایا کرتے تھے کہ جس دن نواب شمس الدین خاں کو دار پر کھینچا گیا ہے۔ جو دلّی میں ایک حادثہ حائلہ تھا۔ وُہی روز میری پیدائش کا تھا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت بزرگانِ خاندان کی خدمت میں پائی۔ جب سن شعور کو پہونچے۔ تو مولانا امام بخش صہبائی کی شاگردی میں سپرد کیئے گئے۔ اور کچھ عرصہ بعد پرانے دلّی کالج میں داخل ہو کر علوم ریاضی وغیرہ تحصیل کیئے۔ اور کالج کے ممتاز طلبا میں شمار ہونے لگے۔ مولوی نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ اور ماسٹر رام چندر اور مولوی نصیر الدین کے معاصر و ہم سن تھے آپکے والد کا انتقال ۱۸۵۶ء میں ہوا اُنھوں نے پچاس۵۰ ہزار روپئے کا سرمایہ فرزند عزیز کے سپرد کیا تھا۔ جو فتنہ غدر ۱۸۵۷ء میں سب کا سب تاراج ہو گیا۔

ایّام غدر میں آپ کی عُمر کا اُنیسواں سال تھا۔ فتح دہلی سے چند ہفتہ پہلے ہی شہر سے نِکل کھڑے ہوئے اور پیادہ پا قطع منازل کرتے ہوئے پانی پت کی راہ سے سہارن پور پہونچے۔ وہاں سے سواری میں دہرہ دون اور وہاں سے مصوری پہاڑ پر رِیڈ صاحب ڈائرکٹر سرشتہ تعلیم کے پاس حاضر ہوئے۔ یہ صاحب آپکے والد کے دوست تھے۔ نہایت مہربانی سے پیش آئے۔ اور اپنے دفتر میں کام سیکھنے کے لئے اِجازت دیدی۔ اِس دفتر کے میر منشی مولوی کریم بخش مرحوم تھے۔ جو دلّی کالج میں ریاضی کے ماسٹر رہ چکے تھے۔ اور آپ کے اُستادِ شفیق تھے۔ آپکے زندہ سلامت پہونچنے سے بے حد مسرور ہوئے۔ اور جب دیکھا کہ پچاس۵۰ ہزار نقد کے لُٹ جانے کا آپکے دِل پر ذرّہ بھر اثر نہیں ہوا۔ تو جنابِ باری میں بہت بہت شُکر ادا کیا۔ مولانا موصوف فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو یہ خوف تھا کہ اگر نجم الدین زندہ رہا تو اِس تلفِ

بضاعت کا غم اُس کو دیوانہ ضرور بنادے گا۔

سنہ ۱۸۵۸ء میں صاحب ڈائرکٹر تعلیم نے آپ کو بجنور کا ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر کیا۔ وہاں دو سال تک کام کیا۔ سیّد احمد خاں اور میر تراب علی صاحب اکبر آبادی آپکے حال پر شفقت فرماتے اور سرکاری کام کے انجام میں آپ کی رہنمائی کیا کرتے تھے۔ سنہ ۱۸۶۰ء سے اُسی عہدہ پر میرٹھ کو تبدیل ہوئے۔ بعد حصولِ پنشن بھی اِسی خطّہ میں رہے اور بعد وفات یہیں مدفون ہوئے۔ غالباً سنہ ۱۸۷۰ء میں آپ کی اہلیۂ اوّل کو سفرِ آخرت پیش آیا تو نہایت صدمہ ہوا۔ خیالات میں پریشانی اور طبیعت میں سخت وحشت پیدا ہوئی۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا۔ اِس لئے میرٹھ سے دلّی گئے کہ کسی بزرگِ باخدا سے عرض حال کریں۔ وہاں سے پتہ ملا کہ حافظ مرتضیٰ صاحب پانی پت میں ایک بزرگ مجذوب صفت ہیں۔ اُن کی زیارت کے لئے پانی پت کا سفر کیا۔ قلندر پانی پتیؒ کے چوک سے گذر رہے تھے کہ ایک بزرگ نے خبر دی کہ قلندر صاحب کی درگاہ میں ایک بزرگ (مولانا سیّد غوث علی شاہ) کچھ عرصہ سے تشریف فرما ہیں پہلے اُن سے مِل لو۔ جگہہ بہت قریب تھی اوّل حضرت قبلہ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ وحشت کی شکایت زبان پر آئی۔ تو فرمایا کہ ہاں ایسی وحشتیں بہت ہوا کرتی ہیں۔ چند لمحے بات چیت میں گذرے تو دیکھا نہ وہ اندوہ ہے نہ دہشت و پریشانی بلکہ طبیعت میں فرحت اور دل کو سکون ہے۔ خیر۔ بعد ازاں حافظ صاحب کی خدمت سے شرف اندوز ہوئے۔ مگر جس میکدہ کے دروازہ پر جذب کھینچ لے گیا تھا ہمیشہ اُسی کے جرعہ نوش رہے۔ نفسِ واپسیں تک اُسی گل و گلزار کے عندلیب اور اُسی شمع کے پروانے بنے رہے۔ جس کے روزِ اوّل بن چکے تھے ؎ (حافظؒ)

غلام نرگسِ مستِ تو تاجداران اند خرابِ بادۂ لعلِ تو ہوشیاران اند

منشی تفضل حسین اور مولوی محمد حیات

منشی نجم الدین صاحبؒ کا دولت کدہ فنونِ لطیفہ کے دلدادہ حضرات کا ایک باقاعدہ کلب تھا جس میں نہ فیس داخلہ تھی نہ چندۂ ماہانہ۔ صبح و شام احباب کا مجمع، شعر و سخن پر گفتگو، تصوّف کا چرچا، علمی مسائل پر بحث احبابِ ہم خیال کا شغل تھا۔ حضرت منشی نجم الدینؒ صاحب کے اخلاق نے شہر میرٹھ کے ہر کہ و مہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ منشی تفضل حسین صاحب جن کا تعلق سررشتۂ تعلیم سے تھا اور مولوی محمد حیات صاحب مالک ضیائی پریس اسی کلب کے نورتن تھے۔ مولانا کی خوش قسمتی تھی کہ ایسی عمدہ سوسائٹی اپنے مسکن سے اتنی قریب اور عین عنفوانِ شباب میں نصیب ہوگئی۔

ذوقِ سخن کس طرح پیدا ہوا

منشی نجم الدین صاحبؒ ۱۸۶۰ء میں میرٹھ تشریف لائے۔ مولانا نے خود ۱۸۶۰ء میں ملازمت شروع کی۔ منشی نجم الدین صاحب کے دولت کدہ پر اہلِ کمال کا اجتماع رہتا ہی تھا۔ ایک دِن کسی صاحب نے فرمایش کی کہ حاضرین میں سے ہر شخص اپنی پسند کا بہترین اُردو شعر سُنائے۔ جب مولانا کی باری آئی تو خیالات یک لخت منتشر ہوگئے۔ کوئی اُردو کا شعر یاد نہ آیا۔ آپ نے بہ اجازتِ احباب فارسی کا ایک شعر سُنایا جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:۔ شعر

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے را با کسے کارے نباشد

خیر۔ یہ وقت تو گذر گیا مگر خفّت و پریشانی کا اثر طبیعت پر مستقلاً قایم ہوگیا۔ آپ نے اساتذہ کا اُردو کلام بالاستیعاب پڑھنا شروع کیا۔ چنانچہ ابتدا حضرت امام بخش صہبائی دہلوی کے گلدستۂ سخن سے کی جو شعرائے اُردو کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد

ذوقؔ و مومنؔ و غالبؔ کا کلام اوقاتِ فرصت میں نہایت توجّہ کے ساتھ مطالعہ کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ کسی اُستاد کی زمین میں خود بھی غزل لکھ لیتے۔ لیکن احباب کو اس مشق کا مُطلقاً علم نہ تھا۔ اِس امر میں بہت فکر فرماتے کہ کلام میں کسی طرح کا نقص یا لغزش نہ رہے۔ مولانا کی عُمر اُس وقت سولہ[۱۶] سال کی تھی۔

شیخ قمرالدین رسالدار نمبر۷ بنگال لانسرز۔ یہ بزرگ مولانا کے برادرِ نسبی تھے۔ خوبصورت اور وجیہہ جوان تھے۔ قد بلند، جسم سُڈول، ہیکل قوی، وضع قدیم، اور مزاج رنگین پایا تھا۔ مولانا سے عُمر میں دس سال بڑے تھے۔ لیکن مولانا کی متانت اور مذاقِ علمی کی بناء پر خود چھوٹے بھائی کا ادب و لحاظ کرتے تھے۔ کسی طرح اُن کو مولانا کے شغلِ غزل گوئی پر واقفیت ہوگئی چنانچہ مشاعروں کی طرح میں مولانا سے غزل لکھواتے اور مشاعروں میں شرکت فرما کر اسے سُناتے اور داد پاتے۔ مولانا نے کسی مشاعرہ میں کبھی شرکت نہیں فرمائی۔ کُلیّاتِ اسمٰعیل کے نئے اڈیشن میں دو غزلیں ہیں۔ جن کے مقطع یہ ہیں:۔

(۱) کچھ آج ہی نہیں ہوں ثناخوانِ مصطفےٰؐ ہے مجھ کو اے قمرؔ یہ وظیفہ دوام کا

(۲) اُس بحرِ نور کا جو ثنا گر ہوا قمرؔ سیراب جامِ لُطف سے ہر خشک لب ہوا

قمرؔ تخلّص ان غزلوں میں جناب شیخ قمرالدین صاحب کے نام کی مناسبت سے ڈالا گیا تھا۔ بعض اور غزلوں میں بھی یہ تخلّص باندھا گیا تھا مگر مولانا نے اِن اشعار کو کلیّات کے پہلے اڈیشن میں نظر انداز کر دیا تھا۔

مشاعروں کا انعقاد یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے سلطنت جا چکی تھی ہنگامۂ غدر ۱۸۵۷ء سے قبل مغلیہ حکومت سسکیاں لے رہی تھی۔ امراء اور شہزادے عیش و

عشرت کے گرداب میں غرق تھے۔ بڑے سے چھوٹے تک نظامِ حکومت کا تزلزل دیکھ کر جی چھوڑ چکا تھا۔ مُرغ بازی۔ بٹیر بازی۔ پتنگ بازی۔ ناچ اور رنگ کی صحبتیں مشاعروں میں غزل سرائی کی دھوم دھام غرض سوسائٹی کا ہر طبقہ کم وبیش اسی شغل میں محو تھا۔ اور یہ کیفیت نہ صرف اہلِ دہلی کی تھی بلکہ ہر شہر میں خاص وعام زیادہ تر اِن لغویات کو مقصودِ زندگی اور مفہومِ تفریح تصوّر کرنے لگے تھے۔ میرٹھ نسبتاً دہلی سے قریب تھا۔ اِس لئے یہ کب ممکن تھا کہ میرٹھ اِن جذبات وتخیلات سے محفوظ رہتا۔ مولانا اِس قسم کی صحبتوں میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ اِس کا ظاہر سبب یہ ہوسکتا ہے کہ آپ کے والد کا مزاج تنہائی پسند تھا۔ ایسی صحبتوں کی شرکت سے پرہیز کرتے تھے۔ مولانا سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ بربنائے اُلفت ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ شاید اِس بنا پر غیر مانوس مجلسوں سے گریزاں رہتے تھے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب سے شرفِ تلمّذ۔

اِس کا صحیح علم نہ ہوسکا کہ مولانا نے میرزا صاحب سے کبھی مشورہٗ سخن کیا یا نہیں۔ لیکن میرزا اسد اللہ خاں غالب رحمۃ اللہ علیہ کو شاعری میں اپنا اُستاد مانتے تھے۔ اور یہ بات خود مولانا کے ارشاد سے ظاہر ہوئی۔ یہ معلوم نہیں کہ مولانا کبھی اُستاد کی خدمت میں حاضر ہوئے یا نہیں۔ مولانا کے کلام میں صنفِ غزل بہت مختصر ہے۔ لیکن اِس کم گوئی پر بھی شاید اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ غزلیں اُستاد کی زمینوں میں لکھی ہیں۔ چنانچہ کُلّیات میں غزلیں کل ۸۸ ہیں۔ اِن میں سے تیرہ غزلیں مرزا غالب کی زمینوں میں ہیں۔ اہلِ سخن اِن کے مطالعہ سے یہ اندازہ کرسکیں گے کہ مولانا نے اپنے یگانۂ روزگار اُستاد کی روِش میں کیا مرتبہ حاصل کیا ہے۔

سنہ ۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۷ء کا زمانہ

یہ سات برس کا زمانہ مسلسل میرٹھ میں گذرا اور اِس وقت کا زیادہ حصّہ منشی نجم الدین اور اُن کے ہم جلیسوں کی صحبت میں۔ چونکہ یہ علمی صحبت تھی اور مولانا کا تعلق سررشتہ تعلیم سے تھا۔ اِس بنا پر روز بروز شوق علمی میں ترقّی ہوتی رہی چونکہ درس کی تکمیل نہیں ہوئی تھی یہ زمانہ کُتب بینی میں صرف کیا گیا۔ بالخصوص کتب فارسی کے مطالعہ میں۔ تحصیلِ علم کے متعلق یہ قول بالکل درست ہوگا کہ مولانا کا مُعلّم اُن کا شوق اور رہبر اُن کی ہمّت تھی۔

قیام سہارن پور ۱۸۶۷ء تا ۱۸۷۰ء

اِس عرصہ میں مولانا کا قیام سہارنپور رہا ہے۔ وہاں کے ضلع اسکول میں مُدرّس فارسی تھے۔ چونکہ وہاں عُلوم عربیّہ کی تعلیم و تعلّم کا چرچا زیادہ تھا۔ آپ نے موقع کو غنیمت جان کر اِس دوران میں زبان عربی کی تحصیل پر توجّہ فرمائی۔ جس اُستاد سے آپ نے عربی پڑھی تھی اُن کا نام اکثر ارشاد فرمایا افسوس ہے یاد نہیں رہا۔ میرٹھ کی واپسی میں آپ کا تقرّر دوبارہ انسپکٹر مدارس کے دفتر میں ہوا اُس وقت آپ نے انگریزی نظموں کا ترجمہ دیکھا۔ اِن دنوں ممالک مغربی و شمالی و اودھ (اس صوبہ کا پہلے یہی نام تھا) کے ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم مسٹر کیمسن تھے۔ اُن کے حکم سے مسٹر ٹی جے کین انسپکٹر مدارس سرکل میرٹھ نے انگریزی زبان کی اخلاقی نظموں کا انتخاب فرمایا۔ اور اُس کا ترجمہ قلق میرٹھی سے کرایا۔ چونکہ اِسی دفتر میں آپ ملازم تھے۔ اِس ترجمہ کے بغور مطالعہ کرنے کا موقعہ مِلا۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ اِس ترجمہ کو دیکھ کر استعجاب ہوا کہ شاعر ایسا کلام بھی لکھتے ہیں۔ ایک طرف دور از کار تشبیہیں اور نفرت انگیز مبالغے جو غزل اور قصیدے کی جان سمجھے جاتے تھے۔ اِدھر مناظرِ قدرت اور جذباتِ انسانی کی صحیح مصوّری وہ بھی سادہ و سلیس طرز میں۔ حقیقت میں اِس ترجمہ کا

مطالعہ ایک امرِ اتفاقی تھا کہ جس نے مولانا کی طبیعت کا رُخ بالکل بدل دیا۔ اِس ترجمہ کو دیکھ کر بعض انگریزی نظموں کا ترجمہ کیا ہے یہ نظمیں کلّیات میں موجود ہیں۔ آیندہ کے لئے اپنے کلام کی بنیاد اِس نئے انداز پر رکھی ہے۔ افسوس ہے کہ اِس صوبہ کے سررشتہ تعلیم نے انجمن لاہور کی روش پر جس کی سرپرستی میں کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب نے ایک نمایاں حصّہ لیا تھا۔ کوئی عملی کارروائی نہیں کی۔ انجمن لاہور نے ایک نئے مشاعرہ کی بنیاد ڈالی تھی جس میں حالی اور آزاد جیسے کاملین نے اپنی سحر طرازی سے اُردو شاعری کے مُردہ قالب میں ایک نئی رُوح پھُونک دی تھی۔

ہمارے صوبہ میں بھی کوئی ایسی تحریک بر روئے کار آتی تو ممکن تھا کہ مولانا کو بھی اپنی فکرِ بلند پرواز کے کارنامے دِکھانے کا براہ راست موقعہ ملتا۔ اِس عرصہ میں مولانا خاموشی کے ساتھ تالیف کا کام کرتے رہے۔ خصوصاً زبانِ فارسی کے متعلق چند رسالے تالیف فرمائے۔ جن کا استعمال طلبائے انگریزی کے لئے مفید تھا۔ اِس زمانہ میں نہ فارسی کی قدر ہے نہ اِن تالیفات کی۔

البتّہ ایک تالیف ایسی تھی جو شعراء اور طلباء دونوں کے حق میں بغایت مفید ثابت ہوتی۔ اگر مولانا اُس کا انطباع پسند فرما لیتے۔ سخت کاوش اور بعید مطالعہ کے بعد مولانا نے مسلّم الثبوت اساتذہ کے کلام سے اشعار کا انتخاب بلحاظ مضامین کیا تھا مثلاً

پاسِ وقت

درؔد = سیر کر دُنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں	زندگانی گر رہی تو نوجوانی پھر کہاں
” بے فائدہ انفاس کو ضائع نہ کر اے درؔد	ہر دم دمِ عیسیٰ ہے تجھے پاس نہیں ہے

درؔد= فرصتِ زندگی بہت کم ہے | مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے
میرؔ= خوب دریافت جو کیا ہم نے | وقتِ خوش میرؔ نکہتِ گل تھا
" غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز | میرؔ اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا
" آیا ہے شیب سر پہ، گیا ہے شباب اب | کرنا ہو جو کچھ تم کو، تو، کرلو شتاب اب
مومنؔ= بہارِ باغ دو دن ہے غنیمت جان اے بلبل | ذرا ہنس بول لے، ہو زمزمہ پرداز، چہچہہ کر

عُزلت

جرأتؔ= نہیں ملتے ہیں جہاں میں وہ کسی سے جرأتؔ | مل گیا جن کو مزہ گوشۂ تنہائی میں

اِس کتاب کی کافی ضخامت تھی افسوس ہے کہ اُس کے صرف چند پریشان اوراق مولانا کے ایک بستہ میں ملے۔ لیکن کتابی شکل جاتی رہی۔ اس زمانہ میں مولانا نے چند نظمیں اپنے احباب کی فرمایش پر لکھیں تھیں بعض بزبانِ فارسی لیکن زیادہ تر اُردو میں۔ ان میں سے قابلِ ذکر دو قصیدے ہیں پہلا ۱۸۶۹ء کی تصنیف ہے۔ زمانۂ قیام سہارن پور میں لکھا گیا تھا۔ یہ اپنے ایک عزیز شیخ یعقوب علی مرحوم کی فرمایش سے لکھا تھا۔ ان صاحب کا تعلق ازمنۂ ماضیہ سے ریاستِ میرٹھ کے ساتھ چلا آتا تھا۔ یہ قصیدہ ذوقؔ و سوداؔ کے انداز میں نہایت خوب لکھا گیا ہے۔ مولانا کی عمر اُس وقت پچیس ۲۵ سال کی تھی۔ اِس سے قدرتِ کلام پورے طور سے ظاہر ہوتی ہے۔ اسی زمین میں مومنؔ کا ایک قصیدہ ہے اُس سے مقابلہ کیا جائے۔ دوسرا قصیدہ ۱۸۷۰ء میں منشی نجم الدین دہلوی کی فرمایش سے لکھا گیا تھا۔ پُرانی روش کے قصائد میں زورِ بندش اور شوکتِ الفاظ کے لحاظ سے اُردو کے بہترین قصائد میں شمار کیے جانے کا مستحق ہے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت ذوقؔ اور سوداؔ کا طرز زیادہ پسندِ خاطر تھا۔

۱۸۷۰ء تا ۱۸۸۸ء قیام میرٹھ یہ سترہ ۱۷ سال کا زمانہ میرٹھ میں گذرا۔ سہارن پور کے ضلع اسکول میں ہیڈ مولوی تھے۔ وہاں سے واپسی پر دوبارہ انسپکٹر مدارس کے دفتر میں تقرر ہوا ۱۸۷۱ء میں میرٹھ کے ضلع اسکول میں اسی عہدہ پر تبدیل کئے گئے۔ بہر حال ۱۸۸۸ء تک متواتر وطن میں قیام رہا۔ مولانا کے سوانح زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے عقیدے میں بے کار رہنا داخلِ گُناہ تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں فارسی درسی کتابوں کی تالیف۔ قواعد اُردو کی تحقیق۔ نظموں کی ترتیب۔ نجم الاخبار کے لئے مضمون نگاری۔ رسالۂ قلندری یا آئینہ خودشناسی کی تدوین، تذکرہ غوثیہ کی تصنیف غرض یہ وقتِ عزیز ان مشاغل علمیہ میں صرف ہوا۔ اِس سے ثابت ہوا کہ مولانا عملی زندگی پسند فرماتے اور وقت کا رائیگاں کرنا اخلاقی جرم تصوّر کرتے تھے۔

ڈاکٹر رحیم اللہ صاحب مرحوم مولانا کے احباب کے سلسلہ میں ڈاکٹر رحیم اللہ صاحب مرحوم کا تذکرہ بھی مناسب ہے۔ ڈاکٹر رحیم اللہ صاحب کا وطن شاہ جہاں پور (روہیل کھنڈ) تھا مگر بہ سلسلہ ملازمت میرٹھ میں تقرر ہوا تھا۔ بعدِ پنشن میرٹھ ہی میں سکونت اختیار فرمائی۔ آپ بڑے کامل اور حاذق طبیب اور سرجن تھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے پیشہ میں قابلِ رشک کامیابی حاصل کی تھی۔ مگر اُن کا چلن ہمیشہ نہایت سادہ رہا۔ مولانا سے بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ اُن کا بہت احترام فرماتے تھے۔ اپنے تین فرزند بغرضِ تربیت آپ کی خدمت میں آگرہ بھیجے تھے۔ جو کئی سال مولانا کے پاس رہے اُن میں سب سے چھوٹے مسٹر حیدر حسن بی۔ اے بیرسٹر ایٹ لا تھے۔ جو بعد میں انسپکٹر مدارس حلقہ میرٹھ ہوئے۔ ہونہار، نیک، خلیق، ذہین وطبّاع شخص تھے۔ افسوس ہے کہ اِن کی عُمر نے وفا نہ کی۔ کوئی چھیالیس سال کی عُمر میں اِس دارِ فانی سے رحلت

فرمائی۔ ڈاکٹر صاحب کے چھ فرزند تھے۔ اور سب کو مولانا کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ مولانا کے معالج رہا کرتے تھے۔

مولانا کے شاگرد | مولانا کے شاگردوں کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ صرف خواص ہی کا تذکرہ کیا جائے۔ تب بھی طول سے خالی نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس ضمن میں صرف دو صاحبوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک ڈاکٹر وزیر سنگھ۔ دوسرے ڈاکٹر رنجیت سنگھ۔ یہ دونوں صاحب اسسٹنٹ سول سرجن ہوئے۔ دونوں کا وطن میرٹھ ہے۔ مولانا سے ضلع اسکول میرٹھ میں تعلیم پائی تھی۔ جب مولانا آگرہ میں تھے۔ ڈاکٹر وزیر سنگھ آگرہ میڈیکل اسکول میں پروفیسر تھے۔ انھوں نے دو انگریزی کتابوں کا ترجمہ کیا تھا۔ ایک اناٹومی کے مضمون پر تھی، دوسری فزیالوجی کے۔ مولانا نے عبارت درست فرمادی تھی۔ لکھنے میں یہ بات معمولی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ایسے ترجمہ کو فصیح بنانے میں جو کاوش کرنی پڑی ہوگی۔ اس کا اندازہ ہر شخص کے لئے آسان نہیں ہے یہ دونوں کتابیں سلاستِ کلام کی بنا پر بہت مقبول ہوئیں۔

ڈاکٹر رنجیت سنگھ صاحب نے عہدۂ سول سرجن تک ترقی کی خطاب رائے بہادری سے موقّر و ممتاز ہوئے۔ بعد پنشن کئی سال لکھنؤ میں قیام کیا۔ اب وطن واپس آگئے ہیں۔ بزرگوں کی تہذیب و تربیت کا یہ نمایاں اثر ہے کہ احباب سے دیرینہ تعلّقات قدیمانہ رنگ میں اب تک قایم ہیں۔ تصوّف سے ذوق رکھتے ہیں۔ مولانا ان دونوں حضرات کی فنِ طب میں شہرت و ناموری حاصل کرنے پر اظہارِ اطمینان فرمایا کرتے تھے۔

ضلع اسکول میرٹھ سے نارمل اسکول میرٹھ کو تبادلہ | یہ صحیح نہ معلوم ہوسکا کہ کس سن میں، لیکن ضلع

اسکول میرٹھ سے آپ کا تبادلہ مدرّسِ فارسی کے عُہدہ پر میرٹھ کے نارمل اسکول میں ہوا ۱۸۸۸ء میں میرٹھ اور جھانسی کے نارمل اسکول توڑ دیئے گئے۔ اور ایک سنٹرل نارمل اسکول آگرہ میں قایم ہوا۔ چنانچہ اِن دونوں نارمل اسکولوں کا عملہ بھی آگرہ تبدیل کردیا گیا۔ اِس طرح بارہ سال مولانا کو آگرہ رہنے کا اتّفاق ہوا۔ مولانا کے کلام کی شُہرت اور مقبولیت قیام آگرہ میں ظہور پذیر ہوئی۔

مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی مرحوم۔

مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی کے والد حاجی سیّد فرید الدین صاحب حضرت قبلہ مولانا غوث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ پانی پتی کے خدّام میں سے تھے۔ اِس بنا پر حضرت مولانا اور مولانا وحید الدین سلیم کے درمیان رابطۂ اِتحّاد قایم تھا۔ "شمع ہستی" اور "سیف و قلم" یہ دونوں مثنویاں اوّل بار رسالہ "معارف" میں چھپی تھیں۔ رسالہ "معارف" مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی کی ادارت میں علی گڑھ سے شایع ہوتا تھا۔ شاید اِس بلند ادبی معیار پر یہ پہلا اُردو رسالہ تھا۔ مولانا وحید الدین سلیم نے یہ مثنویاں رسالہ معارف میں "ایم، آئی" کے نام سے طبع کی تھیں۔ اُن کا جب پانی پت میں جانا ہوا تو حضرت خواجہ حالی سے اِن مثنویوں کی بابت دریافت کیا کہ ان کا مصنّف کون ہوسکتا ہے۔ خواجہ صاحب مرحوم و مغفور نے کلام کی تحسین کے بعد صاحب تصنیف کے متعلق یہ فرمایا کہ اگر ایسی مثنویاں کوئی لکھ سکتا ہے تو وہ مولانا محمد اسمٰعیل ہیں۔

خان بہادر شمس العلماء منشی ذکاء اللہ دہلوی سے مُلاقات

مولانا کی نظمیں گاہے ماہے بلا نام نجم الاخبار میں طبع ہوا کرتی تھیں۔ اِن میں سے بعض نظمیں مثلاً "صبح کی آمد" اور "ملمّع کی انگوٹھی" بر بنائے سلاست بیان اور جدّت مضمون منشی صاحب

موصوف کو بہت پسند آئیں۔ وہ اُن دنوں میور سنٹرل کالج میں اَلسنۂ مشرقیہ کے پروفیسر تھے۔ چونکہ ڈپٹی نجم الدین صاحب کے ہم وطن و ہم جماعت اور دوست تھے اس لئے منشی صاحب نے ڈپٹی صاحب سے بذریعہ تحریر استفسار فرمایا کہ اُس گُم نام شاعر کے نام و نشان سے آگاہ فرمائیں کہ جس کا کلام نجم الاخبار میں شایع ہوتا رہتا ہے اس خط کے جواب میں ڈپٹی صاحب نے منشی صاحب کو میرٹھ تشریف لانے کی دعوت دی۔ چنانچہ موسمِ گرما کی بڑی تعطیل میں دلّی واپس جاتے ہوئے، منشی صاحب میرٹھ تشریف لائے۔ اور ڈپٹی صاحب کے یہاں قیام فرمایا۔ مولانا ذاتی اتحاد و اُنس کی بنا پر بھی اور مذاقِ تصوّف اور عُلوم ادبیّہ کے مرکز ہونے کے تعلّق سے بھی سرکاری اور ذاتی مشاغل سے فرصت پا کر خود ڈپٹی صاحب کے یہاں شام کے وقت روزانہ شریکِ صحبت ہوتے تھے۔ یہاں منشی ذکاء اللہ صاحب سے تعارف ہوا ان بزرگوں کے اخلاق ایسے بلند پایہ تھے کہ یہ ملاقات چونکہ مخلصانہ محرّکات پر مبنی تھی اس لئے تادمِ حیات اُسی پیمانہ پر قایم رہی۔

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد سے دہلی میں مُلاقات

مولانا ایک بار دلّی تشریف لے گئے۔ منشی ذکاء اللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُن کے ساتھ دلّی لائبریری تک گئے۔ واپسی میں جامع مسجد تک ساتھ رہا۔ اُس موقعہ پر راستہ ہی میں مولانا محمد حسین آزاد سے منشی صاحب نے تعارف کرایا۔ مولانا آزاد نے ذوقِ سخن کی کیفیت سُن کر انجمن لاہور کے مشاعرہ کے واسطے نظم کی فرمایش کی۔ مولانا نے اِس مشاعرے کے واسطے تین مثنویاں تصنیف فرمائیں تھیں جن کے نام یہ ہیں:۔ "تکھیاں"۔ "چاند"۔ اور "آبِ لال"، پہلی دو مثنویاں مولانا کے کاغذات میں نہیں ملیں۔ تیسری البتّہ

اُردو ادبی کُتب اور رسائل میں اکثر طبع ہوئی ہے۔ اُس قسم کی نظموں میں جس کی طرح خواجہ حالیؔ اور مولانا آزادؔ نے انجمن پنجاب کے مشاعرے میں ڈالی تھی۔ مثنوی "آبِ زُلال" ممتاز مرتبہ رکھتی ہے۔ اِس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا کی معلومات کس درجہ وسیع اور طبیعت شعر گوئی پر کس قدر حاوی تھی۔

خان بہادر شمس العلما منشی ذکاء اللہ کی ریڈروں میں مولانا کی نظمیں

غالباً ۱۸۹۰ء میں منشی ذکاء اللہ مرحوم نے ایک سلسلہ اُردو ریڈروں کا مدارس پرائمری صوبہ شمالی و مغربی و اودھ کے واسطے طبع کرایا تھا جو داخلِ نصاب بھی ہو گیا تھا۔ اِس سلسلہ میں مولانا کی نظمیں بکثرت انتخاب فرمائی تھیں۔ چنانچہ منشی ذکاء اللہ مرحوم کی ریڈروں کے سلسلہ میں سے دو ریڈریں دوسری اور تیسری ہماری نظر سے گذری ہیں۔ دوسری ریڈر میں حسب ذیل نظمیں منتخب کی گئیں ہیں:۔ "بچّہ اور ماں"۔ "ماں اور بچّہ"۔ "ایک لڑکا اور بیر"۔ "میرا خدا میرے ساتھ ہے"۔ "پن چکی"۔ اور "صبح کی آمد"۔ تیسری ریڈر میں حسب ذیل نظمیں ہیں:۔ "ہماری گائے"۔ "اب آرام کرو"۔ "تھوڑا تھوڑا بہت ہو جاتا ہے"۔ "کوشش کئے جاؤ"۔ "ایک پودا اور گھاس"۔ "دال کی فریاد"۔ "چھوٹی چیونٹی"۔ "خُدا کی قدرت"۔ "سچ اور جھوٹ"۔ "ماں کی مامتا"۔

مولانا ظفر علی خاں لاہور

مولانا کو ظفر علی خاں صاحب کا طرزِ انشاء نہایت محبوب تھا۔ دکن ریویو دلچسپی کے ساتھ مطالعہ فرمایا کرتے تھے۔ پھر پنجاب ریویو اور روزنامۂ زمیندار۔ اِن کے کلام منظوم کو بھی بہت پسند فرماتے تھے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۴ء میں جب کہ جنگِ یورپ کا زور شور تھا۔ کسی قانونی گرفت کے سلسلہ میں اخبار زمیندار کی ضمانت ضبط ہو گئی اور اخبار بند ہو گیا۔ اِس موقعہ پر ایک قطعہ لکھا تھا۔ اُس وقت یہ طبع نہیں ہوا تھا۔

مگر مولانا کا کلام سدا بہار ہے۔ اِسے کلّیات کے جدید اڈیشن میں شامل کر دیا گیا ہے، اور اِس جگہ بھی نقل کیا جاتا ہے۔ مولانا کا مذاق نہایت لطیف ہوتا ہے۔ اِس لئے بہتر معلوم ہوا کہ قارئین اِس قطعہ کو پڑھ کر خود اندازہ لگائیں۔

قطعہ

طبع کے آلات کی ضبطی کے ساتھ — ہو گیا اخبارِ زمیندار بند
چُھٹنا تھا اِس چاٹ کا مشکل، مگر — اب ہے کئی ہفتہ سے ناچار بند
صدق کا اور کذب کا، وہ احتمال — بے خبری میں ہوا، یک بار بند
روگ ہے اخبار بھی، افیون بھی — کر دے کہیں دونوں کو سرکار بند
چاہئے اصطبل میں اپنے رہے — خامۂ چالاک کا رہوار بند
کاسۂ سر میں رہے پیکِ خیال — جیل میں جس طرح گنہ گار بند
پھر تو بڑے چین سے گذرے اگر — سارے زمانہ کے ہوں اخبار بند
کوئی اڈیٹر کا نہ پیشہ کرے — نامہ نگاری کا ہو بازار بند
بعض کی یہ رائے ہے بایں ہمہ — حضرتِ ریوٹر کے نہ ہوں تار بند

خواجہ حسن نظامی دہلوی خواجہ حسن نظامی صاحب مولانا کی ملاقات کے لئے کئی بار میرٹھ تشریف لائے تھے۔ اپنے مختلف جرائد کے واسطے نظموں کی فرمایش کی تھی جہانتک یاد پڑتا ہے۔ مولانا نے اِس ضمن میں ایک عیدی تصنیف فرمائی تھی۔ مولانا کی نظموں میں وہ کونسی دوسری نظم ہے۔ جو مخصوص خواجہ حسن نظامی صاحب کی فرمایش پر لکھی گئی ہے اِس کا صحیح پتہ نہ چلا۔ عیدی بھی ناتمام رہی۔ ذیل میں نقل کی جاتی ہے:۔

عیدی ناتمام

اے مسلمانو! مبارک ہو تمہیں عیدِ الضحیٰ	دین و ملّت سے رکھے اللہ دائم شاد کام
ہو عطا توفیق تم کو کسبِ علم و فضل کی	قوم کے اعزاز کا پرچم اُڑے بالائے بام
قابلیت ہر صنف میں جلد تر پیدا کرو	تا معیشت کے مدارج تم کو حاصل ہوں تمام
ہاں تجارت اور صناعت میں رہو تم پیش پیش	جیسے تھے اسلاف بحر و بر میں دُنیا کے امام
ہے خبر تم کو کبھی یورپ کا تھا اُستاد کون؟	آج تک مغرب میں ابنِ رشد کا روشن ہے نام
تم نے چمکایا تھا برفستان میں خورشیدِ علم	ہیں تمہارے فیض کے ممنون اب تک خاص و عام
کیا طبیعی کیا ریاضی کیا ادب کیا فلسفہ	تھی تمہارے ہاتھ میں کشتیِ حکمت کی زمام
بیشتر قومیں کہ جن میں تھی ابھی وحشت کی بو	اِن کو سکھلایا سیاست اور تمدن کا نظام
شرک اور توحید کی تفصیل کر دی صاف صاف	جس سے دُنیا میں ہوئی تمیزِ انوار و ظلام

رود بارِ غرب سے تا ساحلِ دریائے چیں
تھا تمہارے عزمِ سیاحی کے آگے نیم گام

مولانا محمد قاسمؒ بانیٔ مدرسہ دیوبند

ایک زمانہ میں مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق مطبع ہاشمی میرٹھ سے تھا۔ یہ مطبع محلہ اندرکوٹ میں واقع اور مولانا کے مسکن سے بہت متصل تھا۔ منشی نجم الدین صاحبؒ کے دولت کدہ پر علماء و فقراء کا اجتماع رہتا تھا۔ وہاں حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ بھی تشریف لایا کرتے تھے۔ وہیں مولانا کو بھی اُن سے شرفِ نیاز حاصل ہوا تھا۔ مولانا محمد قاسمؒ کی علمی اور نکتہ رس طبیعت کا ہر شخص معترف تھا۔

مولانا محمد قاسمؒ نہایت سادہ لباس زیبِ تن فرماتے تھے۔ اُنھیں دیکھ کر بعض ظاہر بین حضرات کو تو اُن کے اعلیٰ مراتب علم و فضل اور اتقیٰ اور درویشی کی جانب

گُمان بھی نہیں ہوتا تھا۔

مولانا محمد قاسمؒ کی تقریریں جو دینِ حق کی تائید اور دیگر مذاہب کے علماء کے مقابلہ میں اُنھوں نے مناظروں کے اندر فرمائی تھیں۔ ایسی مدلّل و مفصّل ہیں کہ طالبانِ حق کو اُن کا مطالعہ بغایت مفید ہے۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ اُن کی زبان بھی زمانہ حال کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے، صاف و سلیس ہو جائے تو کیا ہی بات ہو۔

مولانا عبدالرب دہلوی ایک بے نظیر واعظ تھے

مولانا عبدالرب دہلوی اپنے زمانہ میں لاجواب مُقرّروں، اور واعظوں میں سے تھے۔ مولانا کی ملاقات اُن سے جناب منشی نجم الدین صاحبؒ کے دولت کدہ پر ہوئی تھی۔ مولانا عبدالرب وہی بزرگ ہیں جنھوں نے مسجدِ جامع سہارن پور کے لئے اپنی تقریروں سے فراہمیِ زر کا کام کیا تھا۔ مولانا فرماتے تھے کہ اُن کی تقریروں میں عدیم المثال فصاحت اور روانی تھی اور تقریر میں ایسا اثر تھا کہ مجمع کا دل جدھر چاہتے پھیر دیتے۔ ایک بار مولانا نے اُن سے دریافت کیا کہ حضرت وعظ کہنے کے لئے کِس خاص صفت کی ضرورت ہے۔ مولانا عبدالرب نے فرمایا "میاں وعظ کہنے کے لئے اور کیا چاہئے بس آنکھیں بند کر لیں اور مُنھ کھول دیا" یہ فرما کر مولانا سُن کر کُل سامعین ہنس پڑے لیکن مولانا عبدالرب صاحب نے بھی ایسی بات فرمائی جو واعظین کی عام ذہنیت کو بے نقاب کرتی ہے۔

ڈپٹی محمد صدیق مرحوم رئیس میرٹھ

ڈپٹی محمد صدیق صاحب مرحوم سے مولانا کے بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ ہم نے خود مولانا کے مُنہ سے وہ محبّت آمیز کلمات

سُنے ہیں۔ جن کے ساتھ مولانا ڈپٹی صاحب مرحوم کو یاد کیا کرتے تھے۔ یہ تعلّقات اِس درجہ مخلصانہ تھے کہ ڈپٹی صاحب کے صاحب زادے اور مولانا کے فرزند اِن کا وہ تیاً تذکرہ کیا کرتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب مرحوم میرٹھ کے رئیس تھے۔ ابتدا میں سرکارِ انگریزی کے ملازم تھے۔ بعد کو مملکتِ نظام میں تعلّق ہو گیا۔ حیدر آباد دکن تشریف لے گئے۔ اور وہیں انتقال فرمایا۔ ڈپٹی صاحب نے حیدر آباد سے ایک بار یہ فرمائش لکھی کہ عربی خطبات کا ترجمہ مولانا اُردو نظم میں فرمادیں۔ چنانچہ یہ دو خطبے جو کلّیاتِ اسمٰعیل کے پہلے اڈیشن کے صفحہ ۹ پر درج ہیں۔ یہ ڈپٹی صاحب مرحوم ہی کی فرمائش پر لکھے گئے تھے۔

مولوی کریم بخش مرحوم دہلوی مولوی کریم بخش صاحب دہلوی۔ دہلی کالج کے تعلیم یافتہ صوبۂ ممالک مغربی و شمالی و اودھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ یہ اُن تین حضرات میں سے ہیں جنھوں نے تعزیراتِ ہند کا ترجمہ اُردو زبان میں کیا تھا۔ مولوی کریم بخش صاحب ڈپٹی نجم الدین صاحب کے اُستادِ شفیق تھے۔ جب کبھی میرٹھ تشریف لاتے تو اُن ہی کے یہاں قیام فرماتے وہیں مولانا کی اُن سے مُلاقات ہوئی تھی۔ بُہت خوبیوں کے بزرگ تھے۔ مولانا اِن کے انکسار اور اخلاقی جرأت کی بُہت تعریف فرمایا کرتے تھے۔ مولانا نے "مُناجات" مولوی کریم بخش صاحب مرحوم کی فرمائش سے لکھی تھی۔ یہ مُناجات کلّیاتِ اسمٰعیل میں صفحہ ۹۱ سے ۹۶ تک چھپی ہے۔ اِس مرتبہ چند اشعار اِس مُناجات کے اور دستیاب ہو گئے ہیں۔ نئی اشاعت میں وہ بھی درج کر دئے گئے ہیں۔ اہلِ تصوّف اِن اشعار کو پڑھ کر بُہت محظوظ ہوں گے۔

موسم گرما میں منصوری پہاڑ پر قیام ۱۸۷۰ء مولانا اُس وقت دفتر انسپکٹر مدارس قسمت میرٹھ میں

کلرک تھے۔ ایک بار موسمِ گرما میں ایسی ضرورت پیش آئی کہ مولانا کو بھی پہاڑ پر جانا پڑا۔ اِس اتّفاقی سیر کی تصویر نظم "کوہِ ہمالہ" میں کھینچی ہے۔ قدرت کے رنگارنگ مناظر پہاڑوں کی حیرت انگیز بلندیاں۔ گھاٹیوں کا منظر۔ آبشاروں کا گرنا۔ چشموں کا بہنا۔ پھولوں کی بہار۔ غرض برسات کے موسم میں پہاڑ کا منظر جنھوں نے دیکھا ہے، وہ مولانا کی نظم "کوہ ہمالہ" کو پڑھ کر بہت مسرور ہوں گے۔ اس میں اصلی نہ کہ خیالی پہاڑوں کا نقشہ دِکھایا ہے۔ پوری نظم تو کلّیات میں ملاحظہ فرمائی جائے۔ اِس جگہ اِس نظم کے صرف تین شعر لکھے جاتے ہیں۔ جس سے شاعر کے تخیّل اور سلاستِ بیان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:- ؎

ہے ہمالہ پہاڑ سر جیون — جس کے اُوپر تلے کھڑا ہے بن
ہند کی سرزمیں ہے اَن داتا — اور ہمالہ پہاڑ جل داتا
اے ہمالہ پہاڑ تیری شان — دنگ رہ جائے دیکھ کر انسان

علّامہ شبلی نعمانیؒ ۱۸۸۷ء یا ۱۸۸۸ء میں جب کہ محمد محمود سیفی مولانا کے فرزند اکبر مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے، اور علّامہ شبلی نعمانی ایم، اے او کالج میں عربی ادب کے پروفیسر تھے۔ ایک روز ایسا اتّفاق ہوا کہ کسی صاحب نے مولانا کی نظم "صبح کی آمد" علّامہ شبلی نعمانیؒ کو پڑھ کر سُنائی جب یہ بند پڑھا گیا:-

ہر ایک باغ کو میں نے مہکا دیا ہے — نسیم اور صبا کو بھی لٹکا دیا ہے
چمن سُرخ پھولوں سے دہکا دیا ہے — مگر نیند نے تم کو بہکا دیا ہے
اُٹھو سونے والو! کہ میں آرہی ہوں

تو علّامہ شبلی بے ساختہ بول اُٹھے کہ یہ شاعر خدائے قافیہ ہے۔ اِس صحبت میں

محمد محمود سیفی مرحوم بھی شریک تھے۔ انہی کی زبانی یہ روایت سُنی گئی تھی۔ وہ اکثر حضرت علاّمہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

رائے بہادر منشی پراگ نرائن بہارگو آنجہانی مالک ریاست نولکشور لکھنؤ

مولانا ۱۹۰۹ء میں جب کہ مولوی محمد محمود سیفی مولانا کے فرزند اکبر بہ سلسلہ تجارت اپنا قیام لکھنؤ میں رکھتے تھے وہاں تشریف لے گئے تھے اور دو مہینہ قیام فرمایا تھا۔ اس وقت مولانا کی ملاقات رائے بہادر منشی پراگ نرائن آنجہانی سے ہوئی تھی۔ یہ رائے بہادر منشی نول کشور سی۔ آئی۔ ای کے فرزندِ لائق اور جانشین تھے۔ مولانا کی رائے تھی کہ رائے بہادر صاحب نہایت شریف النفس، نیک دل متواضع اور حوصلہ مند شخص ہیں۔ یہ خاندان رائے بہادر منشی نول کشور سی۔ آئی۔ ای کے زمانہ سے اِس وقت تک نہایت سرگرمی کے ساتھ علم دوست رہا ہے۔

تیسرا باب
سلوکِ باطن

شیخ سے بیعت ۱۸۷۰ء

مولانا بڑے خوش قسمت تھے کہ حضرت مولانا سیّد غوث علی شاہ جیسے شیخ سے اِن کو تربیتِ باطن نصیب ہوئی۔ مولانا خواجہ الطاف حسین حالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی سے فرمایا تھا کہ ہم نے تمام عمر میں تین صاحبِ کمال بزرگ دیکھے ہیں۔ شاعروں میں جناب میرزا اسد اللہ خاں غالب۔ مدبّروں میں سرسیّد احمد خاں اور فقراء میں حضرت مولانا سیّد غوث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ۔ مولانا جس وقت شیخ کا تذکرہ فرماتے تو چہرہ دمکنے لگتا

اُس وقت آپ پر ایک کیفیت طاری ہوجاتی - یہ ذکر بھی خاص حالات اور مواقع پر ہوتا تھا۔ ورنہ اغیار اور نا اہلوں کے سامنے آپ کبھی لب کشائی نہیں فرماتے تھے تعلیمِ باطن ایک راز ہے مُرید اور شیخ کے درمیان۔ لیکن شیخ نے جو رنگ مولانا پر چڑھایا تھا۔ اُس کی جھلک مولانا کے کلام سے ٹپکتی ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ فطرۃً یہ مرجان بہ درجۂ کمال مولانا کی طبیعت میں قدرت نے ودیعت کیا تھا۔ شیخ کامل کی صحبت نے اُسے صیقل کر کے جگمگا دیا۔ مولانا اپنے شیخ کی شان میں عرض کرتے ہیں

لب پہ آیا نامِ شہ غوثِ علی ۔۔۔ بے تکلف کھِل گئی دِل کی کلی
اے تجلّیٔ اَحنیرِ ذُو الجلالؔ ۔۔۔ تھا کمالِ بندگی تیرا کمال
ہاں! محمّد وار تو نامِ خُدا ۔۔۔ کر گیا ہے بندگی کا حق اَدا
ترکِ دُنیا ترکِ عُقبیٰ ترکِ جاں ۔۔۔ قول و فعل و حال سے تیرے عیاں
اے! تری آواز آوازِ خُدا ۔۔۔ اور خاموشی تیری رازِ خُدا
تو نہ تھا کچھ عینِ عینُ اللہ تھا ۔۔۔ ظاہرا بندہ نہانی شاہ تھا
تیری مجلس مجلسِ اللہ تھی ۔۔۔ دونوں عالم کی جہاں گم راہ تھی

مولانا کے شیخ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔" اسمٰعیل ایک فرشتہ ہے جو ہر وقت عالمِ سکوت میں رہتا ہے"۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۴۵ تذکرۂ غوثیہ طبع اوّل۔ مطبوعہ ۱۸۸۷ء۔ سوانحِ مولانا گُل حسنؒ کے ضمن میں یہ ذکر آیا ہے۔

پیر بھائی مولانا اپنے پیر بھائیوں سے بڑے اخلاص کے ساتھ ملتے تھے۔ اُن میں سے خاص تذکرے کے قابل یہ حضرات ہیں:۔ ڈپٹی نجم الدینؒ صاحب۔ مولوی گُل حسنؒ صاحب۔ قاضی فتح محمد صاحبؒ لُدھیانوی۔ نواب محمد ابراہیم عرف

نواب پہلوان دہلوی۔ شیخ احسان اللہ صاحب جھجر۔ حافظ ظہور محمدؒ صاحب انصاری مدنی۔ میر غالب حسین صاحب بریلوی۔

ڈپٹی صاحب کا قیام تاحیات میرٹھ میں رہا۔ باقی حضرات گاہے ماہے میرٹھ تشریف لایا کرتے تھے۔ قاضی فتح محمدؒ صاحب جب کبھی تشریف لاتے تو نظم کی فرمایش ضرور کرتے۔ چنانچہ بعض نظمیں "جو نذرانۂ پیرجی" کے نام سے کلیات میں موجود ہیں۔ یہ اِن ہی پیر بھائی کی خدمت میں پیش کی گئی تھیں۔ حافظ ظہور محمدؒ صاحبؒ نے حضرت یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کے فارسی خطوط کا بڑی جانفشانی کے ساتھ اُردو میں ترجمہ فرمایا تھا۔ مولانا سے زبان دُرست کرنے کی فرمایش کی۔ افسوس مولانا کو اتنی فرصت میسّر نہ آئی کہ اِس ترجمہ کی صحت پر توجہ فرماتے۔ تصوّف پر یہ خطوط بے نظیر ہیں جو حضرت یحییٰ منیری نے اپنے مُریدین کو معاملاتِ سلوک کے متعلّق تحریر فرمائے ہیں حافظ ظہور محمدؒ صاحب آخر حصّۂ عُمر میں میرٹھ تشریف لے آئے تھے۔ یہیں ۱۹۲۳ء میں انتقال فرمایا اور مولانا کے مزار کے احاطہ میں دفن ہوئے۔

نواب پہلوان اگرچہ تعلیم یافتہ نہ تھے۔ لیکن بڑے ذہین و طبّاع تھے۔ دلّی وطن تھا۔ مگر جب شیخ نے خدمت میں قبول فرمایا ترکِ وطن کر کے پانی پت میں رہ پڑے اِن کا مدفن مزارِ اقدس کے پائیں ہے۔

میر غالب حسین لاہور کے محکمۂ ڈاک خانہ میں ہیڈ کلرک تھے۔ تجرّد کی زندگی اختیار فرمائی تھی۔ لیکن آخر عمر میں تاہّل اختیار کیا اور اِس طرح سُنّتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پوری کی۔ ۱۹۰۳ء میں مولانا لاہور گئے تھے۔ کرنیل پیری سے آنکھ کا آپریشن کرایا تھا۔ اُس وقت میر صاحب کے یہاں قیام فرمایا تھا۔ میر صاحب چونکہ فقیرانہ زندگی

بسر کرتے تھے۔ میڈیکل کالج لاہور کے اکثر طلبا اُن کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک طالب علم عبدالحکیم خاں صاحب رام پوری میر صاحب کے معتقد تھے۔ اِس بناء پر مولانا کی خدمت میں روزانہ حاضر رہتے، اور آنکھ کی پٹّی بدلا کرتے تھے۔ بعد میں ہز ہائینس نواب رام پور کے یہاں اسٹاف سرجن ہوئے اور میجر کا عُہدہ پایا۔ مولانا کی خدمت میں کبھی کبھی میرٹھ حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک اور صاحب تھے ڈاکٹر محمد اسحاق گیا کے رہنے والے وہ بھی آنکھ پر پٹّی باندھنے کی خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ اب یہ صاحب پٹنہ میں مطب کرتے ہیں اور کامیاب ڈاکٹروں میں ہیں۔

شیخ کا وصال مارچ سنہ ۱۸۸۰ء میں

یہ صحیح طور پر تحقیق نہ ہوسکا کہ مولانا کس سن میں حضرت مولانا سیّد غوث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ پانی پتی کے دربار میں حاضر ہوکر بیعت سے مشرّف ہوئے غالباً سنہ ۱۸۷۸ء میں بیعت ہوئے تھے۔ بیعت کے واقعہ کی تفصیل نہ معلوم ہوسکی۔ مولانا پانی پت حاضر ہوئے اور اِس میں کلام نہیں کہ پہلی حاضری ہی میں شرفِ بیعت حاصل ہوا۔ کسی موقعہ پر حضرت شیخ نے دریافت فرمایا کہ میاں اسمٰعیل تم شعر کہتے ہو۔ جواباً اثبات میں عرض کیا گیا۔ تو حضرت شیخ نے ارشاد فرمایا کہ بھائی ہم کو تو حضرت مولانا شاہ ابو سعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ کی رُباعیاں پسند ہیں۔ تم نے اِن کا مُطالعہ کیا ہے۔ عرض کیا کہ حضرت مجھے تو اتّفاق نہیں ہوا۔ اِس مقام پر تین رباعیاں حضرت ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ کی درج کی جاتی ہیں۔ یہ رباعیاں حضرت شیخ کو پسند تھیں۔ تذکرۂ غوثیہ میں بھی نقل ہوئی ہیں:۔

رُباعی

(۱)

یارب زِ گُناہِ زشتِ خود مُنفعِلَم وز قولِ بد و فعلِ بدِ خود خَجِلَم

فیضے بدلم ز عالمِ قدس بریز   تا محو شود خیالِ باطل ز دلم

(۲)

تسبیحِ ملک را و صفا رضواں را   دوزخ بد را و بہشت مرنیکاں را
دُنیا جم را و قیصر و خاقاں را   جاناں مارا و جانِ ما جاناں را

(۳)

اے آنکہ بملکِ خویش پائندہ توئی   از ذاتِ من شب صبح نمائندہ توئی
کارِ منِ بے چارہ قوی بستہ شدہ   بکشائے خدایا کہ کشائندہ توئی

اِس حاضری کے بعد جب وطن کو مراجعت فرمائی تو محلہ میں داخل ہو کر معلوم ہوا کہ منجھلے بھائی صاحب کی طبیعت ناساز ہے اِس لئے پہلے اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بخار کی شکایت تھی۔ لیکن اب مزاج کی کیفیت بہتر تھی۔ منجھلے بھائی صاحب نے فرمایا کہ میاں اسمٰعیل کل شام ایک صاحب تشریف لائے تھے۔ اور ایک کتاب دے گئے ہیں۔ ہماری طبیعت ابھی کسلمند ہے۔ تم اِسے لیتے جاؤ اور اپنے مُطالعہ میں لاؤ مولانا کتاب لے کر اپنے مکان پر آئے۔ یہاں آ کر اِس کتاب کو ملاحظہ کیا تو حضرت ابو سعید ابو الخیر رحمۃ اللہ علیہ کی رُباعیات کا مجموعہ تھا۔ چنانچہ کتاب آپ کے مُطالعہ میں رہی اِدھر حضرت کا ارشاد بھی یاد تھا۔ مولانا نے تصوف میں چالیس رُباعیاں لکھی ہیں یہ اُسی زمانہ کی تصنیف ہیں۔ کلیات کی پچھلی اشاعت میں رباعیات ترتیب دینے میں کچھ گڑبڑ ہوگئی تھی۔ اب کی بار کلام سنِ تصنیف کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔ چنانچہ رباعیات نمبر ایک تا چالیس وہی رباعیات ہیں جن کا محرک ارشادِ شیخ ہوا تھا ارباب نظر اور حضرات صوفیہ اِن کے مطالعہ سے ذوق وافر حاصل فرمائیں گے۔

شجرۂ طیبہ خاندانِ قادریہ تصنیف ۱۲۰۸ھ اِس شجرہ کو مولانا نے نظم فرمایا ہے یہ نظم ایک رسالہ الموسوم بہ "دورِ آخر" میں جو مولانا کی تصنیف سے ہے چھپ چکی ہے اب یہ رسالہ نایاب ہے اِس لئے شجرۂ منظومہ اِس موقعہ پر نقل کیا جاتا ہے:۔

شجرۂ طیّبہ قادریّہ بر سبیلِ ایجاز

پاک آں ذاتِ کبریائے احد — کہ بدو ہیچ سلسلہ نرسد
لیک اندر طریقۂ ارشاد — دست در دستِ رہ نمایان داد
اشرف الانبیاء حبیبِ خدا — اسد اللہ بابِ علمِ ھدیٰ
ہم حسن ہم حبیب ہم داؤد — باز معروف راہِ حق پیمود
زدہ سرّی جُنید و شبلی دم — عبدِ واحد ابو الفرح بہم
بو الحسن بو سعید آمد باز — غوثِ اعظم کشود پردۂ راز
عبدِ رزّاق شد ابو صالح — اقتدایش نمود ابو صالح
از پس شاہ احمدِ اولیٰ — کرد دعوت شہابِ دیں بخدا
شمسِ دین ست و پس علاؤ الدین — باز نورِ محمد ست ببیں
بعدِ محمود ہست عبدِ جلال — پس بہاول قلندرِ خوش حال
بو المعالی ست رہنمائے یقیں — باز حضرت مُقیمِ مُحکمِ دیں
بعد سید امیر بالا پیر — راہِ عبد اللطیف بری گیر
شیخ درویش و خان احمد شاہ — باز عبد اللطیف حق آگاہ
ملح شاہ است و سید اعظم علی — شاہِ غوثِ علی و مولائی

شہسوارِ معارکِ تجرید تاج دارِ ممالکِ توحید
بحرِ عرفان محیطِ بے پایاں
برتر از وصف و ماوراء بیاں

۱	حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم	۲	حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ	۳	حضرت خواجہ حسن بصریؒ
۴	حضرت خواجہ حبیب عجمیؒ	۵	حضرت داؤد طائیؒ	۶	حضرت معروف کرخیؒ
۷	حضرت سرّی سقطیؒ	۸	سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ	۹	حضرت ابوبکر شبلیؒ
۱۰	حضرت شیخ ابو الواحد عبد الواحد بن عبد العزیز تمیمیؒ	۱۱	حضرت ابو الفرح طرطوسیؒ	۱۲	حضرت ابو الحسن علی قریشی الہنکاریؒ
۱۳	حضرت ابو سعید مبارک بن علی المخزومیؒ	۱۴	حضرت شیخ محی الدین سیّد عبد القادر جیلانیؒ	۱۵	حضرت سید عبد الرزّاقؒ
۱۶	حضرت ابو صالحؒ	۱۷	حضرت سیّد شاہ احمد علیؒ	۱۸	حضرت سیّد شہاب الدینؒ
۱۹	حضرت شمس الدینؒ	۲۰	حضرت علاؤ الدینؒ	۲۱	حضرت نور محمّدؒ
۲۲	حضرت محمودؒ	۲۳	حضرت عبد الجلالؒ	۲۴	حضرت بہاول شیر قلندرؒ
۲۵	حضرت سید ابو المعالیؒ	۲۶	حضرت سیّد مقیم محکم الدین حجرویؒ	۲۷	حضرت سید شاہ امیر بالا پیرؒ
۲۸	حضرت عبد اللطیف برّیؒ	۲۹	حضرت شیخ درویش محمدؒ	۳۰	حضرت خان احمد شاہ کرت پوریؒ
۳۱	حضرت عبد اللطیف ثانیؒ	۳۲	حضرت بدح شاہؒ	۳۳	حضرت سید اعظم علی بابرویؒ
۳۴	حضرت مولوی سیّد محمد غوث علی شاہؒ (پانی پتی)			۳۵	حضرت مولانا محمد اسمٰعیلؒ

مختصر حالات شیخ سنہ ۱۸۸۰ء

حضرت مولانا سیّد غوث علی شاہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ نسبی اٹھارہ واسطوں سے قطب الاقطاب حضرت محبوب سبحانی شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہونچتا ہے۔ اِس طرح پر کہ :-

۱ حضرت غوث الاعظم محی الدین سید عبد القادر جیلانیؒ - ۲- سیّد سیف الدین عرف عبد الوہابؒ

۳۔ سیّد صفی الدین عرف ابونصرؒ ۔ ۴۔ سیّد احمد عرف سیّد حمید الدینؒ
۵۔ سیّد مسعود عرف نور الدینؒ ۔ ۶۔ سیّد علی عرف محمد صالحؒ
۷۔ سیّد شاہ امیر عرف عبدالرحمٰن سیّد کرم علیؒ ۔ ۸۔ سیّد شمس الدین عرف محمد اعظمؒ
۹۔ سیّد محمد عرف محمد غوثؒ ۔ ۱۰۔ سیّد مبارکؒ
۱۱۔ سیّد مصلح الدین ناصر الحسن عرف میر میراںؒ ۔ ۱۲۔ سیّد ابوسعید عرف انوار الحسنؒ
۱۳۔ سیّد حمید الدین حسن عرف حمید علیؒ ۔ ۱۴۔ سیّد حامد حسن عرف حامد علیؒ
۱۵۔ سیّد محمود عرف محمد علیؒ ۔ ۱۶۔ سیّد ظہور محمد عرف ظہور الحسنؒ
۱۷۔ سیّد احمد حسن عرف سیّد احمد علیؒ ۔ ۱۸۔ سیّد ابوالحسن وخورشید علی
المعروف بہ سیّد غوث علی شاہ پانی پتیؒ

آپ کے بزرگوں میں پہلے شخص جنھوں نے خاکِ ہند کو اپنے قدوم سے متبرک بنایا ہے حضرت محمدؒ تھے۔ چنانچہ اخبار الاخیار میں مذکور ہے کہ شیخ محمد الحسنی الجیلانیؒ ولایت روم سے خراساں تشریف لے گئے اور وہاں سے ملتان تشریف لائے۔ اور آخرِ کار شہر اوچھ میں توطن اختیار کیا۔ اِن کے پوتے حضرت سیّد میر میراں اوچھ سے لاہور تشریف لے گئے۔ اِن کی اولاد میں سے ایک بزرگ قصبۂ استھاواں ضلع منگھیر صوبۂ بہار میں زمانۂ غدر سے بہت پہلے اقامت گزیں ہوئے۔ ہمارے حضرت مولانا سیّد غوث علی شاہ اِسی موضع میں ۱۲۱۹ھ مطابق ۷ دسمبر ۱۸۰۴ء بروز جمعہ جلوہ فرمائے عالمِ ظہور ہوئے۔ آپ کی عمر بارہ سال کی تھی کہ اپنے والدِ بزرگ وار حضرت سیّد احمد علی رسالدارؒ کے ہمراہ دہلی گئے۔ ان اطراف میں جو اکابرِ علما تھے اُن کی خدمت میں رہ کر علومِ دینی کی تحصیل میں مصروف ہوئے مثلاً مولانا شاہ عبدالعزیزؒ

دہلویؒ اور مولانا فضل امام صاحب خیر آبادیؒ سے دہلی اور رام پور میں۔ بعد حصولِ تعلیم بجائے منصب و جاہ کی تلاش کے آپکے جوہرِ فطری نے طلبِ حق کی طرف مائل کیا۔ دستورِ خاندان کے بموجب اوّل اپنے پدر بزرگوار سے بیعت کی۔ بچپن ہی سے خاندانی اَوراد و ریاضات میں مصروف رہے۔ چونکہ طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔ اِس لئے کاملین کی تلاش میں امصار و دیار کی سیر فرمائی۔ اِن سفروں میں ہندوستان کے دشت و کوہ، دُور و دَراز شہر، غیر معروف مقامات مردانِ کامل کی تلاش میں چھان مارے۔ عراق، شام اور حجاز کے مُمالک کی سیاحت بھی اِسی جستجو میں فرمائی۔ یہ تفصیل نہایت دلچسپ پیرایہ میں تذکرہ غوثیہ کے اندر بیان کی گئی ہے۔ جب عُمرِ شریف ساٹھ سال کو پُہنچی ہے تو حکمِ الٰہی سے پانی پت میں اٹھّارہ برس سات مہینے چھ روز قیام فرمایا۔

آپ کے طرزِ کلام میں عجیب دلکشی تھی۔ اُس کی جھلک تذکرہ غوثیہ میں نظر آتی ہے۔ اگرچہ یہ تذکرہ بعدِ وصال لکھا گیا ہے لیکن طرزِ کلام وہی ہے جس میں شیخ نے اپنی زبانِ فیض ترجمان سے ارشادات ادا فرمائے تھے۔ سلوکِ باطن کی تعلیم کا فیض اٹھّارہ برس تک جاری رہا۔ دُور و دراز مقامات سے ہر مقصد کا طالب دربارِ مُبارک میں حاضر ہوتا اور بامُراد واپس جاتا۔ آپ کا وصال ۲۶ ربیع الاوّل ۱۲۹۷ھ مطابق ۶ مارچ ۱۸۸۰ء پانی پت میں ہوا۔

ارجعی بشنید نورِ آفتاب سوئے اصلِ خویش باز آمد شتاب

ارشادِ شیخ کے بموجب شیخ کا مدفن بیرونِ قصبۂ پانی پت بنایا گیا۔ ایک پختہ و بلند مزار ہے۔ اُسی کے بازو میں ایک خوبصورت مسجد ہے۔ بہت سے پختہ مکانات اِرد گرد تعمیر ہو چکے ہیں۔ اِس مقام کے چاروں طرف شور پانی کے کنوئیں ہیں۔

مزارِ مبارک کے احاطہ میں تین کنوئیں ہیں ایک آب نوشی کا دو آب پاشی کے۔ لیکن، پانی سب کا شیریں ہے۔

چوتھا باب
تصنیفات و تالیفات

ابتدائی تصنیفات بزبان فارسی ۱۸۷۰ء۔ ۱۸۸۰ء۔

زمانۂ قیام میرٹھ میں چند درسی کُتب بزبانِ فارسی اُس زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے تصنیف فرمائی تھیں۔ اُن کی طباعت اور اشاعت خود فرمایا کرتے تھے۔ یہ ایک تجارتی شغل تھا جس سے مولانا کو قدرے قلیل منفعت بھی حاصل ہوتی رہتی تھی۔

طلسم اخلاق ۱۸۷۰ء

گورنمنٹ یو۔ پی نے مثل اور صوبوں کے اُردو زبان کی ترقی و ترویج کے لئے چونکہ وہ سرکاری دفاتر کی زبان قرار دی جا چکی تھی۔ انعامی اشتہار جاری کئے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ میں مولانا نے ایک خیالی مگر اخلاقی قصہ تصنیف فرمایا تھا۔ جس کی عبارت مقفّٰی اور سُرتا سَر فسانۂ عجائب کے طرز تحریر کی نقل تھی۔ اس کتاب پر دو سو روپیہ انعام بھی ملا تھا۔ مولانا نے آئندہ خود ہی اِس طرز سے سخت ترین اظہارِ تنفّر فرمایا ہے یہ تصنیف ۱۸۶۹ء یا ۱۸۷۰ء کی ہے۔ کیونکہ جس اشتہار کے ذریعہ ایسی تصنیفات طلب کی گئیں تھیں۔ اُس کی تاریخ ۲۰؍ اگست ۱۸۶۹ء ہے۔ اُس وقت مولانا کی عُمر پچیس ۲۵ سال کی تھی

مثنوئ فکرِ حکیم ۱۸۷۷ء

اِس زمانہ میں مولانا نے چھوٹی چھوٹی اخلاقی نظمیں مثنوی کی صورت میں تصنیف فرمائی تھیں۔ یہ کتاب کی صورت میں شایع کی گئیں اِس مثنوی کی ایک جلد

سرسیّد احمد خاںؒ کی خدمت عالی میں بھی پیش کی گئی۔ سرسیّد نے اِن نظموں پر ریویو فرمایا تھا۔ وہ علی گڈھ انسٹیٹوٹ گزٹ یا تہذیب الاخلاق میں شایع ہوا تھا۔ اصل ریویو تو نظر سے نہیں گذرا لیکن مولانا خود فرماتے تھے کہ سیّد صاحب کا خاص اعتراض یہ تھا کہ اِس میں فارسی ترکیبوں کی بھرمار ہے اور یہ مشورہ تھا کہ اگر اِس شاعر نے محاورۂ اُردو پر توجّہ کی تو اُمید ہے کہ اس کو بہت کامیابی ہوگی۔ اُس وقت سے مولانا نے فارسی رنگ کو خیرباد کہا۔ بعد کی نظموں سے یہ امر پورے طور پر ثابت ہوتا ہے۔

طلسمِ اخلاق اور مثنوی فکرِ حکیم یہ دونوں کتابیں اپنے منجھلے بھائی حضرت مولانا عبدالحکیم صدیقی القادری رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے شایع کی تھیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ اُس وقت تک مولانا کو یا تو اپنے کلام پر اعتماد حاصل نہ تھا۔ یا پبلک کی حرف گیری سے خائف تھے۔ چنانچہ جو نظمیں نجم الاخبار میں شایع ہوتی رہتی تھیں۔ اُن میں بھی اپنا نام اکثر نہیں دیتے تھے۔ مثنوئ فکرِ حکیم کے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں:-

شرم کچھ مت کر بیانِ پند میں　　دِل کو رکھ آزاد شانِ پند میں
امرِ حق میں چاہئے کس کا لحاظ　　ہے بجا اظہارِ حق بے جا لحاظ
مت کسی سے کر حیا، حق بات میں　　ہاں حیا، واجب نہیں حق بات میں
ہے نصیحت میں حیا گویا دریغ　　سوچ! کہدینا بھلا ہے یا دریغ
کوئی ہو حق نصیحت کر ادا　　سب برابر ہیں یہاں شاہ و گدا

مضمون عمدہ، الفاظ شستہ، تراکیب چست مگر زبان میں لوچ نہیں۔ اِس کمی کو سرسیّدؒ نے خوب پہچانا تھا۔ مثنوئ فکرِ حکیم ۱۸۷۰ء میں طبع اور شایع ہوئی تھی

ہر چند کہ مصنّف نے خاتمۂ کتاب پر مستجیب الدّعوات کی بارگاہ میں یہ التجا پیش کی ہے

توہی کر اس نظم کو مقبولِ عام تا کہ پہنچے سب کو اِس سے نفعِ تام

اِس کلام میں چونکہ لطافت محاورہ کی کمی تھی قبول عام کی سند سے محروم رہا۔

نجم الاخبار ۱۸۷۷ء-۱۸۸۴ء ۱۸۷۷ء میں روس اور ٹرکی کے درمیان قضیۂ ہرزیگووینا کے متعلّق آغاز جنگ ہوا۔ اُس زمانہ میں منشی محمّد حیات صاحب کی تحریک پر جو ضیائی پریس میرٹھ کے مالک تھے۔ نجم الاخبار کا اجراء کیا گیا۔ اِس نام کے انتخاب میں منشی نجم الدین ؒ کی ہر دلعزیزی کو بڑا دخل تھا۔ یہ اخبار محض اخبارِ جنگ فراہم اور شائع کرنے کی غرض کو لے کر جاری ہوا تھا۔ لیکن تقریباً آٹھ برس جاری رہا چنانچہ مولانا کے ایک قطعہ سے اِس کا پتہ چلتا ہے وہ قطعہ کلیّات اسمٰعیل کے نئے اڈیشن میں شائع کیا گیا ہے اِس اخبار میں مولانا کے مضامینِ نثر بھی طبع ہوا کرتے تھے۔ مگر بلا نام، اِسی طرح آپ کی نظمیں بھی۔ کبھی کبھی اڈیٹر کی غیر حاضری میں آپ خاص آرٹکل اور مدیر کی ذمّہ داریاں بھی پوری کرتے تھے۔ لیکن یہ سب نجی اور دوستانہ طور پر۔ اِس طرح مولانا کا شمار جرنلسٹ کے طبقہ میں بھی ہو سکتا ہے۔ اُس زمانہ میں دو ایک نظمیں اس جنگ کے متعلق مولانا کے قلم سے نکلی ہیں۔ مرثیہ پلیونا کا ذکر ہمیں خاص طور سے کرنا ہے۔

خیال تھا کہ ٹرک فتحیاب ہوں گے۔ چنانچہ مولانا نے فتح پلیونہ کے نام سے ایک نظم بہ شکل مُسدّس تیار کی تھی۔ انجام کار بجائے فتح کے ترکوں کو شکست ہوئی تو اُس کا نام مرثیہ پلیونہ رکھا۔ کُل نظم تو دستیاب نہ ہو سکی ایک بیاض میں چند بند ملے تھے۔ اُن کو کلیّات اسمٰعیل کے پہلے اڈیشن میں شائع کیا تھا۔ اِس مرتبہ

بھی پُرانے کاغذات کی بُہت کچھ چھان بین کی گئی مگر بقیہ نظم کا پتہ نہ چلا۔ اِس مرثیہ سے مولانا کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ شوکتِ الفاظ۔ سلاستِ بیان۔ تصویرِ جنگ۔ جذباتِ اسلام۔ غرض الفاظ میں اِس طرح نقشۂ جنگ کھینچا ہے کہ میدانِ جنگ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

جنگِ روم و روس پر لیکچر ۱۸۷۸ء

زمانۂ جنگ میں ترک مجروحین کی مالی امداد کے لئے مُسلمانانِ میرٹھ نے ایک عام جلسہ منعقد کیا تھا۔ مولانا نے اِس جلسہ میں تقریر فرمائی تھی وہ نجم الاخبار میں شایع ہوئی تھی۔ اُس کی فصاحت کا سر سیّد علیہ الرحمہ نے تہذیب الاخلاق میں ذکر کیا تھا۔ ایک بار تہذیب الاخلاق کا یہ نمبر آگرہ میں دیکھنے کو مل گیا تھا۔ اِس میں تحریر فرمایا تھا۔ کہ اَب مجھے اپنے مرنے کا افسوس نہیں کہ اردو میں ایسے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں جیسا یہ لکچرار ہے۔ اِس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا نثر اور نظم دونوں میں صفائی زبان پر قادر ہو چکے تھے۔ ہر چند تلاش کیا مگر اس تقریر کا مسوّدہ کہیں نہ ملا۔ نجم الاخبار کی پُرانی جلدوں کی بھی تلاش کی البتہ تہذیب الاخلاق میں اِس لکچر کے اقتباسات درج تھے۔

مُرقّعِ زمین ۱۸۸۰ء

اِسی زمانہ میں مولانا نے ایک کتاب جغرافیہ کے مضمون پر تالیف فرمائی تھی۔ مدارس سرکاری کی نصابی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے اور مروّجہ کتب درسیہ کے بدیہی نقائص کو دُور کرنے کی غرض سے یہ کتاب مُدوّن کی گئی تھی۔ مولانا کے مقاصد کا اندازہ اِس کتاب کے "دیباچہ" سے ہوتا ہے:۔

"عرضِ مؤلّف"

میں نے اِن چند اوراق کی تالیف میں کوئی کارِ نُمایاں نہیں کیا۔ کیونکہ وہی مطالب ہیں جو اکثر رائج الوقت رسائل میں موجود ہیں۔ البتّہ یہ کوشش کی ہے کہ ان اجزاء

مختلفہ کو جو نامرتّب انبار کی صورت میں اُوپر تلے دَبے پڑے ہیں۔ ایسی ترتیب سے قرینہ قرینہ لگادوں کہ امتحان دینے والے طلبہ کی حاجت و رغبت اور حالت و وقت کے مناسب ہو جائیں۔ اِس لئے مطالب کو نمبروار دفعات میں تقسیم کر دیا ہے۔ الفاظ میں بھی اختصاراً قطع و برید کی ہے کہ مطلب کے ڈیل ڈول پر چُست آئیں نہ ایسے ڈھیلے ڈھالے کہ پائے طبیعت اُلجھ کر ٹھوکریں کھائے۔ پھر ادائے مطلب کو نقشۂ ممالک کے نگار سے مکمّل کیا ہے تاکہ نظر کی دُوربیں صفحۂ دماغ پر اس علم کا عکس اُتار دے۔

اِسی مناسبت سے اِس کا نام "مُرقّعِ زمین" رکھا گیا۔ اور حصّہ اوّل جس میں صرف ممالک ہند کا بیان ہے طبع کیا گیا اگر طلبہ کو مطبوعِ طبع اور مُفیدِ مطلب ہوا تو باقی اقالیمِ روئے زمین کا مُرقّع بھی پیش کیا جائے گا ورنہ خیر۔ ۲۶ر دسمبر ۱۸۸۳ء

(اس کے بعد دو صفحہ میں "جغرافیہ کے پڑھانے کا انداز" تحریر کیا ہے)

خوشخطی کی کتابیں ۱۸۸۰ء چند کتابیں فنِ خوش خطی پر بھی تالیف فرمائی تھیں۔ اب اُن کا بھی کوئی نسخہ نہیں ملتا۔ مولانا خود نہایت خوش قلم تھے۔ یہ فنِ لطیف حافظ عبدالحق صاحب مغفور کیرانوی سے سیکھا تھا۔ مولانا کے قلم کی تحریر کا نمونہ اس کتاب میں پیش کیا جاتا ہے۔

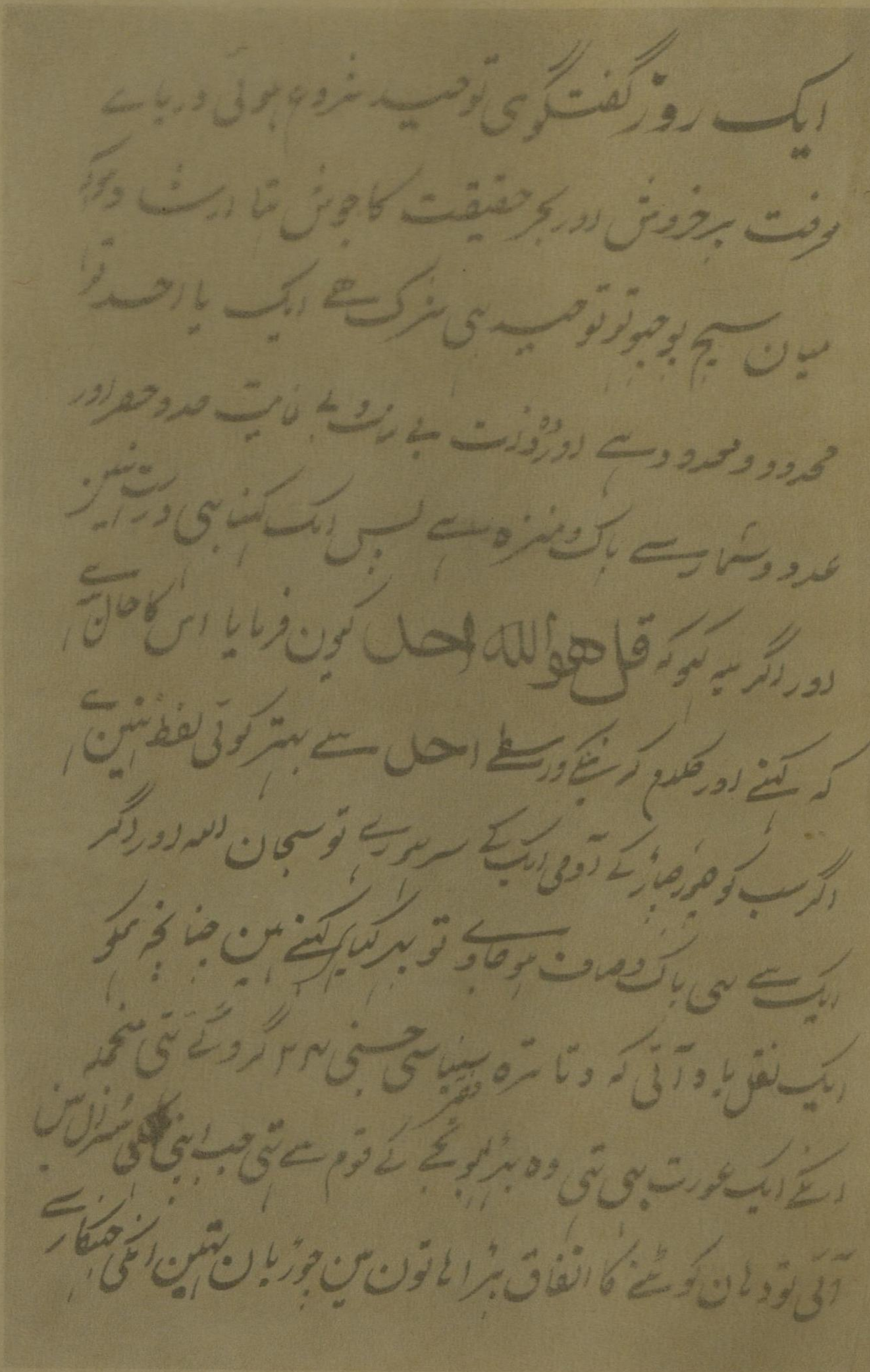
ریزۂ جواہر ۱۸۸۰ء سرسیّد علیہ الرحمہ کے مشورہ کے بعد طرزِ بیان میں سادگی اور کلام میں محاورۂ اُردو کی رنگینی نے مولانا کی نظموں کو لطیف اور شگفتہ بنا دیا۔ اُس زمانہ میں بہت سی نظمیں تصنیف فرمائی تھیں۔ جن میں بیشتر نجم الاخبار کے ذریعہ شایع ہو چکی تھیں اور بعض تازہ تصانیف تھیں۔ احباب نے اُنھیں مُرتّب کیا۔ ڈپٹی نجم الدین صاحب نے "ریزۂ جواہر" نام تجویز فرمایا اور کتابی شکل میں اُن کی اشاعت فرمائی، یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئی۔ اِس کی صرف ایک جلد اُس کا بھی نصف ورق ندارد

مولانا کے کتب خانہ سے دستیاب ہوئی ہے۔

رسالہ قلندری یا رسالہ آئینۂ خود شناسی ۱۸۸۰ء
ڈپٹی نجم الدینؒ اور مولانا ذوقِ تصوّف میں ہم رنگ و ہم خیال تھے۔ اور دونوں حضرات ایک ہی شیخ سے بیعت بھی تھے۔ مولانا کا زیادہ وقت ڈپٹی صاحب کی صحبت میں گذرتا تھا۔ اُن کی محفل میں تصوّف کا رنگ غالب تھا۔ رسالہ قلندری ۱۸۸۰ء میں یا اس کے قریب زمانہ میں تصنیف کیا گیا ہے۔ مولانا کے کلامِ منظوم، ترتیبِ مضمون اور طرزِ انشاء سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ اُن کی تحریر و تصنیف ہے، لیکن سرِ ورق پر نام جنابِ ڈپٹی نجم الدین صاحب علیہ الرحمہ کا ہے اوّل بار یہ رسالہ "رسالۂ قلندری" کے نام سے چھپا ہے۔ لیکن بعد میں اس کے کئی اڈیشن رسالۂ خود شناسی کے نام سے شایع ہوئے ہیں۔ اربابِ ذوق کے لئے شبِ تاریک میں شمعِ ہدایت کا کام کرتا ہے۔ مولانا کا تعلّق اس رسالہ کے ساتھ صرف ادبی پہلو سے دکھانا مقصود ہے۔ احباب میں مخلصانہ برتاؤ عملی طور پر اُس وقت نمودار ہوتا ہے، کہ جانبین میں خود غرضی کا مادّہ نہ ہو۔ چنانچہ حضرت ڈپٹی صاحب اور مولانا کا ارتباط وہ درجہ رکھتا تھا کہ اہلِ دُنیا کے لئے نمونہ تھا۔

تذکرۂ غوثیہ ۸۲-۱۸۸۳ء
حضرت مولانا سید غوث علی شاہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح کی تصنیف میں کم وبیش دو سال صَرف ہوئے۔ آپ کے پیر بھائی جو بعد کو سجادہ نشین بھی ہوئے یعنی مولانا سیّد شاہ گُل حسن رحمۃ اللہ علیہ نے فراقِ شیخ سے مضطرب ہو کر "ارشاداتِ شیخ" میرٹھ کے قیام میں مرتّب فرمائے۔ واقعات اور ارشادات کی ترتیب تو مولانا گل حسن صاحبؒ نے فرمائی اور اُن کو زبان کا جامہ مولانا نے پہنایا۔

یہ حُسنِ اتّفاق ہے یا مولانا کا کمال ہے یا شیخ کا تصرّف ہے کہ زبان و طرزِ بیان



ایک روز گفتگو ہی توحید شروع ہوئی دریاے
معرفت پرخروش اور بحر حقیقت کا جوش تھا ارشاد کیا
میاں سمجھ بوجھ کر توحید ہی شرک ہے ایک یا احد کہنا
محدود و معدود ہے اور وہ ذات بے نہایت و بے غایت حد و حصر اور
عدد و شمار سے پاک و منزہ ہے پس ایک کہنا بھی درست نہیں
اور اگر یہ کہو کہ قل ھو اللہ احد کیوں فرمایا اس کا حال یہ ہے
کہ کہنے اور سمجھنے کے واسطے احد سے بہتر کوئی لفظ نہیں
اگر سب کو چھوڑ چھاڑ کے آدمی ایک کے سر ہو رہے تو سبحان اللہ اور اگر
ایک سے بھی پاک و صاف ہو جاوے تو بہر کیا کہنے ہیں چنانچہ ہم کو
ایک نقل یاد آئی کہ دتاترہ سنیاسی جینی ۲۴ گرو کئے تھے منجملہ
اسکے ایک عورت بھی تھی وہ بوہرے کی قوم سے تھی جب اسکی سسرال میں
آئی تو وہاں کوٹنے کا اتفاق پڑا ہاتوں میں چوڑیاں تھیں انکی جھنکار سے

تذکرہ غوثیہ۔ مولانا کی تحریر۔

مقابل صفحہ ۵۴

مولانا کے کُتب خانہ سے دستیاب ہوئی ہے۔

رسالۂ قلندری یا رسالہ آئینۂ خود شناسی ۱۸۸۰ء

ڈپٹی نجم الدینؒ اور مولانا ذوقِ تصوّف میں ہم رنگ و ہم خیال تھے۔ اور دونوں حضرات ایک ہی شیخ سے بیعت بھی تھے۔ مولانا کا زیادہ وقت ڈپٹی صاحب کی صحبت میں گذرتا تھا۔ اُن کی محفل میں تصوّف کا رنگ غالب تھا۔ رسالۂ قلندری ۱۸۸۰ء میں یا اس کے قریب زمانہ میں تصنیف کیا گیا ہے۔ مولانا کے کلامِ منظوم، ترتیبِ مضمون اور طرزِ انشاء سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ اُن کی تحریر و تصنیف ہے لیکن سرِ ورق پر نام جناب ڈپٹی نجم الدین صاحب علیہ الرحمہ کا ہے اوّل بار یہ رسالہ "رسالۂ قلندری" کے نام سے چھپا ہے۔ لیکن بعد میں اس کے کئی اڈیشن رسالۂ خود شناسی کے نام سے شایع ہوئے ہیں۔ اربابِ ذوق کے لئے شبِ تاریک میں شمعِ ہدایت کا کام کرتا ہے۔ مولانا کا تعلّق اس رسالہ کے ساتھ صرف ادبی پہلو سے دکھانا مقصود ہے۔ احباب میں مخلصانہ برتاؤ عملی طور پر اُس وقت نمودار ہوتا ہے، کہ جانبین میں خود غرضی کا مادّہ نہ ہو۔ چنانچہ حضرت ڈپٹی صاحب اور مولانا کا ارتباط وہ درجہ رکھتا تھا کہ اہلِ دُنیا کے لئے نمونہ تھا۔

تذکرۂ غوثیہ ۱۸۸۲-۸۳ء

حضرت مولانا سید غوث علی شاہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح کی تصنیف میں کم و بیش دو سال صَرف ہوئے۔ آپ کے پیر بھائی جو بعد کو سجادہ نشین بھی ہوئے یعنی مولانا سیّد شاہ گُل حسن رحمۃ اللہ علیہ نے فراقِ شیخ سے مضطرب ہو کر ارشاداتِ شیخ "میرٹھ کے قیام میں مرتّب فرمائے۔ واقعات اور ارشادات کی ترتیب تو مولانا گُل حسن صاحبؒ نے فرمائی اور اُن کو زبان کا جامہ مولانا نے پہنایا۔

یہ حُسنِ اتّفاق ہے یا مولانا کا کمال ہے یا شیخ کا تصرّف ہے کہ زبان و طرزِ بیان

ایک روز گفتگوی توحید شروع ہوئی دریاے
معرفت پر خروش اور بحر حقیقت کا جوش تھا ارشاد کیا کہ
میاں سمجھ بوجھو تو توحید ہی شرک ہے ایک یا احد تو
محدود و معدود ہے اور ذات وہ بے نہایت و بے غایت حد و حصر اور
عدد و شمار سے پاک و منزہ ہے پس ایک کہنا ہی درست نہیں
اور اگر یہ کہو کہ قل ھو اللہ احد کیوں فرمایا اس کا حال یہ ہے
کہ کہنے اور کلام کرنے کے واسطے احد سے بہتر کوئی لفظ نہیں ہے
اگر سب کو چھوڑ چھاڑ کے آدمی ایک کے سر ہو رہے تو سبحان اللہ اور اگر
ایک سے بھی پاک و صاف ہو جاوے تو پھر کیا کہنے ہیں چنانچہ مجکو
ایک نقل یاد آئی کہ دتا ترہ سنیاسی جنہی ۲۴ گرو کئے تھے منجملہ
اسکے ایک عورت بھی تھی وہ بڑہیوں کے قوم سے تھی جب اپنی سسرال میں
آئی تو وہاں کوٹنے کا اتفاق پڑا ہاتوں میں چوڑیاں تھیں انکی جھنکار سے

تذکرہ غوثیہ۔ مولانا کی تحریر۔

مقابل صفحہ ۵۴

میں عجیب دل کشی پیدا ہوگئی ہے۔ پہلے زمانہ میں یہ عجیب دستور تھا کہ صاحبِ مطبع سنِ طباعت کتاب کے سرِورق پر طبع نہیں کرتے تھے۔ نہ اڈیشن کا ذکر ہے کہ یہ پہلا ہے، یا دوسرا۔ پہلا اڈیشن مطبعِ جوہرِ ہند دہلی میں طبع ہوا تھا۔ یہ چار سو پچھتر صفحہ کی کتاب ہے، اس میں یہ وصف ہے کہ شروع کرنے کے بعد جب تک ختم نہ کر لیجیے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اِس کے کئی اڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ آخری اڈیشن حضرت سیّد محمد علی صاحب سجّادہ نشین نے طبع کرایا تھا۔ اِس میں حضرت مولانا سیّد غوث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی شبیہہ بھی درج کتاب کی گئی ہے جو سرتاسر حضرت کے اُصول اور تعلیم کے خلاف ہے فوٹو ہوتا تب بھی ایک بات تھی مگر یہ ایک خیالی خاکہ ہے جو نہایت ہی مہمل اور بے معنی ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے مولانا کی نثر کا یہ اعلیٰ نمونہ ہے۔ اِس میں جو نظمیں درج ہیں خواہ فارسی خواہ اُردو۔ اِن میں سے اکثر و بیشتر مولانا کے قلم سے نکلی ہیں۔ غالباً تذکرہ کی طباعت ۱۸۸۰ء میں ختم ہوئی ہے، اِس کتاب کا قلمی نسخہ مولانا کے قلم کا لکھا ہوا اُن کے کُتب خانہ میں موجود ہے۔ اُس کے ایک صفحہ کا فوٹو سوانح میں پیش کیا جاتا ہے۔ اِس ضمن میں مُناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا گُل حسن رحمۃ اللہ علیہ کے سجع کا بھی تذکرہ کر دیا جائے جو اُن کے اسم گرامی کی نسبت سے مولانا نے کہا تھا۔:-

سجع :- "اصل احمد شاخ زہرا گُلِ حسن"

پنجاب کے اُردو مڈل کورس میں مولانا کی نظمیں ۱۸۸۵ء۔ | اِس میں مولانا کی کافی نظمیں منتخب کی گئیں ہیں۔ غالباً یہ انتخاب "ریزۂ جواہر" سے کیا گیا ہے۔ کیونکہ بعض نظمیں مثلاً خُدا کی تعریف اور مثنویٔ آبِ زُلال، اوّل مرتبہ ریزۂ جواہر میں طبع ہوئی تھیں۔ یہ انتخاب یقین ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد کی سخن فہمی نے قدر افزائی کی نظروں سے کیا ہوگا۔

مولانا کی نظمیں بربنائے سلاستِ بیان اور صفائیِ زبان اکثر کُتب درسیہ میں منتخب کی گئیں ہیں۔ ان کتابوں کی فہرست کا گِنانا ایک تحصیلِ حاصل ہے۔ البتہ اِس سلسلہ میں جناب الیاس برنی نے جو اُردو نظموں کے منتخبات بارہ جلدوں میں شایع کئے ہیں اور جن کے نام معارفِ مِلّت، جذباتِ فطرت اور مناظرِ قُدرت رکھے ہیں اُن کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اپنی قسم کی یہ نئی تالیف ہے یہاں صرف اِس امر کا اظہار مقصود ہے کہ مولانا کی اکثر نظمیں اِس سلسلہ میں منتخب کی گئیں ہیں۔

قندپارسی میٹریکیولیشن کورس ۱۸۸۵ء | ایک مسوّدہ مولانا کے بستوں میں ملا ہے جس پر الہ آباد یونیورسٹی کی مہر بھی ثبت ہے۔ غالباً اُس زمانہ میں وہ کتابیں جو ہائی اسکول کے اِستعمال کے لئے مرتب کی جاتی تھیں۔ یونیورسٹی میں بغرض منظوری بھیجی جاتی ہونگی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب منظور نہیں ہوئی ورنہ طبع ضرور ہوتی۔ اِس نسخہ میں جس کا نام قندپارسی ہے کوئی دیباچہ نہیں ہے جس سے مولانا کے مقاصد اور اغراض کا پتہ چلتا۔

قصیدۂ جریدۂ عبرت ۱۸۸۵ء | یہ قصیدہ مولانا نے یکم نومبر ۱۸۸۵ء کو شایع کیا تھا۔ سَرورق کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹی تقطیع پر طبع کرنے کا مقصد احباب کی خدمت میں تحفتہً دینا تھا اِس لئے کہ سَرورق پر کوئی قیمت نہیں چھاپی گئی۔ شاعر کا نام بھی صرف اِس طرح ظاہر کیا ہے۔ "از محمد اسمٰعیل صاحب" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف میرٹھ کے احباب کی خدمت میں جو نام سے کافی آشنا تھے پیش کرنا مقصود تھا۔ اِس نظم نے ہر پڑھنے والے کے قلب پر گہرا اثر پیدا کیا تھا۔ قوم کی بگڑی ہوئی حالت کا نقشہ کھینچنا وہ بھی اِس طرح کہ لوگ اِس کی اصلاح کی طرف مائل ہوں بُرا سُنیں اور بُرا نہ مانیں۔ ہر مصوّر کا حوصلہ اور کام نہیں ہے اُن حالات و

عادات پر تبصرہ کرنا جو عادت ثانیہ بن چکے ہوں یا اُن طبقوں پر حرف گیر ہونا جن کے افراد پیر مرشد یا مُعلّم وہادی مانے جاتے ہوں اِس طرح کہ سامعین و قارئین متاثر ہوں، اِسی کو شعر کا سحر کہتے ہیں۔ آج بھی قصیدہ "جریدۂ عبرت" کہ اِس تصنیف کو اب پُورے باون۵۲ سال گذر چکے ہیں مُسلمانوں کو اُن کی پست حالت کا نقشہ دِکھا کر بہ بانگِ دہل عبرت دِلا رہا ہے۔

فارسی ریڈروں کا سلسلہ ۱۸۸۸ء-۱۸۹۰ء

فارسی ریڈروں کا بھی ایک سلسلہ مولانا نے تصنیف فرمایا تھا۔ یہ انگریزی مدارس کے لئے مرتّب کیا گیا تھا۔ فارسی زبان میں نظمیں خاص اس سلسلہ کے لئے تصنیف فرمائی تھیں۔ بعض نظمیں فارسی میں اُنھی مضامین پر ہیں جن پر اُردو میں لکھی ہیں اور جو اُردو ریڈروں کے سلسلہ میں شایع ہوئی ہیں۔ یہ فارسی کا سلسلہ کبھی شایع نہیں ہوا۔ اِس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ فارسی کی روز مرّہ کساد بازاری ہوتی جاتی تھی اور یہ توقع نہیں رہی تھی کہ اِس کاوش کی کوئی داد بھی ملے گی۔ یہ مسوّدات مولانا کے کاغذات میں دستیاب ہو گئے ہیں۔ سوانح نگار کے نزدیک بھی اب اُن کی اشاعت غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔

شعراء اُردو کے کلام کا انتخاب ۱۸۹۰ء سے ۱۸۹۹ء

مولانا شعر و سخن کے نقادانِ کامل میں سے تھے شعراء ماضی کے کلام پر کامل عبور رکھتے تھے۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً اُن کے کلام کا انتخاب فرمایا کرتے تھے۔ مولانا کے انتخاب کا معیار سب سے جُداگانہ تھا۔ وہ ہر اُس شعر کو ناپسند فرماتے جس میں تخیّل، الفاظ کی جکڑ بند میں گُم ہو جائے۔ سادگی، سلاست، روانی، صفائی، شیرینی، اثر، پند و حکمت، تصوّف، معاملہ بندی، محاورہ۔ اِن خوبیوں کو جس کلام میں پاتے اِس کو انتخاب فرماتے۔ جن اشعار میں ہوس ناکی یا خیالی

مین میخ نکالنا ہی اس میں ذرّاجوٹ کی اور ناانصافی نہیں تھی۔ ادھر کوئی ایسا لفظ آیا جس میں
تنگ بندیاں ہوں اُن سے بیزار ہوتے تھے۔ اُن کی سخن فہمی کا پایہ اِس درجہ بلند تھا کہ
جو شعر اس معیار پر صادق آتا وہ جواہرات میں تولنے کے قابل ہوتا تھا۔

اساتذۂ ماضی کے کلام کا انتخاب خاص کر اُن شعراء کا جن کے اسمائے گرامی
ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ کم و بیش عُمدہ مقدار میں کیا گیا ہے۔ مولانا کا قصد
اِن شعراء کے کلام پر تبصرہ لکھنے کا بھی تھا۔ افسوس یہ ارادہ پُورا نہ ہوسکا۔ البتہ مختصراً
اپنی رائے کا اظہار اِن شعراء کے کلام پر کیا ہے۔ الفاظ مختصر ہیں مگر جامع۔ اِن اساتذہ
کے اسمائے گرامی کا اِس مقام پر تذکرہ کیا جاتا ہے:۔

(۱) خواجہ میر درد (۲) میر محمد تقی میر۔ (۳) میرزا رفیع سودا۔ (۴) شیخ غلام ہمدانی مصحفی۔
(۵) انشاء اللہ خاں انشا۔ (۶) مرزا اسد اللہ خاں غالب۔ (۷) حکیم مومن خاں مومن
(۸) نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ (۹) شیخ ابراہیم ذوق۔ (۱۰) بہادر شاہ ظفر۔ (۱۱) خواجہ
حیدر علی آتش۔ (۱۲) شیخ امام بخش ناسخ۔ (۱۳) شیخ قلندر بخش جرأت۔ (۱۴) نواب
محمد خاں رند۔ (۱۵) میر ممنون۔ (۱۶) نواب میرزا داغ۔

علاوہ اِن کے نہایت مختصر انتخاب حضرات مندرجہ ذیل کے کلام کا بھی کیا ہے:۔
میر محمد دہلوی۔ بیاں۔ جرأت۔ جوشش۔ حاتم۔ حسرت۔ حسن۔ درد۔ ضیا۔
عشق۔ فقیر۔ فغاں۔ فرقت۔ قدیم۔ قدرت۔ منت۔ ولی۔ ہدایت۔ شہید۔ آبرو۔
آرزو۔ فغاں۔ مظہر اور تاباں۔

چونکہ اِس انتخاب کی اشاعت شائقینِ ادب کے حق میں مفید ثابت ہوگی اور مولانا
کے سخن فہمی کے معیار سے اُن کو واقفیت بھی حاصل ہوگی۔ اِن مسوّدات کو ایک
جدید سلسلہ میں عنقریب شائع کیا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اُردو زبان کی کتابوں کا سلسلہ ۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۴ء

غالباً ۱۸۹۲ء میں مولانا کو اُردو زبان کی کتابیں لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ سب سے پہلے قاعدہ اور پہلی کتاب مرتب فرمائی۔ اور جن کی طباعت اوّل بار ۱۸۹۲ء میں ہوئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں خود ہی طبع کرائی تھیں اور اُن کی اشاعت بطور خود ہونے لگی تھی۔ اگلے سال موسمِ گرما کی تعطیل میں مولانا وطن تشریف نہیں لے گئے۔ گرمیاں آگرہ ہی میں گذاریں اور اِس دو مہینے کی تعطیل میں بقیہ چار کتابیں اِس سلسلہ کی تصنیف فرمائیں جس قدر نظمیں "ریزۂ جواہر" میں شایع ہو چکی تھیں۔ اُن کے علاوہ باقی نظمیں اِن کتابوں کی تصنیف کے دوران میں لکھی گئی تھیں۔ ۱۸۹۴ء میں یہ سلسلہ ٹکسٹ بک کمیٹی نے منظور فرمایا اور تمام یو۔پی کے مدارسِ ابتدائی میں بحکم ڈائرکٹر سرشتہ تعلیم جاری ہوا۔ اِس کی طباعت کا انتظام مطبع اکبری آگرہ میں ہوتا تھا۔ اِس مطبع کے مالک منشی مجید الدین صاحب تھے نہایت نیک اور کم گو شخص تھے۔ کتابت کا پیشہ کرتے تھے۔ مولانا کی تصانیف کی تمام تر طباعت اِس مطبع میں ہوتی تھی۔ اُس وقت اُردو اور ہندی کی کتابیں جداگانہ عبارت میں ہوتی تھیں۔ دونوں کا مقصود اُردو اور ہندی زبانوں کا سکھانا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں گورنمنٹ نے یہ پالیسی تبدیل کر دی۔ اُردو اور ہندی زبانوں کی کتابیں عام بول چال کی زبان میں تصنیف کرائی گئیں۔ مضامین دونوں کے ایک۔ مگر کتابت جداگانہ۔ یہ ہی پالیسی اب بھی جاری ہے۔

یہاں یہ جتانا چنداں ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ اِن کتابوں کی تصنیف سے مولانا نے اُردو زبان پر کس قدر احسان کیا ہے۔ زبان کا معیار، کتابوں میں تدریج۔ بیان کی سادگی، مضامین کا انتخاب، نظم کی شگفتگی۔ غرض ہر پہلو سے اِن کتابوں میں

ایسی خوبیاں پیدا کیں کہ آج تک یہ سلسلہ مقبولِ خاص و عام ہے۔ مدارس سرکاری کے واسطے علی العموم جو کُتب تصنیف و تالیف کی جاتی ہیں۔ زمانہ منظوری ختم ہوتے ہی اس طرح صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں جیسے برسات ختم ہونے پر حشرات الارض فنا ہو جاتے ہیں۔ اِن ریڈروں کا بیالیس ۴۲ سال تک زندہ رہنا اور اب تک دل چسپی کے ساتھ پڑھا جانا، مولانا کے سحرِ قلم کا اعجاز کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

توزک اُردو ۱۸۹۴ء آگرہ ہی کے قیام میں ادبِ اُردو کا ایک انتخاب اُردو مڈل کلاس کے طلباء کے لئے مرتّب فرمایا جو "توزکِ اُردو" کے نام سے شائع کیا گیا تھا۔ یہ انتخاب کئی برس تک سررشتہ تعلیم کے نصاب میں داخل رہا۔ کچھ زمانہ کے بعد اس کتاب کا ایک بڑا اڈیشن مرتّب فرمایا۔ جو کئی برس تک ہائی اسکولوں کی نویں ۹ اور دسویں ۱۰ جماعتوں میں پڑھایا جاتا رہا۔ سررشتہ تعلیم کا کچھ ایسا اُصول معلوم ہوتا ہے کہ دو چار سال کے بعد عُمدہ کتابوں کو بھی تبدیل کر دینا چاہیئے۔ شاید اسی اُصول کے تحت میں یہ کتاب بھی نصاب سے علیحدہ کر دی گئی۔ لیکن جس روش پر اور جس مرتبہ کا کلامِ نظم و نثر مولانا نے انتخاب فرمایا تھا۔ اُس کی داد اہلِ ذوق اب تک دیتے ہیں۔ اِس کتاب میں مولانا کا ایک مضمون "جنگِ مرہٹہ و دُرّانی" کے عُنوان سے ہے۔ اِس میں جنگ کی کیفیت جس طرح بیان ہوئی ہے، اُس کا حظ صرف پڑھنے سے آسکتا ہے۔ اِس کلام پر تبصرہ کرنا یوں بھی غیر ضروری ہے کہ مولانا کا کلام وہ مرتبہ حاصل کر چکا ہے کہ اب اِس کی خوبیاں جتانے کی حاجت باقی نہیں اُس سے استفادہ کی ضرورت ہے۔

قواعدِ اُردو حصّہ اوّل و دوم مؤلفہ ۱۸۹۴ء اِس تصنیف سے مولانا کو خاص دل چسپی تھی معلوم ہوتا ہے، کہ شروع زمانہ ملازمت سے آپ کو قواعدِ زبانِ اُردو کی تدوین کا خیال تھا چنانچہ

مولانا کا ایک پُرانا قلمی مسوّدہ ملا ہے جس میں عربی قواعد کی تقلید کی گئی ہے اِس کو خود ہی مسترد فرما دیا تھا۔ چند سال بعد قواعد اُردو پر دو رسالہ از سرِ نو مرتّب فرمائے۔ یہ آگرہ میں طبع ہوئے۔ غالباً پہلی مرتبہ ۱۸۹۸ء میں شایع ہوئے تھے۔ یہ دونوں حصّے اب تک نول کشور پریس لکھنؤ سے شایع ہوتے رہتے ہیں۔ مولانا کی کُل تصنیفات ۱۹۰۲ء سے نول کشور پریس لکھنؤ سے شایع ہوتی ہیں۔ مولانا عبد الحق سکرٹری انجمن ترقیٔ اُردو نے اپنی کتاب قواعد اُردو مطبوعہ ۱۹۱۴ء میں جہاں قواعد اُردو کی تحقیقات کا تذکرہ کیا ہے۔ مولانا کے اِن دونوں رسالوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو قواعد اُردو مصنّفہ علّامہ ڈاکٹر عبد الحق سکرٹری انجمن ترقیٔ اُردو صفحہ ۱۷ "مقدمہ"۔ "زمانۂ حال میں متعدد کتابیں اِس مبحث پر طلبۂ مدارس وغیرہ کے لئے پنجاب و ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں تالیف ہوئی ہیں۔ جن میں کم و بیش عربی صَرف و نحو کا تتبّع کیا گیا ہے البتّہ مولوی محمّد اسمٰعیل صاحب نے جو دو مختصر رسالے طلبۂ مدارس کے لئے لکھے ہیں اِس میں اُنھوں نے تقلید سے الگ ہو کر جدّت سے کام لیا ہے لیکن یہ رسالے بہت مختصر ہیں اور صرف ابتدائی مدارس کے طالب علموں کے لئے کار آمد ہو سکتے ہیں"۔

ترجمانِ فارسی ۱۸۹۴ء | یہ کتاب زمانۂ قیامِ آگرہ میں مرتّب فرمائی تھی۔ اِس میں اُردو سے فارسی اور فارسی سے اُردو ترجمہ کرنے کے طریقے سکھائے گئے ہیں۔ یہ کتاب سرکاری مدارس کے مبتدی طلباء کے فائدے کے واسطے ہے۔ چونکہ زبان فارسی کی اب کچھ قدر نہیں رہی اِس لئے اِس کتاب کی اور اِس قسم کی دوسری کتابوں کی بھی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہ کتاب نول کشور پریس لکھنؤ سے اب تک شایع ہوتی ہے

اُردو کورس برائے نارمل سکول ۱۸۹۷ء | ۱۸۹۷ء میں یہ کتاب نول کشور پریس لکھنؤ کی فرمائش پر

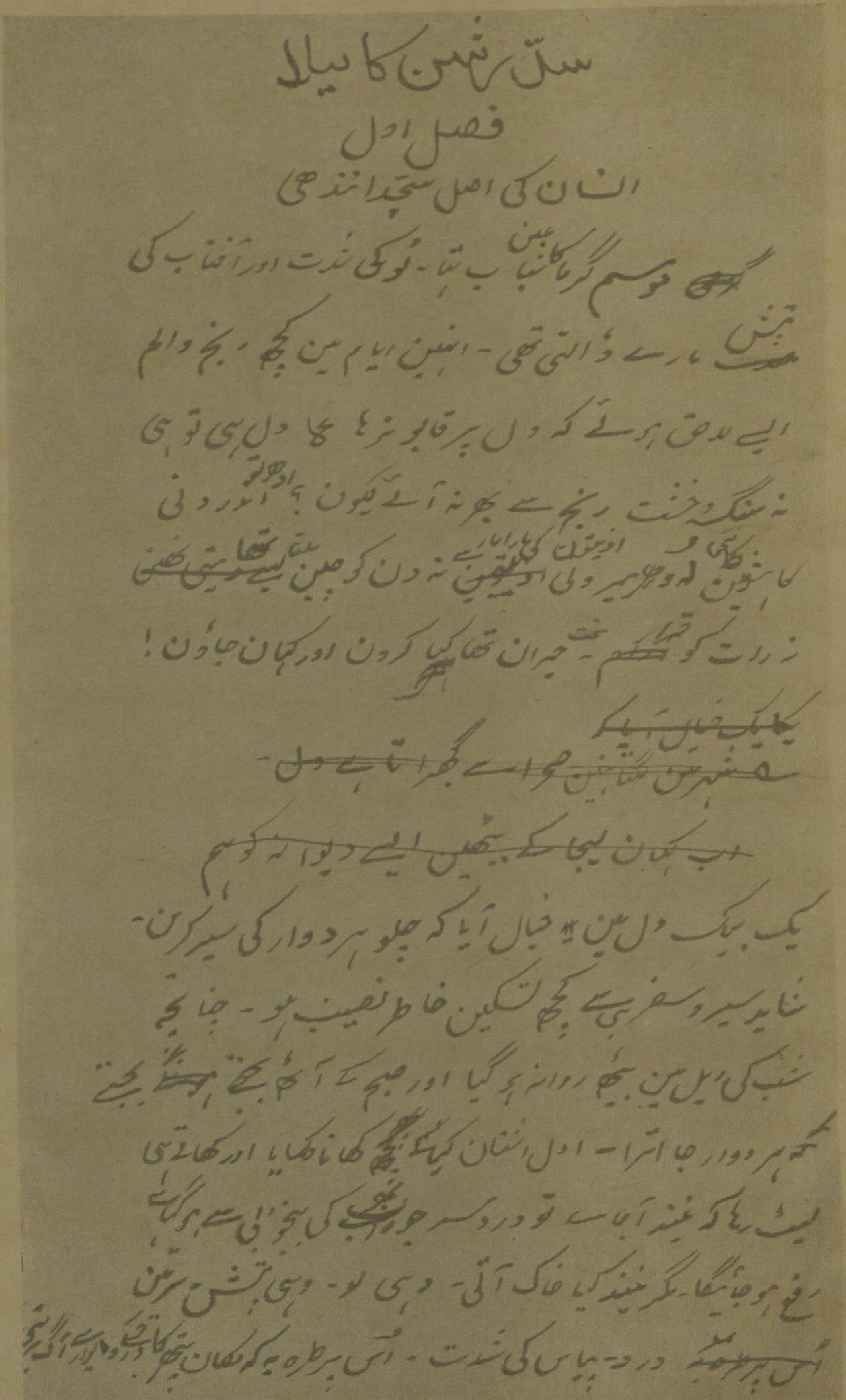
تالیف فرمائی تھی۔ اُسی مطبع میں طبع ہوئی اور اُس کے بُک ڈپو سے شایع ہوئی۔ اِس کتاب میں مضامین نثر و نظم کا انتخاب ہے۔ معیارِ انتخاب نارمل اسکولوں کی دوسرے سال کی جماعت کے لحاظ سے ہے۔

سُدرشن کا میلہ حصّہ اوّل ۱۹۰۱ء

مولانا میرٹھ کے ضلع اسکول میں مُدرّسِ فارسی تھے، اور پنڈت گیندن لال بی۔ اے اُسی مدرسہ میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ مولانا کے اُن سے بہت مخلصانہ تعلّقات تھے۔ پنڈت جی بھی مولانا کا احترام فرماتے تھے۔ جب کبھی مولانا بیمار ہو جاتے تو پنڈت جی مکان پر مزاج پُرسی کے لئے تشریف لایا کرتے تھے۔ یہی طریقہ پنڈت جی کا آگرہ میں بھی جاری رہا۔ جب کہ وہ اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس ہو کر وہاں تشریف لے گئے۔ اُن کے ایک چھوٹے بھائی تھے۔ پنڈت چھیدا لال۔ صاحبِ علم، اور ذوقِ تصوّف سے آشنا تھے۔ بالخصوص فلسفۂ ویدانت میں۔ اُنھوں نے ایک کتاب زبانِ اُردو میں تصوّف پر مرتّب فرمائی تھی۔ پنڈت گیندن لال آنجہانی کی خاطر سے مولانا نے اِس کتاب کو فصیح زبان کا جامہ پہنایا۔ اِس کتاب کا نام "سُدرشن کا میلہ" ہے نول کشور پریس لکھنؤ سے شایع ہوئی ہے۔ پہلا حصّہ تو مولانا نے لِکھ دیا تھا۔ لیکن دوسرا حصّہ لکھنے کی فرصت نہ مل سکی۔ دونوں حصّے شایع ہو چکے ہیں۔ دونوں کی عبارت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ صاحبِ ذوق جب اِس کتاب کا مُطالعہ فرمائیں گے تو اس فرق کو خود محسوس کریں گے۔ یہ کتاب بہ لحاظ مضامین نہایت خوب ہے اور بہ لحاظ زبان خوب تر۔

کمکِ اُردو اور ادیبِ اُردو ۱۹۰۹ء

یہ دونوں کتابیں لکھنؤ کے قیام میں تالیف فرمائی تھیں۔ ۱۹۰۹ء میں مولانا وہاں اپنے فرزندِ اکبر کے پاس تشریف لے گئے تھے۔ یہ ادبی


سدرشن کا میلا

فصل اول

انسان کی اصل سچدانند ہی

موسم گرما کا شباب تھا۔ لُو کی شدت اور آفتاب کی
تپش مارے ڈالتی تھی۔ انہیں ایام میں کچھ رنج والم
ایسے لاحق ہوئے کہ دل پر قابو نہ رہا۔ دل ہی تو ہے
نہ سنگ و خشت رنج سے بھر نہ آئے کیوں؟ ادھر تو اندرونی
کاہشوں کا وہ ہجوم اور بیرونی آفتوں کی یہ یلغار کہ نہ دن کو چین ملتا تھا
نہ رات کو آرام۔ سخت حیران تھا کیا کروں اور کہاں جاؤں!
~~یکایک خیال آیا کہ~~
~~شہر میں گنگا جی ... ہوا سے گھبراتا ہے دل۔~~
~~اب کہاں یہاں کے بیٹھیں ایسے دیوانہ کو ہم~~
یکایک دل میں یہ خیال آیا کہ چلو ہردوار کی سیر کروں۔
شاید سیر و سفر ہی سے کچھ تسکین خاطر نصیب ہو۔ چنانچہ
شب کی ریل میں بیٹھ روانہ ہو گیا اور صبح کے آٹھ بجتے بجتے
ہردوار جا اترا۔ اول اشنان کیا پھر کچھ کھانا کھایا اور کھاتے ہی
لیٹ رہا کہ نیند آجائے تو دردِ سر جو رات کی بے خوابی سے ہو گیا ہے
رفع ہو جائیگا۔ مگر نیند کیا خاک آتی۔ وہی لو۔ وہی تپش سر میں
اس پر درد۔ پیاس کی شدت۔ اس پر طرہ یہ کہ مکان بھی ...

سدرشن کا میلہ۔ مولانا کی تحریر

مقابل صفحہ ۶۲

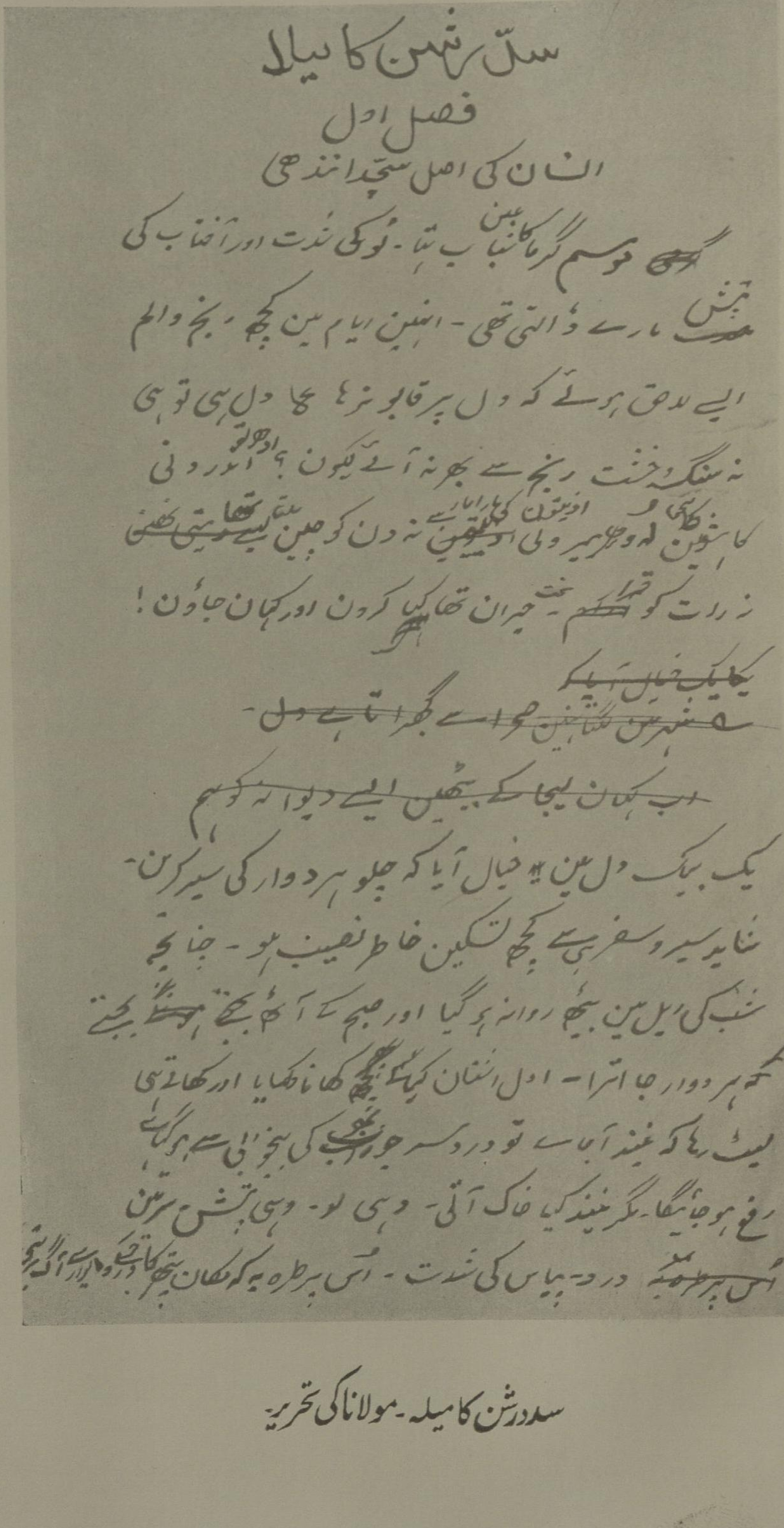
تالیف فرمائی تھی۔ اُسی مطبع میں طبع ہوئی اور اُس کے بُک ڈپو سے شایع ہوئی۔ اِس کتاب میں مضامین نثر و نظم کا انتخاب ہے۔ معیار انتخاب نارمل اسکولوں کی دوسرے سال کی جماعت کے لحاظ سے ہے۔

سد درشن کا میلہ حصّہ اوّل ۱۹۰۱ء

مولانا میرٹھ کے ضلع اسکول میں مُدرّسِ فارسی تھے، اور پنڈت گیندن لال بی۔ اے اُسی مدرسہ میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ مولانا کے اُن سے بہت مخلصانہ تعلّقات تھے۔ پنڈت جی بھی مولانا کا احترام فرماتے تھے۔ جب کبھی مولانا بیمار ہو جاتے تو پنڈت جی مکان پر مزاج پرسی کے لئے تشریف لایا کرتے تھے۔ یہی طریقہ پنڈت جی کا آگرہ میں بھی جاری رہا۔ جب کہ وہ اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس ہو کر وہاں تشریف لے گئے۔ اُن کے ایک چھوٹے بھائی تھے۔ پنڈت چھیدا لال۔ صاحب علم، اور ذوقِ تصوّف سے آشنا تھے۔ بالخصوص فلسفۂ ویدانت میں۔ اُنھوں نے ایک کتاب زبانِ اُردو میں تصوّف پر مرتّب فرمائی تھی۔ پنڈت گیندن لال آنجہانی کی خاطر سے مولانا نے اِس کتاب کو فصیح زبان کا جامہ پہنایا۔ اِس کتاب کا نام "سد درشن کا میلہ" ہے نول کشور پریس لکھنؤ سے شایع ہوئی ہے۔ پہلا حصّہ تو مولانا نے لکھ دیا تھا۔ لیکن دوسرا حصّہ لکھنے کی فرصت نہ مل سکی۔ دونوں حصّے شایع ہو چکے ہیں۔ دونوں کی عبارت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ صاحبِ ذوق جب اِس کتاب کا مُطالعہ فرمائیں گے تو اس فرق کو خود محسوس کریں گے۔ یہ کتاب بہ لحاظ مضامین نہایت خوب ہے اور بہ لحاظ زبان خوب تر۔

کمک اُردو اور ادیب اُردو ۱۹۰۹ء

یہ دونوں کتابیں لکھنؤ کے قیام میں تالیف فرمائی تھیں۔ ۱۹۰۹ء میں مولانا وہاں اپنے فرزند اکبر کے پاس تشریف لے گئے تھے۔ یہ ادبی



سد درشن کا میلہ۔ مولانا کی تحریر

مقابل صفحہ ۶۲

انتخابات ہیں دونوں کتابیں شہری اور دیہاتی مدارس کی جماعت ہائے پنجم اور ششم میں مدّتوں داخل درس رہیں۔ "ادیبِ اردو" میں اصناف سخن کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور اساتذہ کے کلام پر مختصر الفاظ میں اظہار رائے (ریویو) کیا گیا ہے۔ ادیب اردو میں مرزا کا خواب پڑھنے کے قابل ہے۔ اگرچہ اور حضرات نے بھی انگریزی سے اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ لیکن جن صاحبوں کو اس مضمون کے پڑھنے کا اتّفاق ہوا ہے، اُن کی رائے ہے کہ یہ ترجمہ نہیں اصل معلوم ہوتا ہے۔ مولانا کے فرزند اکبر مولوی محمد محمود سیفی مرحوم نے یہ ترجمہ کیا تھا اور مولانا نے زبان درست فرمادی تھی۔ یہ مولانا کی اصلاح تھی کہ جس نے لطفِ زبان کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔

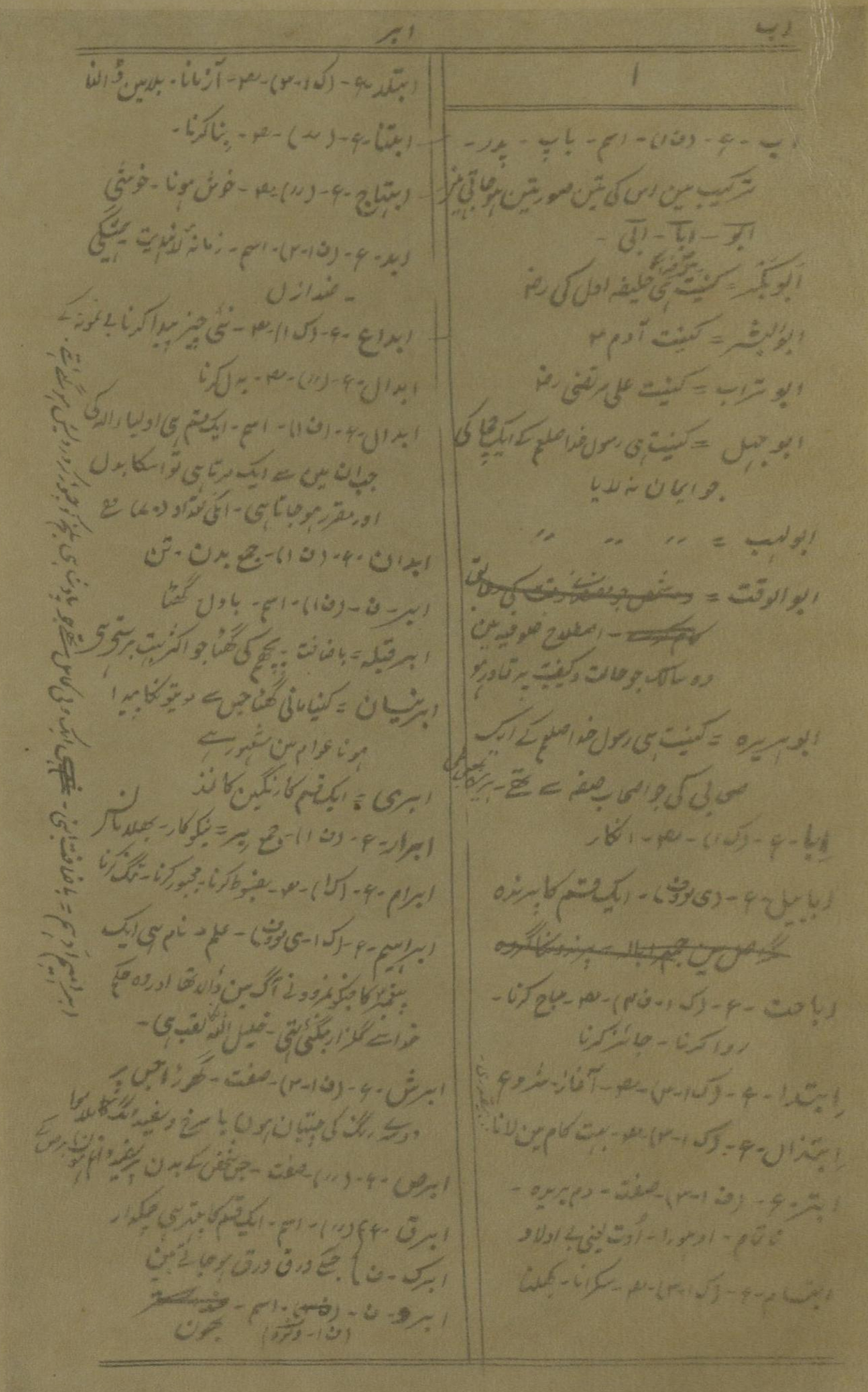
اردو کی درسی لغات ۱۹۱۰ء | زبان اردو کی درسی لغات کی ترتیب میں مولانا مدّت سے مصروف تھے۔ اِس کے لئے بہت کچھ ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ چنانچہ کئی جلدوں میں اِس کے مسوّدے محفوظ ہیں۔ مولانا کا منشا اردو زبان کی ایسی ڈکشنری مرتب کرنے کا تھا جو مستند بھی ہو اور کم قیمت بھی۔ مولانا نے اساتذہ کے کلام سے اشعار کا انتخاب اِس لحاظ سے کیا تھا کہ الفاظ کا صحیح استعمال مصرعہ یا شعر پڑھ کر طالب علم کی سمجھ میں بہ آسانی آجائے۔ اِس تالیف کے متعلق مولانا نے بعض اہلِ قلم سے مشورہ بھی کیا تھا۔ اُن میں سے خاص تذکرہ کے مستحق مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی ہیں جنھوں نے ایک مبسوط تحریر اِس بارے میں ارسال فرمائی تھی۔ مولانا کے وصال کے بعد یہ دفتر بند ہو گیا اور مسوّدے الماریوں میں محفوظ۔ "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند"۔ سوانح مولانا کے سلسلہ میں چونکہ مسوّدات کا دیکھنا ضروری تھا۔ اِس طرح اِن مسوّدات سے بھی واقفیت ہو گئی۔ اِس مقام پر لغات درسیہ کا ایک صفحہ مولانا کے قلم کا لکھا ہوا بذریعہ فوٹو پیش کیا جاتا ہے۔

رسالۂ نماز ۱۹۱۰ء مولانا نے نہایت سادہ اور سلیس انداز میں جس میں انھیں کمال حاصل تھا۔ ایک رسالۂ نماز بھی لکھا تھا۔ یہ کئی بار طبع ہوا۔ منشا صرف اِس قدر تھا کہ اس کو مُفت یا برائے نام قیمت پر بہ کثرت شایع کیا جائے تاکہ ارکانِ نماز سے عوام بالخصوص بچّے اور بچّیاں اچھّی طرح واقف ہو جائیں۔ برائے نام قیمت سے یہ مراد تھی کہ اس کی آمدنی سے کتاب دوبارہ طبع کرلی جائے۔ اِس رسالہ کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوگا کہ اِس سے زیادہ سلیس اور مختصر انداز میں ارکانِ نماز کی تفصیل کسی اور رسالہ میں تحریر نہیں ہوئی ہے۔ اِس رسالہ کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں :-

رات دن کی سب ملا کر سترہ[۱۷] رکعتیں ہیں فرض، تم کر لو شمار
فجر کی دو[۲] رکعتیں مغرب کی تین[۳] ظہر اور عصر و عشاء کی چار[۴] چار[۴]

کُچھ خبر بھی ہے تمھیں سُنّت ہیں کتنی رکعتیں اوّل آخر فرض کے بارہ[۱۲] ہیں کُل ہم سے سُنو
فجر کے اوّل میں دو[۲] او ظہر کے اوّل میں چار[۴] ظہر و مغرب اور عشاء ہر ایک کے آخر میں دو[۲]

قصیدہ نوائے زمستاں ۱۹۱۰ء یہ قصیدہ ابتدائے ۱۹۱۰ء میں اپنی طبیعت کے میلان سے لکھنا شروع کیا تھا۔ اس کا نام "نوائے زمستاں" تجویز فرمایا تھا۔ شاید اِس خیال سے کہ سردی کا موسم تھا۔ کُچھ دنوں بعد یہ اعلان ہوا کہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی طرف سے ایک وفد میرٹھ آنے والا ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے میرٹھ کے امراء و رؤساء سے دریافت فرمایا تھا کہ وفد کب تک آئے اور میرٹھ سے کس قدر چندہ کی اُمّید کی جائے اِس معاملہ میں مشاورت کی غرض سے ایک جلسہ نواب اسد اللہ خاں مرحوم کے دولت کدہ پر منعقد ہوا۔ اِس میں رُؤسا و امراء کے علاوہ طبقہ متوسط کے بھی کُچھ حضرات مدعو تھے۔ ایک صاحب نے جن کا نام یاد نہیں رہا۔ طبقۂ امراء کی جانب سے اظہارِ خیال فرمایا کہ تمام



ا

اب - ع - (ف ا) - اسم - باپ - پدر -
ترکیب میں اس کی تین صورتیں ہو جاتی ہیں
ابو - ابا - ابی -
ابو بکر = کنیت ہی خلیفہ اول کی رضہ
ابو البشر = کنیت آدم ع
ابو تراب = کنیت علی مرتضی رضہ
ابو جہل = کنیت ہی رسول خدا صلعم کے ایک چچا کی
جو ایمان نہ لایا
ابو لہب = " " "
ابو الوقت = ~~شخص جو~~ - اصطلاح صوفیہ میں
وہ سالک جو حالت و کیفیت پر قادر ہو
ابو ہریرہ = کنیت ہی رسول خدا صلعم کے ایک
صحابی کی جو اصحاب صفہ سے تھے -
اِبا - ع - (ک ا) - مص - انکار
ابابیل - ع - (ی بو دش) - ایک قسم کا پرندہ
~~جس کی جمع ابابیل~~
اباحت - ع - (ک ا - ف ہ) - مص - مباح کرنا -
روا کرنا - جائز کرنا
ابتدا - ع - (ک ا - س) - مص - آغاز - شروع
ابتذال - ع - (ک ا - ۲) - مص - بہت کام میں لانا
ابتر - ع - (ف ا - ۳) - صفت - دم بریدہ -
ناتمام - ادھورا - اوت یعنی بے اولاد
ابتسام - ع - (ک ۱ - ۳) - مص - مسکرانا - مسکرانا

ابتلا - ع - (ک ا - س) - مص - آزمانا - بلا میں ڈالنا
ابتنا - ع - (ر) - مص - بنا کرنا -
ابتہاج - ع - (ر) - مص - خوش ہونا - خوشی
ابد - ع - (ف ا - ۲) - اسم - زمانہ لانہایت - ہمیشگی
- ضد ازل
ابداع - ع - (ک ا) - مص - نئی چیز پیدا کرنا بے نمونہ کے
ابدال - ع - (ر) - مص - بدل کرنا
ابدال - ع - (ف ا) - اسم - ایک قسم کی اولیا اللہ کی
جب ان میں سے ایک مرتا ہی تو اسکا بدل
اور مقرر ہو جاتا ہی - انکی تعداد ۷۰ ہے
ابدان - ع - (ف ا) - جمع بدن - تن
ابر - ف - (ف ا) - اسم - بادل گھٹا
ابر قبلہ = بافتح = پچھم کی گھٹا جو اکثر بہت برستی ہی
ابر نیسان = کنایا مانی گھٹا جس سے موتی کا پیدا
ہونا عوام میں مشہور ہے
ابری = ایک قسم کا رنگین کاغذ
ابرار - ع - (ف ا) - جمع بر = نیکوکار - بھلا مانس
ابرام - ع - (ک ا) - مص - مضبوط کرنا - مجبور کرنا - تنگ کرنا
ابراہیم - ع - (ک ا - ی بو دش) - علم - نام ہی ایک
پیغمبر کا جنکو نمرود نے آگ میں ڈالا تھا اور وہ حکم
خدا سے گلزار بن گئی تھی - خلیل اللہ لقب ہی -
ابرش - ع - (ف ا - ۳) - صفت - گھوڑا جس پر
دو رنگ کی چتیاں ہوں یا سرخ و سفید رنگ کا ملا ہوا
ابرص - ع - (ر) - صفت - جس شخص کے بدن پر سفید داغ ہوں برص کے
ابرق - ع - (ر) - اسم - ایک قسم کا پتھر ہی چمکدار
ابرک - ف - جسکے ورق ورق ہو جاتے ہیں
ابرو - ف - (ف ا - ۳) - اسم - بھوں
(ف ا - و ترود)

لغات درسیہ - مولانا کی تحریر -

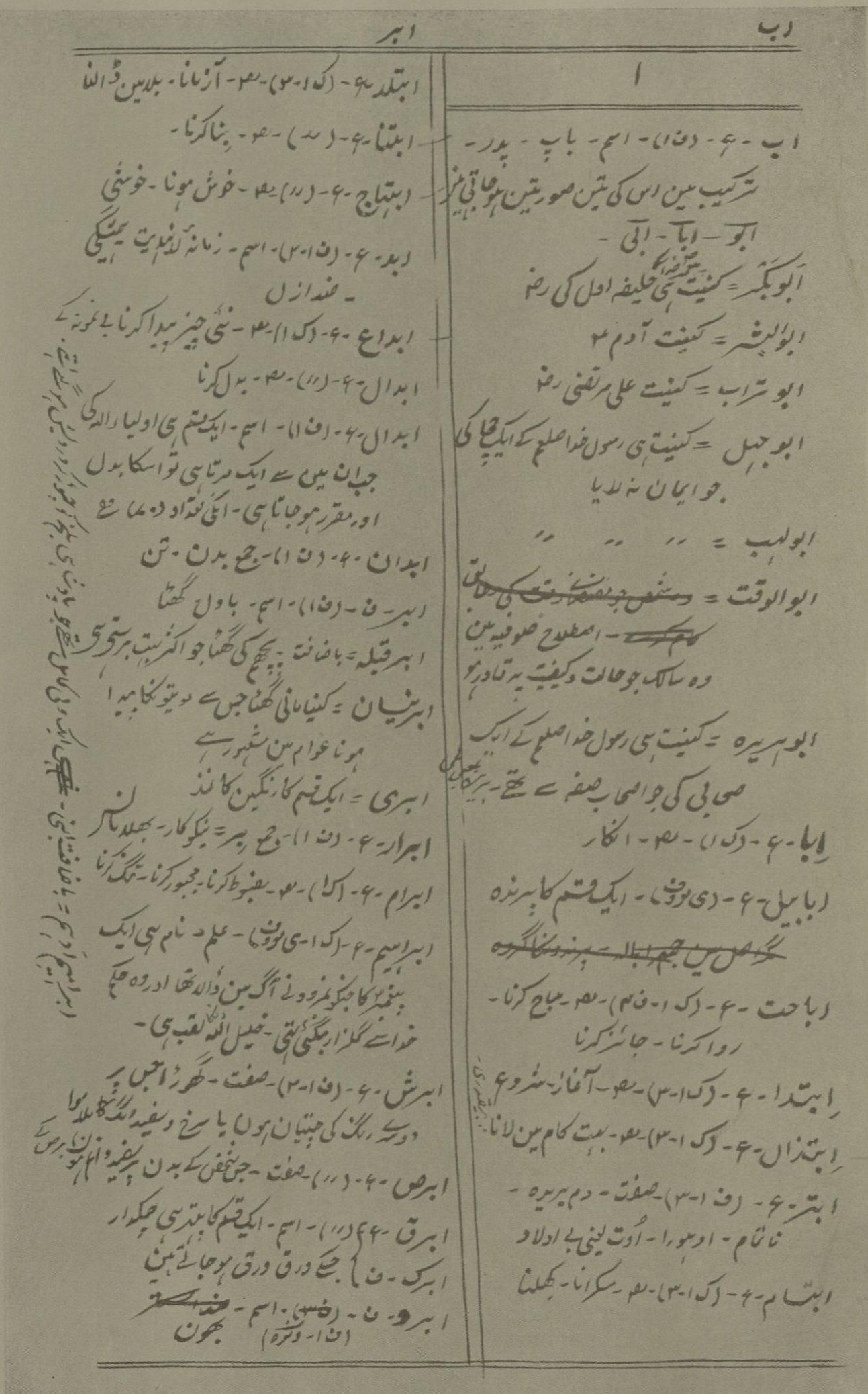
مقابل صفحہ ۶۴

رسالۂ نماز ۱۹۱۰ء مولانا نے نہایت سادہ اور سلیس انداز میں جس میں انھیں کمال حاصل تھا۔ ایک رسالۂ نماز بھی لکھا تھا۔ یہ کئی بار طبع ہوا۔ منشا صرف اِس قدر تھا کہ اس کو مُفت یا برائے نام قیمت پر بہ کثرت شایع کیا جائے تاکہ ارکانِ نماز سے عوام بالخصوص بچّے اور بچیّاں اچھی طرح واقف ہوجائیں۔ برائے نام قیمت سے یہ مراد تھی کہ اس کی آمدنی سے کتاب دوبارہ طبع کرلی جائے۔ اِس رسالہ کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوگا کہ اِس سے زیادہ سلیس اور مختصر انداز میں ارکانِ نماز کی تفصیل کسی اور رسالہ میں تحریر نہیں ہوئی ہے۔ اِس رسالہ کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں :-

رات دن کی سب ملاکر سترہ۱۷ | رکعتیں ہیں فرض، تم کرلو شمار
فجر کی دو۲ رکعتیں مغرب کی تین۳ | ظہر اور عصر و عشاء کی چار۴ چار۴

کچھ خبر بھی ہے تمھیں سُنّت ہیں کتنی رکعتیں | اوّل آخر فرض کے بارہ۱۲ ہیں کُل ہم سے سُنو
فجر کے اوّل میں دو۲ اور ظہر کے اوّل میں چار۴ | ظہر و مغرب اور عشاء ہر ایک کے آخر میں دو۲

قصیدہ نوائے زمستاں ۱۹۱۰ء یہ قصیدہ ابتدائے ۱۹۱۰ء میں اپنی طبیعت کے میلان سے لکھنا شروع کیا تھا۔ اس کا نام "نوائے زمستاں" تجویز فرمایا تھا۔ شاید اِس خیال سے کہ سردی کا موسم تھا۔ کچھ دنوں بعد یہ اعلان ہوا کہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی طرف سے ایک وفد میرٹھ آنے والا ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے میرٹھ کے امراء و رؤساء سے دریافت فرمایا تھا کہ وفد کب تک آئے اور میرٹھ سے کس قدر چندہ کی اُمید کی جائے اِس معاملہ میں مشاورت کی غرض سے ایک جلسہ نواب اسد اللہ خاں مرحوم کے دولت کدہ پر منعقد ہوا۔ اِس میں رؤسا و امراء کے علاوہ طبقہ متوسط کے بھی کچھ حضرات مدعو تھے۔ ایک صاحب نے جن کا نام یاد نہیں رہا۔ طبقۂ امراء کی جانب سے اظہارِ خیال فرمایا کہ تمام


اب | ابر

ا

اب - ع - (ف ا) - اسم - باپ - پدر -
ترکیب میں اس کی تین صورتیں ہو جاتی ہیں
ابو - ابا - ابی -
ابوبکر = کنیت ہی خلیفہ اول کی رضہ
ابوالبشر = کنیت آدم ع
ابو تراب = کنیت علی مرتضی رضہ
ابو جہل = کنیت ہی رسول خدا صلعم کے ایک چچا کی
جو ایمان نہ لایا
ابولہب = " " "
ابوالوقت = اصطلاح صوفیہ میں
وہ سالک جو حالت و کیفیت پر قادر ہو
ابوہریرہ = کنیت ہی رسول خدا صلعم کے ایک
صحابی کی جو اصحاب صفہ سے تھے
ابا - ع - (ک ۱) - مص - انکار
ابابیل - ع - (ی بروزن) - ایک قسم کا پرندہ
اباحت - ع - (ک ا - ف م) - مص - مباح کرنا -
روا کرنا - جائز کرنا
ابتدا - ع - (ک ا - س) - مص - آغاز - شروع
ابتذال - ع - (ک ا - ۳ - ا) - مص - بہت کام میں لانا
ابتر - ع - (ف ا - ۳ - ا) - صفت - دم بریدہ -
ناتمام - اور ہورا - اوت یعنی بے اولاد
ابتسام - ع - (ک ا - ۳ - ا) - مص - مسکرانا - کھلنا

ابتلا - ع - (ک ا - س) - مص - آزمانا - بلا میں ڈالنا
ابتنا - ع - (") - مص - بنا کرنا -
ابتہاج - ع - (") مص - خوش ہونا - خوشی
ابد - ع - (ف ا - ۲ - ا) - اسم - زمانہ لانہایت - ہمیشگی
- ضد ازل
ابداع - ع - (ک ا) - مص - نئی چیز پیدا کرنا بے نمونہ کے
ابدال - ع - (") - مص - بدل کرنا
ابدال - ع - (ف ا) - اسم - ایک قسم ہی اولیاء اللہ کی
جب ان میں سے ایک مرتا ہی تو اسکا بدل
اور مقرر ہو جاتا ہی - انکی تعداد ۷۰ مانتے
ابدان - ع - (ف ا) - جمع بدن - تن
ابر - ف - (ف ا) - اسم - بادل گھٹا
ابر قبلہ = باضافت - پچھم کی گھٹا جو اکثر بہت برستی ہی
ابر نیسان = کنیا مانی گھٹا جس سے موتی کا پیدا
ہونا عوام میں مشہور ہے
ابری = ایک قسم کا رنگین کاغذ
ابرار - ع - (ف ا) - جمع بر = نیکوکار - بھلا مانس
ابرام - ع - (ک ا) - مص - مضبوط کرنا - مجبور کرنا - تنگ کرنا
ابراہیم - ع - (ک ا - ی بروزن) - علم - نام ہی ایک
پیغمبر کا جنکو نمرود نے آگ میں ڈالدیا تھا اور وہ حکم
خدا سے گلزار بن گئی تھی - خلیل اللہ لقب ہی -
ابرش - ع - (ف ا - ۳ - ا) - صفت - گھوڑا جس پر
دوسرے رنگ کی چتیاں ہوں یا سرخ و سفید رنگ کا ملا ہوا
ابرص - ع - (") - صفت - جس شخص کے بدن پر سفید داغ ہوں برص کے
ابرق - ع - (") - اسم - ایک قسم کا پتھر ہی چمکدار
ابرک - ف - جسکے ورق ورق ہو جاتے ہیں
ابرو - ف - (ف ا - و ترہ) - اسم - بھون

لغات درسیہ - مولانا کی تحریر -

مقابل صفحہ ۶۴

سر برآوردگانِ شہر کی یہ رائے ہے کہ وفد کو ابھی میرٹھ آنے کی دعوت نہ دی جائے۔ واللہ اعلم اِس تحریک میں کیا مصلحت مضمر تھی لیکن مولانا نے ذرا جوش کے لہجہ میں فرمایا کہ تمام سر برآوردگانِ میرٹھ کی یہ رائے ہے کہ یہ وقت وفد کو بلانے کے لئے نہایت موزوں ہے۔ چنانچہ یہی تجویز اتفاق رائے سے پاس ہوئی۔ وفد کو دعوت دی گئی۔ نواب وقار الملک بہادر مرحوم کی سرکردگی میں وفد آیا۔ قصیدہ "نوائے زمستاں" مولانا نے پُورا کر دیا تھا جس میں نہایت پُر جوش طریقہ سے یونیورسٹی کے لئے چندہ کا اپیل کیا گیا تھا۔

"جریدۂ عبرت" جو ۱۸۸۵ء کی تصنیف ہے جس میں قوم کی مبتذل حالت پر سخت ترین نکتہ چینی کی تھی اور دکھایا تھا کہ قوم کے دوست کون ہیں اور دُشمن کون اور کس طرح وہ سنبھل سکتی ہے پچیس سال کے بعد "نوائے زمستاں" میں مُسلمانوں کی اخلاقی کمزوریوں، اقتصادی خرابیوں اور ادبی بد مذاقیوں پر سختی کے ساتھ حرف گیر ہوئے ہیں۔ علم کو ہر مرض کی دوا تجویز کرتے ہوئے، جن اشعار کے ذریعہ یونیورسٹی کی اِمداد کے لئے اہلِ وطن کو آمادہ، اور چندہ کا اپیل کیا ہے۔ وہ اِس جگہ نقل کئے جاتے ہیں ؎

اگر قوم کی زندگی چاہتے ہو — تو ہے ورسٹی چشمۂ آبِ حیواں
اطبائے حاذق کی تجویز ہے یہ — گھٹے گا اِسی سے مذلّت کا یرقاں
تلافیٔ مافات کا گُر یہی ہے — کمر باندھ لو اور بنو مردِ میداں
اُٹھا دو سمندِ عزیمت کی باگیں — بجا دو بس اب کوسِ ایثار و احساں
گرجنے لگے ابر، جود و کرم کا — برسنے لگے دام و درہم کا باراں
چمکنے لگیں بجلیاں سیم و زر کی — اُبلنے لگے چشمۂ جیب و ہمیاں

خزینہ دفینہ نہیں ہے تو کیا غم نہ ہونا نہ ہونا نہ ہونا ہراساں
زراہِ خلوص ایک کوڑی بھی دو گے تو رکھّے گی وہ قدرِ لعلِ بدخشاں
کرو جمع جو جو تو ہو جائیں سَو سَو بنے قطرے قطرے سے دریا عمّاں
ہزاروں سے بڑھ کر ہو لاکھوں پہ نوبت ہو لاکھوں سے بڑھ کر کروڑوں کی میزاں
جو ہمّت کرو تم تو حامی خُدا ہے خدا کے سوا کون ہے میرِ ساماں
ہے امّید واثق کہ سرمایہ کافی خزانہ میں داخل ہو تا ماہِ رمضاں
جو دریا دلی قوم نے کی تو فوراً ہمارے امیر اور نوّاب اور خاں
کریں گے یہ کوشش کہ ہر وِرسٹی کا مزیّن ہو طغرائے شاہی سے فرماں
بنفسِ نفیس آئیں شاہِ معظّم کریں حصنِ علمی کی مرصوص بُنیاں
کرو جدّ و جہد اب خدا کے بھروسے ہمارا تمہارا خدا ہے نگہباں
کمر بستہ ہو کر کرے کام بھی کچھ
سُنے جو کوئی یہ "نوائے زمستاں"

تعلیم غوثیہ مطبوعہ سنہ ۱۹۱۹ع — ایک کتاب جناب مولانا سیّد گُل حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے 'تعلیم غوثیہ' کے نام سے لکھی ہے۔ یہ سنہ ۱۹۱۹ع میں جے اینڈ سنز برقی پریس دہلی میں طبع ہوئی اور قاضی محتشم الدین احمد صاحب مرحوم نے جو مولانا گُل حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مُرید تھے شائع کی۔ اِس کتاب کی عبارت مولانا گُل حسن صاحب نے مولانا سے لکھوانی چاہی جس طرح کہ تذکرہ غوثیہ کی لکھوائی تھی۔ سجادہ صاحب کی خاطر کچھ حد تک تو یہ کام انجام دیا۔ اِس کی شہادت خود طرزِ بیان سے ملتی ہے چنانچہ ملاحظہ ہو حمد صفحہ چار تعلیمِ غوثیہ۔ اِس کا مقابلہ اُس مضمون سے کیا جائے جو صفحہ دو سے پانچ تک

تذکرۂ غوثیہ میں درج ہے۔ یہاں صرف طرزِ انشاء کا تقابل مقصود ہے۔ تعلیمِ غوثیہ میں جو اشعار صفحہ پانچ پر طبع ہوئے ہیں، یہ کلیاتِ اسمٰعیل کے طبع اول میں صفحہ تراسی ۸۳ و پچاسی ۸۵ پر طبع ہوئے ہیں۔ چنانچہ تعلیم غوثیہ کے صفحہ آٹھ و گیارہ پر جس نظم کی سُرخی "وصفِ پیرِ کامل" ہے۔ کلیاتِ اسمٰعیل میں صفحات پچاسی ۸۵ و نواسی ۸۹ پر "یادِ حضرت شیخ" کے نام سے طبع ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں نظمیں اور ایک غزل جو تعلیم غوثیہ کے صفحہ ۱۲ پر درج ہے۔ یہ سب نظمیں مولانا گُل حسن صاحب کی فرمایش سے تعلیم غوثیہ کے لئے لکھی تھیں۔

تعلیم غوثیہ کی عبارت صرف اوّل پچاس صفحہ تک مولانا نے دُرست کی تھی جیسا کہ اُس کے مسوّدہ سے پتہ چلتا ہے جو مولانا کے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے اور اُس سے مطبوعہ حصّہ مطابقت رکھتا ہے۔

سفینۂ اُردو ۱۹۱۰ء | یہ کتاب بھی مولانا کی تالیف سے ہے سرکاری نصابِ تعلیم میں مدارس انگریزی کے درجہ ہفتم و ہشتم کے واسطے مقرر تھی۔ اِس کی تالیف کا زمانہ کمکِ اُردو اور ادیبِ اُردو کے بعد کا ہے۔ غالباً ۱۹۱۰ء میں تالیف ہوئی ہے یہ کتاب بھی اُردو انتخابات کا بہترین نمونہ ہے۔ چنانچہ اِس میں پہلی مرتبہ سیّد سجاد حیدر یلدرم کا کلام انتخاب کیا گیا ہے۔ سفینہ اُردو میں جن نئے مصنّفوں کے کلام پر مولانا نے اپنی مُہرِ انتخاب ثبت فرمائی ہے اُن کے نام حسب ذیل ہیں:۔

مولوی محمد محمود سیفی فرزند اکبر جناب مولانا۔

مولانا سیّد وحید الدین سلیم پانی پتی۔

مولانا سجّاد میرزا بیگ دہلوی۔

مولانا عبد الحق صاحب بی۔ اے۔

مولانا راشد الخیری دہلوی۔

میرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی۔

مسٹر عنایت اللہ بی۔ اے دہلوی۔

مولانا ظفر علی خاں بی۔ اے۔

مولانا ظفر علی خاں کا کلام منظوم اسی زمانہ میں انتخاب کیا گیا ہے مثلاً "ایک رشی کے بیٹے کی کہانی" اور "طوفانِ حیدر آباد دکن"۔ "یادِ احباب" از میرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی جن نئے شاعروں کا کلام مولانا کو پسند آتا اُسے اپنی بیاض میں نقل کرالیا کرتے تھے جس کا مفصّل تذکرہ کسی اور مقام پر آئے گا۔

قصیدۂ نوید مقدم شاہی ۵ جنوری ۱۹۱۱ء

نوروز ۱۹۱۱ء کو یہ تار برقی اعلان اخباروں میں چھپا کہ اسی سال کے آخیر میں ملکِ معظم قیصر ہند جارج پنجم بہ نفسِ نفیس ہندوستان تشریف لاکر دربارِ تاج پوشی منعقد فرمائیں گے۔ اِس خبر سے مطّلع ہوکر مولانا نے ایک قصیدہ اپنی طبیعت کے رُجحان سے ۵ جنوری ۱۹۱۱ء کو مرتّب فرمایا۔ اِس کی نسبت ایک شاعر نے جس کا مرتبۂ اُستادی، غزل گوئی میں مسلّم ہے۔ یہ فرمایا کہ مولانا کے شہنشاہیت پسند خیالات کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اِس قصیدہ کو رودکی کے قصیدہ سے بڑھا دیا ہے۔ سخن شناس حضرات اور زبان اُردو کے آئندہ محقّقین اس قصیدہ کو اور اس کے ساتھ کے دوسرے قصیدہ کو جو ۱۲ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کو لکھا گیا تھا، پڑھ کر یہ تسلیم کریں گے کہ مولانا قصیدہ کی صنف میں ایک نئے انداز کے مؤجد ہیں۔ پہلا طرز تو سودا اور ذوق کا ہے یہ فارسی کے مشہور قصیدوں کا انداز ہے۔ اس کے بعد میرزا اسد اللہ خاں غالب نے ایک جُدا طرز کی بنا ڈالی ہے ملاحظہ ہوں اُن کے دو قصیدوں کے مطلع :۔

مطلع

ہاں مہِ نو سُنیں ہم اُس کا نام　　　جس کو تو جُھک کے کر رہا ہے سلام

مطلع

صُبح دم دروازۂ خاور کھُلا　　　مہرِ عالمتاب کا منظر کھُلا

مولانا کا انداز اپنے اُستاد کے طرز سے بھی نرالا ہے۔ جس میں پُرانی وضع کی مدح سرائی کا نام و نشان نہیں۔ البتہ نظامِ سلطنت سے جو عُمدہ نتائج مُرتّب ہوئے ہیں اور ایسے ادارے قایم کیے گئے ہیں جو مخلوق کے واسطے نفع رس ثابت ہو رہے ہیں اُن کا ذکر ہے۔ یا سائنس کو عملی جامہ پہنانے سے جو نئی اختراعات و مصنوعات پیدا ہوئی ہیں اور عامۃ الناس کے حق میں مُفید ہیں اُن کا۔ جہاں ایک طرف تبدیلِ مضمون نے یہ صورت اختیار کی ہے وہاں فنِّ شاعری کے لحاظ سے بھی سلاست اور سادگی کو اُلجھی ہوئی اور مغلق ترکیبوں پر ترجیح دی ہے۔ مولانا کے ہم عصروں میں سوائے امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ کے اور کسی کا قصیدہ جس میں پوری شانِ قصیدیت نمایاں ہو نہیں مانا گیا۔ مثلاً نواب میرزا داغ جہاں اُستاد بادشاہِ غزل تسلیم کیے گئے ہیں۔ گو اُنھوں نے قصیدے لکھے اور بہت لکھے مگر سب پھیکے۔ مولانا نے کوئی قصیدہ اس حیثیت سے نہیں لکھا کہ کسی رئیس کے دربار سے وہ متعلق ہوں اور اُس کی ثنا و صفت ہر سال یا خاص خاص مواقع پر اُن کے فرائض میں داخل ہو۔ جتنے مدحیّہ قصیدے مولانا نے تصنیف فرمائے ہیں وہ سب دوستوں کی فرمایش سے بجز قصیدۂ مذکور کے۔ ایک قصیدہ مولانا نے شیخ یعقوب علی صاحب کی فرمایش پر ۱۸۶۹ء میں لکھا تھا۔ اُس کا مطلع ہے ؎

قیدِ سخت اور خانۂ بے در نکلوں کیوں کر جہان سے باہر[۱]

یہ قصیدہ پرانے انداز میں ہے جو ذوقؔ اور سوداؔ کے قصائد کی روش ہے۔
اسی طرح دوسرا قصیدہ صفحہ ۱۶۱ پر کلیاتِ اسمٰعیل کے پہلے اڈیشن میں طبع ہوا تھا
اُس کا مطلع ہے ؎

دکھاؤں شاہدِ مضموں کی چینِ پیشانی کہ ہووے چشمۂ آئینہ غرقِ حیرانی[۲]

تیسرا قصیدہ (صفحہ ۱۶۲ - کلیاتِ اسمٰعیل پہلا اڈیشن) یہ ان دونوں کے مقابلہ میں
شوکتِ الفاظ اور چستی تراکیب کے لحاظ سے زوردار ہے۔ اس کا مطلع ہے ؎

رنگِ فریب سادگی دل میں ہے نہاں افزایشِ یقیں نہیں بے کاہشِ گماں[۳]

اُس وقت مولانا کی عمر پچیس[۲۵] یا چھبیس[۲۶] سال کی تھی۔ کلام کی روانی اور پختگی بتاتی ہے کہ مولانا کس ذوق کے ساتھ فنِ سخن کی تکمیل میں مصروف تھے۔ یہ زورِ کلام اس عمر میں حاصل ہونا خاص کر ایسی صورت میں کہ مولانا کو اپنے بے بدل اُستاد یعنی میرزا اسداللہ خاں غالبؔ سے بہت کم مشورۂ سخن کا موقع ملا۔ اُن کی زورِ طبع اور پروازِ تخیل کا ثبوت دیتا ہے۔

اِس کے بعد دو قصیدے اور ہیں ایک "جریدۂ عبرت"[۴] مصنفہ یکم نومبر ۱۸۸۵ء۔ اِس کے طرز میں جو سادگی اور روانی ہے، اس کا باعث یقیناً قصیدہ کا نفسِ مضمون ہے۔ لیکن دوسرا قصیدہ جو تہنیتِ جشنِ جوبلی پر لکھا گیا ہے اور جس کی تصنیف کا سن ۱۸۸۷ء ہے۔ اِس کا مطلع ہے ؎

---

[۱] مصنفہ ۱۸۶۹ء۔ [۲] مصنفہ ۱۸۶۹ء مقام سہارن پور، وہیں کے کسی صاحب کی فرمایش پر لکھا تھا۔ [۳] مصنفہ ۱۸۷۰ء بفرمایش جناب منشی نجم الدین صاحب ڈپٹی انسپکٹر مدارس میرٹھ جو آپ کے پیر بھائی بھی تھے اور عزیز ترین دوست اور مشربِ تصوّف میں ہم رنگ و ہم خیال۔

جان نے تن میں کیا حکم سے جس کے اجلاس ہے خُداوندِ حقیقی کو سزا وار سپاس

اِس قصیدہ سے طرزِ نو کی بِنا پڑتی ہے۔

قصیدۂ تاج پوشی، ۲۷ر اکتوبر ۱۹۱۱ء | ملکِ معظم قیصرِ ہند جارج پنجم آنجہانی کی تاج پوشی ۱۱ر دسمبر ۱۹۱۱ء کو دہلی میں ہوئی۔ ستمبر یا اکتوبر ۱۹۱۱ء میں مسٹر جے آر پیرسن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ میرٹھ نے بذریعہ مراسلہ مولانا سے خواہش ظاہر فرمائی کہ وہ ایک قصیدہ دربارِ تاج پوشی کے متعلّق تصنیف فرما دیں۔ مولانا نے بربنائے خرابیِ صحت معذرت پیش کی لیکن مسٹر پیرسن کے مزید اصرار پر قصیدہ لکھا اور اُنھیں کی معرفت سرجان ہیوٹ کی خدمت میں ارسال فرمایا۔ یہ قصیدہ ۲۷ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کو مکمّل کر کے بھیج دیا گیا تھا۔ بادشاہی میلہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۱۱ء کو دہلی میں قایم ہوا۔ سُنا گیا تھا کہ ایک دربارِ خاص منعقد ہوگا اور اُس میں شہنشاہِ ہند کے روبرو شعراءِ ہند اپنے قصائد سُنائیں گے۔ بعد میں یہ رائے تبدیل ہوئی اور یہ قصیدے ایک جلسہ میں پڑھے گئے جس کی صدارت منجانب مَلکِ معظّم قیصرِ ہند، لفٹننٹ گورنر پنجاب نے فرمائی۔ مولانا کو اس جلسہ کی دعوت دی گئی تھی لیکن علالتِ طبع کے باعث مولانا شرکت سے معذور رہے۔ اگر شہنشاہِ ہند ۱۲ر دسمبر کے دربار میں ان قصائد کو بہ نفس نفیس سُنتے تو شاید مولانا حاضری کی تکلیف گوارا فرما لیتے۔ ججنگ کمیٹی نے اس قصیدہ کو نمبر تین۳ قرار دیا تھا۔ اس جلسہ کی کوئی روُداد دیکھنے میں نہیں آئی نہ کبھی وہ قصائد نظر سے گذرے جو نمبر ایک۱ و نمبر دو۲ قرار دئے گئے! اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ وہ کن بزرگوں کی تصنیف سے تھے جس کمیٹی نے ان قصائد کی جانچ کی وہ بھی پردۂ اِخفا میں رہی۔

بہر حال اِس قصیدہ کے صلہ میں مولانا کو ایک "سرٹیفکٹ آف آنر" مورخہ دہلی

۱۸ر دسمبر ۱۹۱۱ء جس میں بہ حیثیت پریزیڈنٹ ڈین صاحب کے دستخط ہیں عطا ہوا۔ (غالباً یہ صاحب اُس وقت لفٹنٹ گورنر تھے) اور ایک چاندی کا تمغہ بھی مرحمت ہوا تھا۔ شاہانِ مشرق کے درباری روایات کی تقلید اور خلعت و خطابات کی بجائے مغربی انداز کے "سرٹیفکٹ" اور "تمغے" ایسی انوکھی بات تھی جو غالباً مشرقی شعراء کے لئے تسکین قلب کا موجب نہ ثابت ہوئی ہو۔ اِس قصیدہ کو نوجوانانِ مُلک اُس ذہنی انقلاب کے باعث جو آزادیٔ مُلک کے خیال نے پیدا کر دی ہے شاید توجہ سے نہ پڑھیں۔ لیکن ادبی جواہر ریزے اہلِ سخن سے ضرور خراج تحسین وصول کریں گے۔ سیاسی کشمکش کو نظر انداز کرتے ہوئے خالص ادبی نقطۂ نظر سے قصیدہ "نویدِ مقدم شاہی" اور قصیدہ "دربارِ تاج پوشی" اپنے انداز میں بالکل نرالے پائے جائیں گے اور اس صنفِ سخن میں ایک جدید طرز کے نمونے۔

قصیدہ خدائی لشکر
مرتّبہ الہ آباد ۱۹۱۱ء

مولانا ایک کمیٹی کے ممبر تھے۔ اِس کے صدر پنڈت راما شنکر مصرا پنشنر کلکٹر تھے۔ اراکین میں مولانا اور پنڈت منوہر ناتھ زتشی تھے۔ اِس کمیٹی کا کام تھا کہ جو مضامین اُردو، ہندی ریڈروں کے لئے مختلف مصنّفین کے پاس سے آئیں، اُس کی عبارت اگر غلط ہو تو دُرست کر دیں۔ چنانچہ اس کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے واسطے مارچ یا اپریل ۱۹۱۱ء میں مولانا الہ آباد تشریف لے گئے اور ظہور احمد صاحب بیرسٹر کی کوٹھی نمبر ۱۸ اڈمانسٹن روڈ میں قیام فرمایا۔ نواب عبدالمجید صاحب سی۔ آئی۔ ای رئیس جون پور و الہ آباد نے مولانا کے اعزاز میں ایک ایوننگ پارٹی مسلم ریڈنگ روم کے مکان میں مرتّب فرمائی کہ الہ آباد والوں سے مولانا کا تعارف کرایا جائے۔ اُس زمانہ میں ایک صاحب

عبدالودود نامی میور سنٹرل کالج الٰہ آباد میں ایل ایل بی کلاس کے متعلّم تھے۔ یہ صاحب سر علی امام مرحوم کے کچھ عزیز ہوتے تھے۔ اُنھیں کسی طرح یہ علم ہوا کہ مولانا، ظہور احمد صاحب کے یہاں مقیم ہیں۔ چنانچہ اُن سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ یہ وہی دن ہے جس کی شام کو پارٹی ہونے والی ہے۔ مولانا سے مُصر ہوئے کہ آپ کچھ پند و نصائح مُسلم طلباء الٰہ آباد کو بھی فرمائیں۔ اور یہ اڈریس نظم میں ہو تاکہ اِس موقع کی یادگار رہے۔ ساڑھے پانچ بجے جلسہ ہونے والا تھا اور یہ حضرت ایک بجے تشریف لائے جب کہ مولانا آرام فرما رہے تھے۔ پھر اُن سے ملاقات ہوئی اور دیر تک اِس بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ غرض اُن کے بے حد اصرار پر مولانا نے وعدہ فرما لیا۔ چنانچہ اُن کے جانے کے بعد مولانا نے ایک قصیدہ لکھا جس میں پینتالیس شعر ہیں اور اُس میں مُسلم طلباء الٰہ آباد یونیورسٹی کو مخاطب کیا ہے۔ یونیورسٹی کے طلباء کثیر تعداد میں شریک تھے۔ بلحاظ سلاست زبان اور رفعتِ خیال یہ قصیدہ مولانا کے بہترین کلام میں شمار ہوگا۔ الفاظ کی نشست بندشوں کی چُستی۔ تخیّل کی پرواز۔ مختصر یہ کہ اِس قصیدہ نے ایک نیا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ قصیدہ کلّیات اسمٰعیل میں ملاحظہ فرمایا جائے۔

کلیات اسمٰعیل پہلا اڈیشن ۱۹۱۱ء جامعِ سوانح نے کلّیاتِ اسمٰعیل ۱۹۱۱ء میں جب کہ مولانا حیات تھے مرتّب کیا تھا اور اُسی سال وہ طبع ہو کر شایع ہو گیا تھا۔ اس کی ترتیب بہ لحاظ اصنافِ سخن کی گئی تھی۔ دورانِ طباعت میں چند تازہ نظمیں لکھی گئیں تھیں۔ اُس وقت یہ خیال دامن گیر ہوا کہ اُن کو بھی کلّیات میں شامل کر لیا جائے۔ ایسا کرنے سے بے ترتیبی پیدا ہو گئی۔ اُردو نظموں کے اختتام پر فارسی نظمیں ترتیب دی گئیں تھیں۔ اُن کے آخیر میں ضمیمہ لگانا پڑا۔ ترتیبِ کلّیات کے وقت جن نظموں کی

تاریخِ تصنیف معلوم ہوسکی وہ اُن کے نیچے "فٹ نوٹ" میں دے دی گئی تھی۔ اب کی بار اِس تحقیق میں زیادہ کاوش کی گئی ہے۔ مسوّدوں کی زیادہ غور سے چھان بین کی گئی، اور بعض قدیم نظموں کی تاریخیں اب کی بار دستیاب ہوئی ہیں۔ اِس کاوش سے یہ مقصود ہے کہ شاعر کے کلام کا تدریجی ارتقاء شائقینِ علم ادب کو مرورِ زمانہ کے لحاظ سے ذہن نشین ہوسکے۔ کچھ حصّہ قدیم نظموں کا اُس وقت نہیں ملا تھا جو اب مل گیا ہے۔ اُسے بھی جدید اڈیشن میں شامل کیا گیا ہے۔

پہلے اڈیشن کی اشاعت پر اُردو جرائد نے بہت جوش کے ساتھ مولانا کے کلّیات کا خیر مقدم کیا تھا۔ عالمانہ تنقیدوں سے اہلِ ذوق کے لئے بہت کچھ لٹریری سامان مہیّا کیا گیا تھا۔ آرٹسٹ یعنی شاعر اور کرٹیک یعنی نکتہ چیں ایک دوسرے کے واسطے جزو لاینفک ہیں۔ ایک اپنے خیالات کی مصوّری کرتا ہے دوسرا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں کیسی کیسی خوبیاں اور کیا کیا نقائص ہیں۔

اُردو ریڈریں برائے گورنمنٹ ۱۹۱۲ء سنہ ۱۹۱۱ء میں گورنمنٹ یو۔پی نے ایک کمیٹی بنائی تھی جس میں پنڈت راما شنکر مصرا رٹائرڈ کلکٹر و رئیس بنارس صدر اور مولانا اور پنڈت منوہر ناتھ زتشی ارکان تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ایک سیٹ اُردو ریڈروں کا گورنمنٹ کے لئے سادہ زبان میں تیّار کرایا جائے اور ان کتابوں کا کاپی رائٹ گورنمنٹ کے حق میں محفوظ رہے۔ مصنّفین کو گورنمنٹ نے حق المحنت ادا کر دیا تھا۔

یہ سیٹ اِس طرح تیّار ہوا کہ مصنّفین کو مضامین بتا دئے جاتے تھے وہ اُن شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے جن کے تحت میں یہ درکار تھے۔ اِس کمیٹی کے پاس مضامین ارسال کرتے تھے۔ پھر کمیٹی حسبِ ضرورت زبان کو درست کرتی تھی۔ اِس سلسلہ میں مولانا نے

مولانا راشد الخیری کا نام پیش کیا تھا چنانچہ اُنھوں نے بھی کچھ مضامین ان ریڈروں کے واسطے لکھے تھے۔ یاد نہیں آتا کہ یہ ریڈریں کس سال میں رائج ہوئیں۔ مولانا کی لائبریری میں ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۹ء کے اڈیشن موجود ہیں۔ لیکن قیاس چاہتا ہے کہ یہ کتابیں ۱۹۱۲ء میں رائج ہوگئی تھیں۔ گورنمنٹ نے یہ کتابیں اِس خیال سے تیار کرائی تھیں کہ پبلشرز کے ذریعہ سے جو ریڈریں ۱۹۰۷ء میں آئیں اور منظور ہوئیں ان کی زبان بے محاورہ تھی یہ ایسا داغِ بدنامی تھا کہ اس کے مٹانے کے لئے گورنمنٹ نے جلد یہ سلسلۂ کتب خود تیار کرایا۔ چونکہ یہ سلسلہ ایسی زبان میں لکھا گیا تھا جس میں کم سے کم الفاظ فارسی اور عربی زبانوں کے آئیں۔ ادھر اُردو مڈل اور انگریزی مدارس کی اونچی جماعتوں میں ادبی کتابیں لازمی طور پر پڑھائی جاتی تھیں۔ اِس کمی کو پورا کرنے کے واسطے ان ریڈروں کے ساتھ ایک ادبی کتاب بھی لگائی گئی۔ مختصر یہ ہے کہ ان ریڈروں کے مصنّفوں میں تو بہت سے حضرات تھے۔ مگر مولانا نے اُن کی عبارت حسبِ ضرورت دُرست کردی تھی اس طرح کہ حشو و زوائد اور محاورات کی غلطیاں نہ رہ جائیں۔

قواعدِ اُردو حصّہ اوّل و دوم مولفہ ۱۹۱۳ء مولانا کو ۱۹۱۲ء میں ان رسالوں کی ترمیم کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن جب لکھنے بیٹھے تو بجائے ترمیم کے ایک جدید کتاب مُرتّب فرمادی۔ چنانچہ اس نئی تالیف کے دو حصّے ۱۹۱۳ء میں مکمّل ہوگئے اور اکتوبر ۱۹۱۳ء میں نول کشور پریس لکھنؤ سے طبع ہوئے حصّہ دوم کے دیباچہ میں اُردو زبان کے قواعد کی تدوین کے اُصولوں پر مولانا نے بحث کی ہے، ایک خط کے ذریعہ ممتاز اہلِ زبان اور اہلِ قلم سے جدید اصطلاحات کے متعلّق مولانا نے مشاورت فرمائی تھی مگر جیسا کہ خود دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں "غالباً یہ فن ہی ایسا غیر دلچسپ اور بے حظ ہے کہ دماغ کو مصروفیت کا کوئی فوری

صلہ عطا نہیں کرتا"۔ اِس لئے اکثر حضرات اِس صحرائے لق و دق کی سیر سے محروم رہتے ہیں۔ بہرنوع یہ دونوں حصے "ٹیکسٹ بک کمیٹی یوپی" میں پیش ہوئے اور اُس کے ممبروں کے نزدیک ناقابلِ انتخاب قرار دئے گئے۔ نامنظوری کا سبب یہ بتایا گیا کہ اُن میں کلمات کی پُرانی تقسیم یعنی اسم۔ فعل۔ حرف۔ ترک کردی گئی ہے۔ اور نئی اصطلاحیں اختراع کی گئی ہیں۔ ایسی قدر افزائی کے بارے میں اور کیا کہا جاسکتا ہے "کہ بریں عقل و دانش بباید گریست"۔ اُمید تو یہ تھی کہ اِس محققانہ تالیف کو قدر کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔ لیکن ٹکسٹ بک کمیٹی کے مُشیرانِ قدامت پسند نے اِس محنت اور کاوش پر پانی پھیر دیا۔ مولانا کو اِس ناقدردانی سے بہت ملال ہوا۔

قاعدہ اُردو ۱۹۱۳ء علامہ ڈاکٹر[1] عبدالحق کے اصرار پر ۱۹۱۳ء میں مولانا نے ایک قاعدۂ زبان اُردو میں لکھا تھا اِس کام کے متعلق آگرہ میں ایک کانفرنس اہلِ علم اور اہلِ قلم کی منعقد ہوئی تھی۔ یہ انعقاد کانفرنس مولانا عبدالحق مدظلہ العالی کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ تھا۔ یہ جلسہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلہ میں کیا گیا تھا۔ مولانا بہ سبب علالت طبع خود شریک اجلاس نہ ہو سکے تھے۔ مولانا کا قاعدہ اہلِ شوریٰ کے نزدیک گو عمدہ قرار دیا گیا۔ لیکن کسی اور صاحب کا تالیف کردہ قاعدہ کمیٹی نے انتخاب فرمایا۔

سوادِ اُردو ۱۹۱۴ء ۱۹۱۴ء میں سررشتۂ تعلیم یوپی نے مولانا سے خواہش کی تھی کہ ایک کتاب ایسی تالیف فرمائیں جو علمِ ادب کی راہ نُما ہو سکے تاکہ جو لڑکے ہندوستانی زبان کی تیسری اور چوتھی کتابیں پڑھ رہے ہیں وہ ادبِ اُردو کے ابتدائی منازل سے روشناس

---

[1] دسمبر ۱۹۳۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی کی گولڈن جوبلی کے موقع پر علامہ عبدالحق کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی آنریری ڈگری عطا ہوئی جس کے وہ صحیح معنوں میں مستحق تھے۔

ہوسکیں۔ جیسا کہ کسی اور جگہ ذکر آچکا ہے یہ نئی کتابیں جنھیں ناحق اُردو زبان کی کتاب کہا جاتا ہے۔ ایسی عبارت میں لکھی جاتی ہیں جس کے پڑھنے سے بچّوں میں کوئی لیاقت پیدا نہیں ہوتی اور یہ نقصان مزید برآں ہے کہ متروک الاستعمال الفاظ۔ قواعد اُردو اور محاورہ کی غلطیاں اور قلّت لغات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مدرسہ چھوڑنے کے بعد طالب علم کسی دوسرے ذریعہ سے استفادہ کرنا تو درکنار خط لکھنے اور پڑھنے سے بھی قاصر رہتا ہے۔ یہ کتاب سوادِ اُردو ۱۹۱۴ء سے غالباً ۱۹۳۰ء تک جاری رہی۔ اسی زمانہ میں رطب و یابس میں کچھ امتیاز باقی نہ رہا اور زرِ خالص پر مسِ ناقص کو ترجیح دی جانے لگی ہے۔

سوادِ اُردو میں چند مضامین یعنی بے غرض کی دوستی، غرض کی دوستی، محمود اور ایاز، نثر میں۔ اور نظم میں ناقدردانی، عجیب چڑیا، قابلِ مطالعہ ہیں۔

قواعدِ اُردو حصّہ سوم و چہارم ۱۹۱۴ء مولانا استقلال کے ساتھ ۱۹۱۴ء میں اِس قواعد کے حصّہ سوم کی تدوین میں مصروف تھے۔ اُس زمانہ میں مشہور شعراء کا کلام زیرِ مطالعہ تھا اور اشعار میں ایسے الفاظ پر نشان بناتے جاتے تھے۔ جس سے ظاہر ہو جائے کہ یہ لفظ کس کلمہ کے طور پر شاعر نے استعمال کیا ہے۔ بابِ صرف میں کلمۂ فعل پر جب پہنچے ہیں تو اُس کو اِس قدر وسعت ہوئی کہ بعض صرفی دشواریوں کے حل کی غرض سے بابِ نحو کی تالیف پر متوجہ ہونا پڑا۔ اُس زمانہ میں جناب نواب اسحاق خاں صاحب رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر جو اِن دنوں مدرستہ العلوم علی گڈھ کے سکرٹری تھے مولانا سے ملاقات کے واسطے تشریف لائے۔ بہ اصرار خواہشمند ہوئے کہ مولانا کوئی کام کلیاتِ خسروؒ کے متعلق ضرور اپنے ذمّہ لیں۔ ادبی دُنیا میں یہ ایک یادگار چیز ہوگی چنانچہ حیاتِ خسروؒ کی تصنیف اور قران السّعدین کی تنقید یہ دو کام مولانا نے اپنے ذمّہ لئے۔

اِس عظیم الشّان ادبی مصروفیت کے سامنے قواعدِ اُردو کے مصادر کی گردان بند کرنی پڑی۔
قواعدِ اُردو کی تالیف مولانا کے پچاس سالہ بلکہ اس سے بھی زیادہ زمانہ کی عالمانہ تحقیق کا نتیجہ تھی۔ بہر نوع قواعدِ اُردو کی تالیف ہو یا حضرت امیرؒ کی حیات کی تصنیف دونوں کام زبان و ادب اُردو سے تعلّق رکھتے تھے۔ مولانا کی عُمر کے آخر تین سال ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۷ء تک اِس ادبی خدمت میں صَرف ہوئے۔ یہ شغل مولانا کے لئے نہایت مسرّت بخش ثابت ہوا۔

مثنوی قران السّعدین ۱۹۱۴ء کے آخر یا ۱۹۱۵ء کے شروع میں مولانا نے اس مثنوی پر تنقید لکھنے کی ذمّہ داری قبول فرمائی۔ شمس العلماء، نواب عماد الملک مولوی سیّد حسین صاحب بلگرامی سی۔ ایس۔ آئی مرحوم و مغفور کی تحریک پر یہ قرار پایا تھا کہ حضرت امیر خسروؒ کا کُل کلام جمع کیا جائے۔ اوّل تو ہر تصنیف کی کامل تصحیح کی جائے۔ اِس کے بعد اُس کی مکمّل تاریخ اُردو زبان میں لکھی جائے اور اخیر میں اس پر تنقید ہو۔ شعرائے ہند میں حضرت امیر خسروؒ کا عُلوئے مرتبہ دیکھتے ہوئے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کُل دنیائے اسلام کے شعراء میں جو امتیاز و عظمت اُن کو حاصل ہے اِس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایسے شاعر کے کلام کو مُستقبل کی بے پروائیوں سے محفوظ رکھنا ازبس ضروری تھا۔ اِس لئے یہ قرار پایا کہ اس زمانہ کے اہلِ کمال سے کامل توجّہ کے ساتھ اُن کے کلام کو جمع کرایا جائے۔

اِس کام کے لئے خاص خاص حضرات انتخاب کئے گئے جو زبانِ فارسی پر مکمّل عبور اور سخن فہمی میں درجۂ کمال رکھتے تھے۔ اُن دِنوں مولانا بڑے انہماک کے ساتھ قواعدِ اُردو کی تدوین میں مصروف تھے۔ لیکن حضرت امیر خسروؒ کے کلام کی ترتیب ایک زبردست قومی اور ادبی کام سمجھ کر مولانا نے اپنا کام چھوڑا اور حضرت امیرؒ کی تصانیف کو سنبھالا چنانچہ ایک سال سے زیادہ وقت مولانا کا اِس کام میں صَرف ہوا۔ مولانا کی یہ

ادبی خدمت بربنائے ذوقِ ادب انجام پائی نہ کہ حرص زر کی خاطر۔ اِس بات کا اشارہ مولانا نے اُس مثنوی میں کیا ہے۔ جو قران السّعدین کی بحر میں اپنی تنقید کے اختتام پر لکھی ہے اور پہلے اڈیشن کے صفحہ ایک سو چھیاسٹھ ۱۶۶ پر اُس میں یہ شعر آیا ہے ؎

تاختہ ام ہرزہ براہِ دراز　　　براثرِ حکم نہ از روئے آز

اِسی بات کا اظہار مسٹر حسن برنی نے قران السّعدین کی تمہید لکھتے ہوئے صفحہ چار پر اِن الفاظ میں کیا ہے "سلسلۂ خسروی میں انھوں (مولانا) نے اپنا تمام قیمتی وقت بغیر کسی قسم کے معاوضہ قبول کئے صَرف کیا۔ اور جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دُنیا میں بہت کم لوگ ایسا استغنا دِکھا سکتے ہیں۔ تو مولانا کا ایثار خاص طور پر ہمارے دل میں اُن کی وقعت پیدا کر دیتا ہے۔" ایک بار ۱۷-۱۶ ۱۹۱۷ء میں جناب نواب عماد الملک بہادر مرحوم میرٹھ بھی تشریف لائے تھے۔ اور نواب محمد اسحاق خاں صاحب مرحوم کے یہاں مہمان ہوئے تھے۔ مولانا بہ سبب کسلِ طبع ملاقات کے لئے تشریف نہ لے جاسکے۔ اِس مثنوی کے مسوّدات صاف لکھنے کے واسطے ایک صاحب دہلی کے رہنے والے مسٹر حسن چشتی جن کو زبان فارسی سے کافی واقفیت تھی، مامور کئے گئے تھے۔ اُن کی تنخواہ دفتر علی گڈھ سے ملتی تھی۔ مولانا کے مسوّدات جو مثنوی قران السّعدین کی تنقید پر لکھے گئے ہیں، خود مولانا کے قلم کے اور صاف کئے ہوئے بارہ ۱۲ جلدوں میں جمع کئے گئے ہیں۔ اگرچہ مثنوی ۱۹۱۸ء میں طبع ہو چکی ہے لیکن جو جگر کاوی مولانا نے کی ہے اِس کا کچھ اندازہ ان مسوّدوں کو دیکھ کر صاحبِ ذوقِ سلیم ہی کر سکتے ہیں۔

مثنوی مع تنقیدِ مولانا ۱۹۱۸ء میں بعد وفات مولانا مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڈھ کالج میں طبع ہوئی ہے۔ اِس موقع پر مولانا کی وہ مثنوی جو "قران السّعدین" کی بحر میں

بطورِ خاتمۂ مقدّمہ لکھی گئی ہے درج کی جاتی ہے:۔

خاتمہ

تنقید مثنوی قران السّعدین از خاکسار مقدّمہ نگار[1]

مثنویٔ چند جز این مثنوی ۔۔۔ ہست نگارِ قلمِ خسروی[1]
خرّم و خنداں چو گلِ بوستاں ۔۔۔ تحفۂ نغز ست پئے دوستاں
ہاں! اگر ایں نامہ کہ دانش نام ۔۔۔ یافت ازاں جملہ فراتر مقام
چشمِ ہنر بیں شدہ حیرانِ او ۔۔۔ ریختہ نیرنگ زِ الوانِ او
دیدۂ بینندہ گہر دیدنش ۔۔۔ سیر نگر دیدہ زگُل چیدنش
ہر چہ فزوں دید۔ فزوں شد ہوس ۔۔۔ کرد ثنا ہا خرَدِ نکتہ رس
بیتِ قصیدہ چو مغے در کنشت ۔۔۔ ہر غزلے ہم چو غزالِ بہشت
موج زناں نظم چو آبِ رواں ۔۔۔ از نفسِ طوطیٔ عذبُ البیاں
دادِ نوا سنجیٔ آں نغز گو ۔۔۔ تا بدہد۔ بلبلِ شیراز کو؟
طوطیٔ ہند ار بنوا آمدے ۔۔۔ بُلبُل از ایران بہ ثنا آمدے
من کہ ندانم روشِ پارسی ۔۔۔ بے خبرِ ہندیم ار وا رسی
من ز کجا۔ نقدِ سخن از کجا؟ ۔۔۔ کاسہ تہی و عمل از کیمیا!
گر زِ کجی ساز خطا می زنم ۔۔۔ بانگِ کرم زن کہ کجا می زنم
ور قلم افتادہ دریں بابِ است ۔۔۔ راستیش حضرتِ نوّاب[2] راست

[1] مولٰنا محمد اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ۔
[2] نوّاب محمد اسحاق خاں مرحوم۔

خانِ فضائل حشم اسحاق[1] خاں — آئینہ حسرتیِ[2] نکتہ داں
پُر حذرم از سرِ سودا و سود — دامِ دلم خاطرِ والاشں بود
تاختہ ام ہرزہ براہِ دراز — بر اثرِ حُکم - نہ از روئے آز
نوبتِ پیری و منم طفلِ راہ — عاجزم و عاجزیم عذر خواہ
خوشں مثلے گفتہ و دُر سفتہ اند — "پیری و صد عیب چنیں گُفتہ اند"
نیز سپاسے بجنابِ بشیر[3] — خُلقِ وے آمیختہ شکّر بہ شیر
یاوریِ او کہ بسے کار کرد — از کتبِ خاستہ انبار کرد
خامہ زنِ من کہ حسن چشتی[4] ست — رہروِ آبیم و خطش کشتی ست
ہر ورقے نقشِ نو انگیختن — لعل و دُر از نوکِ قلم ریختن
کز لکِ او بر رُخِ کاغذ رواں — لیک نہ بینی ز ستردن نشاں
عارضِ کاغذ کہ سمن زار بود — گشتہ کنوں سُرخ و سیاہ و کبود
لاجرم آں کاغذِ زار و حزیں — شُد ہمہ تن پیرہنِ کاغذیں
از خمِ شاں خامہ کہ دُزدی کش ست — یادِ بزرگاں بہ ز رو دسے خوش ست
شعرِ تو اے خسروِ شیریں بیاں! — زندۂ جاوید - تو ہم زندہ ماں
خضرِ توئی و سخن آبِ حیات — نوشں تو بادا سخن از عینِ ذات
شعرِ تو پروردۂ درد ست و سوز — شعلۂ او سر نگشتہ ہنوز

---

[1] حاجی نواب محمد اسحاق خاں صاحب رئیس جہاں گیر آباد و بلند شہر و آنریری سکرٹری ایم - اے او کالج علی گڈھ ۱۲-
[2] حاجی نواب محمد مصطفےٰ خاں صاحب خلد مکاں المتخلص بہ شیفتہ و حسرتی رئیس جہاں گیر آباد و دہلی - ۱۲
[3] شیخ بشیر الدین صاحب رئیس لال کورتی و آنریری مجسٹریٹ میرٹھ - ۱۲
[4] ایس ایم حسن چشتی اندر کوٹ مشائخان میرٹھ سٹی - ۱۲

گرچہ گزشتہ است ازشش صد فزوں | لیک نہ کم شد تفِ سوز دروں
تادمِ گرمِ تو فغاں برکشید | آتشِ سوزندہ زباں درکشید

شاد بماں خسروؔ جنّت نشیں
باد بجانِ توزحق آفریں

حیات حضرت امیر خسروؔ ۱۹۱۶ء | مثنوی قران السّعدین پر جن دنوں مولانا تنقید تحریر فرمایا کرتے تھے انہماک کی کوئی حد نہ تھی۔ رفتہ رفتہ جب یہ کام انجام کو پہنچا تو حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ کی سوانح عمری کے واسطے معلومات کا بہم پہنچانا اور ضروری اقتباسات کا مختلف کُتبِ متعلّقہ سے نقل کرانا بس اِس شغل میں تمام تر وقت صرف ہونے لگا۔ لیکن چونکہ قواعد اُردو کی ترتیب سے مولانا بہت ہی شغف رکھتے تھے۔ اور اس فن سے انھیں ذوق خاص اور واقفیت تام تھی۔ ایک بار جون ۱۹۱۷ء میں جبکہ Lumbago کی سخت تکلیف لاحق ہوئی اور ایک ہفتہ تک صاحبِ فراش رہنے کے بعد مولانا کی طبیعت روبہ صحت ہوئی تو راقمِ سوانح پر کمال اظہار ناراضی فرمایا اور ارشاد کیا کہ تم نے یہ مضمون ہم سے پورے طور پر نہ سمجھ لیا کہ خود لکھ لیتے۔ اُس وقت یہ گمان بھی نہ ہوا۔ کہ اب وقت رخصت قریب آیا ہے اور اِس بنا پر یہ کلمات زبان پر آئے ہیں۔ چنانچہ باقی وقت ہمہ تن حضرت امیر خسروؔ کی سوانح عمری کی ترتیب و تیاری میں صرف ہوتا رہا۔ حضرت امیر خسروؔ کے قریب قریب نصف زمانۂ حیات کے سوانح مرتّب ہو چکے تھے کہ مولانا نے یکم نومبر ۱۹۱۷ء بروز پنجشنبہ داعئ اجل کو لبّیک کہا۔ گو مولانا کی وفات کو بیس سال کا زمانہ گذر چکا ہے۔ لیکن مسوّداتِ حیاتِ خسروؔ اب تک ناتمام ہیں۔ علی گڈھ جیسے ادارۂ علمی سے اب تک اس کام کا پایۂ تکمیل کو نہ پہنچنا موجبِ حیرت ہے۔ دُنیائے ادب

حضرت امیر خسروؒ کے سوانح حیات سے اور جامع حیات خسروؒ کے اِس عظیم الشان کارنامہ سے اب تک ناآشنا ہے۔ زیادہ ملال اِس امر کا ہے کہ قوم میں اہل قلم کا ایسا فقدان ہے کہ حیات خسروؒ کی تکمیل کے لئے اب تک کوئی صاحب کمر بستہ نہ ہوئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک زندہ قوم کے شاعر شکسپیر کے سوانح اُس قوم کے سینکڑوں مصنّفوں اور محققوں نے مختلف پہلوؤں سے لکھے اور طبع کرائے ہیں۔ حضرت امیر خسروؒ اور شکسپیر کے کلام میں بعد مشرقین سہی۔ لیکن اِس میں کلام نہیں کہ شعراء ہند میں حضرت امیرؒ کا مرتبہ اِس قدر بلند ہے کہ اُن کے سوانح حیات کی تکمیل بھی ایک قومی فریضہ ہے۔

جنگل کی دوسری کتاب پر ایک نظر منشی عنایت اللہ صاحب علی گڈھ کالج کے گریجویٹ ہیں اور مولانا کے فرزند اکبر مولوی محمد محمود سیفی کے کلاس فیلو۔ زمانۂ طالب علمی میں باہم بہت ارتباط تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ بزرگوں کے مخلصانہ تعلقات ہوں۔ بہرحال رڈیارڈ کپلنگ کی جنگل بُک کا ترجمہ کارے دارد۔ عنایت اللہ صاحب نے جنگل کی پہلی کتاب کا ترجمہ کیا اور بہت خوب کیا۔ مولانا نے بعدِ طبع ملاحظہ فرمایا اور بہت پسند کیا۔ اُس کی دوسری کتاب کا مسوّدہ مولٰنا کی خدمت میں آیا اور اُس میں ضروری اصلاح مولانا نے فرمادی۔ اِس بات کا اعتراف منشی عنایت اللہ صاحب نے جنگل کی دوسری کتاب کے دیباچہ میں اِس طرح کیا ہے:۔

"پہلی کہانی میں محاورات وغیرہ کی کچھ غلطیاں انگریزی خواں ہونے کی بدولت رہ گئی تھیں، چنانچہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے جو مترجم کے حال پر غایت درجہ بزرگانہ لطف وکرم رکھتے ہیں، پہلی کہانی کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ اگر دوسری کہانی کا ترجمہ کرو تو مسوّدہ ہمارے پاس بھیج دینا۔ مترجم نے اِس حکم کی تعمیل کی اور اب اُس کو فخر ہے کہ اِس

کہانی کے مسوّدہ کو ایسے زبان داں نے درست کردیا ہے جس کی اُردو نظم و نثر سے اِس وقت تک مُلک کے لاکھوں نونہال اپنی مادری زبان سیکھ رہے ہیں۔ مولوی صاحب قبلہ کی اِس تکلیف کا مترجم ہمیشہ شکر گزار رہے گا۔

مولوی صاحب کے فرزند اکبر محمد محمود صاحب کا شکریہ لکھنا بھی مترجم کا پہلا فرض ہے کہ اُنھوں نے باوجود طرح طرح کی پریشانی اور کثرت کار کے مسوّدہ کے چھپوانے کا کُل انتظام اپنے ذمّہ لیا اور ہم مکتب ہونے کا پورا حق ادا کیا۔"

باب پانچواں

قیام آگرہ سنہ ۱۸۸۸ء سنہ ۱۸۹۹ء

وطن سے آگرہ کو تبادلہ

مولانا جولائی سنہ ۱۸۸۸ء میں آگرہ تشریف لے گئے۔ اور سنہ ۱۸۹۹ء تک وہاں رہے۔ یکم دسمبر سنہ ۱۸۹۹ء کو پنشن لے کر وطن مالوف میں واپس تشریف لے آئے اور بقیّہ عمر وطن میں گذاری۔

مولوی سراج الدین احمد اڈیٹر چودھویں صدی آثار سلف اشاعت سنہ ۱۸۹۰ء

مولانا جولائی سنہ ۱۸۸۸ء میں آگرہ تبدیل ہو کر گئے تھے۔ مئی سنہ ۱۸۸۹ء میں مولانا نے قلعۂ آگرہ کی کیفیت ایک مثمّن کی صورت میں نظم فرمائی تھی۔ بیانیہ نظموں میں غالباً یہ پہلی نظم تھی جو فصیح زبان میں لکھی گئی تھی۔ اوّلاً یہ نظم مسدّس کے طور پر لکھی تھی۔ شاید اس خیال سے کہ مسدس حالی شایع ہو چکا تھا بعد میں اس کو مثمن بنایا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا یہ نظم کب اور کس طرح شایع فرماتے۔ آیا بشکل کتاب یا آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے

ایک مثمن

شعر بہ کیفیت قلعہ اکبر آباد و خطاب بہ نوجوانان قوم

مئی سنہ ۱۸۸۹ء - محلہ غالب پورہ - نائی کی منڈی

شہر آگرہ

باقی ہے کہیں مشعل کشتہ کا دھواں ہے - یا گلشن برباد کی یہ فصل خزاں ہے

یا بزم عیش برہم کی فریاد و فغاں ہے - یا قافلہ رفتہ کا بس خیمہ رواں ہے

یاں دور گذشتہ کی بہت سے نشاں ہیں - بانی عمارت کا جلال اس سے عیاں ہے

اڑتا تھا یہاں پرچم جم جاہی اکبر

بجتا تھا یہاں کوس شہنشاہی اکبر

باہر سے نظر ڈالی اس قلعے پہ بلند - ہر پایہ ہے لب آب جمن صورت الوند

گویا یہ ہے اک سورما مضبوط تنومند - یا ہند کا رجپوت ہے یا گرد سمرقند

کیا بارہ سنگین کا پہنا ہے قزاگند - زینی کا قزاگند ہے باندھا ہے کمر بند

مسدود ہے خندق سے رہ فتنہ و آشوب

ارباب نمرد کی نئی برج میں سرکوب

آثار سلف مثمن - مولانا کی تحریر

مقابل صفحہ ۸۴

کہانی کے مسوّدہ کو ایسے زبان داں نے درست کر دیا ہے جس کی اُردو نظم و نثر سے اِس وقت تک مُلک کے لاکھوں نونہال اپنی مادری زبان سیکھ رہے ہیں۔ مولوی صاحب قبلہ کی اِس تکلیف کا مترجم ہمیشہ شکر گزار رہے گا۔

مولوی صاحب کے فرزند اکبر محمد محمود صاحب کا شکریہ لکھنا بھی مترجم کا پہلا فرض ہے کہ اُنھوں نے باوجود طرح طرح کی پریشانی اور کثرت کار کے مسوّدہ کے چھپوانے کا کُل انتظام اپنے ذمّہ لیا اور ہم مکتب ہونے کا پورا حق ادا کیا۔"

باب پانچواں

قیام آگرہ سنہ ۱۸۸۸ء سنہ ۱۸۹۹ء

وطن سے آگرہ کو تبادلہ

مولانا جولائی سنہ ۱۸۸۸ء میں آگرہ تشریف لے گئے۔ اور سنہ ۱۸۹۹ء تک وہاں رہے۔ یکم دسمبر سنہ ۱۸۹۹ء کو پنشن لے کر وطن مالوف میں واپس تشریف لے آئے اور بقیہ عمر وطن میں گذاری۔

مولوی سراج الدین احمد اڈیٹر چودہویں صدی آثار سلف اشاعت ۱۸۹۰ء

مولانا جولائی سنہ ۱۸۸۸ء میں آگرہ تبدیل ہو کر گئے تھے۔ مئی سنہ ۱۸۸۹ء میں مولانا نے قلعۂ آگرہ کی کیفیت ایک مثمّن کی صورت میں نظم فرمائی تھی۔ بیانیہ نظموں میں غالباً یہ پہلی نظم تھی جو فصیح زبان میں لکھی گئی تھی۔ اوّلاً یہ نظم مسدّس کے طور پر لکھی تھی۔ شاید اِس خیال سے کہ مسدس حالی شایع ہو چکا تھا بعد میں اس کو مثمن بنایا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا یہ نظم کب اور کس طرح شایع فرماتے۔ آیا بشکل کتاب یا آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے

ایک مثمن

شعر بہ کیفیت قلعہ اکبر آباد و خطاب بہ نوجوانان قوم

مئی ۱۸۸۹ء ۔ محلہ غالب پورہ ۔ نائی کی منڈی

شہر آگرہ

باقی ہے یہ کسی مشعل کشتہ کا دھواں ہے ۔ یا گلشن برباد کی یہ فصل خزاں ہے
یا برہمی بزم کی فریاد و فغاں ہے ۔ یا قافلہ رفتہ کا پس خیمہ رواں ہے
یاں دور گذشتہ کی بہاروں کا نشاں ہے ۔ بانی عمارت کا جلال اس سے عیاں ہے
اڑتا تھا یہاں پرچم جم جاہی اکبر
بجتا تھا یہاں کوس شہنشاہی اکبر

باہر سے نظر ڈالی اس قلعے پہ بلند ۔ ہر پایہ ہے لب آب جمن صورت الوند
گویا یہ ہے ایک پورا مضبوط تنومند ۔ یا بند کا رجوت ہے یا برج سمرقند
کیا بارہ سنگین کا پہنا ہے قزاگند ۔ زینے کا قد النگ ہے باندھا ہے کمربند
محدود ہے خندق سے رہ فتنہ و آشوب
ارباب تمرد کی نئی برج میں سرکوب

آثار سلف مثمن ۔ مولانا کی تحریر

مقابل صفحہ ۸۴

سالانہ اجلاس میں۔ بہر حال ایک روز مولوی سراج الدین احمد صاحب راولپنڈی پنجاب سے علی گڈھ ہوتے ہوئے آگرہ تشریف لائے اور مولانا سے ملاقات فرمائی۔ واللہ اعلم پہلے سے شناسائی تھی یا نہیں۔ اس ملاقات کے موقع پر مولانا کی نظموں کے سُننے کی فرمایش کی۔ یہ واقعہ غالباً ۱۸۸۹ء کا ہے۔ چونکہ یہ نظم بھی غیر مطبوعہ تھی اُن کے سامنے پیش کی گئی۔ مولوی سراج الدین احمد صاحب اِس مثمّن کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ اپنے ہفتہ وار اخبار میں اُسے شایع کرنے کی اجازت چاہی۔ مولانا نے اس بارے میں کچھ تکلّف فرمایا۔ لیکن مولوی صاحب کے اصرار سے مجبور ہو کر یہ مسوّدہ اُن کے نظر کر دیا۔ یہ نظم ہفت روزہ اخبار "چودھویں صدی" راول پنڈی میں غالباً اخیر ۱۸۸۹ء میں شایع ہوئی۔ اشاعت پر مولانا کی خدمت میں اطراف و جوانب ہند سے سینکڑوں خطوط موصول ہوئے۔ جن میں اس کلام کی داد دی گئی تھی۔ افسوس ہے وہ خطوط محفوظ نہ رہے کہ مشتے نمونہ از خروارے یہاں پیش کئے جاتے۔ حضرت شادؔ عظیم آبادی کا خط بھی اِسی سلسلہ میں موصول ہوا تھا۔ اُس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ مولانا دلّی کے لال قلعہ کو بھی یاد رکھئے گا۔ اِس نظم کی اشاعت کے بعد سے مولانا کا مرتبۂ اُستادی عام طور پر تسلیم کیا جانے لگا۔ آثارِ سلف یعنی مشعر کیفیت قلعہ اکبر آباد کو پنجاب کے پبلشرز نے بطور خود کئی بار طبع کیا اور میرٹھ میں بھی اِس کے کئی اڈیشن طبع ہوئے تھے۔ ایک پُرانا اڈیشن ۱۸۹۶ء کا مولانا کی لائبریری سے دستیاب ہُوا ہے یہ نظم کلّیاتِ اسمٰعیل میں موجود ہے۔

سر سیّد احمد خاں ۱۸۹۷ء ابتدائے ۱۸۹۷ء میں مولانا نے کچھ روپیہ کالج فنڈ کے واسطے جناب سر سیّد احمد خاںؒ کی خدمت میں جامع سوانح کی معرفت پیش کیا تھا۔ سر سیّد مہتابی

کے سامنے والے کمرہ میں تشریف فرما تھے۔ مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی مرحوم اُن کے لٹریری سکرٹری بھی تشریف رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ہی جامع سوانح کو جو اُس وقت ایک نوعمر طالب علم تھا سرسیدؒ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ سرسیدؒ نے ارشاد فرمایا کہ مولانا کی خدمت میں ہمارا اسلام پہنچانا اور پھر دریافت فرمایا کہ "آج کل تمہارے باوا کیا لکھ رہے ہیں؟ کیا اسلم کی بلّی ابھی زندہ ہے"؟ مولانا خاموشی سے مدرستہ العلوم کی مالی امداد کیا کرتے تھے۔ سرسیّد۔ سیّد محمود اور احبابِ سرسیّد کا بہت احترام اور وقار کرتے تھے۔ یہ امر اُس قطعہ سے جو سرسیّد کی مدح میں لکھا ہے اور اُس مضمون سے جو سیّد محمود کے سکرٹری منتخب ہونے کے متعلق لکھا تھا، خوب واضح ہوتا ہے۔

مولوی عزیز الحسن ایم۔ اے ۱۸۹۸ء | عزیز الحسن صاحب بھرتپور کے رہنے والے تھے۔ آگرہ کالج میں بی۔ اے کلاس کے طالب علم تھے۔ بعد میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوئے۔ اب پنشن لے چکے ہیں۔ زمانۂ طالب علمی سے شعر گوئی کا شوق تھا اور نواب میرزا داغ فصیح الملک جہاں اُستاد کے تلامذہ میں سے تھے۔ ایک دن مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی ایک غزل اصلاح کے لئے پیش کی۔ مولانا نے فرمایا کہ اس معاملہ میں اپنے اُستاد سے مشورہ کیجیے۔ عزیز الحسن صاحب نے اصرار کیا کہ میں تبرکاً آپ سے اصلاح چاہتا ہوں۔ مولانا نے مطلع سُنکر فرمایا کہ اِس میں دوبارہ فکر کیجیے۔ اِس پر اُنھوں نے اصرار کیا کہ مولانا آپ ہی دُرست فرمادیں۔ وہ مطلع یاد نہیں رہا مگر مولانا نے جو مطلع خود کہہ دیا تھا وہ یہ ہے۔

زُعمِ باطل میں نہ کافر ہوں نہ دیندار ہوں میں
آسرا تیرے کرم کا ہے گنہگار ہوں میں

معلوم نہیں کہ مولوی عزیز الحسن صاحب کا دیوان مرتب ہوا یا نہیں۔ غزل گوئی سے ذوقِ وافر رکھتے تھے۔

چھوٹا غالب پورہ محلہ نائی کی منڈی میں سکونت ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۹ء تک | مولانا جب آگرہ تشریف لے گئے اور جب تک وطن کو مراجعت فرمائی محلہ چھوٹا غالب پورہ میں ہی قیام فرمایا۔ اس محلہ میں ایک صاحب ڈاکٹر عبدالقادر صاحب مرحوم پنشنر رہا کرتے تھے۔ جب اُن کے بڑے صاحب زادے عبدالخالق صاحب کی شادی ہوئی تو برات میں مولانا بھی شریک ہوئے برات پُہنچنے کے تھوڑی دیر بعد سازندوں نے ساز ملانا شروع کیا۔ نمازِ مغرب میں ذرا ہی دیر تھی۔ چھوٹے غالب پورہ میں حکیم نجف علی خاں صاحب مرحوم پُرانی وضع کے بزرگ تھے معزز اور کامیاب طبیب تھے۔ مولانا اُٹھ کھڑے ہوئے تو حکیم صاحب نے ازراہِ مزاح دریافت فرمایا کہ مولانا کہاں، مولانا نے جواب میں ارشاد فرمایا "ذرا وضو کر آؤں"۔ اِس کے بعد حاضرین میں سے کسی نے مولانا سے قیام کے لئے اصرار نہیں فرمایا۔

مولانا کی اہلیہ کا انتقال آگرہ میں یکم دسمبر ۱۸۹۹ء کو | مولانا یکم دسمبر ۱۸۹۹ء کو پنشن لے کر بارِ ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ آپ کی اہلیہ عرصہ سے مرضِ سرطان میں مبتلا تھیں تقریباً تین سال بیمار رہ کر یکم دسمبر ۱۸۹۹ء مطابق ۲۷ رجب المرجب ۱۳۱۶ھ جمعہ کا دن تھا کہ اِس دارِ فانی سے رحلت فرمائی۔ آپ کا مدفن پنچ کوئیوں کے قبرستان میں ہے۔ اِس موقع پر مولانا نے ایک درد انگیز قطعہ فارسی زبان میں لکھا تھا۔ زبانی یاد نہ رہا۔ اور کسی بیاض میں اِس کی نقل نہ ملی۔ چند روز بعد مولانا نے وطن کو مُراجعت فرمائی۔ جہاں تک علم ہے پھر کبھی آگرہ تشریف نہیں لے گئے۔

مشاعرۂ حیدر آباد دکن جب نواب میرزا خاں داغؔ دہلوی حیدر آباد دکن پُہنچ گئے اور کچھ عرصہ بعد جناب مولانا امیر احمد امیرؔ مینائی رحؒ بھی۔ تو اربابِ سخن نے ایک مشاعرہ مرتّب کیا جس میں اِن دونوں حضرات کو خصوصیت کے ساتھ دعوت دی گئی تھی۔ مصرعِ طرح تو یاد نہیں رہا اور

اِس کا علم بھی نہیں کہ اس مشاعرہ کی غزلیں کسی رسالہ میں یکجا طبع ہوئی ہوں لیکن اِس مشاعرہ کے لئے مولانا نے بھی غزل لکھی تھی۔ مولانا مقطع تو لکھتے نہ تھے کیونکہ تخلّص نہیں فرماتے تھے۔ اس غزل کے آخر دو شعر یہ ہیں ؎

جاتا ہے خاکِ پاکِ دکن کو یہ ریختہ　　واں قدرداں اِس گہرِ بے بہا کے ہیں

احباب کا کرم ہے اگر نکتہ چیں نہ ہوں　　ورنہ ہم آپ معترف اپنی خطا کے ہیں

یہ غزل مولانا کی معرکتہ الآرا غزلوں میں سے ہے۔ مولانا کا رنگ معاملہ بندی نہیں ہے، اُن کی غزل کے غالب عناصر تصوّف اور پند و حکمت ہیں۔ چنانچہ اِسی غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں ؎

اِتنا تو جانتے ہیں کہ بندے خدا کے ہیں
آگے جو اس سے گم خردِ نارسا کے ہیں

ڈپٹی انسپکٹری پر تقرر قیامِ آگرہ میں مولانا کا نظامِ اوقات یہ تھا کہ دن درس گاہ میں صرف ہوتا تھا اور بقیہ وقت کُتب بینی اور تصنیف میں۔ پروفیسران سینٹ جانس اور آگرہ کالج ان کی شاعری کے بہت مدّاح تھے۔ اِسی طرح انسپکٹر مدارس اور دیگر اعلیٰ افسرانِ سرشتہ تعلیم بھی۔ لیکن مولانا کبھی اپنی جانب سے ترقیٔ مدارج کے لئے کوشاں نہیں ہوتے تھے۔ البتہ ایک روز خود مدرسہ سے واپسی پر یہ ارشاد فرمایا کہ آج معلوم نہیں کس طرح یہ حکم موصول ہوا ہے کہ ضلع بجنور کی ڈپٹی انسپکٹری مل سکتی ہے اگر ہم وہاں جانا منظور کریں۔ ہم نے تو انکار لکھ دیا اِس عُہدہ پر اکثر سفر میں رہنا پڑتا ہے اور یہ ہم کو پسند نہیں۔

مولانا رحیم اللہ صبا مولانا رحیم اللہ صبا اکبر آباد کے ایک مشہور و معروف ادیب تھے۔ ادبِ عربی کے اُستادِ کامل تھے۔ ان کے سامنے مولانا کی شاعری کا تذکرہ آیا۔ بہت اصرار فرمایا کہ ہم

اُن کے کلام کے بہت مشتاق ہیں۔ چنانچہ جو نظمیں کُتب درسیہ میں طبع ہوئیں تھیں وہ ایک صاحب نے پیش کیں۔ اصرار کیا کہ مولانا کا اور بھی کلام ہوگا وہ بھی ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مولانا کی ایک بیاض تھی وہ حضرت رحیم اللہ صاحب مرحوم کی خدمت میں بھیج دی گئی۔ جابجا حاشیوں پر کلمات تعریف تحریر فرمائے تھے۔ اِن بزرگ کے انتقال پر مولانا نے ایک قطعۂ تعزیت تحریر فرمایا تھا وہ کلّیات اسمٰعیل میں طبع ہوا ہے۔

اشاعتِ کُتبِ درسیہ جب سے سلسلۂ کتب اُردو جو کہ اب اسمٰعیل ریڈرس کے نام سے مشہور ہے جاری ہوا اور جب تک مولانا کا قیام آگرہ میں رہا۔ اشاعت کا اہتمام مولانا خود فرماتے تھے طباعت کا انتظام مطبع اکبری آگرہ میں ہوتا تھا لیکن ۱۸۹۶ء میں ایک مطبع میرٹھ میں زیرِ اہتمام مولانا محمد محمود سیفی جاری کیا گیا تھا یہ زیادہ مدّت جاری نہیں رہا۔ گو مولانا کو اپنی تصانیف کی اشاعت سے بہت کثیر نفع حاصل ہوا لیکن اِس دولت سے اُن کے تمدّن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ فاخرہ لباس یا عیش و عشرت کے سامان کو مطلق پسند نہیں فرماتے تھے۔ باوجود دولت کے کبھی سواری کا رکھنا پسند نہیں فرمایا۔

جائیداد اپنے روپیہ سے بہت کافی جائداد خرید فرمائی۔ لیکن کُل جائداد اپنی حیات میں اولاد کے نام بذریعہ ہبہ نامہ منتقل فرمادی۔ اور حقوق تصنیف کُتب درسیہ اپنے فرزند اصغر کے نام رسائن یعنی منتقل فرمادئے۔

بعد پنشن مولانا اٹھّارہ سال حیات رہے اور کُل آمدنی کا حساب آپ کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن آپ صرف اُس قدر لیتے تھے جو خود خیرات کرنا منظور ہوتا۔ اور باقی روپیہ اپنے فرزند اصغر کے سُپرد فرمادیتے تھے۔

فرزند اصغر مولانا کے ارشاد کے بموجب فرزند اصغر نے تجارتی کام دہلی میں شروع

کیا تھا۔ ایم۔ اے او کالج علی گڑھ میں بی۔ اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے دہلی میں اسلم اینڈ کمپنی کے نام سے امپورٹ اور ایکس پورٹ کا کام شروع کیا جب اِس کو انگلستان اور یورپ کے سفر میں جانے کا اتّفاق ۱۹۰۴ء میں پیش آیا تو دہلی میں مولانا خود نگرانی کے واسطے تشریف رکھتے تھے۔

مولانا کے خطوط سے جو اُس زمانہ میں تحریر فرمائے ہیں یہ دِل چسپ واقعہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مولانا معاملات تجارت سے بہت گہری واقفیّت رکھتے تھے۔ چنانچہ اِس موقعہ پر ایک خط بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:۔

خط بنام فرزند اصغر

میرٹھ۔ ۱۹ر دسمبر ۱۹۰۴ء

عزیز من سلمہٗ۔ تمہارا خط جو میرے خط کے جواب میں تھا پرسوں شام کو ملا۔ کل بھی چلنے کا ارادہ رہا لیکن گھٹا بہت تھی آج پھر ارادہ کیا اور ۱۲ بجے کا پختہ قصد کر لیا تھا۔ قریب ۱۱ بجے کے قاضی فصیح الدین صاحب ایک بہلی میں سوار بازار کی سڑک پر ٹھہرے اور مجھے بُلایا۔ معلوم ہوا کہ رات دلّی سے آکر اب لاوڑ جا رہے ہیں۔ محمود بھی وصول لگان کے لئے اُن کے ساتھ چلا گیا۔ اِس لئے آج کا ارادہ بھی ملتوی کرنا پڑا۔ میں نے جس مقصد سے تم کو یہاں بُلایا تھا وہ یہیں ہو سکتا ہے میں دلّی آؤں گا تو صرف اُس کا ذکر تم سے کر سکتا ہوں۔ مگر وہاں اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اب یا دیر میں پھر بھی تم کو یہیں آنا پڑے گا۔

تم نے احسان کے لیجانے میں جلدی کی بُوا کو اُس کے چلے جانے کا بہت صدمہ ہے، ہیڈ ماسٹر نے بھی مجکو کہلا بھیجا تھا کہ آپ نے ناحق اُٹھایا میں تو اس کو وظیفہ کے واسطے تیار کر رہا تھا۔ اِس کے علاوہ اور بھی مصلحت ہے کہ وہ گھر پر رہے۔ اِس لئے اُس کو واپس بھیجدو تو بہتر ہے کیونکہ ابھی اسکول سے اُٹھے ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں زیادہ عرصہ ہو جائیگا تو پھر داخل ہونے میں سال بھر جاتا رہے گا۔ تم جو کام سکھانا چاہتے ہو وہ پھر بھی سیکھ سکتا ہے۔ دوکان پر بھی دوسرا لڑکا موجود ہے، احسان کے بغیر کوئی ہرج نہیں ہو سکتا۔

اب محمود لاوڑ سے واپس آجائے تو میں آؤنگا۔ آج تمہارا لفافہ محمود کے نام کا پہونچا میں نے کھولا تو انگریزی میں تھا وہی آکر پڑھے گا۔ صدر میں جن لوگوں کو تمہارے نمونے دکھائے تھے وہ کپڑے کا عرض پوچھتے ہیں خدا جانے تم نے اس خط میں بھی لکھا ہے یا نہیں۔

قاضی محتشم الدین دلّی آگئے ہیں رات بشیر الدین دلّی سے آئے وہ کہتے ہیں کہ اُنھوں نے کشمیری دروازہ مکان لیا ہے جہاں پیرزادہ صاحب جج بھی رہتے ہیں۔

(محمد اسمٰعیل)

چھٹا باب

واپسی وطن پر مشاغلِ علمی

مولانا کی فارسی انشاء پردازی ۱۹۰۲ء | مولانا کی فارسی نظمیں کلیاتِ اسمٰعیل میں شائع ہو چکی ہیں۔

فارسی نثر بھی مولانا کی تصنیف سے کافی مقدار میں موجود ہے۔ اِس کا زیادہ حصّہ اُن مضامین پر مشتمل ہے۔ جو اپنی فارسی ریڈروں کے واسطے تصنیف فرمائے تھے لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، فارسی زبان کی کساد بازاری بڑھتی گئی۔ اِس لئے اُن کتابوں کو آپ نے شایع نہیں فرمایا۔ بطور نمونہ اُن ریڈروں میں سے ایک مضمون اِس مقام پر نقل کیا جاتا ہے۔

راستی

آوردہ اند کہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (رحمۃ اللہ علیہ) در عنفوانِ شباب جہتِ تحصیلِ علوم عزیمتِ بغداد کرد۔ مادرِ مہربان چہل دینار زادِ سفر بداد و عہد گرفت کہ جز سخنِ راست بر زبان نیارد و با چشمِ پُر آب وداع فرمود۔ چوں از منزلِ ہمداں گذشتند رہزنان کاواں را زدند و دست بغارت کشادند۔ یکے از ایشاں رو بشیخ آورد و پرسید چہ داری۔ فرمود چہل دینار کہ مادرم زیر بغل دوختہ است۔ او باور نہ داشت و طرف دیگر برفت۔ بعد از ساعتے کہ رہزناں جمع آمدند تا غارت را بہم قسمت کنند حالِ شیخ با سالارِ خود باز گفتند او بخواند و تفحّص کرد و ہماں چہل دینار برآمد۔ پرسید چرا از ما پنہاں نداشتی۔ فرمودند شرم دارم از نقصِ عہد کہ با مادرِ مہربان کردہ ام کہ ہیچ گاہ زباں را بدروغ نیالایم۔ امیرِ دزداں را باستماعِ ایں سخن حال متغیّر شد۔ گفت اے جوان تو کہ ہنگامِ مخافت عہدِ مادر را نقص نہ کنی ما چرا بیرونِ آفت پیمانِ خداوندی را بشکنیم و تا کے در طغیان و عصیان بزنیم پس امیر و اتباعش

ہمہ ہا بردستِ شیخ توبہ و انابت کردند و ہماندم رخت و متاعِ کاروانیاں یک یک را باز دادند
و بحل خواستند و بزمرۂ صلحاء درپیوستند ؎

چو تیغ راستی داری توانی لشکرے کشتن ولیکن تیغِ فولادی نہ ہر جائے بکار آید

(اسمٰعیل)

مدرسہ بنات المسلمین کا قیام ۱۹۰۹ء مولانا پنشن لے کر وطن تشریف لے آئے تھے۔ جب سے
فرزند اصغر نے دہلی میں سکونت اختیار کی اور وہاں پہلے چھاپہ خانہ قایم کیا اور ازآں بعد ایک
تجارتی کمپنی، تو مولانا بھی اکثر دہلی میں قیام فرمانے لگے۔ لیکن ۱۹۰۷ء سے مستقلاً میرٹھ میں
قیام اختیار کیا۔ چنانچہ اُس وقت سے مولانا نے میرٹھ کے پبلک اداروں میں عملی دلچسپیوں
کا بھی اظہار کیا۔ اس زمانہ میں شہری تعلیم کا انتظام بھی ڈسٹرکٹ بورڈ میرٹھ کے سپرد تھا۔
سرکاری نصاب کے تحت میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کا کچھ انتظام نہ تھا۔ مولانا کی دُور بیں
نگاہوں نے اِس کمی کو محسوس کیا۔ چنانچہ ۱۹۰۹ء میں مدرسہ بنات المسلمین کی بناء
ڈالی۔ مدرسہ کا مکان مولانا کے مسکونہ مکان سے متصل تھا۔ اِس طرح نگرانی بہ آسانی اور
بخوبی ہو سکتی تھی۔ شرفاء کی یہ کیفیت تھی کہ اپنی لڑکیوں کو مدرسہ میں تعلیم کے لئے بھیجنا شان
شرافت کے خلاف سمجھتے تھے۔ مولانا نے اپنی پوتی اور دیگر اعزا کی لڑکیوں کو مدرسہ میں داخل
کرایا۔ ساکنانِ قرب و جوار نے بھی اِس مدرسہ سے فائدہ اُٹھانا شروع کیا۔ ۱۹۱۶ء میں
جب میونسپل بورڈ نے شہری رقبہ کے مدارس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو مالی امداد کی
ذمہ داریاں میونسپل بورڈ نے پوری کیں۔ مدرسہ میں اُس سال چھٹی جماعت لوور مڈل
کی قایم ہوئی تھی۔ یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو مولانا نے اِس دار فانی سے دار البقاء کی طرف
رحلت فرمائی۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں پہلی مرتبہ اِس مدرسہ کی طرف سے آٹھ لڑکیاں ورنیکلر لوور مڈل امتحان میں شریک ہوئیں۔ اِن میں سے تین اوّل درجہ میں کامیاب ہوئیں اور تین دوسرے میں۔ سنہ ۱۹۱۶ء سے سنہ ۱۹۲۶ء تک یہ مدرسہ میونسپل بورڈ کے زیرِ اہتمام رہا۔ مولانا کے فرزندِ اصغر انتظامی نگرانی کے لئے منجانب کمیٹی تعلیم منیجر مقرر ہوئے۔ اِس عرصہ میں برابر تحریک ہوتی رہی کہ یہ ایک قومی مدرسہ بنجائے جس میں مسلمان لڑکیاں ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کرسکیں۔ بڑی جدّوجہد کے بعد سنہ ۱۹۲۶ء میں یہ قرار پایا کہ میونسپل بورڈ میرٹھ مولانا کی تعلیمی خدمات کے اعتراف میں ایک ہزار نوسو بیس روپئے سالانہ بطور گرانٹ اِن ایڈ یعنی مالی امداد دیا کرے۔ لیکن اس شرط پر کہ ایک رجسٹری شدہ انجمن اس ادارہ کے انتظامات اور بقیہ مالیات کی ذمّہ دار بنجائے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۵ء میں ایک انجمن محمد اسمٰعیل گرلز اسکول ایسوسی ایشن کے نام سے بموجب ایکٹ نمبر ۲۱ سنہ ۱۸۶۰ء رجسٹر کرادی گئی۔ گورنمنٹ نے ازراہ کرم تین ہزار روپئے سالانہ کی مالی امداد منظور فرمائی۔ اُس وقت سے یہ مدرسہ محمد اسمٰعیل گرلز اسکول کے نام سے موسوم ہے۔ اب اس میں آٹھویں جماعت تک تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن کارکنانِ مدرسہ اِس فکر میں ہیں کہ اِس ادارہ کو ہائی اسکول تک پہنچایا جائے اور انشاءاللہ تعالیٰ ایسا ہوگا بھی۔

مدرسہ بنات المسلمین کا تذکرہ نامکمّل رہے گا جب تک اہلیہ محمد اسلم سیفی کی خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے۔ سنہ ۱۹۰۹ء کے روزِ اوّل سے جب کہ یہ مدرسہ قایم ہوا، اِس وقت تک کہ اٹھائیس ۲۸ سال ہوچکے ہیں، اِن کے انہماک اور خلوص میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اِن کے لئے دو خاص سبب محرّک ہیں۔ ایک یہ کہ محمد اسمٰعیل گرلز اسکول مسلمان بچیوں کی درس گاہ ہے اور شروع ہی سے اِس کا اندرونی انتظام اور نگرانی اِن کے

سُپرد ہے۔ دوسرا یہ کہ مولانا کے مقدّس ہاتھوں نے اِس مدرسہ کی بُنیاد قایم کی ہے۔ مولانا نے اپنی حیات ہی میں اُستانیوں کے کام کی دیکھ بھال، لڑکیوں کی ماؤں سے مُلاقات، اشیاءِ تعلیمی کی بابت معلومات کا بہم پہنچانا اور پھر اُن کا مُہیّا کرنا۔ غرض مدرسہ کا کُل اندرونی انتظام اِن کے ذمّہ کر دیا تھا۔ مولانا اِن کے علمی شغف کے متعلق اظہارِ اطمینان فرمایا کرتے تھے۔

مولانا کی وفات کے دس سال بعد تک یہ مدرسہ میونسپل بورڈ کے زیرِ اہتمام رہا۔ اِس دوران میں بھی اس مدرسہ کی نگرانی اہلیہ اسلم سیفی کے سپرد رہی اور جب سے یہ مدرسہ قومی درس گاہ ہوا ہے اُس وقت سے یہ جائنٹ سکرٹری ہیں۔ تعلیم نسواں کے متعلق ان کی یہ بے لوث اور خاموش خدمت ضرور قابلِ ستایش ہے۔

ٹیچرز کانفرنس منعقدہ علی گڈھ سنہ ۱۹۱۰ء یہ کانفرنس علی گڈھ میں منعقد ہوئی تھی۔ سر عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لاء اِس کے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے تھے جو بعد میں ہائی کورٹ پنجاب کے جج ہوئے اور آج کل وزیر ہند کی کونسل کے ممبر ہیں۔ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم اُس کے سکرٹری تھے۔ مولانا کو بھی دعوت دی گئی تھی اور وہ تجربہ کار ٹیچر کی حیثیت سے اس میں شریک ہوئے تھے۔ اس موقع پر ایک قطعہ مولانا نے تصنیف فرمایا تھا۔ اُن کے دلی جذبات کی صحیح تصویر اس قطعہ میں نظر آتی ہے۔ قوم کے حق میں یہ نصائح جس درجہ سود مند ہیں خود اہل قوم اس کے معترف ہیں۔ مولانا اِس کے بعد اُردو کانفرنس کی صدارت کے واسطے منتخب ہوئے تھے لیکن علالت طبع کے باعث شرکت نہ فرما سکے۔

مولانا حالی کا میرٹھ تشریف لانا سنہ ۱۹۱۰ء میں سنہ ۱۹۱۰ء میں خواجہ غلام الثقلین بی اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ مرحوم جو خواجہ حالی کے نواسے تھے میرٹھ میں وکالت کرتے تھے۔ مولانا کو

اُن سے بہت اُنس تھا۔ اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ اُس زمانہ میں خواجہ الطاف حسین حالی میرٹھ تشریف لائے ہوئے تھے اور خواجہ غلام الثقلین صاحب کے یہاں مقیم تھے۔ جامع سوانح خواجہ حالی کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا۔ اتفاق سے وہ اُس وقت تنہا تشریف فرما تھے۔ مولانا کی غزلیں سُنانے کی اجازت چاہی۔ بعد عطائے اجازت بہت دیر تک یہ شغل جاری رہا۔ قدیم طرز کی غزلوں کو بہت پسند فرمایا اور اکثر اشعار پر داد دی۔ مولانا نے ایک غزل آگرہ میں مرتب فرمائی تھی۔ زمین پُرانی ہے۔ اِس میں سوداؔ اور غالبؔ کی غزلیں بھی ہیں۔

سوداؔ کا مطلع

گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

غالبؔ کا مقطع

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

مولانا کا مطلع

جہاں تیغِ ہمّت علَم دیکھتے ہیں محالات کا سر قلم دیکھتے ہیں

اِس غزل میں جب یہ شعر سُنایا:۔

بس اے رنگ و بُو تو نہ کر نازِ بے جا خُدا جانے کیا بات ہم دیکھتے ہیں

خواجہ حالی رحمۃ اللہ علیہ نے بآوازِ بلند "خوب" اور "سُبحان اللہ" فرمایا۔ ارشاد فرمایا کہ پھر پڑھیئے۔ دوبارہ پڑھ کر جب اگلا شعر پھر شروع کیا تو فرمایا نہیں اُسی شعر کو پڑھیے۔ "بہت خوب شعر ہے"۔ غرض اس شعر کو بار بار سُننے کا ایما فرمایا۔ اپنے اُستاد میرزا غالبؔ کی زمین میں مولانا کی ایک غزل ہے۔ اس کا شعر ہے:

خوفِ ناکامی ہے جب تک کامیابی ہے محال   مشکلیں جب بڑھ گئی ہمّت سے آساں ہوگئیں

اِس غزل کا مطلع نہیں تھا۔ پہلا شعر تھا ؎

زُلف دیکھی اُس کی جن قوموں نے وہ کافر بنیں   رُخ نظر آیا جنہیں وہ سب مسلماں ہوگئیں

جب جامع سوانح نے اِجازتِ رُخصت چاہی تو ارشاد فرمایا۔ مولانا کا کلام نہایت پُختہ ہے وہ مسلّم الثبوت اُستاد ہیں۔ ہماری جانب سے کہئے گا کہ مولانا اِس غزل کا مطلع ضرور لکھ دیں۔ واپسی پر مولانا سے عرض کیا گیا۔ شب کے دس بجے کا وقت اور موسم سرما تھا۔ بستر پر آرام فرما رہے تھے۔ کئی صاحب مولانا کے نزدیک فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ارشاد فرمایا لکھو ؎

عارضِ روشن پہ جب زُلفیں پریشاں ہوگئیں   کُفر کی گُمراہیاں ہم رنگِ ایماں ہوگئیں

زُلف دیکھی اُس کی جن قوموں نے وہ کافر بنیں   رُخ نظر آیا جنہیں وہ سب مسلماں ہوگئیں

سخن فہم اِس برجستہ مطلع سے جو حمد باری تعالیٰ میں ہے جب کہ دوسرا شعر نعت میں تھا، ضرور لُطف اندوز ہوں گے۔

مسلم لیگ میرٹھ ۱۹۱۱ء مولانا کو ایسی ہر تحریک سے شغف تھا۔ جس سے قومی تنظیم اور اصلاح کا کام انجام پا سکے۔ خود بھی عملی حصّہ لیتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ نوجوان حضرات کی رہنمائی کر سکیں اور یہ دکھا دیں کہ قومی خدمت کی انجام دہی میں وہ نوجوانوں سے پیچھے نہیں ہیں مولانا مسلم لیگ میرٹھ کے وائس پریسیڈنٹ تھے۔

لسان العصر خان بہادر سید اکبر حسین الہ آبادی سے ملاقات ۱۹۱۱ء میں مولانا جب الہ آباد تشریف لے گئے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت اکبر الہ آبادی سے ملاقات نہ فرماتے۔ چنانچہ ایک روز بعدِ عصر لسان العصر کے دولت کدہ پر حاضر ہوئے۔ نہایت تپاک اور محبّت کے ساتھ

ملاقات ہوئی۔ سوانح نگار نے مولانا کی ایک غزل اور ایک رُباعی حضرت اکبر کو سنائی بہت داد دی خاص کر مطلع کی اور فرمایا کہ پہلے مصرعہ میں پورا شعر ہے۔ اُس غزل کا صرف مطلع یہاں درج کیا جاتا ہے، پوری غزل کلیات میں ملاحظہ فرمائی جائے۔

بزمِ ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں ہے یہ تیری ہی صدا غیر کی آواز نہیں

مولانا نے ایک رُباعی میں کلام اکبر پر اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے وہ رُباعی یہ ہے:۔

حقّا کہ بلند ہے مقامِ اکبر توقیعِ سخن ہے اب بنامِ اکبر
دیواں ہے لطائف و حِکم سے معمور اکبر کا کلام ہے کلامِ اکبر

کلّیات کے پہلے اڈیشن میں یہ رُباعی ۱۹۱۰ء کی مرتبہ لکھی گئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۱۱ء کی تصنیف ہے۔ مولانا نے حضرت اکبر کی ملاقات کے بعد یہ رُباعی لکھی ہے اور کلّیات بھی بعد سفر الہ آباد شائع ہوا ہے۔

سرٹیفکٹ آف آنر مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء دربارِ تاج پوشی کے موقع پر ایک سرٹیفکٹ جو بادشاہ جارج پنجم شہنشاہ ہندوستان کے نام سے عطا کیا گیا تھا۔ اُس کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:۔ "یہ سرٹیفکٹ اُن کے طویل مُفید کام کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو بہ حیثیت مدرس فارسی انجام دیا اور اُن خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو اُنھوں نے زبان اُردو کی ترویج میں کی ہیں بہ حیثیت اُردو نثّار اور شاعر کے اور جن کی نثر و نظم مُلک کے واسطے ایک نمونہ ہے بطور صلہ عطا کیا جاتا ہے۔"

مسٹر برسٹ انسپکٹر مدارس سرکل میرٹھ ۱۹۱۲ء یہ صاحب ۱۹۱۲ء میں میرٹھ سرکل کے انسپکٹر مدارس تھے۔ نہایت نیک اور پاک باطن بزرگ تھے۔ کچھ عرصہ کے لئے ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم بھی ہو گئے تھے مگر عارضی طور پر۔ مولانا کے علم و فضل کے بہت مداح تھے۔ ۱۹۲۱ء

یا ۱۹۲۲ء میں قبل از وقت پنشن لے لی۔

عطائے خطاب ۱۲؍جون ۱۹۱۲ء | انعقاد دربار سے اگلے سال یعنی ۱۹۱۲ء میں مولانا کو خطاب "خاں صاحب" منجانب سرکارِ ہند عطا ہوا۔ "ہر چہ از دوست می رسد نیکوست"۔ لیکن یہ خطاب مولانا کے تبحّر علمی سے کوئی مناسبت بھی نہیں رکھتا۔ کبھی کبھی گورنمنٹ کی جانب سے غیر موزوں خطابات عطا ہو جاتے ہیں۔ مولانا کا خطاب بھی اسی قبیل کی ایک بات معلوم ہوتی ہے۔ اکثر حضرات نے گورنمنٹ کی اس ناقدردانی کے متعلق اظہار تاسّف فرمایا تھا۔ بعض مخصوص حضرات اپنے مراسلات میں خطاب شمس العلماء سے مولانا کو مخاطب کیا کرتے تھے۔ مولانا اِن باتوں سے بالاتر تھے۔ اِس سلسلہ میں یہ امر ضرور قابلِ اظہار ہے کہ یوپی کے سررشتہ تعلیم نے مولانا کی ادبی خدمات کے بارے میں انتہائی بے نیازی کا برتاؤ کیا۔ مولانا کی ادبی خدمات نے اطرافِ ہند میں شمال سے جنوب اور شرق سے مغرب تک اُن کے نام کو روشن کر دیا۔ کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ یو۔پی کے سررشتہ تعلیم کو اس شہرت کا علم ہی نہ تھا۔ کاش اس مایۂ ناز ہستی کا سررشتہ تعلیم یو۔پی بھی قدرداں ہوتا جیسا کہ کل ملک تھا۔

انجمن ترقیٔ اُردو سے تعلق ۱۹۱۳ء | مولانا انجمن ترقیٔ اُردو کی مجلس شوریٰ کے رُکن تھے۔ اس انجمن کی علمی خدمات پر بہت اظہار اطمینان فرمایا کرتے تھے۔ اِس انجمن کی گذشتہ رودادوں کے دیکھنے سے مولانا کی رُکنیت کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا عبدالحق جو اس انجمن کی روح رواں ہیں اِن سے گاہے ماہے رسل و رسائل کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

منشی اسعد علی دہلوی ۱۹۱۴ء | یہ صاحب دہلی کے رہنے والے تھے۔ پولیس میں سب انسپکٹر تھے اُن دنوں کٹھور کے تھانہ میں تھانہ دار تھے۔ مولانا سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ زبان فارسی میں

اچھی دست گاہ رکھتے تھے۔ اکثر مولانا کی خدمت میں مشورۂ سخن کی غرض سے حاضر ہوا کرتے تھے۔

مولانا حالی کا مرثیہ ناتمام از مولانا ۱۹۱۴ء

مولانا۔ خواجہ حالیؒ کی شاعری کے بہت مداح تھے، اور جو اُس پر حرف گیر ہوتا اُس سے اظہار ناراضی فرماتے۔ خواجہ حالی کے وصال کے بعد ان کا مرثیہ لکھنا شروع کیا تھا۔ افسوس ہے پورا نہ ہوا۔ اِس کے چند اشعار ایک پرچہ پر مولانا کے قلم کے لکھے ہوئے ملے۔ تبرکاً و تیمناً اُسی طرح کلیات کے جدید اشاعت میں درج کیے جاتے ہیں اور یہاں بھی نقل کیے جاتے ہیں:۔

واقعہ ہے روح فرسا دل ہے سینہ میں تپاں — اشکِ حسرت مُدّتوں رُلوائے گی یہ داستاں
ایک غم ہوتا ہے شخصی ایک عالم گیر غم — ہے بجا گر ہوں سیہ پوش آج ابنائے جہاں
حضرتِ حالی کی رحلت تھی تو امر ناگزیر — سال بھر سے تھی دلوں میں یہ کھٹک سوہانِ جاں
جو سونگھا کر لخلخہ مُردوں کو لایا ہوش میں — کیوں نہ ہو اُس کا فراقِ دائمی سوہانِ جاں
بے حسی کا زنگ چھایا تھا کچھ ایسا بزم میں — ہزل کو سمجھے ہوئے تھے شعر کی غایت یہاں
مرحبا اے فکرِ خواجہ تیری جودت سے کئے — سرزمینِ شعر میں حکمت کے سرچشمے رواں

مزارِ شیخ پر آخری حاضری ۱۹۱۵ء

پنشن کے بعد جب مولانا وطن کو واپس آ رہے ہیں تو قریب قریب ہر سال حضرت قبلہ کے عرس کے موقع پر پانی پت حاضر ہوا کرتے تھے۔ پھر کئی سال تک جانا نہ ہو سکا۔ تو شروع یا اخیر ۱۹۱۵ء میں پانی پت حاضر ہوئے اور یہ آخری حاضری تھی۔ چنانچہ اسٹیشن سے سیدھے مزار مرشدنا و مولانا غوث علی شاہ قدس سرّہ العزیز پر حاضر ہوئے اور وہیں قیام فرمایا۔ اتّفاق سے سجادہ نشین صاحب تشریف فرما نہ تھے۔ اُس وقت مولانا سیّد شاہ گل حسن رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین تھے۔

شب کے وقت خدّامِ مزارِ شریف میں سے ایک شخص حجرے میں حاضر ہوا اور تعویذ کی درخواست کی۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی ہم اِس فن سے واقف نہیں ہیں۔ تم سجادہ صاحب سے عرض کرنا۔ وہ نہ مانا اور بولا آپ بھی تو حضرت کے خاص مریدوں میں سے ہیں۔ میں تو آپ ہی سے تعویذ لوں گا، سجادہ صاحب خبر نہیں کب تک تشریف لائیں۔ جب اُس کو بہت ہی مُصر پایا۔ مجبوراً چلتے وقت تعویذ لکھ دیا۔ میرٹھ پہنچنے کے دو مہینے بعد اُس کا خط آیا کہ خدا کے فضل سے اُس کا کام ہوگیا۔

مولانا زبردست خادم ملک تھے مولانا درد قومی سے سرشار تھے۔ آپ کا تمام تر علمی کارنامہ نثر ہو یا نظم۔ اِسی بات پر زور دیتا ہے کہ "علم سیکھو پڑھو لکھو بچو"۔ کسی طبقہ پر نکتہ چیں ہوئے ہیں تو اس کی غایت بھی اصلاحِ قوم تھی۔ حقیقت میں یہ بھی محبّت اور ہمدردی کا تقاضا تھا۔

جب روپیہ پاس نہ تھا تو قدمے، قلمے، اور سخنے، خیر خواہیٔ قوم میں مصروف رہے جب دولت آئی تو دامے و درمے کا اضافہ ہوگیا۔

مورلے منٹو ریفارم اسکیم ۱۹۱۰ء میں نئے نظام کے ماتحت پہلا الیکشن پیش آیا تھا۔ آگرہ اور میرٹھ دو قسمتوں سے ایک ممبر کا انتخاب ہونا تھا۔ بدقسمتی سے دو اُمیدوار میدان میں آئے۔ دونوں علی گڈھ کالج کے ممتاز اولڈ بوائے تھے۔ ایک خواجہ غلام الثقلین بی اے ایل ایل بی اڈوکیٹ۔ دوسرے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بیرسٹرایٹ لا۔ مولانا نے خواجہ صاحب کی اُمیدواری کی تائید کی۔ ان دونوں قسمتوں کے رؤسا کا میلان صاحبزادہ صاحب کی طرف تھا۔ خواجہ صاحب اصلاحات کے حامی اور مصنوعی تہذیب کے مخالف تھے۔ رؤسا کو اُن کا مخالف ہونا ہی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صاحبزادہ صاحب کو کامیابی ہوئی۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں صاحبزادہ صاحب انڈیا کونسل کے ممبر ہوکر

انگلستان تشریف لے گئے۔ اِس جگہ کے واسطے پھر الکشن ہوا۔ اب کی مرتبہ سیّد آلِ نبی صاحب رئیس آگرہ مدِّ مقابل بنے۔ خواجہ صاحب کامیاب ہوئے اور اپنے زمانہ ممبری میں ایک ممتاز مرتبہ اپنی جودت، ذہانت، ہمّت اور عملی کارناموں کی بدولت کونسل کے اراکین میں حاصل کیا۔ افسوس ہے ان کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ مُلک کے بہترین مُدبّروں میں سے ہوتے۔ مولانا کو اُن کے ساتھ خاص اُنس تھا۔ اِس کے دو سبب تھے اوّل یہ کہ خواجہ صاحب کا وطن پانی پت تھا۔ دوسرے خواجہ صاحب میں علم و فضل و سادگیٔ مزاج، دردِ قومی، عملی خدمت اور علمی ذوق تھا۔

لوکل الکشنوں میں دلچسپی مولانا جس اُصول کو پسند فرماتے اس پر عامل بھی ہوا کرتے۔ چنانچہ میونسپل بورڈ کے معاملات میں الکشن کی پارٹیوں سے تو وہ سروکار رکھتے نہ تھے لیکن جن اُمیدواروں کو پسند فرماتے اُن کی امداد کھُلّم کھُلّا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حکیم فخرالدین صاحب مرحوم اور لالہ نیادر سنگھ آنجہانی کی طرف داری میں بہت سرگرم رہا کرتے تھے اور اِن دونوں حضرات سے بہت مخلصانہ تعلّقات رکھتے تھے۔

خان بہادر منشی احفاظ الرحیم سے مراسلت خان بہادر منشی احفاظ الرحیم صاحب مولانا کے ہم وطن اور عزیز تھے۔ صوبۂ سی۔ پی میں مدّتوں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہے۔ نیک نامی اور عمدہ خدمات کے صلہ میں خطاب خان بہادری سے معزّز و ممتاز ہوئے۔ سنہ ۱۰-۱۱-۱۹۱۰ء میں ریاست بھوپال میں افسر بندوبست تھے۔ اُس زمانہ میں ہر ہائنس بیگم صاحبہ والیٔ ریاست بھوپال نے خان بہادر صاحب کی معرفت مولانا سے ایما فرمایا۔ کہ مولانا اُردو ریڈروں کا سلسلہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے تصنیف فرما دیں۔ نیز یہ کہ اس تصنیف کے صلہ میں بیگم صاحبہ پانچہزار روپیہ عطا فرمانے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن

ایک شرط یہ تھی کہ وہ سلسلہ ہر ہائنس کے نام نامی سے شائع ہوگا اور حق تصنیف بھی بیگم صاحبہ کو حاصل ہوگا۔ مولانا نے اِس شرط کو منظور نہیں فرمایا۔ اِس کے بعد خان بہادر صاحب کا خط آیا کہ آپ بھوپال تشریف لائیے حضرت سرکار عُلیہ اِس بارے میں خود گفتگو فرمانا چاہتی ہیں۔ اِس مراسلہ کے جواب میں مولانا نے حاضری سے معذوری ظاہر کی۔ اصل بات یہ تھی کہ بہ سبب ضعفِ جسمانی مولانا سیاحت پسند نہیں فرماتے تھے۔ بالآخر خان بہادر صاحب نے بہ ایمائے حضرت عُلیہ تحریر فرمایا کہ دلّی میں دربار ہونے والا ہے (جارج پنجم آنجہانی کا دربار دسمبر ۱۹۱۲ء میں ہونے والا تھا) سرکار وہاں تشریف لیجائیں گی۔ آپ دہلی آکر اُن سے ملاقات فرمالیں۔ اب موسم سرما آپہنچا تھا۔ مولانا کرانک برانکائٹس کے مریض تھے۔ اِن وجوہات سے مولانا دہلی بھی تشریف نہ لے جاسکے۔ اِس لئے لڑکیوں کے نصاب کے بارے میں ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال سے کوئی مشاورت نہ ہوسکی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا صوفی منش اور آزادہ رو تھے۔ رُوسا کی دربارداری سے پرہیز فرماتے تھے۔ چونکہ دُنیا کی ہوس نہ تھی اِس معاملہ پر زیادہ توجّہ نہ فرمائی۔

نئے شعراء کا کلام سنہ ۱۹۱۲ء سے سنہ ۱۹۱۴ء کے درمیان بعض نظمیں جو مولانا نے روزناموں اور ادبی رسالوں میں دیکھیں اور پسند فرمائیں اپنی بیاض میں نقل کرالیں۔ یہ انتخاب چونکہ ادبی دائرہ میں دلچسپی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ اِس لئے اختصاراً اُس کا ذکر کیا جاتا ہے سب سے پہلے ایک نظم ہے جس کا نام "پرندہ کی فریاد" ہے مصنّفہ سر محمدؒ اقبال۔ اس کے بعد "پھول کی فریاد" ہے مصنّف شوق۔ "سچے دوست" مصنّف سیّد فاروق "جلوۂ صبح" سیّد ابو الحسن ناطق۔ غزل، اُس کا مطلع یہ ہے اور سر محمد اقبال کی تصنیف سے ہے ؎

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا ۔۔۔ سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

"مامتا" از میرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی۔ "بلادِ اسلامیہ" اس پر کسی شاعر کا نام نہیں ہے لیکن یہ تصنیف سر محمد اقبال کی ہے۔ ملاحظہ ہو "بانگِ درا"۔ "یادِ احباب" از میرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی۔ "ہوشیار" یہ نظم اشاعت روزانہ ہمدرد مورخہ ۲ نومبر ۱۹۱۳ء سے لی گئی ہے۔ اس پر شاعر کا نام نہیں ہے۔ اِن کے علاوہ کچھ نظمیں اور ہیں جو پسند فرما کر مولانا نے نقل کرالیں مگر وہ اس بیاض میں نقل نہیں ہوئیں اور کچھ نظمیں جدید شعراء کی ایسی ہیں جو مولانا نے اپنے ادبی انتخابات مثلاً ادیب اردو، کمک اردو، سفینہ اردو، کے لئے منتخب فرمائی تھیں اور وہ اُن میں طبع ہو چکی ہیں۔

اصلاحِ مراسم مولانا اُن نامعقول مراسم کو جو شادی اور غمی کے موقعوں پر مروّج ہو گئی ہیں سخت ناپسند فرماتے تھے۔ اس امر میں ہمیشہ کوشاں رہے کہ کسی طرح قوم کو اُن کے ترک کرنے پر آمادہ کیا جائے لیکن یہ خرابی سوسائٹی میں اتنی گہری جڑ پکڑ چکی ہے کہ اُس کا اکھاڑنا آسان کام نہیں۔ نہ یہ کام دو چار سال کی کوششوں میں انجام پا سکتا ہے۔ بہر حال مولانا نے اپنے محدود دائرے میں اصلاح مراسم کی عملی طور پر کوشش کی مگر ناکام۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر آپ لوگوں کے یہاں جاتے اور اس امر کی ترغیب دیتے کہ وہ روپیہ فضولیات میں صرف نہ کریں بلکہ کارِ خیر میں دیں۔ چنانچہ بہت موقعوں پر روپیہ آپ نے لوکل کمیٹی کو دلایا تھا۔ یہ کمیٹی نادار طلباء کی مالی امداد کیا کرتی تھی۔

مولانا کا فی البدیہہ کلام ایسے مواقع پیش آئے کہ مولانا نے فی البدیہہ اشعار فرمائے۔ افسوس کہ اُن اشعار کو منضبط نہیں کیا گیا۔ ایک بار جامع سوانح کہ اُس زمانہ میں آگرہ کالج کی ایف اے کلاس کا طالب علم تھا۔ سر والٹر اسکاٹ کی لیڈی آف دی لیک، پڑھ رہا تھا۔ یہ کتاب اُس سال انگریزی نظم کے کورس میں داخل تھی۔ مولانا نے دریافت فرمایا

کہ یہ کس کا کلام ہے اور اُن اشعار کے سُننے کا ایما فرمایا۔ چنانچہ پہلا شعر سُنایا ؎

دی منسٹرل واز اِنفرم اینڈ اولڈ دی وے واز لانگ دی وِنڈ واز کولڈ

مولانا نے فوراً یہ شعر فرمایا ؎

مطرب کی کمزور نوا تھی راہ دراز اور سرد ہوا تھی

اِسی طرح اور اشعار کا ترجمہ بھی فرمایا مگر وہ محفوظ نہیں رہا۔

نبیرے کی وِلادت کی خوشی

مولانا کے فرزند اکبر مولوی محمد محمود سیفی کے صرف ایک دختر پیدا ہوئی۔ اس کے بعد کوئی اولاد نہ ہوئی۔ منجھلے فرزند مولوی محمدؐ حامد مرحوم نے بعمر ۲۶ سال ۲۱ اکتوبر ۱۸۹۵ء میں انتقال فرمایا۔ اُن کے بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ تیسرے اور سب سے چھوٹے فرزند محمدؐ اسلم سیفی کی پہلی اہلیہ سے کوئی اولاد نہ تھی۔ دوسری اہلیہ سے پہلے لڑکی پیدا ہوئی اور اُس کے بعد ۳۰ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو فرزند تولّد ہوا جس کا نام محمدؐ مسلم سیفی ہے۔ مولانا پوتے کی ولادت سے بہت خوش ہوئے تھے۔ جیسا کہ تقاضائے فطرت تھا چنانچہ عقیقہ کی تقریب میں مولانا نے بہت بڑے پیمانہ پر احبّا و اہلِ برادری کی دعوت کی تھی۔ اس کا انتظام بھی بہ نفسِ نفیس فرمایا تھا۔ مہمان نوازی سے اُن کے قلب کو بہت فرحت و انبساط حاصل ہوتا تھا۔

حضرت علاّمہ شبلی کے موازنہ انیس و دبیر پر کسی کا اعتراض اور مولانا کا جواب

یہ جواب مولانا کی بیاض میں سے دستیاب ہوا۔ معلوم نہیں اُس وقت یہ مضمون کسی اخبار میں شایع ہوا تھا یا نہیں؟ چونکہ یہ مسائل اربابِ ذوق کے واسطے ہر زمانہ میں باعثِ دلچسپی ہیں۔ اِس لئے اس مضمون کو یہاں بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے:۔

(ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰۵ پر)

شمس العلماء شبلی نعمانی اور میرزا دبیر

عنوان بالا سے ایک مضمون "ہمدرد" مطبوعہ ۱۸ مارچ ۱۹۱۴ء میں چھپا ہے حضرت شبلی کے اعتراضات پر صاحب مضمون کا ایراد محض بے بنیاد ہے۔ ع کب شعلۂ خس نور کی قندیل کو پہنچے، اصولِ بیان کے مطابق مقصود فی البیان مضاف ہوتا ہے۔ اِس لئے شعلۂ خس اور نور کی قندیل کا مقابلہ رہ جاتا ہے۔ اِن دونوں ترکیباتِ اضافی سے خس اور نور کو چھوڑ دیجئے تو شعلہ اور قندیل کا مقابلہ باقی رہجاتا ہے۔ اگر مولانا شبلی نے اس کو بے ربط کہا تو سچ کہا۔ البتہ اگر خس کے شعلہ کا مقابلہ قندیل کے نور سے کیا جاتا تو صحیح ہوتا۔

مضمون نگار نے جو کلامِ الٰہی سے استدلال کیا ہے وہ سراسر مُغالطہ ہے۔ نورِ الٰہی کو مصباح (چراغ) سے تشبیہ نہیں دی گئی بلکہ یہاں ایک تمثیل بیان کی گئی ہے اِس تمثیل کو کوکبٌ دُرِیٌّ بلکہ اِس سے بھی آگے تک پڑھنا چاہیئے۔ اور تشبیہ و تمثیل میں امتیاز کرنا چاہیئے۔ دوسری تاویل بھی محض رکیک ہے شعلہ اور نور کا مقابلہ بس ہے لفظ قندیل پھر بھی لغو ہے۔

(۲) اُڑ کر نہ مگس طنطنۂ فیل کو پہونچے، ہم اِس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ صاحب مضمون اُڑنے کے معنی حقیقی و مجازی کو دو محاورہ قرار دیتے ہیں! خیر یوں ہی سہی۔ ہم اُس کے قیاس کے مطابق یہاں اُڑنا بمعنی تعلّی تسلیم کئے لیتے ہیں تو کیا مطلب ہوا کہ مگس از راہِ تعلّی طنطنۂ فیل کا مقابلہ نہیں کر سکتی مگر اتنی کسر اب بھی ہے کہ طنطنۂ فیل کے مقابلہ میں طنین مگس چاہیئے نہ کہ مجردِ مگس۔

(۳) بلبل کا لب و لہجہ نہ جبریل کو پہنچے۔ اِس مصرع میں مولانا شبلی کا ایراد صحیح نہایت صحیح ہے ظاہر ہے کہ جبریل کی صفت نوا سنجی یا نغمہ سرائی نہیں ہے۔ صاحب مضمون کا یہ فرمانا کہ

جبریل کو "طائرِ سدرہ" کہتے ہیں تو یہ کہنا بلحاظ طیران ہے۔ چہچہانے یا گانے کا لحاظ اس میں نہیں ہے۔ شیخ ناسخ کا شعر بھی مفید استدلال نہیں ہے۔ کیونکہ اس شعر میں "بُلبُل" اور "روح القدس" میں وصف مشترک۔ جنابِ امیر کی مدح ہے اور بُلبُل بھی یہاں معمولی بُلبُل نہیں بلکہ شاعر نے اپنی ذات کو استعارۃً بُلبُل کہا ہے۔

(۴) "القاب سُخن سنج سُخنور ہے ہمارا"۔ اس مصرع پر شبلی کا اعتراض بجا ہے کہ القاب بجائے لقب باندھا ہے۔ مضمون نگار صاحب نے پھر وہی مغالطہ پیش کیا ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ خطوط میں القاب واحد بولا جاتا ہے۔ لیکن اس مصرع میں تو خطوط کا کوئی ذکر یا قرینہ نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا لقب خلیل اور حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا لقب کلیم ہے تو کیا اس جُملہ میں بھی "القاب" کا استعمال صحیح ہوگا۔ حاشا وکلّا!!

(۵) راقم کے نزدیک چوتھا مصرع بھی محلِ تامّل ہے۔ "پتّے کا نہ غُل صورِ سرافیل کو پہونچے"۔ پتّے کا کھڑکا بولتے ہیں نہ کہ غُل، اور غُل کا استعمال غیر ذی رُوح کے لئے فصحاء کی زبان پر جاری نہیں ہے۔ ۱۲ (محمد اسمٰعیل)

مولانا حسرت موہانی کا اعتراض مولانا کے ایک شعر پر

جب کلیات کا پہلا اڈیشن ۱۹۱۱ء میں شایع ہوا ہے اور پبلشر کی جانب سے اڈیٹران جرائد کی خدمت میں "ریویو" کے واسطے ارسال کیا گیا۔ اس موقع پر جناب مولانا حسرت موہانی اور بعض دیگر حضرات نے کلام میں جو سُقم محسوس کئے اُن کے بارے میں اظہارِ رائے فرمایا تھا۔ چنانچہ مولٰنا حسرت موہانی نے یہ اعتراض کیا تھا کہ فارسی ترکیب کے ساتھ ہندی عطف جائز نہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا اِس قاعدہ سے ناواقف تھے یا کلام پر اتنی قدرت نہیں رکھتے تھے کہ اِن دونوں شعروں کو بلکہ صرف دو مصرعوں کو بدل دیتے

وہ دو شعر یہ ہیں ؎

ہاں زروئے محاسنِ اخلاق — معدنِ حلم اور حیا کہیئے
پاک دل پاک طبع نیک نہاد — مخزنِ مہر اور وفا کہیئے

اخباروں میں جو نکتہ چینیاں کلام کے متعلق ہوئیں وہ مولانا کے ملاحظہ سے گذری تھیں۔ مگر مولانا نے اِن کے اُوپر کوئی توجّہ نہیں کی بجز اِس اعتراض کے۔ چنانچہ سوانح نگار سے یہ فرمایا کہ علی گڑھ میں اگر تمہاری ملاقات مولانا حسرت موہانی سے ہو، تو نظم کی تعریف پوچھنا۔ اور جب یہ تعریف تسلیم کریں کہ بیان میں اختصار اُس کی شرط لازمی ہے تو یہ ترکیب اِس لحاظ سے بالکل صحیح ہوئی، یہ تسلیم ہے کہ اساتذہ ماضی نے ایسا نہیں کیا۔ بہرحال کوئی نہ کوئی اس کی ابتدا کرے گا۔ اگر اساتذہ ماضی میں سے کوئی اس ترکیب کو اختیار کر لیتا تو اب سند ہوتی۔ پھر مولانا نے ارشاد فرمایا کہ یہ ترکیب بالقصد اختیار کی ہے تاکہ آئندہ لکھنے والوں کو آسانی ہو۔ سوانح نگار کی ملاقات حضرت حسرت موہانی سے ہوئی تو انھوں نے اتّفاق فرمایا کہ مولانا کا خیال تو بجا ہے لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی فرمایا اگر فلاں شاعر ایسی ترکیب لکھتا تو اُس کے حق میں یہ وجہ ہرگز نہ مانتا۔ کیونکہ اُس کو وہ علم حاصل نہیں جو مولانا کو ہے۔ اُس شاعر کا نام قرینِ مصلحت نہیں کہ ظاہر کیا جائے گو کلام اس کا نہایت دل پسند ہے۔

شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد دہلوی ایک بار مولانا نے جامع سوانح کی معرفت شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم سے قواعد اُردو کا ایک مسئلہ دریافت فرمایا چنانچہ اس شعر میں ؎

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی

جو لفظ "سہی" آیا ہے اس کی بابت مولانا کا سوال تھا کہ یہ قواعد اُردو کی رو سے

کونسا کلمہ ہے۔ جناب شمس العلماء مولانا نذیر احمدؒ نے اپنے بے نظیر انداز میں ارشاد فرمایا کہ میاں اِس فن کو تمہارے باوا ہم سے زیادہ اچھا سمجھتے ہیں، اور وہی خوب جانتے ہوں گے کہ یہ کون سا کلمہ ہے۔ جب نیا کلیاتِ اسمٰعیل شایع ہوا ہے تو مولانا نے ایک جلد شمس العلماء ڈاکٹر مولانا نذیر احمد کی خدمت میں پیش کی تھی اور سرورق پر یہ شعر اپنے قلم سے تحریر فرمایا تھا ؎

ہرزہ گوئی قطرہ نیست گر سوئے دریا شتافت ما من ولجائے خویش جز تہ دریا نہ یافت
(اسمٰعیل)

مولانا نذیر احمد آثارِ سلف کے اِس شعر کی بہت داد دیا کرتے تھے جو قلعہ آگرہ کی موتی مسجد کے بارے میں لکھا گیا ہے ؎

ہیں اب تو نمازی مرے باقی یہی دو تین یا دھوپ ہے یا چاندنی یا سایۂ مسکیں

خاص کر لفظِ مسکیں کی بابت فرماتے تھے کہ بہت ہی صحیح معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

کلامِ شیفتہ پر سرسری نظر ۱۹۱۶ء مولانا کو حضرت شیفتہ کا کلام بغایت پسند تھا۔ چنانچہ اپنے ادبی انتخابات میں آپ کی غزلوں کا انتخاب درج کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ تو زکِ اُردو کا پہلا اڈیشن مطبوعہ ۱۹۰۸ء اِس میں صفحہ ۳۹-۴۱ پر حضرت شیفتہ کی سات منتخب غزلیں طبع ہوئی ہیں۔ کلامِ شیفتہ پر رائے اِن الفاظ میں ظاہر کی ہے۔ کلام نہایت متین و سنجیدہ فارسی کا رنگ غالب۔ کلّیاتِ شیفتہ ۱۹۱۶ء میں طبع ہوا ہے۔ اِس پر صفحہ ۵۹ سے صفحہ ۹۰ تک جو مقالہ "کلامِ ریختہ پر ایک نظر" کے عنوان سے چھپا ہے یہ مولانا کے قلم کا ہے افسوس ہے کلّیاتِ شیفتہ میں اِس امر کا اظہار نہیں کیا گیا۔ مولانا کے مسوّدات کے دیکھنے سے اِس بات کا پتہ چلا ہے۔ یہ مسوّدات بھی ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۵ء کے تحریر شدہ ہیں۔

اِس سلسلہ میں ایک خط جناب نواب محمد اسحاق خاں صاحب فردوس آشیاں کا ملا جس میں اس بات کا تقاضا ہے کہ کلیات طبع ہو رہا ہے مولانا کلام شیفتہ پر تبصرہ جلد عنایت فرما دیں۔ مولانا کی رائے تھی کہ جناب نواب مصطفیٰ خاں رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر اُن شعراء باکمال میں سے تھے جن کا کلام اُردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں اعلیٰ حیثیت رکھتا تھا۔ مولانا کو جناب نواب صاحب کی خدمت میں کئی بار حاضری کا موقع بھی ملا تھا۔ کمالات علم و فضل اور شاعری کے علاوہ نواب صاحب ایک بلند پایہ درویش بھی تھے۔

تبصرہ ۱۹۱۶ء | یہ ایک پمفلٹ ہے ۸۰ صفحہ کا اور بالائے دستخط جناب نواب محمد اسحاق خاں مرحوم مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڈھ میں ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء طبع ہوا تھا۔ اِس پمفلٹ میں اُس کارروائی کی رپورٹ ہے جو ابتدائے ۱۹۱۵ء سے ترتیبِ کلیاتِ حضرت امیر خسروؒ کے بارے میں اُس کے طبع ہونے کے وقت تک بر روئے کار آئی تھی۔ اِس سے چند باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اِس عظیم الشان ادبی خدمت کے انجام دینے کا خیال شمس العلماء مولوی نواب سید حسین بلگرامی سی۔ ایس آئی المخاطب بہ نواب عماد الملک بہادر کے دِل میں پیدا ہوا تھا۔ دوسری بات یہ کہ حضرت امیر خسروؒ کا کلام جو اس طرح شایع ہوتا رہے گا۔ اِس کا ڈیڈیکشن اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن نے اپنے نام پر قبول فرمالیا تھا۔ اور ایک خاص فرمان کے ذریعہ سے اُس کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ تیسری بات یہ ہے کہ تمام ہندوستان میں صرف نو حضرات اِس اہم خدمت کی انجام دہی کے واسطے منتخب ہوئے تھے۔ چنانچہ نواب محمد اسحاق خاں صاحب مرحوم تحریر فرماتے ہیں "اُن میں سے ایک خاں صاحب مولانا محمد اسمٰعیل صاحب رئیس و

پنشنر ہیڈ مولوی ہیں جن کی مقبول عام تصانیف سرکاری مدارس کے نصاب میں داخل ہیں۔ آپ علم فارسی کے ماہر ہونے کے علاوہ فنِ تعلیم میں بھی غیر معمولی دستگاہ رکھتے ہیں، آپ کا اُردو کا کلام نظم و نثر قبول عام کا رتبہ حاصل کئے ہوئے ہے۔ آپ اِس دور کی زندہ یادگار ہیں۔ اپنے معاصرین میں مذاقِ فارسی کے لحاظ سے ہمیشہ ممتاز سمجھے گئے ہیں۔ آپ کی ذکی و فہیم طبیعت میں نکتہ سنجی اور تنقید کا ملکہ بڑھا ہوا ہے۔" چنانچہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب رئیس میرٹھ نے مطلوبہ مقدمہ تحریر کرنے کا وعدہ فرمالیا ہے۔ متعدد انگریزی، فارسی اور اُردو تذکرے جناب موصوف کی خدمت میں پہنچا دئے گئے ہیں تاکہ آپ حسبِ ضرورت اُن میں سے مواد اخذ کرلیں۔ اُس کے بعد جو نسخہ طبع ہوگا، اُس کے شروع میں اُس پر تبصرہ ہوگا جس میں اُس خاص نسخہ کے مضامین کا خلاصہ اور اُن مضامین پر تنقید ہوگی"۔

"جن نو حضرات کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے اُن میں سے ہر صاحب حصّہ رسدی ایک ایک نسخہ پر تبصرہ لکھیں گے۔ چنانچہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب قِران السّعدین پر ایک مبسوط ریویو تحریر فرما چکے ہیں"۔

حضرت امیر خسروؒ کی مثنوی قِران السّعدین پر مولانا کا مبسوط ریویو طبع اور شایع ہو چکا ہے اس ریویو کے ختم پر خود مثنوی قران السّعدین کی بحر میں ایک نظم مولانا نے لکھی ہے۔ اس میں اپنی اِس ادبی خدمت کا کچھ تذکرہ کیا ہے۔ حیاتِ خسروؒ نصف یا نصف سے کچھ زیادہ زمانہ کی مولانا ترتیب فرما چکے تھے کہ پیغامِ اجل کو لبیّک کہا اور اِس دارِ فانی سے رحلت فرمائی۔ مولانا نے اِن تصنیفات کے صلہ میں کوئی معاوضہ قبول نہیں فرمایا تھا، شاید اِس خیال سے کہ کسی مناسب محل پر شمس العلماء نواب سیّد حسین عماد الملک بہادر ایس

خدمت کا انکشاف حضور سرکار نظام میں فرمائیں اور اُس دربارِ دُربار سے شاہانہ عطیہ مولانا کے بنا کردہ مدرسہ بنات المسلمین کے لئے منظور ہو جائے۔ اپنی حیات کے اخیر ایّام میں مولانا نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ہم کو اُمید ہے کہ جب مدرسہ کو ضرورت پیش آئیگی مالی امداد سرکارِ نظام کے خزانہ عامرہ سے ملے گی۔ سرکار نظام تک رسائی بلا توسّل محال تھی اِس لئے اب تک بجز خاموشی کے کوئی چارۂ کار نہ دیکھا۔ ممکن ہے نواب مہدی یار جنگ بہادر اپنے والد مرحوم کے تعلق سے اِن اوراق کو ملاحظہ فرما کر کچھ توجہ فرمائیں۔

مولانا ابوالحسن جوہر اور میر ابوالولا لکھنوی ۱۹۱۳ء

مولانا کے انتقال سے کوئی چھ ماہ قبل ایک روز بعد نماز عصر یہ دونوں حضرات مولانا سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ اُس زمانہ میں مولٰنا حیات خسروؒ کی تصنیف میں مصروف تھے حضرت امیر خسروؒ اور دیگر فارسی شعراء کے کلام کا موازنہ ہو رہا تھا۔ اُس وقت اساتذۂ فارسی کا کلام مولانا اِس روانی سے زبانی بیان فرما رہے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ اِس سے اُن کی خداداد قوّتِ حافظہ اور وسیع مطالعہ کا پتہ چلتا تھا۔ میر ابوالولا زبان فارسی کے بڑے ماہر تھے۔ کلّیات خسروؒ کی تدوین کے سلسلہ میں شاید اُن کو بھی کوئی خدمت سپرد تھی۔ اِس سے ظاہر ہے کہ اُن کی فارسی دانی مسلّم تھی۔ اُنھوں نے مولانا کے وصال کے بعد فرمایا تھا کہ کلام کا مزہ جاتا رہا، یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ہم نے ایسا خوش گفتار انسان اپنے تجربہ میں دوسرا نہیں دیکھا۔ مولانا بہت کم گو تھے لیکن بے تکلّفانہ گفتگو صرف اُن حضرات کے سامنے فرماتے تھے۔ جن سے وہ مانوس ہو جاتے تھے۔ میر ابوالولا لکھنوی نے مولانا کا کلّیات دیکھ کر یہ بھی ارشاد فرمایا کہ باوجود کمی مشق کلام کا اس قدر مجموعہ حیرت انگیز امر ہے۔

لوکل کمیٹی

بیسویں صدی کے ابتداء میں کچھ حضرات نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

(صدر دفتر علی گڑھ) کی ایک شاخ میرٹھ میں قائم کی تھی۔ مدّعا یہ تھا کہ مسلمانانِ میرٹھ تعلیمی معاملات میں قوم کی مُفید خدمت انجام دے سکیں۔ چنانچہ اس انجمن کی طرف سے ایک ریڈنگ روم قائم کیا گیا اور جو کچھ آمدنی ماہانہ چندوں یا عطیات کے ذریعہ سے وصول ہوتی اُس کا زیادہ حصّہ غریب طلباء کی امداد میں صرف کیا جاتا مثلاً اُن کی طرف سے فیس ادا کیجاتی تھی۔ اور حسبِ ضرورت اُن کے لئے کتابیں اور دیگر ضروری سامانِ تعلیم مُہیّا کیا جاتا۔ مولانا ایسی تحریکوں میں بہت دل چسپی لیتے تھے۔ چنانچہ اُن خدمات کے اعتراف میں اِس ادارہ کے وائس پریزیڈنٹ تاحینِ حیات رہے۔ اکثر اِس قسم کی مُفید تحریکیں باہر کے حضرات میں جو میرٹھ میں بہ سلسلہ مُلازمت تشریف لاتے تھے، اُن کی جانب سے عملی جامہ پہنتی تھیں۔ اِس تحریک کے کامیاب بنانے میں مولوی عبدالاحد ملازم محکمۂ کمسریٹ، اور مسٹر عبدالمجید خاں مرحوم سابق طالبِ علم مدرسۃ العلوم علی گڑھ (وہ بھی محکمۂ کمسریٹ ہی سے متعلّق تھے) بہت انہماک کے ساتھ مصروفِ کار رہتے تھے۔

فیض عام ہائی اسکول میرٹھ | مولانا اِس ادارہ سے بھی شغف خاص رکھتے تھے۔ اوّل تو یہ ایک علمی درس گاہ تھی۔ یہ ہی وجہ دِل چسپی کے لئے کافی تھی۔ دوسرے مولانا کے منجھلے بھائی مولانا عبدالحکیم صاحب جوشش اِس مدرسہ کے بانیوں میں سے تھے۔ مگر اس کی بناء کو مُستحکم کرنے میں حقیقی دِل چسپی مولانا کے عزیز مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم نے لی اور انہیں کے سر پر اس کامیابی کا سہرا بندھا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کا کوئی اور ہائی اسکول میرٹھ میں نہ تھا۔ اسکول کے انتظام میں بڑی دل چسپی لیتے تھے۔ اور تعلیمی تجربہ کی بناء پر اس مدرسہ کے ٹرسٹی اور وائس پریزیڈنٹ تھے۔ عیدالفطر اور عیدالضحٰے کے موقعوں پر اسکول کے واسطے قطعات لکھ دیا کرتے تھے۔ منتظمین کی جانب سے یہ کارڈوں پر چھپوا کر عید گاہ میں

تقسیم کئے جاتے اور اس طرح اسکول کے واسطے پروپگنڈا بھی ہوتا اور چندہ بھی۔ یہ نظمیں کلیات کے جدید اڈیشن میں شامل کی گئیں ہیں۔

ہز اگزالٹڈ ہائینس نظام دکن کی مدح میں قصیدہ ۱۹۱۷ء۔

مولانا نے ایک قصیدہ سرکار نظام کی خدمت میں پیش کرنے کی غرض سے لکھنا شروع کیا تھا۔ مولانا مدرسہ بنات المسلمین کے مالیات کی جانب سے اکثر متفکّر رہا کرتے تھے۔ شاید اس عرض داشت کے ذریعہ سے مدرسہ کے قیام و دوام کی طرف اُس چشمۂ فیض کی توجّہ مبذول کرانی متصوّر ہو۔ قِران السّعدین کی تنقید اور حیات خسروؒ کی ترتیب نے اِتنی مُہلت نہ دی کہ اُسے پورا کر سکتے یہاں وہ قصیدۂ ناتمام بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے۔ اس کی نادر تشبیب سے ظاہر ہے کہ اس کی گُریز کیا ہوتی :- ؎

اَے مُلکِ ہند سچ مچ تو لعلِ بے بہا ہے   جنّت نشان تیرا صحرائے دل کُشا ہے
آن و اَدا پہ تیری مفتوں ہے رُبعِ مسکوں   تو ہے عُروسِ گیتی یا جانِ ایشیا ہے
رخ سے ترے عیاں ہے نقش و نگارِ قدرت   رعنائیوں کا خلعت تجھ کو عطا کیا ہے
پربت ترا ہمالہ دیوِ بلند بالا   حدِّ شمال جس سے بامِ فلک نُما ہے
پٹکا تری کمر میں باندھا ہے بِندھیا نے   وادیٔ زیر بالا گویا جُدا جُدا ہے
آبِ اٹک سے لے کر تا سر زمینِ مشرق   سیراب ندّیوں سے میدانِ پُر فضا ہے
اِک سطح مُرتفع ہے وہ خطّۂ جنوبی   جس سر زمیں پہ بہتا دریائے نربدا ہے
دو پہلوؤں میں اُس کے ہیں دو پہاڑ قایم   بحرِ محیط جن کے قدموں سے آلگا ہے
ہیں جمع تیرے اندر منظر طرح طرح کے   سو رنگ کا مرقّع گویا تری قبا ہے
حیرت فزا ہیں تیرے میدان و کوہ و دریا   گویا طلسمِ قدرت تیرا فنا منا ہے

تو مرغ زار بھی ہے اور ریگ زار بھی ہے وہ دشتِ ریگ جس میں رہرو شکستہ پا ہے
تو گرم سیر بھی ہے اور سرد سیر بھی ہے یا تند بادِ صرصر یا نرم خو صبا ہے
گلشن ہیں تیرے آباد۔ آبادیاں ہیں گلشن یا خانہ باغ ہے تو۔ یا بوستاں سرا ہے
ہر ذی حیات کو تو دیتا ہے آب و دانہ خوانِ کرم میں تیرے ہر جنس کی غذا ہے
رنگیں ہے سال تیرا قوسِ قزح کی صورت برسات کا سماں ہے۔ یا صیف یا شتا ہے

پردیسیوں نے تجھ کو اپنا وطن بنایا
تاثیرِ دل کشی میں تو مثلِ کہربا ہے

مولانا کا حلیہ | مولانا کا قد ۵ فٹ ۸ انچہ تھا۔ سر گول۔ ماتھا چوڑا اور اونچا۔ داڑھی بھری ہوئی آنکھیں بڑی۔ ناک اونچی اور چوڑی۔ ہونٹ پتلے۔ چہرہ گول اور شاندار جس سے آثارِ بزرگی نمایاں۔ سینہ چوڑا۔ کمر ذرا جھکی ہوئی۔ ممکن ہے کثرتِ نشست سے یہ بات پیدا ہو گئی ہو۔ کفِ دست بھرے ہوئے۔ انگلیاں لمبی اور گاؤدم۔ پاؤں متوسّط۔ قوی الجثّہ نہ تھے مگر نحیف الجثّہ بھی نہ تھے۔ جوانی میں جسم لاغر تھا۔

لباس | عمدہ لباس زیبِ تن نہیں فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ زمانہ شباب میں بھی سادہ لباس پہنتے تھے۔ سر پر زیادہ تر عمامہ باندھتے تھے۔ جوتہ ہمیشہ دیسی پہنتے تھے۔ پاجامہ شرعی۔ کُرتہ اوسط لمبائی کا پہنتے تھے نہ کہ حاجیوں کی وضع کا۔ شیروانی استعمال کرتے تھے۔ موسمِ سرما میں شیروانی پر اوور کوٹ۔ جب باہر تشریف لے جاتے تو لکڑی ہاتھ میں ضرور رکھتے تھے۔ مولانا جامہ زیب تھے کیسا ہی لباس ہو اُن پر خوب پھبتا تھا۔

تندرستی | مولانا کی تندرستی ایّام جوانی میں اچھّی نہ تھی۔ اکثر درد قولنج کی شکایت رہتی تھی اور کبھی کبھی درد گُردہ کی بھی۔ یہ کیفیت قیامِ آگرہ میں بھی جاری رہی۔ سینہ کی کھانسی

جسے انگریزی میں کرانک برانکائٹس کہتے ہیں مزید براں تھی یہ شکایت سگریٹ کے کثرت استعمال سے پیدا ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر کی ممانعت پر سگریٹ کا پینا یک لخت ترک کر دیا تھا۔ موسم سرما میں طبیعت زیادہ ناساز رہا کرتی تھی۔

مزاج مزاج نہایت سادہ تھا۔ کم گو اور تنہائی پسند تھے لیکن احباب کے جلسہ میں بے تکلّف گفتگو فرماتے وہ باتیں سُننے ہی کے قابل ہوتی تھیں۔ افسوس کہ مولانا کے لطائف و ظرائف قلم بند نہیں کئے گئے۔ مولانا بڑے بذلہ سنج تھے۔ نہایت لطیف مذاق ہوتا تھا۔

عُزلت نشینی جن دنوں تالیف و تصنیف کا شغل نہ ہوتا تو مولانا زیادہ تر مثنوی مولانا رومؒ یا حضرت فرید الدین عطارؒ کی مثنوی کا مطالعہ فرمایا کرتے۔ لیکن حالتِ تندرستی میں مطالعہ یا تحریر کا شغل بلا ناغہ جاری رہتا تھا۔ تصوّف کے مضمون پر مولانا کے کتب خانہ سے متعدد قلمی کتب برآمد ہوئیں۔ اِن میں بعض ایسی ہیں جن کو مولانا نے اپنے کاتب سے نقل کرایا تھا۔ جب سے منشی نجم الدین صاحب کا وصال ہوا گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ جن انجمنوں کے رُکن تھے، اُن کے جلسوں میں یا پبلک جلسوں میں اگر مدعو ہوتے تو شرکت فرما لیا کرتے تھے۔ یہ آخر حصّۂ عُمر کا تذکرہ ہے یعنی ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۷ء تک کا۔

مولانا جولائی ۱۸۸۸ء سے دسمبر ۱۸۹۹ء تک آگرہ میں مقیم رہے۔ آگرہ میں مولانا ہر طبقہ میں عزّت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ مولانا کی خاموش زندگی ہی اس بات کا سبب ہوئی کہ اُن کی شُہرت کا آفتاب نہ چمکا۔ یہاں مقصود مولانا کا کیرکٹر اور اخلاق دکھانا ہے کہ وہ اُن لوگوں میں ہرگز نہ تھے کہ خود غرض ہوں اگر ایسے ہوتے تو زورِ قلم سے ہر جگہ بہ آسانی تعارف پیدا کر لیتے اور ہر با اثر شخص کو اپنا مُرید نہیں تو گرویدہ ضرور بنا لیتے۔

احباب | آخر زمانۂ عُمر کی کیفیت دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کثیر الاحباب نہ تھے۔ اُن کا اُصول تھا "یک در گیر محکم گیر"۔ البتّہ اس در کا عُمدہ صفات سے مزیّن ہونا ضروری تھا اُن کے احباب کے دائرہ میں اوّل مرتبہ منشی نجم الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ جن حضرات سے جیسے مراسم تھے اُن کو وضع داری کے ساتھ تمام عُمر نباہا کئے۔

عادات | مولانا کا مزاج تنہائی پسند تھا۔ اپنی خواہش سے امراء، رؤسا کی ملاقات کے لئے کبھی نہیں جاتے تھے۔ کسی ضرورتمند کی سفارش کے لئے البتہ چلے جاتے تھے حکّام کی خدمت میں بھی حاضر ہونے سے گریزاں رہے۔ ایک مرتبہ سر لُڈوِک پورٹر آنجہانی سے مُلاقات کی تھی اور ایک یا دو مرتبہ مسٹر جے آر پیرسن سے۔ یہ دونوں صاحب میرٹھ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ رہے تھے۔ مسٹر پیرسن مولانا کے علم و فضل اور شاعری کے بہت معترف تھے۔ مدرسہ بنات المسلمین کے سلسلہ میں مولانا نے ان افسروں سے مُلاقات فرمائی تھی۔

مولانا چہل قدمی کے لئے کبھی چلے جاتے ہوں ورنہ گھر سے باہر بہت ہی کم نکلتے تھے۔ اپنے قدیم الایّام احباب سے ملنے کے لئے البتہ جایا کرتے تھے۔ مولانا کی نشست زیادہ تر منشی نجم الدین صاحب کے بالاخانہ پر رہتی تھی۔

اخلاق | صفتِ خلوص مولانا میں اِس درجہ ممیّز تھی کہ اُن کی صحبت کے حاضرین میں سے ہر شخص یہ محسوس کرتا کہ مجھ سے زیادہ کسی دوسرے کے ساتھ اُنس نہیں ہے۔ جو شخص جس قابلیت کا ہوتا اُس سے ویسی ہی باتیں کرتے۔ ہمدردی کی صفت غالب تھی۔ ہندو مسلمان کی تفریق نہ تھی۔ سائل کو کبھی خالی ہاتھ واپس نہ کرتے۔ تواضع عربی النّسل لوگوں کا خاصّہ ہے۔ مولانا میں یہ صفت بدرجۂ غایت تھی۔ جب آپ کسی کی دعوت کرتے تو

چہرہ سے مسرّت ٹپکتی تھی یہ کیفیت دیکھنے سے تعلّق رکھتی تھی۔ مولانا خیرات کرتے مگر خاموش طریقہ سے۔ غریبوں کو روپیہ قرضِ حسنہ کے طور پر دیتے نہ اُس کا حساب لکھتے نہ واپسی کے اُمیدوار ہوتے۔ حاجت مندوں کی مالی امداد کرتے۔ چنانچہ آگرہ میں جن صاحب کے مکان میں رہتے تھے، گردشِ زمانہ سے اُن کا کاروبار خراب ہوگیا تھا۔ مولانا سے امداد کے طالب ہوئے۔ اُن کو کافی مالی امداد دی۔ رفتہ رفتہ اُن کے کاروبار میں ایسی ترقی ہوئی کہ اُنھوں نے آدھا محلہ خرید لیا۔ عزیزوں قریبوں کے حقوق ادا کرتے۔ محتاجوں کی حاجت روائی کرتے۔ ایک صاحب کو اپنے صرفہ سے بی۔ اے تک تعلیم دلائی اور اُن ہی صاحب کی ہمشیرہ کو بھی۔ اکثر بیواؤں کو اپنے مدرسہ میں تعلیم دلائی اور ٹریننگ کرایا تاکہ وہ معلّمہ کا پیشہ اختیار کرسکیں چنانچہ ایسی متعدّد اُستانیاں موجود ہیں۔

ہر مُفید کام میں چندہ عطا کرتے۔ بہت سے اُردو رسالے اور اخبار اُن کے نام آتے تھے۔ زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ ایک ممتاز ادیب تھے۔ اُن کا سالانہ چندہ ادا کیا کرتے تھے۔ اخبار زمیندار کو بہت شوق سے پڑھتے تھے۔ ایک بار وہ بند ہوگیا تو ایک قطعہ لکھا تھا۔ اِس مرتبہ درج کلّیات کیا جاتا ہے جو مولانا کی سنجیدہ ظرافت کا عُمدہ نمونہ ہے۔ اخبار البشیر سے بھی بہت دل چسپی تھی اُس کے اڈیٹر خان بہادر مولانا بشیر الدین سے مراسم دوستانہ تھے۔

خُدّام یوں تو مولانا کی خدمت میں اُن کی اولاد ہی ہر وقت مصروف رہتی تھی۔ لیکن ملازمین میں سے بُدّھن ساکن فیض آباد نے جواب تک مولانا کے نواسے سیّد احسان الحق کے پاس ملازم ہے، مولانا کو بہت آرام پہونچایا تھا۔ اور دوسرا شخص اِس سلسلہ میں قابلِ ذکر شیخ محمدؐ عُمر گدّی ہے جو اپنے شوق سے مولانا کے کمرہ کے

باہر سوتا تھا جاڑا ہو یا گرمی اُسے چار بجے اُٹھ کر مولانا کے لئے حُقّہ تیار کر دینا۔ مولانا کے شاگرد جب کبھی حاضر خدمت ہوتے تو اِس بات کی کوشش کرتے کہ حُقّہ بھر کر مولانا کے سامنے پیش کریں۔ مولانا حُقّہ بہت پیتے تھے۔

بیماری کے حالات ۱۹۱۷ء ۵ محرّم الحرام ۱۳۳۶ھ ہجری کو معمولی بُخار لاحق ہوا۔ اس کی ابتدا دردِ سر کی شکایت سے ہوئی۔ بظاہر کوئی غیر معمولی کیفیت نہ تھی۔ اُس سال رام لیلا اور محرّم کے جلوس ساتھ آپڑے تھے اور تصادم کا احتمال تھا۔ مولانا کو اِس بارے میں بہت خیال تھا کہ انسداد فساد کے لئے ہندو اور مسلم رؤسا اور با اثر حضرات کا ایک جلسہ مُرتّب کیا جائے اور اُس میں یہ قرارداد ہو کہ ہندوؤں کے میلہ میں مسلمان، اور مسلمانوں کے میلے میں ہندو انتظام میں ایک دوسرے کے شریک و مُعاون رہیں گے چنانچہ حالات بیماری میں اِس امر کو بار بار دریافت فرماتے تھے۔ اور جب اِس معاملہ کے طے ہونے میں تاخیر ہونے لگی تو ارشاد فرمایا کہ ہمارے مکان پر جلسہ ہو کر یہ معاملہ جلد تر طے کیا جائے۔ بہر حال جنابِ خان بہادر نواب اسد اللہ خاں مرحوم رئیس و چیرمین میونسپل بورڈ کے دولت کدہ پر جلسہ منعقد ہوا اور ہر امر قابل اطمینان طریقہ سے طے پا گیا۔ اس موقع پر آنریبل سر سیتارام نے جو اُن دنوں میونسپل بورڈ کے ممبر تھے شرکت فرمائی تھی۔ اور برابر تین سال تک رام لیلا اور محرّم کے جلوسوں کے ساتھ خاص انہماک کے ساتھ شرکت فرمایا کرتے تھے۔ عزیز، قریب، اہلِ برادری، ہمسائے، اہل شہر، عمائد، برابر مزاج پُرسی کے لئے تشریف لاتے تھے۔ آپ کے ایک پیر بھائی حافظ ظہور محمدؒ مرحوم بھی مزاج پُرسی کے لئے روزانہ تشریف لاتے تھے۔ ۹ محرم الحرام کو اُن سے دیر تک باتیں کیں اور فرمایا ۹-۱۰-۱۱-۱۲-۱۳-بس چودہ۱۴ تک سمجھنا چاہیے۔ وہ اِس کے معنی یہ سمجھے کہ



نشست گاہ - یہاں انتقال ہوا تھا - یکم نومبر ۱۹۱۷ء -

مقابل صفحہ ۱۱۹

مولانا کا وصال چودہ تاریخ کو ہوگا۔ لیکن حافظ صاحب نے اِس بات سے کسی کو مطلع نہ کیا۔ جب تک بات چیت کر سکے مدرسہ بنات المسلمین کا حال دریافت فرماتے رہے۔ اِسی کے قیام و مالیات کے بارے میں اشارات فرماتے تھے۔ بعض اوقات بات سمجھ میں نہیں آتی تھی اِسی سلسلہ میں یہ بھی فرمایا کہ مدرسہ کے لئے روپیہ کی ضرورت ہو تو سرکار نظام میں رجوع کرنا وہاں سے امداد ملے گی۔ واللہ اعلم یہ کیا راز تھا۔ شاید اِس خیال سے فرماتے ہوں کہ سرکارِ نظام کے یہاں سے اکثر ہندوستان کے مدارس فیض یاب ہوئے ہیں۔

بہرحال اب تک کمیٹی انتظامی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ محمد اسمٰعیل گرلز اسکول کی مالی امداد کے متعلق سرکار نظام میں کوئی عرض داشت پیش کرتی۔

مولانا کی رحلت ۱۹۱۷ء

مولانا کی رحلت چودہ ۱۴ محرم الحرام ۱۳۳۶ھ مطابق یکم نومبر ۱۹۱۷ء جمعرات کے دن چار بجکر ۲۰ منٹ پر ہوئی۔ اِس بیماری کے وقت آپ نشست گاہ میں سکونت پذیر تھے۔ فوراً بعدِ وفات زنانے مکان میں لے گئے۔ اِسی مکان میں آپ پیدا ہوئے تھے جس کمرے میں پیدا ہوئے تھے اسی کمرہ میں آپ کو غسلِ میت دیا گیا۔ بیرونِ شہر جس مقام پر باغپت اور غازی آباد کی سڑکیں ملتی ہیں اِس سے کوئی سَو گز کے فاصلہ پر جانبِ شمال آپ کا مزار ہے۔ وفات سے دو یا تین سال قبل عیدگاہ کو جاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہم کو اِس مقام پر دفن کرنا اور یہ زمین بیع کر لینا۔ چنانچہ حسبِ وصیت یہ کام کیا گیا۔ اِس مقام سے کوئی دو سو قدم جانبِ دکن غازی آباد کی سڑک پر حضرت منشی نجم الدین رحؒ کا مزار مبارک ہے۔ جن کا وصال ۱۹۰۷ء میں ہو چکا تھا۔ قدرت نے دونوں پیر بھائیوں کے مزار ایک دوسرے کے متصل مقرر کر دئے تھے۔ مزار کے شرق اور جنوب میں آنریبل سر سیتارام رئیس میرٹھ کی زمین ہے وہ مولانا کی تدفین کے وقت بھی

موجود تھے۔ اُسی زمانہ میں جب آپ سے مزار کے راستہ کے متعلق گفتگو آئی تو نہایت خندہ پیشانی سے وعدہ فرمایا۔ مولانا کا جنازہ مغرب کے قریب اُٹھایا گیا تھا آٹھ بجکر ۴۵ منٹ پر جسم پاک سُپردِ خاک کیا گیا۔ اگرچہ دفن میں عجلت کی گئی اور عام طور پر شہر میں اطلاع نہ کی جا سکی تاہم ہندو اور مُسلمانوں کا مجمع کثیر جنازہ کے ہمراہ تھا۔ بہت سے حضرات کو افسوس رہا کہ لاعلمی کے باعث وہ نمازِ مغفرت میں شرکت نہ کر سکے۔

خطوطِ تعزیت اور جرائد ہند میں مولانا کی وفات پر اظہارِ تاسّف

انتقال کے وقت انگریزی حساب سے تہتّر۷۳ اور ہجری حساب سے پچھتّر۷۵ سال کی عُمر شریف تھی۔ ہر گوشۂ مُلک سے مولانا کے قدردانوں یا یوں کہئے کہ علم دوست حضرات نے مولانا کی اولاد کے ساتھ کمال ہمدردی کا اظہار فرمایا اور اُس آفتابِ مُلکِ سخن کے غروب ہونے پر اظہارِ ملال کیا۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی رئیس حبیب گنج المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ کا اظہارِ تعزیت کے لئے میرٹھ تشریف لانا ۱۷ سنہ ۱۹ ع

مولانا کے انتقال کے کئی روز بعد جناب مولٰنا حبیب الرحمٰن خاں صاحب المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ تعزیت کے لئے میرٹھ تشریف لائے تھے۔ آپ کا یہ اخلاقِ کریمانہ موجبِ ستائش ہے۔ علم ادب کے ایک دُرِّ بے بہا کی رحلت سے متاثر ہو کر آپ کا میرٹھ تک تکلیف کرنا ایسا اخلاقی نمونہ تھا جو قابلِ ذکر ہے۔ حالانکہ مولانا سے نواب صاحب کے مراسم نہایت سَرسَری وضع کے تھے۔ آپ کی تشریف آوری کے موقع پر حیاتِ خسروؒ کا مسوّدہ آپ کے سُپرد کر دیا گیا تھا۔

قطعاتِ تاریخ وفات سنہ ۱۹۱۷ع

ایک مرثیہ بصورت ترکیب بند اور صرف دو قطعات یہاں درج کئے جاتے ہیں:—

هُوالباقی

قطعۂ تاریخ وفات

ذبیح تیغ اجل شد بہ منزل تسلیم — چشیدہ جرعہ زجامِ وصالِ اسمٰعیل
چو پنج شنبہ رسید و یکم نومبر شد — بوقتِ عصر نمود ارتحال اسمٰعیل
بہ بست رختِ سفر زیں جہاں بملکِ بقا — امیر قافلہ صاحب کمال اسمٰعیل
زفیضِ غوثِ علیؒ تاجِ معرفت پوشید — وحیدِ عصر عدیم المثال اسمٰعیل
فصیح و سعدیٔ دوراں و اُستادِ زماں — ادیب و شاعرِ نازک خیال اسمٰعیل
رہینِ منّتِ او ہندو ہم زبانِ ہند — نشاند سکّہ زشیریں مقال اسمٰعیل

بہ بینِ علیمؔ[۱] ہے یادگارِ عمِّ کریم
بگفت صبرؔ[۲] فرشتہ خصال اسمٰعیل

۷۸۶

اَلقَیُّوْمُ

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ ۝

آیۂ قرآن

سنہ ۱۳۳۶ ھ

آرام گاہِ عالی پائیگاہ

جنابِ خان صاحب مولوی محمد اسمٰعیل مرحوم

سنہ ۱۹۱۷ ء

---

[۱] مولانا عبدالعلیم صدیقی برادر زادہ۔ [۲] صبر یعنی مولانا نذیر احمد خجندی برادر اکبر مولانا عبدالعلیم سلمۃ الرحمٰن۔

صوفیٔ باصفا و بزرگِ بے ریا بود- در نظم و نثرِ فارسی و اُردو دستگاہِ کامل داشت شرفِ بیعت از غوث علی شاہ پانی پتی قدس سرہٗ حاصل بود- ولادتِ باسعادت ۱۸۴۲ء ورحلت بعمرِ ۷۵ سال بروز پنجشنبہ- ۴ و ۲۶ منٹ- ۱۴ محرم الحرام ۱۳۳۶ھ ہجری ۱۹۱۷ء بود- مزاجِ فیض امتزاج بُود- صفاتِ ستودہ رِفق و خُلق و انکسار و بے تعصّبی و ایثار بے غایت می داشت-

فِیہِ التّاریخ

سنہ ۱۳۳۶ ہجری

خان صاحب محمّد اسمٰعیل	مظہرِ شانِ کردگارِ جلیل
صوفیٔ صاف و باصفا صوفی	سخنِ نغزِ او نداشت عدیل
خُلق و رِفقِ محمّدی می داشت	خُلقش بُود بر مثالِ خلیل
ساعیِ علم و قومی ہم درپے	عاجزاں را مدام بود کفیل
بے تعصّب بدو مُدام بخُلق	داشت مرعی چوحق عطائے جزیل
مدرساتِ بناتِ اسلامی	یافت از جہد وسعیِ او تکمیل
بدنظیرے برائے خویش خوداو	ہم چو شمسے برائے خویش دلیل
روزِ آدینہ وقتِ عصر- اجل	آہ! بہرش بکوفت کوسِ رحیل
از محرّم چو بودہ چاردہ روز	رفتہ معصوم سوئے ربِّ جلیل
غین و شین- بود و- واو یا لامے	ہجری- کاں بُد از بنائے حسنیل
سال ہفتاد و پنج از عمرش ق	مختتم کرد و- یازدہ روز علیل
ماند- وزاں پس بحق شدہ واصل	ہم چو تیر از کماں بصد تعجیل

سنہ ۱۳۳۶

لازما جُست حشتی سالِ وصال　تا شُمارند از وفہیم وعقیل
بے دلِ ریب خوان "لقد وصل"　"خان صاحب محمد اسمٰعیل"

سنہ ۱۳۳۶ھ

اُخر

عیسوی سن "برفت سوئے جناں　خان صاحب محمد اسمٰعیل"

سنہ ۱۹۱۷ء

آخر

خان صاحب محمد اسمٰعیل　رخت بربست چوں زجائے ظہور
سالِ او گفت ہاتفم مغفور　از سرِ رو وہم ز قلبِ نور

سنہ ۱۳۳۶ھ

منشی عنایت نبی صاحب ارشد

انقلابِ دہر

یعنی

مرثیہ وفاتِ حسرت آیاتِ جنابِ خان صاحب، مولوی

محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم

آہ اے دُنیائے دوں تیری ادائے انقلاب　روز و شب ہر شے کو دیتی ہے صلائے انقلاب
تیری نیرنگی نے نقشِ عالمِ امکان کو　کر دیا ہے سر بسر محوِ لقائے انقلاب
ہیں تری ہیبت سے لرزاں کوہ و صحرا دشت و در　سُن رہے ہیں دم بخود افسانہائے انقلاب

کر دیا عالم تہ و بالا تری رفتار نے
ہو گئے پامال کتنے زیرِ پائے انقلاب

آہ! حالِ انقلابِ ہستیٔ موہوم آہ!
آہ کیوں کر ہو بیانِ ماجرائے انقلاب

سعیِ غارت میں ہے ہر دم ہر گھڑی آٹھوں پہر
روز و شب عالم پہ رہتی ہے جفائے انقلاب

کیسے کیسے خسروانِ دہر نے پائی شکست
مٹ گئے طبل و علم پیشِ لوائے انقلاب

گردشِ افلاک نے کیا کیا نہ کی ہم پر جفا
غیر ممکن ہے بیانِ انتہائے انقلاب

داغِ دل داغِ جگر سوزِ دروں، اشکِ رواں
ہیں یہ اپنے پاس سامانِ عطائے انقلاب

انقلابِ عالمِ ہستی نے پسپا کر دیا
کاش کہ ہوتی جہاں میں منتہائے انقلاب

کس نے چھینا ہائے ہم سے کاملینِ مُلک کو
سنگ دل ہے کون اتنا ماورائے انقلاب

قُلزمِ اسرارِ حق کے کیسے دُرِّ بے بہا
سیلِ ہستی نے کئے نذرِ بہائے انقلاب

کوکبِ چرخِ ادب وہ نیّرِ برجِ شرف
آہ واحد میں کہاں تو نے چھپائے انقلاب!

آہ! اے ہنگامہ افروزِ بلائے ناگہاں
چار سُو برپا ہے کیوں شورِ صدائے انقلاب

ہو رہا ہے کیوں زمانہ قائلِ اہلِ کمال
رہنمائے قوم کا مدِّ نظر ہے کیوں زوال

بند ۲

کیوں ہے جلّادِ فلک آمادۂ جور و جفا
ہے کمیں میں کس لئے پوشیدہ صیّادِ قضا

کس کی غارت پر کمر بستہ ہوا ہے چرخِ پیر
گھات میں کس کی ہے شہبازِ اجل ہنڈلا رہا

کیا کسی رہبر کی پھر غارتگری منظور ہے
کیا پسند آئی کسی مُرغِ خوش الحاں کی نوا

کس لئے جوشِ حسد سے تنگ ہے اے چشمِ دہر!
کس ہُنرور کے ہُنر سے ہے تجھے بُغض و عنا

روشنیٔ طبعِ خود کس پہ بلائے جاں ہوئی
کون سا کامل ہوا محسودِ چشمِ بد نُما

راہئ مُلکِ بقا ہے کون سا پیرِ رشید   قوم کس کو رو رہی ہے ہائے ہائے مُقتدا"

کس نہالِ پُر ثمر پر گر پڑی برقِ خزاں   گر گیا کس گُل کو بادِ تُند کا جھونکا فنا

اَے چمن ہیں کیوں وہ شادابی و رعنائی نہیں   کیوں وہ پہلا سا نہیں جوشِ نمو نشو و نُما

نونہالانِ چمن کمُھلا نہ جائیں دیکھنا   ہائے گُلشن میں نہیں اب باغبانِ خوش اَدا

آہ! اے بے مہریٔ گردونِ دوں! افسوس آہ!   آہ! کج رفتاری و کج خُلقیٔ ارض و سما

یوں چمن بے پیر اسے خالی ہو گُلستانِ چمن   یوں رہیں نوخیز پودے تشنۂ آبِ بقا

قلزمِ بحرِ فنا میں گُم ہوں یوں دریائے فیض   یوں اجل کے دام میں آجائے خضرِ رہنما

اِک زمانہ فیض سے جس کے رہے یوں شاد کام   حیف یوں ہے خُشک ہو وہ چشمۂ آبِ بقا

دیکھ لی دستِ اجل تیری صفائی دیکھ لی   تُجھ کو بھاتے ہی نہیں اہلِ ہُنر اہلِ صفا

اے فلک! کیا تو نے پایا گر کیا ناشاد ہمیں   پیشوائے قوم کو ہم سے چھڑا کر کیا ملا

حیف ہے اِک مُلک کے محسن کو کھویا ہاتھ سے   خاک میں اِک گوہرِ نایاب پنہاں کر دیا

گوہرِ نایاب بھی وہ بے عدیل و بے مثال   جس کا ثانی ہی نہیں ہندوستاں میں دوسرا

آہ اے ہمدرد و بنّا[۱]ئے بنائے قصرِ علم!   اے دبستانِ بنات[۲] المسلمین کے پیشوا!

اے ادیبِ علم و دانش بانیٔ فضل و کمال!   اے خطیبِ خطبۂ خُلق و ادب حلم و حیا!

پیشوائے قوم مولانا محمد اسمٰعیل   ماہتابِ برجِ حکمت۔ آفتابِ فلسفا

بس کہ تیری ذات بہرِ قوم تھی سالارِ قوم   کاروانِ مُلک کا بے شک تو ہی تھا بدرقا

روضۂ علم و ادب کی زیب و زینت مٹ گئی   تُجھ سے تھی کاشانۂ تعلیم میں نُور و ضیا

کس جگہ اب ڈھونڈنے جائیں کہاں پائیں تجھے   راس آئی کیا مگر گلزارِ جنّت کی فضا

۱؎ بنّا معنی معمار۔ ۲؎ میرٹھ میں ایک نسوانی مدرسہ ہے جس کے بانی مولانا مرحوم و مغفور تھے۔ ۱۲

کیوں نہ روئیں تجھ کو ہم اے زبدۂ افضالِ قوم! | کیوں نہ ہو غم سے ترے یوں ہند میں آہ و بکا
تجھ سے تھی اے ابرِ رحمت! رونقِ گلزارِ ہند | تجھ سے پاتے تھے نہالانِ چمن نشو و نما
جملہ اطفالِ وطن تیری بدولت شاد تھے | چاشنیٔ علم میں پاتے تھے اِک طرفہ مزا
گونجتی تھی چار سُو گویا ہی صدائے جاں نواز | گویا ہے نغمہ کُناں اِک عندلیبِ خوش نوا
تیری تصنیفات و تالیفات ہیں آبِ حیات | جس کا ہر ہر گھونٹ ہے اِک جُرعۂ راحت فزا
پیکرِ علمِ ادب میں رُوح تازہ پھونکنا! | اے مسیحائے زماں! تیرا یہ ادنےٰ کھیل تھا

ایک میرٹھ[۱] ہی نہیں ہندوستاں شیون میں ہے،
آہ! اے شیوہ بیاں! سارا جہاں شیون میں ہے

بند ۴

کون اِس خوبی سے ہوگا طرحِ اندازِ سخن | تجھ سے تھی قائم جہاں میں بس کہ بُنیادِ سخن
مانتے تھے تجھ کو سب اُستاد۔ اُستادِ سخن | نصب تو نے کر دئے عالم میں اَوتادِ سخن
تو مصنّف بھی مؤلّف بھی تھا اور نقّاد بھی | شاعرِ شیریں بیاں۔ بے مثل نقّادِ سخن
تیری تصنیفات سے معمور ہیں دارالعلوم | تجھ کو زیبا ہے خطاب خانہ آبادِ سخن
وہ نصائح پُر اثر تیرے وہ پندِ سود مند | اَلغرض ہر بات ہے اِک نزہت آبادِ سخن
چُٹکیاں لیتی ہے دل میں تیری بانگِ جانفزا | بُلبلِ سروِ سخن۔ قُمریٔ شمشادِ سخن
ہوگیا برباد سارا گلشنِ علم و کمال | تجھ کو کیا آئی خزاں اے سروِ آزادِ سخن!
آہ! اے روحِ روانِ پیکرِ علمِ عروض | بے ترے ہیں قالبِ بے رُوح افرادِ سخن
ہو رہی ہے اب پراگندہ جماعت نظم کی | ہے عجب اُفتاد میں۔ افسوس اُفتادِ[۲] سخن

---

۱ مولانا کا وطن مالوف میرٹھ ہے ۱۲۔ ۲ اُفتاد مُراد طرز، روش، ڈھنگ وغیرہ ۱۲۔

نثر کی حالت ہے ابتر، نظم کی مٹّی خراب
کون پہنچے داد کو دے کون اب دادِ سخن

کیا بیاں ہو خستگیٔ علمِ معنی و بیاں
کاش سُن لے آکے اے اُستاد! فریادِ سخن

واقعی تو تھا جہاں میں ناخدائے بحرِ علم
تیرے باعث تھی رواں کشتیٔ اَمجادِ سخن

شاہ راہِ علمِ انشاء، مبدءِ علم کلام
مُرشدِ علّامِ عالَم اور مرصادِ سخن

ہے کہاں تو آہ! یعسوبِ سخن دانِ سخن
ہیں سخن پر حملہ آور، آہ! حُسّادِ سخن

اب ہے اطراف و جوانب میں فغانِ دل خراش
ایک دَم سے تھی جہاں میں طرفہ ایجادِ سخن

ارشدِ خستہ نوا کی اب کہاں بانگِ نشید
رات دن روتا ہے تجھ کو کب ہے انشادِ سخن

درغمت ہر ذرّہ اَم بس قطرۂ خوں ناگشت
بہرِ سیلِ اشک خوں ہر چشم من میزاب گشت

ماخوذ از ایجوکیشنل گزٹ
لکھنؤ

نوٹ۔ منشی عنایت نبی صاحب ارشد مرحوم کا تعلّق ریاست بھاول پور میں تھا غالباً ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے، اور ظاہر ہے کہ مولانا کے تلامذہ سے تھے۔

باب (۷) ساتواں

مولٰنا کے کلام پر تاریخی نظر

مولانا کی شاعری کا زمانہ سنہ ۱۸۶۰ء سے سنہ ۱۹۱۷ء تک ہے۔ سوانح کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مولانا کی ولادت ۱۲ ر نومبر سنہ ۱۸۴۴ء کو شہر میرٹھ میں ہوئی۔ اور سنہ ۱۸۶۰ء میں جب کہ وہ اپنی عمر کے صرف سولہ منازل طے کر چکے تھے، ایک دن احباب کی مجلس میں شعر وسخن کا تذکرہ چلا۔ حاضرین میں سے فرمائش ہوئی کہ ہر شخص اپنی اپنی پسند کا اُردو زبان میں بہترین شعر سُنائے۔ چنانچہ اُس وقت سے مولانا کے دل میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ وطن میں کسی اُستاد سے مولانا نے مشورۂ سخن نہیں کیا۔ نہ یہاں اُس زمانہ میں کوئی بلند پایہ شاعر تھا۔ یہ بات خود مولانا کی زبانی معلوم ہوئی تھی کہ اُن کو میرزا اسد اللہ خاں غالب سے نسبتِ تلمّذ حاصل تھی۔ اِس کے کبھی تفصیلی واقعات سُننے میں نہیں آئے۔ آیا مشورۂ سخن بذریعہ خط وکتابت کیا جاتا تھا یا کبھی اُستاد کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ مولانا کی شاعری کے چار دَور قرار دئے جا سکتے ہیں:۔

مولانا کی شاعری کا پہلا دور۔ سنہ ۱۸۶۰ء سے سنہ ۱۸۷۰ء تک

پہلا دَور سنہ ۱۸۶۰ء سے سنہ ۱۸۷۰ء تک گیارہ سال پر مشتمل ہے یہ زمانہ مشقِ ابتدائی کا تھا۔ غزل گوئی اُس وقت کے فیشن میں داخل تھی۔ مولٰنا کے کلام کی ابتداء بھی غزل گوئی سے ہوئی ہے۔ اِس صنفِ کلام پر مولانا زیادہ متوجہ نہ تھے۔ اِس کی دلیل یہ ہے کہ اُس زمانہ کی زیادہ غزلیں دستیاب نہیں ہوئیں۔ یہ بات بھی تحقیق سے ثابت ہوئی کہ شیخ قمر الدین رسالدار مرحوم

جو مولانا کے برادر نسبتی تھے، اُن کی فرمایش پر کچھ غزلیں لکھی جاتی تھیں۔ رسالدار صاحب مرحوم اِن غزلوں کو میرٹھ، شاہجہاں پور اور سیتاپور کے مشاعروں میں سُنایا کرتے تھے

سنہ ۱۸۶۰ء میں مولانا انسپکٹر مدارس میرٹھ کے دفتر میں ملازم ہو چکے تھے۔ کچھ عرصہ بعد انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ دفتر انسپکٹر مدارس میں موصول ہوا۔ مولانا کو یہ موقعہ اچھّا ہاتھ آیا۔ اِس ترجمہ کو غور و تحقیق کے ساتھ دیکھا۔ چونکہ انگریزی شاعری کے اندازِ بیان کو دلچسپ اور اچھوتا پایا۔ بعض انگریزی نظموں کا خود بھی ترجمہ کیا۔ ملاحظہ ہوں ذیل کی نظمیں مطبوعہ کلّیاتِ اسمٰعیل سنہ ۱۹۱۱ء۔

نام نظم	قسم نظم	سنہ تصنیف	نام کتاب جس میں طبع ہوئی	سنہ طباعت
کیڑا	مثنوی	سنہ ۱۸۶۷ء	ریزۂ جواھر	سنہ ۱۸۸۰ء
ایک قانع مُفلس	"	"	"	"
موت کی گھڑی	"	"	"	"
فادر ولیم	"	"	"	"
حُبِّ وطن	"	سنہ ۱۸۶۸ء	"	"
انسان کی خام خیالی	"	"	"	"

مولانا کے معاصرین | شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالیؔ۔ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی۔ نواب میرزا داغؔ دہلوی المخاطب بہ فصیح الملک جہاں اُستادِ حضرت امیرؔ مینائی۔ حضرت جلالؔ لکھنوئی[۱]۔ یہ سب بزرگ اپنے وقت کے مسلّم الثّبوت اُستاد تھے۔ آخر الذکر تین حضرات کی شاعری زیادہ تر غزل گوئی تک محدود رہی

[۱] خان بہادر سید اکبر حسین لسان العصر الہ آبادی یہ نام سہواً کاتب سے رہ گیا۔

مولانا آزاد کی شاعری کو فروغ نہ ہوا۔ نثر کا میدان چونکہ فراخ اور اُن کی طبیعت سے زیادہ موزونیت رکھتا تھا۔ اِس لئے بیشتر اِس طرف توجّہ مبذول فرمائی۔ اُن کی تصنیفات نثر بڑے پایہ کی مانی گئی ہیں۔ حضرت علّامہ شبلی نے اُردو شاعری پر بہت کم توجّہ فرمائی۔ لیکن اخیر عُمر میں جو قطعات سیاسی اور قومی جذبات سے متاثر ہو کر لکھے وہ بے نظیر ہیں گو مقدار میں قلیل۔

شمس العلماء خواجہ حالؔی اپنے عہد کے شعراء میں مُسلّم مرتبہ اُستادی رکھتے تھے اُن کی شاعری نے اُردو زبان میں کایا پلٹ کردی اور قوم کے پست اور پژمردہ خیالات میں تازگی اور شگفتگی۔ انھوں نے اپنے کمالِ فن کو قوم کی اصلاح کے لئے وقف کر دیا تھا۔

اُردو شاعری میں طرزِ نو کے موجد

اِس مسئلہ پر بارہا خامہ فرسائی ہو چکی ہے کہ اُردو شاعری میں نئے طرز کی بنیاد ڈالنے کا سہرا کس کے سر ہے۔ اِس میں کلام نہیں کہ شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالؔی اور شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاؔد کو عموماً اِس شرف کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ خواجہ حالؔی کا سالِ ولادت ۱۸۳۷ء ہے اور مولانا محمد حسین آزاد کا ۱۸۳۰ء اِس طرح یہ دونوں بزرگ مولانا سے عُمر میں سات سال اور چودہ سال بڑے تھے۔ اوّل الذّکر گو پانی پت میں وطن رکھتے تھے مگر شوقِ علم دہلی کھینچ لے گیا۔ ثانی الذّکر دہلی ہی میں سکونت پذیر تھے۔ خواجہ حالؔی اور مولانا آزاد یہ دونوں بزرگ زمانہ کے رنگ سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ مشاعروں میں شرکت فرماتے اور غزلیں سُناتے تھے۔ اِس طرح خواجہ حالؔی کو جناب میرزا اسد اللہ غالبؔ کی صُحبت نصیب ہوئی اور جناب آزاد کو ملک الشعراء خاقانیِ ہند اُستاد ذوقؔ کی۔

برعکس اِن حالات کے مولانا کا خاندان ۱۸۳۸ء تک قصبہ لاوڑ میں سکونت پذیر رہا

مولانا ایک کلرک کی حیثیت سے سررشتہ تعلیم میں ملازمت قبول کرتے ہیں۔ تعلیم ابھی ناتمام ہے۔ منشی نجم الدینؒ کا دولت کدہ ان کا کلب ہے یہاں صرف تعلیم و تعلّم کا چرچا ہے یا علمی مضامین پر بحث یا کلام تصوّف کا رُوح پرور مطالعہ۔ نہ اِس جلسہ میں کوئی عالی مرتبہ شاعر شریکِ صُحبت ہے۔ نہ مشاعروں کی شرکت سے مولانا کو کوئی رغبت۔ پھر بھی فطری جوہر چمکا۔ اور اُس نے ایک خاص روش اختیار کی جو اُس وقت کے مروّجات کے خلاف تھی۔ عام خیال تو یہی ہے کہ مولانا خواجہ حالی اور مولانا محمد حسین آزاد اُردو شاعری میں طرزِ جدید کے بانی ہیں۔ لیکن یہ امر تاریخی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ انجمن پنجاب کے مشاعرے کی بُنیاد ۱۸۷۴ء میں قائم ہوئی۔ اِس بارے میں خود حضرت خواجہ حالی نے مجموعۂ نظم حالی کے دیباچہ میں یہی سن تحریر فرمایا ہے۔ اِس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ جو شہرت اُس مشاعرے اور اُن نظموں کو (جو اس مشاعرے میں پیش ہو کر شائع ہوئیں) نصیب ہوئی۔ وہ مولانا کے کلام کو کم از کم زمانہ ابتدائی میں حاصل نہ ہوئی۔ اِس کے اسباب بھی ظاہر ہیں۔ انجمن پنجاب جیسی کوئی انجمن صوبہ مغربی و شمالی و اودھ میں قائم نہ تھی۔ نہ اِس صوبہ کے ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے اُس ذوق کے ساتھ اُردو زبان کی ترقی میں دلچسپی لی جس طرح کرنل ہالرائڈ نے صوبہ پنجاب میں۔ نہ یوپی میں اُردو ادب کے دلدادگان نے خود ہی ترقئ زبان اور اصلاحِ سخن کے متعلّق کوئی مشاعرہ انجمن پنجاب کی تقلید میں مرتّب فرمایا۔

سررشتہ تعلیم یوپی کی سرد مہری نے افسردہ طبیعتوں کو اور بھی پژمُردہ کر دیا۔ خُدا بھلا کرے جناب سرسیّد علیہ الرحمۃ کا جن کی ذات ستودہ صفات اہلِ کمال کے حق میں ایسی جاذب ثابت ہوئی جیسا لوہے کے حق میں مقناطیس۔ خود اِن کے ذاتی احسانات

زبانِ اُردو پر بے حد اور لازوال ہیں۔ نثر اُردو میں سلاست اور سادگی پیدا کرنے کا سہرا اِن ہی کے سر پر باندھا گیا ہے۔

اِن کے احباب نے بھی اپنے لیڈر کی طرح زبان کی صفائی اور علوم مغربیہ سے اسے مالا مال کرنے میں چار چاند لگائے ہیں۔ زبانِ اُردو کا کوئی تذکرہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ جب تک اِن حضرات کے اسمائے گرامی کا ذکرِ خیر نہ آجائے۔ چنانچہ اِس موقع پر ضمناً لکھا جاتا ہے کہ شمس العلماء خان بہادر منشی ذکاء اللہ مرحوم۔ شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم۔ نواب محسن الملک بہادر مرحوم۔ نواب انتصار جنگ مولوی چراغ علی مرحوم۔ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی مرحوم وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے اُردو زبان کی پہلی اور دوسری منزلیں اُس بُنیاد پر تعمیر کیں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں رکھی گئی تھی۔ اور جس کی دیواریں میرزا اسد اللہ غالب اور سر سید علیہ الرحمۃ نے اپنے باکمال ہاتھوں سے چُنی تھیں۔ کہنا یہ مقصود تھا کہ گو مولانا کی ہمّت نے شوق کے پَر لگائے لیکن اُنھیں حسب خواہش ماحول اور آزادی نصیب نہ ہوئی خود فرماتے ہیں ؎

اتنے خوگر ہو گئے ہم دام کے
یاد بھی آتا نہیں عیشِ چمن

خود مولانا کی طبیعت صبر و سکون، قناعت و عزلت پسند تھی، اِن کے کلام کی اوّل تو پبلسٹی یعنی اشاعت نہ ہو سکی۔ دوسرے مزاج میں ترقیٔ مدارج کی رغبت نہ تھی تیسرے ذوقِ تصوّف نے دولتِ دُنیا اور شہرت عام کی جانب سے دل مستغنی کر دیا تھا۔ پس مولانا کا ابتدائی کلام پبلک کے سامنے نہ آسکا۔ لیکن ۱۸۷۰ء سے ۱۸۸۰ء تک کی چھوٹی چھوٹی نظمیں جن کا مجموعہ "ریزۂ جواہر" کے نام سے ۱۸۸۰ء میں شایع ہوا ان کی تعداد پینتالیس[۴۵] ہے، یہ سب نظمیں اپنے رنگ میں نرالی ہیں اور اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ اُن کا

مصنّف کسی طرز کا مقلّد نہیں بلکہ طرزِ نو کا موجد ہے جو اپنے کلام کے اندر کچھ خصوصیات رکھتا ہے۔ مثلاً جدید سائینس سے واقفیت جیسا کہ مثنویٔ بادِ مُراد۔ مثنویٔ آبِ زُلال، اور مثنویٔ صنعتِ الٰہی[1] کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ پیش پا اُفتادہ مضامین کو حُسن بیان سے لطیف بنا دینا مولانا کے سحر کلام کا ادنیٰ نمونہ تھا۔ جیسے ہَوا چلی۔ گرمی کا موسم، رات۔ برسات۔ شفق۔ دال کی فریاد۔ دال چپاتی۔ اِن نظموں کے مطالعہ سے نوخیز بچّے، کالج کے طالب علم اور بڑے بُوڑھے انسان یکساں لُطف اندوز ہوتے ہیں کلام کی سلاست، بیان کی سادگی، الفاظ کی شُستگی، قوافی کی برجستگی، اِن نظموں کی خصوصیات ہیں۔ وحوش اور طیور کی فطری حرکات اور نقش و نگارِ قدرت کا سماں جو صُبح کی آمد میں دِکھایا ہے۔ یہ افرادِ مُلک سے خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے "بارش کے پہلے قطرے" میں اتّفاق کی خوبیاں اور ملمّع کی انگوٹھی میں تصنّع سے نفرت ایسے لطیف پیرایہ میں پیش کی ہے گویا ایسپ کی کہانیوں میں اضافہ کیا ہے۔ اِس پر مستزاد یہ کہ سادگی و دلآویزی نے اِن نظموں کو بچّوں اور بڑوں کی نوکِ زباں پر ہی نہیں بلکہ دلوں میں مستقل جگہ دی ہے۔ جب یہ مجمُوعۂ نظم موسوم بہ "ریزۂ جواہر" ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا تو صوبۂ پنجاب میں اُس وقت درسی کتابیں تیار کی جا رہی تھیں۔ چنانچہ اس مجموعہ میں سے کئی منظومات اُس میں انتخاب کی گئیں اور غالباً اِس انتخاب میں مولانا محمد حسین آزاد اور دیگر معاصرین کو دخور ہوگا لیکن اتّفاق وقت سے ایسی صورت پیش نہ آسکی کہ مولٰنا انجمن پنجاب کے مشاعرہ میں عملی حصّہ لیتے۔ سرکاری ملازمت کے تعلّق سے اوّل تو قلّتِ فرصت سدِّ راہ ہوتی رہی۔ دوسرے وطن سے جانا مولانا کو پسند نہ تھا۔ ایسے انساں

---

[1] مثنوی کلّیاتِ اسمٰعیل مطبوعہ ۱۹۱۰ء میں خُدا کی صنعت کی سُرخی سے صفحہ ۵ پر طبع ہو چکی ہے۔

کے لئے جو خود ہی غیر مانوس سوسائٹی میں شرکت سے جھجکتا ہو لازم تھا کہ اپنی طبیعت کے لئے کوئی نئی جولاں گاہ تلاش کرے۔ چنانچہ جو وقت ملا اِس سعدیٔ ہند نے بچوں کی تربیت اخلاق کے لئے خزینۂ نظم جمع کرنے میں صرف کیا۔ مولانا کی نظموں کے بغور مطالعہ سے ہر سخن فہم کو یہ راز آشکار ہو جائے گا کہ وہ مقلد نہیں بلکہ موجد ہیں اور جدّت کی یہ کیفیت ہے کہ اُس نوعِ نظم سے بھی گریز کرتے ہیں جس میں کسی ہم عصر کو قبولیتِ عام حاصل ہو چکی ہے مثلاً مسدّس، چونکہ مسدّس حالی مصنفہ ۱۸۷۹ء قبول عام کا سہرا لے چکا تھا۔ اِس لئے جریدۂ عبرت مصنفہ ۱۸۸۵ء بہ صورت قصیدہ اور مثنوی کیفیت قلعہ اکبر آباد مصنفہ ۱۸۸۹ء بہ شکل مثمّن تصنیف فرمائے۔ ہمارا قیاس یہی کہتا ہے ورنہ ممکن ہے کوئی اور سبب ہو۔

مولانا کے کلام کی ہر دلعزیزی اور شہرتِ عام اُس وقت سے ہوئی جب سے اُن کی اُردو ریڈروں کا سلسلہ داخل درس ہو کر اطرافِ ہند میں مقبول ہوا۔ اب کثرت استعمال سے یہ سلسلہ اسمٰعیل ریڈرس کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ مولانا کی نثر کا انداز ایسا ہی شگفتہ ہے جیسی اُن کی نظم اپنی سادہ بیانی میں بے نظیر ہے۔ جب سے جریدۂ عبرت ۱۸۸۵ء اور آثارِ سلف مصنفہ ۱۸۸۹ء کی اشاعت ہوئی ملک میں خاص و عام نے مان لیا۔ کہ ہندوستان کے اُفق شاعری پر ایک نیا آفتاب طلوع ہوا ہے۔ جو بزم سخن کے جدید شعراء کی صفِ اوّل میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ سخن فہم حضرات مولانا کے کلام کا مطالعہ اور دیگر معاصرین کے کلام سے مقابلہ فرمائیں گے تو بلا شبہ مولانا کو اُردو شاعری کے طرزِ جدید کا مسلّم اُستاد اور یکے از بانیاں ضرور تسلیم کریں گے۔

مولانا کا رنگِ تغزّل تخیل کی پرواز، بیان کی سادگی، الفاظ کی نشست، تراکیب کی چُستی، قوافی کی برجستگی۔ غرض ہر پہلو سے غزل مرصّع ہوتی ہے۔ مولانا کی قدیم غزلوں میں

فلسفۂ عشق کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے جس کی بناء پر جدید اور قدیم رنگ میں ایک بیّن تفاوت ہے جو مطالعہ کے وقت خود بخود نمایاں ہو جاتا ہے۔ مولانا کو ابتذال سے سخت تنفّر تھا۔ اِس لئے مضمون آفرینی میں زیادہ فکر کرتے تھے۔ وہ شعرائے قدیم و جدید جنکی مشقِ سخن صرف غزل تک محدود ہے۔ اکثر پس خوردہ مضامین کو نئے نئے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن الفاظ کا لبادہ اُتارنے کے بعد یہ افکارِ تازہ اساتذہ قدیم کے کلام کی جُگالی معلوم ہوتے ہیں۔ البتّہ عصرِ جدید کے چند شعراء کا کلام اپنے طرز میں جدّت پُختگی اور تازگی رکھتا ہے۔

مولانا کی غزل کے غالب عناصر فلسفہ، پند و حکمت اور تصوّف ہیں۔ خود فرماتے ہیں کہ "غزل موضوع تو اِسی غرض سے ہوئی تھی کہ اُس میں محض عاشقانہ مضمون ہوں۔ مگر تصوّف، پند و حکمت، ظرافت وغیرہ اور مضامین بھی داخل ہو گئے ہیں" ایک جگہ اپنے اُستاد میرزا اسد اللہ خاں غالؔب کے کلام کے متعلق فرماتے ہیں "آخر میں دوستوں کی صلاح سے صاف گوئی اور سادہ بیانی اختیار کر لی تھی۔ بہر کیف اُن کا کلام بلاغت اور متانت کا عُمدہ نمونہ ہے۔ معانی کثیر کو الفاظ قلیل میں بڑے لُطف سے ادا کرتے ہیں" اور یہی روش مولانا کو مرغوب تھی۔ اپنے اُستاد کی زمینوں میں تیرہ ۱۳ غزلیں لکھیں ہیں۔ جن کے مُطالعہ سے ظاہر ہے کہ اُستاد کے مخصوص انداز میں پوری کامیابی حاصل کی ہے۔ مولانا کی غزلوں کا کُل مجموعہ چھیاسی ۸۶ غزلوں پر مشتمل ہے۔ لیکن جو کُچھ بھی اِس صنف میں لکھا ہے، اُس سے پختگیٔ کلام ٹپکتی ہے۔ اِس موقع پر غزلوں کے منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں:۔

(ملاحظہ ہو آئندہ صفحہ ۱۳۶)

تصوّف (۱)

توڑ اصنامِ ہوا اور دل کو ویرانہ بنا ۔۔۔ ہے یہی سنگِ بنا اِس کعبہ کی تعمیر کا

(۲)
وصل و فراق وہم سہی دل لگی تو ہے ۔۔۔ پھر ہم کہاں جو پردۂ رازِ نہاں اُٹھا

پروانہ کی تپش نے خدا جانے کان میں ۔۔۔ کیا کہہ دیا کہ شمع کے سر سے دُھواں اُٹھا

(۳)
جز نام نہیں نشان میرا ۔۔۔ سچ مُچ میں بحرِ بیکراں ہوں

پند و حکمت - (۱)

عیب پوشی کو ہمیشہ کام فرمایا کئے ۔۔۔ کُشتۂ الطاف ہوں یارانِ بے تدبیر کا

(۲)
جُرم بھی اور خیرگی؟ یہ سیرتِ ابلیس ہے ۔۔۔ ابنِ آدم کو ہے شایاں عذرہی تقصیر کا

(۳)
معنی میں کر تلاش معاشِ دماغ و دل ۔۔۔ حیواں صفت نہ لذّتِ کام و دہاں اُٹھا

(۴)
جس دل سے کدورت نہ گئی خاک ہے وہ دل ۔۔۔ کیا آئینہ جو اہلِ صفا ہو نہیں سکتا

(۵)
نہ کر کسی سے بُرائی نہ بن بھلے سے بُرا ۔۔۔ بھلا بھلا ہے بُرا کام ہے بُرائی کا

(۶)
ناقص بھی کاملوں سے کچھ کم نہیں کہ ان سے ۔۔۔ سیکھا ہے کاملوں نے کسبِ کمال کرنا

(۷)
جو گدھا خُوئے بد کی دَل دَل میں ۔۔۔ جا پھنسا پھر کبھی رِہا نہ ہوا

(۸)
جو ہو جائے خطا کوئی کہ آخر آدمی ہو تُم ۔۔۔ تو جتنا جلد ممکن ہو کرو اُس کا بدل اچّھا

کرے جو پاؤں بدراہی تو سونا اُس کا بہتر ہے ۔۔۔ نہ ہو جس ہاتھ سے نیکی تو ایسا ہاتھ شل اچھا

(۹)
کبھی بھُول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا ۔۔۔ کہ جو کوئی تم سے کرتا تُمھیں ناگوار ہوتا

(۱۰)
کرنے دو بدی کرے جو کوئی
اُس کا بھی خدا بھلا کرے گا

(۱۱)
کمتر ہے ددو دام سے انسان بمراتب
ہر دم جو ترقّی نہ کرے چال چلن میں

(۱۲)
دوستی اور کسی غرض کے لئے
وہ تجارت ہے دوستی ہی نہیں

(۱۳)
اظہارِ مشیخت ہے نشاں بے ہُنری کا
جو اہلِ ہُنر ہیں کبھی دعویٰ نہیں کرتے

ترغیبِ عمل

غایتِ ترکیب اعضا ہے یہی کچھ کام کر
کاہلی اے بے خبر منشا نہیں تقدیر کا

ظرافت

ہمارے دل سے کدورت مٹائے تو جانیں
کھلا ہے شہر میں ایک محکمہ صفائی کا

مقصود شعر

اُسی کا وصف ہے مقصود شعر خوانی سے
اُسی کا ذکر ہے منشا غزل سرائی کا

اپنی نسبت

نہیں ہے اب کے زمانہ کی یہ روشِ نہار
میں یادگار ہوں خاقانی و سنائی کا

(۲)
مبدءِ فیّاض کے شاگرد کو
حاجتِ آموزشِ اُستاد کیا

(۳)
ہوں میں تو وہی معتکفِ گوشۂ عزلت
حالانکہ میرا ریختہ پہنچا ہے دکن میں

صبر

کام اگر حسب مُدّعا نہ ہُوا
تیرا چاہا ہوا بُرا نہ ہُوا

توکّل

رہ روِ مسلکِ توکُّل ہے
وہ جو محتاج غیر کا نہ ہوا

ہمدردی

ذرا غمزدوں کے بھی غمخوار رہنا
کریں ناز تو ناز بردار رہنا

فراخی و عسرت میں شادی و غم میں
بہر حال یاروں کے تم یار رہنا

ہمّت

سمجھ نردباں اپنی ناکامیوں کو
کہ ہے شرطِ ہمّت طلب گار رہنا

جہاں تیغِ ہمّت علم دیکھتے ہیں
(۲) محالات کا سر قلم دیکھتے ہیں

خوفِ ناکامی ہے جب تک کامیابی ہے محال
(۳) مشکلیں جب بندھ گئی ہمّت سب آساں ہوگئیں[۱]

ہمّت کے لئے عار ہے احسان اُٹھانا
(۴) وہ درد بھی اچھا جو نہ محتاجِ دوا ہو

ہمہ اوست

ہے اِک آئینہ خانہ بزمِ کثرت
بتاؤں غیر کس کو ماسوا کیا

بزم ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں
(۲) ہے یہ تیری ہی صدا غیر کی آواز نہیں[۲]

تسلیم و رضا

نہیں معلوم کیا واجب ہے کیا فرض
میرے مذہب میں ہے تیری رضا فرض

سادگی

تاثیر ہو کیا خاک جو باتوں میں گھڑت ہو
کچھ بات نکلتی ہے تو بے ساختہ پن میں

سودا پر میر کو ترجیح

یہ سچ ہے کہ سودا بھی تھا اُستادِ زمانہ
میری تو مگر میر ہی تھا شعر کے فن میں

---

[۱] یہ غزل بھی اپنے اُستاد میرزا غالب کی زمین میں لکھی تھی [۲] اِس مطلع کی داد خان بہادر لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی نے بہت دی تھی۔ جبکہ مولانا کی موجودگی میں یہ غزل جامع سوانح نے جناب اکبر کو سُنائی تھی۔ ۱۲

ذوقِ طلب

ساقی اِدھر تو دیکھ کہ ہم دیر مست ہیں کچھ مستیِ نگہ بھی مِلا دے شراب میں[1]

نزاکتِ خیال

بس اے رنگ و بُو تو نہ کر نازِ بے جا خُدا جانے کیا بات، ہم دیکھتے ہیں[2]

قُدرتی کارخانے

نہیں ریل یا تار برقی پہ موقوف چُھپے قُدرتی کارخانے بہت ہیں

ابتدائے عشق

کیا کوہکن کی کوہ کنی کیا جنونِ قیس وادیٔ عشق میں یہ مقام ابتدا کے ہیں

دکن کی عظمت

جاتا ہے خاکِ پاکِ دکن کو یہ ریختہ واں قدرداں اِس گہرِ بے بہا کے ہیں
احباب کا کرم ہے اگر نکتہ چیں نہ ہوں ورنہ ہم آپ معترف اپنی خطا کے ہیں

گردشِ زمانہ

زمانہ اُن سے کراتا ہے آج خار کشی جو محوِ سرو و صنوبر تھے خانہ باغوں میں
اُنھیں یہ گردشِ ایّام کا گِرا نزلہ سمائی بوئے گُل و مُل تھی جن دماغوں میں
وہ عطرِ فتنہ سے بستا تھا جن کا پیراہن میسّر اب نہیں روغن انھیں چراغوں میں
وہ مانگ تانگ کے پیتے ہیں اوک سے پانی بھری تھی جن کے مئے مشک بُو ایاغوں میں

بے نشانی

---

[1] اکثر اہلِ ذوق کو مولانا کا کلام جامع سوانح نے سُنایا کیونکہ مولانا اپنی زبان سے اپنا کلام نہیں سُنایا کرتے تھے اِس شعر کی داد ہر سخن فہم نے بڑی شد و مد سے دی۔ یہ غزل اپنے اُستاد میرزا غالبؔ کی زمین میں لکھی تھی غالباً ۱۸۶۵ء میں۔ [2] اِس شعر پر خواجہ الطاف حسین حالؔی کو وجد کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ بار بار داد دیتے اور بار بار اِس کے پڑھنے کی فرمایش فرماتے تھے۔ ۱۲

سَر ہی کے بل گئے ہیں سدا رہروانِ عشق حیرت زدہ نہ بن کہ نشانِ قدم نہیں

حسنِ ذات

عارضِ روشن پہ جب زلفیں پریشاں ہو گئیں کفر کی گمراہیاں ہم رنگِ ایماں ہو گئیں [۱]

فلسفہ

اِک فرشتے بھی تو ہیں جن کو نہ محنت ہے نہ رنج خواہشیں دل کی بلائے جانِ انساں ہو گئیں

خودی

تھی وہ توفیقِ الٰہی میں نے سمجھا اپنا فعل طاعتیں بھی میرے حق میں عینِ عصیاں ہو گئیں

بے ثباتیِ عالم

بُلبُل کے دِل میں داغِ وداعِ بہار ہے یارب کوئی فریفتۂ رنگ و بُو نہ ہو

دل آزاری گُناہ ہے

دردِ دلِ آزردہ سے ہے جن کو خبر کچھ آزار کسی کا بھی گوارا نہیں کرتے

مولانا کا اخلاقی کلام | شہر میرٹھ کے محلہ مشائخان میں ایک متوسط الحال خاندان میں ایک ایسا ہونہار فرزند پیدا ہوا، جو بڑا ہو کر سادگی۔ اخلاق۔ اِتّقا۔ حِلم۔ انکسار اور ہمدردی کی صفات سے متّصف ہوا۔ اہلِ محلّہ۔ اہلِ برادری۔ اہلِ شہر جن کا اُس سے سابقہ پڑا۔ ابتک اُس کے حُسنِ اخلاق کو یاد کرتے ہیں۔ صرف یہی نہیں، اُس کی تصنیفات و تالیفات نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں جہاں اُردو زبان بولی اور پڑھی جاتی ہے اُس کو روشناس کرادیا۔ اُس کا کلام ایسا مقبولِ خاص و عام ہوا کہ لاکھوں

---

[۱] یہ مطلع مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کے اصرار پر لکھا تھا، اُس وقت یہ غزل بغیر مطلع کے تھی۔ اور اسی صورت میں مولانا حالی کو سُنائی تھی ۱۲۔

اہلِ وطن اُس سے مستفید ہوئے۔ یہ شخص تعلیم کی کمی اپنے فطری ذوق اور ذاتی جدّوجہد سے پوری کرتا ہے جو کمال اپنی کوشش سے حاصل کیا اُسے اہلِ وطن کی ترقیٔ علم واخلاق کے لئے پیش کیا۔ باوجود ابتدائی رکاوٹوں کے پبلک نے رفتہ رفتہ اُن خدمات کا اعتراف کیا۔ وہ کبھی امراء کی صحبتوں میں باریابی کا خواہشمند نہ ہوا۔ نہ چند فلوسہائے گندہ کی خاطر رؤسا کی چاپلوسی اور بے جا تعریف سے اپنے قلم کو شرمندہ کیا۔ اس نے مبدءِ فیض سے سبق لیا۔ ہندی اور اُردو زبان کے سادہ، شُستہ، دلپذیر اور شیریں الفاظ میں اخلاق وحکمت کے پھولوں کے گلدستہ سجائے کہ جنھیں دیکھ کر بچّوں اور بڑوں سب کو یکساں وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے، ملاحظہ ہوں اشعارِ ذیل :۔

ہمّت

گھوڑ دوڑ میں گدائی کی بادی تھی ایک دن　　تازی پہ کوئی تُرکی پہ اپنے سوار تھا
جو ہچکچا کے رہ گیا سو رہ گیا اِدھر　　جس نے لگائی ایڑ وہ خندق کے پار تھا

(۲)

گلستانِ جہاں میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی　　مگر جو گُل کے جویا ہیں اُنھیں کیا خار کا کھٹکا

کسبِ کمال

کوئی پیشہ ہو زراعت، یا تجارت یا کہ علم　　چاہئے انسان کو پیدا کرے اُس میں کمال
کاملوں کی عُمر بڑھ جاتی ہے خود کر لو حساب　　باہُنر کا ایک دن اور بے ہُنر کا ایک سال

دُور بینی

جنھیں دی ہے خُدا نے عقلِ دانا　　ہے اُن کو آج ہی سے فکر کل کی
مُسافر چل پڑا جو آخرِ شب　　تو ہو جاتی ہے منزل اُس کی ہلکی

بدی کے عوض میں نیکی کرو

ہر ایک جانور کا یہی خاصّہ ہے بدی کے عوض میں بدی کی تو کیا کی
ہے البتّہ وہ شخص انسانِ کامل جفا کے مقابل میں جس نے وفا کی

دل کی یکسوئی

اگر دل گرفتار ہے مخمصوں میں تو خلوت بھی بازار سے کم نہیں ہے
مگر جس کے دل کو ہو یکسوئی حاصل تو وہ انجمن میں بھی خلوت نشیں ہے

امیر اور غریب

خوش ہیں غریب اپنے اُن جھونپڑوں کے اندر جو دُھوپ کی تپش سے دوزخ کی بھٹّیاں ہیں
شاکی ہیں اہلِ دولت حالانکہ اُن کے گھر میں پنکھا بھی کھنچ رہا ہے اور خس کی ٹٹّیاں ہیں

لالچ

ہم حرص کے بندوں کو دُنیا جو نہیں ملتی تو بنتے ہیں بے پروا۔ پر دل میں ہیں للچاتے
اِک لومڑی کہتی تھی جب بس نہ چلا اُس کا انگور ہوئے کھٹّے۔ مجھ کو تو نہیں بھاتے

آزادی

مِلے خُشک روٹی جو آزاد رہ کر تو وہ خوف و ذلّت کے حلوے سے بہتر
جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو بھلی اُس محل سے جہاں کچھ خطر ہو

استقلال

تیزی نہیں منجملۂ اوصافِ کمال کچھ عیب نہیں اگر چلو دھیمی چال
خرگوش سے لے گیا ہے کچھوا بازی ہاں راہِ طلب میں شرط ہے استقلال

ملاپ

جب تک کہ سبق ملاپ کا یاد رہا　　بستی میں ہر ایک شخص دل شاد رہا
جب رشک و حسد نے پھوٹ اُن میں ڈالی　　دونوں میں سے ایک بھی نہ آباد رہا

میٹھی بات

جو بات کہو صاف ہو، ستھری ہو بھلی ہو　　کڑوی نہ ہو، کھٹّی نہ ہو، مصری کی ڈلی ہو

بد کی صحبت سے پرہیز واجب ہے

بد کی صحبت میں مت بیٹھو اِس کا ہے انجام بُرا　　بد نہ بنے تو بد کہلائے بد اچھا بدنام بُرا

سیدھا راستہ

راستی سیدھی سڑک ہے اِس میں کچھ کھٹکا نہیں　　کوئی رہرو آج تک اس راہ میں بھٹکا نہیں

یادِ ایّام

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا　　یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانہ کی خاک

حقیقت پر نظر

ساغرِ زرّیں ہو یا مٹّی کا ہو ایک ٹھیکرا　　تو نظر کر اُس پہ جو کچھ اُس کے اندر ہے بھرا

یہ انمول موتی جو مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر یہاں پیش کئے گئے ہیں ضرب المثل بنکر چھوٹے بڑوں کی نوک زباں پر جاری ہیں جس نے ایک بار یہ کلام پڑھ لیا ہے اُسکی لذّت سے دل و دماغ کو دائمی سرور حاصل ہے یہ وہ ابدی حقائق ہیں جن کا سُننے والا بقول میرزا غالب بے ساختہ کہہ اُٹھتا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مولانا کے کلام کا دوسرا دور ۱۸۷۰ء سے ۱۸۸۷ء تک

دوسرا دور سترہ سال پر مشتمل ہے اس زمانہ میں صرف تین سال کے لئے مولانا ضلع اسکول سہارنپور میں بطور مُدرّس فارسی

تبدیل ہو کر تشریف لے گئے تھے۔ تقرریٔ اوّل تک جو ۱۸۶۰ء میں ہوئی تھی۔ زبانِ فارسی کی تحصیل پر متوجہ رہے۔ فارسی زبان کا اکتساب میرزا رحیم بیگ مرحوم سے کیا تھا بعد ملازمت بھی فارسی زبان کی تکمیل میں منہمک رہے۔ زمانۂ قیام سہارنپور میں ادبِ عربی پر عبور حاصل کیا۔ سہارنپور میں عربی زبان کے ماہرین کا اجتماع تھا چنانچہ مولانا نے یہ تین سال کا وقت تحصیلِ زبان عربی میں صرف کیا۔ شاعری سے دلچسپی جاری رہی۔ سہارن پور کے قیام میں چند قصیدے اور کچھ نظمیں بزبانِ فارسی تصنیف فرمائیں۔ طرز جدید کی نظمیں بالخصوص بچّوں کی اخلاقی تربیت کے واسطے دورِ ثانی کے اندر کافی تعداد میں تصنیف فرمائی ہیں۔ مثنوی فکرِ حکیم ۱۸۷۳ء میں طبع ہوئی ہے یہ سرتاسر طرز جدید میں لکھی ہے لیکن اُس میں فارسی تراکیب کی کثرت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک فارسی شعراء کا کلام زیادہ مرغوبِ طبع تھا۔ سرسیّدؒ نے اِس مثنوی کے متعلّق اپنے ریویو میں یہ تحریر فرمایا تھا کہ یہ "شاعر اکثر محاورۂ اُردو کا استعمال کرے تو بہتر ہو"۔

اِس دور میں ایک قصّہ مسمّٰی بہ "طلسمِ اخلاق" تصنیف فرمایا۔ اُس کی عبارت مقفّٰی ہے، مضمون اخلاقی ہے لیکن فسانۂ عجائب کے طرز تحریر کی سرتاسر نقل ہے۔ بعد میں اِس طرز سے سخت نفرت کا اظہار کیا ہے۔ اِسی زمانہ میں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد سے دہلی میں ملاقات ہوئی اور اُن کی فرمایش پر چند مثنویاں انجمن پنجاب کے مشاعرے کے لئے تصنیف فرمائی ہیں۔ اُن میں سے دو نہ مل سکیں اور ایک الموسوم بہ "آبِ زُلال" کلّیاتِ اسمٰعیل مطبوعہ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی ہے۔ اِسی دَور کی تصنیف کردہ نظمیں وقتاً فوقتاً نجم الاخبار میں طبع ہوئی ہیں یہ اخبار غالباً ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا تھا۔ اور آٹھ

دس سال میرٹھ میں جاری رہ کر آگرہ منتقل ہوگیا۔ اِسی دور میں جنگِ روم و روس پر نظمیں لکھی گئیں ہیں۔ کچھ تصانیفِ نثر اس زمانہ میں لکھی ہیں اور قواعد اُردو کی تحقیق اور تدوین کا ابتدائی کام بھی اسی زمانہ میں شروع ہوا۔ اب مولانا کے کلام میں ہندی الفاظ اور اُردو محاورہ کا استعمال آزادی کے ساتھ ہونے لگا ہے۔ بیان میں سادگی اور روانی نمایاں ہے۔ غالباً ۱۸۷۷ء میں حضرت قبلہ مولانا سیّد غوث علی شاہ پانی پتی رح سے بیعت ہوئے اور تصوّف پر کلام اِس دور میں لکھنا شروع کیا۔ شیخ کا وصال مارچ ۱۸۸۰ء میں ہوا۔ مثنوی "دورِ آخر" فارسی میں۔ "نالۂ چند در فراقِ شیخ" بصورت ترجیع بند اُردو میں اور متعدد قطعات تاریخ اُردو و فارسی اِسی دَور کی تصنیف ہیں۔ کلام میں پختگی، سلاست اور سادگی صاف طور پر نُمایاں ہے۔

قصیدالموسوم بہ "جریدۂ عبرت" مصنّفہ ۱۸۸۵ء اِسی دَور کی تصنیف ہے۔ ایسی نظم کو انگریزی میں "سٹائر" کہتے ہیں۔ قوم کے نام نہاد رہنما اور خواص و عوام کی تباہی کج روی و بد اخلاقی کی سچّی تصویریں۔ جوشیلے مگر مخلصانہ پیرائے میں نہایت مؤثر انداز سے کھینچی ہیں۔ اِس نظم کا اصلاحِ معاشرت و اخلاق کے حامیوں نے بہت ذوق و شوق سے خیر مقدم کیا تھا۔ یہ مسدّسِ حالیؔ سے چھ سال بعد کی تصنیف ہے ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریا آنجہانی کی تہنیت جوبلی کا قصیدہ طرزِ نو کا پہلا نمونہ ہے۔ مختصر یہ ہے کہ سترہ سال کا زمانہ مولانا کی شاعری کے عُمدہ نمونے پیش کرتا ہے، اور اس میں کُچھ کلام ہی نہیں کہ اشاعت اور شہرت کے ذرایع حاصل ہوتے تو بہت قبل مولانا مُلک سے بہ حیثیت ایک مایۂ ناز شاعر کے روشناس ہو چکے ہوتے۔

مولانا کی شاعری کا تیسرا دور ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۹ء تک

مولانا جولائی ۱۸۸۸ء میں میرٹھ سے تبدیل ہو کر آگرہ تشریف لے گئے۔ آگرہ کی سب سے پہلی تصنیف مُشعرِ کیفیت قلعہ اکبر آباد الموسوم بہ "آثارِ سلف" (مئی ۱۸۸۹ء) ہے مضمون کی موزونیت کے لحاظ سے بحر اور انداز بیان یعنی "اسٹائل" کی بھی وہی شان ہے جیسا کہ مضمون چاہتا ہے۔ عمارت قلعہ کی خوبی و عظمت، بانیٔ قلعہ کا اقبال و جلال، اس کی پالیسی اور کارنامے، سلطنت مغلیہ کی شان و شکوہ۔ اِس کے مقابلہ میں دَورِ حاضرہ کی پستی و شکستہ حالی۔ مستقبل کے لئے ہمّت و استقلال سے کام لینے کی نصیحت تلافیٔ مافات کے لئے میدانِ علم میں صف آرا ہونا۔ غرض اِن کیفیات و جذبات کا مُرقّعہ اِس درد انگیز نظم میں خوب کھینچا ہے۔ اِس کی اشاعت مولوی سراج الدین احمد اڈیٹر چودھویں صدی نے بہ اصرار اپنے اخبار کے ذریعہ سے کی تھی۔ اِس تفصیل کا کسی دوسرے مقام پر ذکر آچکا ہے۔ اِس کی اشاعت پر نقّادانِ سخن نے ہم نوا ہو کر دادِ سخن کا حق ادا کیا تھا۔ آج تک یہ نظم اپنی وضع میں بے مثل مانی گئی ہے۔ اِسی زمانہ میں مولانا نے جدید طرز پر قواعد اُردو مرتّب فرمائی اور اِس کے دُو حصّے آگرہ سے شایع ہوئے ہیں۔ یہی زمانہ ہے کہ مولانا نے اپنا مشہور و معروف اور مقبولِ خاص و عام اُردو زبان کی ریڈروں کا سلسلہ تصنیف فرمایا ہے۔ یہ وہ ریڈریں ہیں جن کی تعریف میں آج تک اہلِ قلم رطب اللسّاں ہیں۔

اِس سلسلہ میں وہ نظمیں بھی ہیں جو "ریزۂ جواہر" میں شایع ہو چُکی تھیں۔ مگر بعض نظمیں اِس سلسلہ کی تدوین کے وقت تصنیف فرمائی ہیں۔ اِن جدید نظموں کے طرز بیان میں محاورہ اور رنگینیٔ الفاظ نے ایک عجیب دل کشی پیدا کر دی ہے۔

قیامِ آگرہ میں غزلیں بھی کافی تعداد میں لکھی گئیں ہیں اور وہ سب طرزِ جدید ہیں۔ کچھ غزلیں اُن طرحوں میں لکھی ہیں، جو اُس وقت کے رسائل میں طبع ہوتی تھیں اور جن میں داغ، امیر اور جلال کی غزلیں بھی ہیں۔ اِن اساتذہ کی غزلوں سے مولانا کی غزلوں کا موازنہ اور مولانا کے قدیم وجدید طرز کا فرق معلوم کرنا شعروسخن کے محققین کے لئے باعثِ استفادہ اور موجبِ دلچسپی ثابت ہوگا۔ آگرہ کے قیام میں مثنوی "سیف و قلم" اور "شمع ہستی" بھی تصنیف فرمائی ہیں۔ یہ دونوں مثنویاں رسالہ 'معارف' میں جس کے اڈیٹر مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی تھے اور جو علی گڑھ سے شایع ہوتا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں شایع ہوئی تھیں۔ مولانا نے مثنوی میں اپنے زورِ طبع اور قادر الکلامی کا کمال دکھایا ہے۔ اُن کی تصنیف سے کوئی طولانی مثنوی تو ہے نہیں اور نہ کسی مثنوی میں کوئی قصہ یا طویل مضمون نظم کیا ہے البتہ خصائص مثنوی پر غور کرتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مولانا کا کلام اِس صنف میں بھی ایک کامل نمونہ ہے۔ اب مولانا کا کلام نظم و نثر نہ صرف یوپی بلکہ دوسرے صوبوں میں حتّٰی کہ دکن تک پہنچ چکا ہے اور قبولِ خاص و عام کا سہرا اس کو مل چکا ہے۔ خود فرماتے ہیں ؎

ہوں میں تو وہی معتکفِ گوشۂ عزلت
حالانکہ میرا ریختہ پہنچا ہے دکن میں

مولانا کی شاعری کا چوتھا اور آخری دور ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۷ء تک

یہ دور بھی دوسرے دور کی طرح سترہ سال پر مشتمل ہے، یہ آخری دور ہے۔ کیونکہ یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو مولانا نے اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی ہے۔ اِس دور میں چار مشہور قصیدے لکھے ہیں۔ پہلا "نوائے زمستاں" کے نام سے شایع ہوا تھا اس قصیدہ میں ایک سو ساٹھ شعر ہیں

اِس کی تشبیب میں علمِ ہیئت کے نکات بیان کیے ہیں۔ پھر سچّے مسلمان کی تعریف ہے، گداگری کے معائب اور اقتصادی خرابیاں جو اُن سے پیدا ہوتی ہیں۔ ناول نگاری اور طرزِ قدیم کی شاعری کا خاکہ اُڑایا ہے۔ اکتساب علوم و فنون سے مُسلمانوں کی غفلت رہنمایانِ قوم سے خطاب۔ یونیورسٹی کے محاسن کا بیان۔ اِس کے قیام کے لئے سعی اور آخر میں نہایت پُرزور الفاظ میں مُسلمانوں سے فراہمی چندہ کا اپیل کیا ہے قصیدہ نگاری میں مولانا کے طرزِ خاص کا یہ بہترین نمونہ ہے۔ اِس کے بعد ایک قصیدہ الموسوم بہ "نویدِ مقدمِ شاہی" ہے یہ قدماء کے طرز سے بالکل نرالا ہے۔ اِس کے بعد ایک قصیدہ الموسوم بہ "خدائی لشکر" اِس میں مسلم طلباء الٰہ آباد یونیورسٹی کو مخاطب کیا ہے۔ پھر وہ قصیدہ ہے جو تہنیت دربار پر لکھا گیا تھا۔ اور دہلی کے دربار کے موقع پر ۱۲ر نومبر ۱۹۱۱ء کے جلسہ میں پیش ہوا تھا۔ یہ سب قصیدے نرالی شان رکھتے ہیں اور خصوصیات قصیدہ کے مکمّل نمونہ ہیں۔ شوکتِ الفاظ، چُستیٔ تراکیب، روانیٔ کلام، صفائیٔ بیان، بلندیٔ تخیّل، یہ سب خوبیاں ان میں پائی جاتی ہیں۔

اِس دَور میں قطعات زیادہ لکھے ہیں اور بر بنائے کمالِ سادگی عجیب لُطف دیتے ہیں۔ ایک قطعہ اخبار "زمیندار" کے بند ہو جانے پر لکھا تھا۔ اِس میں مولانا کی لطیف ظرافت کا نمونہ نظر آتا ہے۔ ایک قطعہ نجم الاخبار کی تقریب سال گرہ پر لکھا تھا یہ غالباً ۱۸۸۳ء کی تصنیف ہے لیکن اِس میں اُن کے اُستاد میرزا اسد اللہ خاں غالب کا قدیم رنگ جھلکتا ہے۔ پانچ نئی غزلیں ہیں۔ ایک اپنے شیخ کی تعریف میں ایک خواجہ میر دردؔ رحمۃ اللہ علیہ کی زمین میں اور ایک اپنے اُستاد میرزا غالبؔ کی زمین میں۔ ایک غزل میں سر جیمس ہیسٹن کا شکوہ ہے کہ اُنھوں نے مسلمانانِ کانپور

کے حق میں عادلانہ برتاؤ نہ فرمایا جب کہ مسجد کانپور کے متعلق وہاں کے مسلمانوں نے معمولی اور مروّج طریق پر صدائے احتجاج بلند کی تھی، اس غزل میں ایک خاص درد پایا جاتا ہے۔ غالباً اِس وضع میں مولانا کی تصنیف سے یہ پہلی نظم ہے۔ ایک غزل ظریفانہ انداز میں اپنے نبیرہ اسلام احمد سیفی کے لئے لکھی تھی۔ اُس وقت وہ سات سال کا تھا۔ حکیم مومن خاں کے چند مصرعوں کو تضمین کیا ہے۔ ایک اور غزل میں رنگِ ظرافت پایا جاتا ہے۔ اُس کا مطلع ہے ؎

سر زمینِ ہند کا میوہ ہے پھوٹ   بوالہوس گرتے ہیں اُس پر ٹوٹ ٹوٹ

اِس غزل میں بوٹ، سوٹ، روٹ، جوٹ، انگریزی الفاظ قافیوں میں استعمال کیئے ہیں آخر میں فرماتے ہیں ؎

کیا ہمارے شعر اور کیا شاعری   گا ہے ماہے اور وہ بھی جھوٹ موٹ

ایک غزل بہ تقریبِ سنگِ بنائے مدرسۂ فیضِ عام لکھی تھی۔ سنگِ بُنیاد سر جیمیس میسٹن نے رکھا یہ اب لارڈ میسٹن ہیں۔ اُس زمانہ میں یوپی کے لفٹنٹ گورنر تھے اِس نظم کی رنگینی میں عجیب دل فریبی ہے۔

یہ سترہ سال کا زمانہ بھی بہت کچھ علمی مشغولیتوں کا حامل رہا ہے۔ لغاتِ درسیہ کا بہت کچھ حصہ مکمّل کیا ہے۔ اساتذہ ماضی و حال کے کلام سے اشعار ہندی و فارسی الفاظ کا استعمال دکھانے کے لئے بطورِ سند انتخاب کئے ہیں۔ مگر افسوس یہ کام ناتمام رہا۔ ۱۹۱۳ء میں اُردو قواعد کے دو حصّے از سرِ نو تالیف فرمائے تھے۔ اِس ترتیب میں اور ۱۸۹۴ء کے تصنیف کردہ دونوں رسالوں میں بے حد تفاوت ہے۔ اِس نئی تحقیق کی بنا پر مولانا کا قصد تھا کہ قواعدِ اُردو کی تکمیل چار حصّوں میں کی جائے۔

چنانچہ تیسرے حصّہ کی تدوین میں مصروف تھے کہ نواب محمد اسحاق خاں صاحب مرحوم جو اُن دنوں مدرستہ العلوم علی گڈھ کے سکرٹری تھے، مولانا سے مُصر ہوئے کہ وہ حضرت امیر خسروؒ کی مثنوی قران السعدین پر تنقید لکھ دیں اور حیات خسروؒ کی تصنیف بھی اپنے ذمّہ لے لیں۔ مولانا اخلاق کے پُتلے تھے۔ اپنے دلچسپ مشاغل چھوڑ کر اس کام پر متوجہ ہوئے سنہ ۱۹۱۴ء سے تادمِ واپسیں اِسی ادبی کام کی انجام دہی میں مصروف رہے۔

اقسامِ نظم کے لحاظ سے مولانا نے ہر صنفِ سخن میں زورِ طبع دکھایا ہے۔ شاید یہ لکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ مولانا نے ہر صنفِ سخن میں کس قدر نظمیں لکھی ہیں۔ اس لئے وہ تفصیل اِس مقام پر پیش کی جاتی ہے:۔

(۱) رُباعیاں ۸۱۔ (۲) غزلیں ۸۸۔ (۳) قصیدے ۱۹ (تمام و ناتمام)۔ (۴) قطعات ۶۱ (۵) مثنویاں ۱۰۷۔ (۶) مثلث ۲۔ (۷) مربع ۲۔ (۸) مخمّس ۵۔ (۹) مُسدّس ۶۔ (۱۰) مثمّن ۱ (۱۱) ترجیع بند ۲۔ (۱۲) نظمِ بے قافیہ ۲۔ (۱۳) ابیات ۱۶۔

مولانا کا کلام محتاجِ تعارف نہیں۔ اہلِ ملک کی قدر دانی نے پورے طور پر دادِ سخن دی ہے۔ مولانا کا مرتبہ مسلّم الثبوت اساتذہ میں مانا گیا ہے۔ اِن کا کلام زبانِ اُردو کی ادبی کُتب میں بہ کثرت انتخاب کیا جاتا ہے۔ مختلف تذکروں میں اُن کے کلام پر بہترین خیالات کا اِظہار کیا گیا ہے۔ اُردو نظموں کے مشہور منتخبات میں اُن کی نظمیں زینت بخشِ کتاب ہیں۔ اُن کے کلام کی مخصوص صفت سادہ بیانی ہے۔ جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؎

روشِ سادہ بیانی میری ہے یہ تیغِ صفہانی میری

مولانا کا کلامِ منظوم بہ لحاظِ نفسِ مضمون تین حصّوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ ایک تو مخصوص بچّوں کے واسطے، دُوسرے میں قومی نظمیں اور تیسرے میں تصوّف۔

مولانا کے ہم عصر اُن سے عُمر میں بڑے تھے اِس لئے سب اُن کے پیش رو تھے اور اپنا اپنا رنگ اختیار کر چکے تھے۔ مثلاً: شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی اور شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد۔ یا مثلاً نواب میرزا داغ۔ مولانا امیر احمد امیر مینائی اور حضرت جلال لکھنوی[۱]

مولانا نظم پر تو قدرت رکھتے ہی تھے اور اِس فن کا فطری ذوق بھی لیکن میدانِ عمل کا اِنتخاب ضروری تھا چنانچہ اُن کی طبیعت کی جودت نے وطن کے حالات کو پیشِ نظر رکھ کر پہلا انتخاب بچّوں کی اخلاقی تعلیم کا کیا۔ اِس مضمون کے لئے میدان کافی وسیع محکمۂ تعلیم سے تعلّق اور اُن حضرات کی صحبت نصیب جو کلچرل ترقّی کے حامی تھے۔ اُن کی قدر دانی نے ہمّت افزائی کی۔

مولانا کے قومی جذبات جیسا کہ اُن کے کلام سے ظاہر ہے کہ وہ قومی فلاح کے متعلق بہت تفکّر فرماتے تھے اور اُن کی زبردست خواہش تھی کہ مُسلمان کسی طرح سنبھل جائیں۔ اِن جذبات کو نرالے پاکیزہ اور مؤثر انداز میں طرح طرح سے نظم کیا ہے۔ مگر اپنا رنگ معاصرین سے الگ رکھا ہے۔

اگر اُن کو شوقِ شہرت دامن گیر ہوتا تو بہت آسان تھا کہ شمس العلماء خان بہادر مولانا ذکاء اللہ مرحوم کے تعارف سے سرسیّد رحمۃ اللہ علیہ کے لٹریری کلب میں شرفِ شرکت حاصل کرتے اور وہ بھی خواجہ حالی کے انداز میں کم از کم ایک طویل نظم سالانہ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں سُنایا کرتے۔ مگر اُن کے نزدیک یہ تقلید موجبِ دلچسپی نہ تھی۔

رہا کلامِ تصوّف تو بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے معاصرین میں سے کسی نے تصوّف پر

---

[۱] غلطی سے خان بہادر سیّد اکبر حسین الٰہ آبادی لسان العصر کا نام رہ گیا ہے۔

زورِ طبع نہیں دکھایا۔ نہ یہ مضمون ایسا ہے کہ اشعار میں اُن خیالات کا نقشہ جمایا جائے جن کا شاعر کے دل و دماغ پر کافی اثر نہیں ہے۔ اِن خیالات کی مصوّری وہی خوب کر سکتا ہے جس کے دل میں یہ بس چکے ہوں۔

مولانا کی رباعیات، مثنوی دورِ آخر فارسی میں۔ نالۂ چند در فراقِ شیخ اُردو میں، مثنوی دریادِ شیخ اور دوسری نظمیں اس امر کی دلیل ہیں کہ تصوّف کے مضمون پر مولانا کا کلام وہ تاثیر دِکھاتا ہے جو صرف اہلِ دِل سے وابستہ ہے۔

مختصر یہ ہے کہ مولانا کی ہر نظم میں سادگی، روانی، قوافی کی خوبی، بھاشا الفاظ کا استعمال تاثیر اس طرح پائی جاتی ہے کہ پڑھنے والا نہ صرف محظوظ ہوتا ہے بلکہ اُن خیالات سے متاثّر ہوتا ہے۔

لیکن مولانا محض شاعر نہ تھے۔ نثر میں اُن کی تحریر کی یادگار سب سے زیادہ ضخیم دو معرکۃ الآرا کتابیں ہیں۔ اوّل "تذکرہ غوثیہ"[1]۔ اس کتاب میں یہ خاص خوبی ہے کہ اس کا اندازِ تحریر آٹو بایوگرافی کا ہے گویہ ہے بایوگرافی۔ مگر چونکہ مولانا نے اپنے شیخ کی زبان سے وہ کلامِ فیض ترجمان خود سُنا تھا اِس لئے بلا کوشش وہ طرز اختیار کیا کہ گویا شیخ خود ہی تحریر فرمار ہے ہیں۔

دُوسری کتاب "مثنوی قران السّعدین"[2] ہے جو حضرت امیر خسروؒ کی تصنیف سے ہے، اِس کی تنقید بزبان اُردو ہے۔ اِس مثنوی کی تصنیف کے محرّکات اور اسباب، جائے وقوع، سُلطان معزالدین کیقباد شہنشاہِ ہند اور اس کے باپ سُلطان بغراخاں کے تعلّقات کی کشیدگی اور پھر حضرت امیر کی شاعری کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اِس مثنوی کی خُوبیاں اور جہاں کہیں اعتراض کی گنجائش تھی اُن کا اظہار۔ یہ اَدبی خدمات ایک مہتم بالشّان کام ہے۔

اِن کتابوں کے علاوہ اُن کی درسی کتابوں کا مشہور سلسلہ ہے جو اُردو کے سادہ اور شگفتہ طرز کے سکھانے میں آج تک بے بدل تسلیم کیا گیا ہے۔ غرض نثر میں بھی مولانا ایک طرزِ خاص کے موجد ہیں۔ مولانا کی زندگی میں ایک ادیب کی حیثیت سے وہ خصوصیات ہیں کہ آیندہ رہروؤں کے لئے ایک عُمدہ نمونہ پیش کرتی۔

کلیاتِ اسمٰعیل

از تصنیف

مولانا محمد اسمٰعیل مرحوم

رئیس

میرٹھ

مُرتّبِ کلیات

محمد اسلم سیفی

طبع اوّل سنہ ۱۹۱۱ء

طبع ثانی مکمّل سنہ ۱۹۳۹ء

دیباچہ کلّیاتِ اسمٰعیل

سنہ ۱۹۱۰ء میں میرا قصد ہوا کہ مولانا کا کلام ایک جگہ جمع کیا جائے۔ اُن نظموں کے علاوہ جو اُن کی اُردو کتابوں میں شائع ہو چکی تھیں یا ریزۂ جواہر میں یا جُداگانہ طور پر جیسے "آثارِ سلف" اور "جریدۂ عبرت"۔ بہت کچھ ذخیرہ باقی تھا مگر متفرق۔ میں نے اِس متفرق کلام کو جمع کیا، چونکہ غزلوں کی تعداد کم تھی اِس لئے بجائے دیوان کے "کلّیاتِ اسمٰعیل" نام تجویز کیا۔ کلام کی ترتیب بھی میں نے خود کی اور فٹ نوٹ بھی حسبِ ضرورت لکھے۔

افسوس ہے اُس وقت یہ خیال ہی نہ پیدا ہوا کہ مولانا سے التجا کروں کہ وہ کلّیات کا دیباچہ تحریر فرما دیں۔ ان کے کلام کا زیادہ حصّہ جدید طرز کی شاعری سے تعلّق رکھتا تھا۔ اِس طرز کو عام طور سے نیچرل شاعری کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ کیا اچّھا ہوتا کہ مولانا خود اس شاعری کی ابتدا اور اس کے مختلف مدارج پر ایک مبسوط تاریخی اور تنقیدی بحث تحریر فرماتے۔

کلّیاتِ اسمٰعیل کی اوّل اشاعت پر اہلِ مُلک نے نہایت تپاک کے ساتھ اِس کا خیر مقدم کیا۔ مری محنت کی بھی داد ملی۔ لیکن یہ اعتراض بھی ہر سمت سے پیش ہوا کہ کلّیات بغیر حیاتِ اسمٰعیل کے اَدھورا رہا۔ پہلا اڈیشن جلد ہی ختم ہو گیا تھا۔ میں نے یہ تہیّہ کر لیا تھا کہ کلّیات جب دوبارہ شائع ہوگا تو "سوانح حیات" کا اِس میں ضرور اضافہ کروں گا۔ ایک مدّت گذر گئی اور یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا اور اِسی وجہ سے کلّیات کی دوبارہ طباعت رُکی رہی۔

اب ہر طرف سے تقاضوں کا تار بندھا ہوا ہے اور کلّیات کے طالبین برابر اِس کی خواہش کرتے ہیں۔ مجھے بھی تھوڑی فرصت ملی تو پچھلے سال میں نے کُل کاغذات ایک جا کئے اور "سوانح حیات" کی تیاّری میں مصروف ہوا۔ الحمدللہ کہ وہ کام بھی پورا ہو گیا۔

پہلے صرف سوانح مصنّف کی کمی کا الزام تھا اب تاخیرِ اشاعت کا بھی ہے۔ مجھے اعترافِ قصور ہے ؎

احباب کا کرم ہے اگر نکتہ چیں نہ ہوں
ورنہ ہم آپ معترف اپنی خطا کے ہیں

اِس سلسلہ میں دو صاحبوں کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے ایک مسٹر سرفراز عالم اختر علیگ جنھوں نے ترتیبِ مضامین اور فہرستِ مضامین کے متعلق مجھے پُوری امداد نہایت خوش دلی کے ساتھ دی ہے، دوسرے مسٹر محمد مرتضیٰ صدیقی بی۔ اے علیگ ایل۔ ٹی کا انھوں نے کاپیوں کی تصحیح میں بڑے انہماک کے ساتھ کام کیا ہے۔

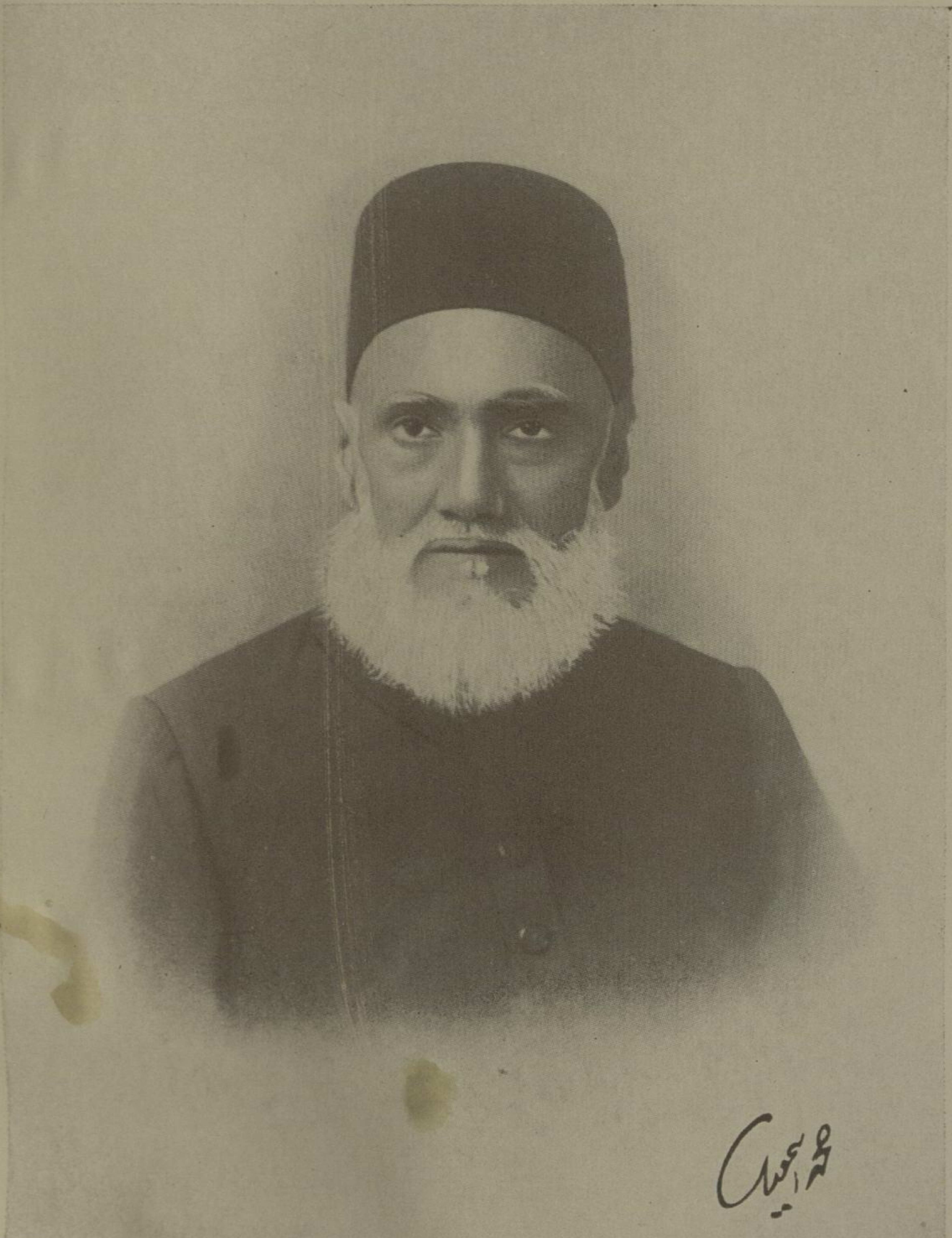
محمد اسلم سیفی

میرٹھ۔ مشائخان اورنٹیل ہاؤس

یکم ستمبر ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین کلیّات اسمٰعیل (اُردو)

نوٹ - جس نظم پر حرف غ بنایا گیا ہے، یہ غیر مطبوعہ ہے - اول بار اِس مکمل اڈیشن میں طبع ہوئی ہے۔ ۱۲


محمد اسمعیل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلیاتِ اسمٰعیل

مثنویات

۱- صنائعِ الٰہی

خدایا نہیں کوئی تیرے سوا اگر تو نہ ہوتا تو ہوتا ہی کیا
تصوّر تری ذات کا ہے محال کسے یہ سکت اور کہاں یہ مجال
تعقّل میں اِتنی صفائی کہاں تفکّر کو ایسی رسائی کہاں
یہاں عقل جاتی ہے آئی ہوئی تخیّل پہ ہیبت ہے چھائی ہوئی
تفکّر کے جلتے ہیں پر اِس جگہ تصوّر کا کٹتا ہے سر اِس جگہ

کسی کی یہاں دال گلتی نہیں — کسی کی یہاں چال چلتی نہیں
نہ ٹھیری کوئی ناؤ اِس موج میں — نہ پہونچا کوئی تیر اِس اوج میں
جَلا اِس ہَوا میں نہ کوئی چراغ — پریشاں ہوئے دِل تھکے سب دماغ
جو ہوتی مُشابہ ترے کوئی چیز — تو کچھ کام کرتی سمجھ یا تمیز
ترا کوئی ہم جنس و ہمتا نہیں — گماں کا یہاں پاؤں جمتا نہیں
سمجھ کیا ہے؟ اور کیا سمجھ کی بساط؟ — سمندر سے قطرہ کا کیا ارتباط؟
چلی بُوند لینے سمندر کی تھا — یکایک لیا موج نے اُس کو کھا
ہوئی آپ ہی گُم تو پائے کسے؟ — بتائے وہ کیا اور جتائے کسے؟
اگر تیری قدرت کی کاریگری — نہ کرتی سمجھ بوجھ کی رہبری
تو وہ سر پٹکتی ہی رہتی مدام — طلب میں بھٹکتی ہی رہتی مدام
بنائی ہے تو نے یہ کیا خوب چھت — کہ ہے سارے عالم کی جس میں کھپت
یہ سقفِ کہن ہے ابھی تک نئی — اِسے دیکھتے یوں ہی دُنیا گئی
زمیں پر گئیں کتنی نسلیں گزر — رہی اِس کی ہیئت پہ سب کی نظر
اِسے سب نے پایا اِسی ڈھنگ میں — اِسے سب نے دیکھا اِسی رنگ میں
عجب ہے یہ خیمہ رسن ہے نہ چوب — ہمیشہ مُصفّا ہے بے رُفت و رُوب
نہ در ہے نہ منظر نہ کوئی شگاف — اِدھر سے اُدھر تک ہے میدان صاف
جھروکا نہ کھڑکی نہ دَر ہے نہ چھید — عجب تیری قدرت عجب تیرے بھید

کہیں جوڑ ہے اور نہ پیوند ہے — جدھر دیکھئے اُس طرف بند ہے
بنایا ہے کیا دستِ قدرت نے گول — چُرس ہے نہ جُھرّی نہ سلوٹ نہ جھول
عجب قدرتی شامیانہ ہے یہ — نظر کی پہنچ کا ٹھکانا ہے یہ
ہوا کو دیا تو نے کیا خوب رنگ — سراسیمہ ہے عقل اور فکر دنگ
پرے اُس کی حد سے نہ جائے نظر — جہاں تک نظر جائے آئے نظر
یہ تارے جو ہیں آتے جاتے ہوئے — چمکتے ہوئے جگمگاتے ہوئے
نظر آرہے ہیں عجب شان سے — ہیں لٹکے ہوئے سقفِ ایوان سے
چراغ ایسے روشن جو بِن تیل ہیں — یہ تیری ہی قدرت کے سب کھیل ہیں
یہ لعل و گہر ہیں جو بکھرے پڑے — زمیں سے بھی ہیں اِن میں اکثر بڑے
کوئی اِن میں سورج کوئی اِن میں چاند — کہ یہ ماہ و خور سامنے جن کے ماند
نظر میں جو اِتنے سے آتے ہیں یہ — بہت دور چکّر لگاتے ہیں یہ
پڑے اپنے چکّر میں ہیں گھومتے — ترے حکم کے ذوق میں جھومتے
یہ قائم ہیں تیری ہی تقدیر سے — بندھے ہیں بہم سخت زنجیر سے
گِھسے جو کبھی اور نہ ٹوٹے کبھی — نہ اِس بند سے کوئی چھوٹے کبھی
رسائی سے ہاتھوں کی برتر ہے وہ — نظر کے بھی قابو سے باہر ہے وہ
نہ سیمیں نہ زرّیں نہ وہ آہنی — مگر دستِ قدرت سے ہے وہ بنی
کھُلے کب۔ کوئی اُس کو کھولے اگر — اُسے عقل پائے ٹٹولے اگر

وہ زنجیر کیا ہے کشش باہمی
نہ اُس میں خلل ہو نہ بیشی کمی

عجب تو نے باندھی ہے یہ باگ ڈور
تُلا سب کا رہتا ہے آپس میں زور

یہ سب لگ رہے ہیں اُسی لاگ پر
لگاتے ہیں چکّر اُسی باگ پر

ہر اِک کے لئے اِک معیّن ہے دَور
وہی اِک وتیرہ وہی ایک طَور

نشہ میں اطاعت کے سب چُور ہیں
کہ قانونِ قدرت سے مجبُور ہیں

سدا چال کا ایک انداز ہے
نہ کھٹکا نہ آہٹ نہ آواز ہے

کبھی چلتے چلتے ٹھٹکتے نہیں
طریقہ سے اپنے بھٹکتے نہیں

ہے اِن سب کا آئینِ ایجاد ایک
ہُنر ایک ہے اور اُستاد ایک

یہ شاخیں ہیں سب ایک ہی اصل کی
بہاریں ہیں کُل ایک ہی فصل کی

ہر اِک چیز ذرّہ سے تا آفتاب
بلاشبہ رکھتی ہے یکساں حساب

ہیں ذرّوں میں خورشید کی سی صفات
ہے خورشید بھی ذرّۂ کائنات

حقیقت میں ہے یاں دورنگی کہاں
جہاں ذرّہ ہے اور ذرّہ جہاں

نہیں تیری قدرت سے کچھ یہ بعید
کہ ہو ہر ستارہ جہانِ جدید

نہیں تیرے لُطف وکرم سے عجب
کہ ہو اُس جہاں میں بھی مخلوق سب

ہو گرمی بھی سردی بھی برسات بھی
اندھیرا اُجالا بھی دِن رات بھی

یہ ندّی یہ نالے سمندر۔ پہاڑ
یہی بیل بُوٹے درخت اور جھاڑ

ہَوا بھی ہو اور لُطفِ باراں بھی ہو
خزاں بھی ہو فصلِ بہاراں بھی ہو

ہو سر پر اِسی طور سے آسماں ہو پاؤں کے نیچے زمیں بھی وہاں
فلک پر ستارے بھی ہوں جلوہ گر وہاں بھی ہو دورانِ شمس و قمر
ہوں انسان بھی اور حیوان بھی
ہر اک جنس کا ساز و سامان بھی

(۲) خُدا کی صنعت

جو چیز خُدا نے ہے بنائی اُس میں ظاہر ہے خوشنمائی
کیا خُوب ہے رنگ ڈھنگ سب کا چھوٹی بڑی جس قدر ہیں اشیا
روشن چیزیں بنائیں اُس نے اچھّی شکلیں دِکھائیں اُس نے
ہر چیز کی ہے ادا نرالی حِکمت سے نہیں ہے کوئی خالی
ہر چیز ہے ٹھیک ٹھیک لاریب ہیں اُس کے تمام کام بے عیب
ننھّی کلیاں چٹک رہی ہیں چھوٹی چڑیاں پھُدک رہی ہیں
اُس کی قُدرت سے پھُول مہکے پھُولوں پہ پرند آکے چہکے
چڑیوں کے عجیب پَر لگائے اور پھُول ہیں عطر میں بسائے
چڑیوں کی ہے بھانت بھانت آواز پھُولوں کا جُدا جُدا ہے انداز
محلوں میں امیر ہیں بہ آرام ہے در پہ کھڑا غریب ناکام
ہے کوئی غَنی تو کوئی مُحتاج بے گھر ہے کوئی کِسی کے گھر راج
رُوزی دونوں کو دی خُدا نے معمُور ہیں قُدرتی خزانے

تاروں بھری رات کیا بنائی! دِن کو بخشی عجب صفائی!
موتی سے پڑے ہوئے ہیں لاکھوں ہیرے سے جڑے ہوئے ہیں لاکھوں
کیا دُودھ سی چاندنی ہے چھٹکی! حیران ہو کر نگاہ ٹھِٹکی!
تارے رہے صُبح تک نہ وہ چاند آگے سُورج کے ہو گئے ماند
نیلا نیلا اَب آسماں ہے وہ رات کی انجمن کہاں ہے
شام آئی تو اُس نے پردہ ڈالا پھر صُبح نے کر دیا اُجالا
جاڑا - گرمی - بہار - برسات ہر رُت میں نیا سماں نئی بات
جاڑے سے بدن ہے تھرتھراتا ہر شخص ہے دِن میں دُھوپ کھاتا
سردی سے ہیں ہاتھ پاؤں ٹھِرتے سب لوگ الاؤ پر ہیں گِرتے
سرسوں پھُولی بسنت آئی ہولی پھاگن میں رنگ لائی
پھُوٹیں نئی کونپلیں شجر میں اِک جُوش بھرا ہُوا ہے سر میں
جاڑے کی جو رُت پلٹ گئی ہے دِن بڑھ گیا رات گھٹ گئی ہے
گرمی نے زمین کو تپایا بھانے لگا ہر کِسی کو سایہ
برسات میں دَل ہیں بادلوں کے ٹھنڈی ٹھنڈی ہَوا کے جھُونکے
رَو آئی ہے زُور شُور کرتی دامانِ زمین کو کترتی
کِس زور سے بہہ رہا ہے نالا اُونچے ٹیلے کو کاٹ ڈالا
بل کھا کے ندی نکل گئی ہے رُخ اپنا اُدھر بدل گئی ہے

دریا ہے رواں پہاڑ کے پاس   بستی ہے بسی اُجاڑ کے پاس
بستی کے اِدھر اُدھر ہے جنگل   جنگل ہی میں ہو رہا ہے منگل
مِٹّی سے خُدا نے باغ اُگائے   باغوں میں اُسی نے پھل لگائے
میوے سے لدی ہوئی ہے ڈالی   دانوں سے بھری ہوئی ہے بالی
سبزے سے ہرا بھرا ہے میداں   اُونچے اُونچے درخت ذی شاں
ہم کھیلتے ہیں وہاں کبڈّی   میری ہے کوئی - کوئی پھسڈّی
گائیں بھینسیں عجب بنائیں   کیا دُودھ کی ندّیاں بہائیں
پیدا کئے اُونٹ بیل گھوڑے   ہر شے کے بنا دئے ہیں جوڑے
روشن آنکھیں بنائیں دو دو   قدرت کی بہار دیکھنے کو
دو ہونٹ دئے کہ مُنہ سے بولیں   شکر اُس کا کریں زبان کھولیں

ہر شے اُس نے بنائی نادِر
بیشک ہے خُدا قوی و قادِر

(۳) حمد باری تعالیٰ

خُدایا اوّل و آخر بھی تو ہے   خُدایا باطن و ظاہر بھی تو ہے
وہ اوّل تو کہ ہے آخر سے آخر   وہ آخر تو کہ ہے اوّل سے فاخر
وہ اوّل تو کہ نا محرم بدائت   وہ آخر تو کہ ناپیدا نہایت
نہیں اوّل کو آخر سے جُدائی   ورائے عقل ہے تیری خُدائی

جو آخر ہے وہی اوّل بھی تھا تو ۔۔۔ وہی جو آج ہے سو کل بھی تھا تو
ہے تیرا اوّل و آخر مطابق ۔۔۔ نہ تیرے ساتھ لاحق ہی نہ سابق
جو اوّل ہے تو پہلے اور تھا کون ۔۔۔ جو آخر ہے تو پیچھے رہ گیا کون
جو باطن ہے تو باطن کا پتا کیا ۔۔۔ جو ظاہر ہے تو ہے تیرے سوا کیا
ہے تو باطن میں ظاہر بلکہ اظہر ۔۔۔ بظاہر بن گیا تو عینِ مظہر
ترا اِخفا ہے گویا عینِ اِظہار ۔۔۔ ترا اِظہار ہے اِخفائے اسرار
کھُلا جتنا ہوا اُتنا ہی مستور ۔۔۔ چھُپا جتنا رہا کھُلتا بدستور
ازل سے تا ابد ہے ایک ہی شان ۔۔۔ ترا طغرا ہے اَلآنَ کما کان
مبرّا قید اور اطلاق سے تو ۔۔۔ منزّہ انفس و آفاق سے تو
مگر مطلق میں ہے تو عینِ مطلق ۔۔۔ نہ جامد ہے نہ مصدر ہے نہ مشتق
مقیّد میں مقیّد ہے تری ذات ۔۔۔ نہیں ہوتا کسی خانہ میں تو مات
ہے اصلِ رُوح تو رُوحانیوں میں ۔۔۔ ہے قیدِ جسم تو جسمانیوں میں
اگر ناسوت میں ہی موج پُر جوش ۔۔۔ تو ہے لاہوت میں دریائے خاموش
اگر جبروت میں بانگِ اَنَا ہے ۔۔۔ صفِ ارواح میں حمد و ثنا ہے
تو ہی ہے علم و عالم بلکہ معلوم ۔۔۔ تو ہی ہے رحم و راحم بلکہ مرحوم
تجھے نسبت ہے لا شے سے نہ شے سے ۔۔۔ غنی ہی تو نہیں سے اور ہے سے
تری وحدت میں کثرت ہے نمودار ۔۔۔ کہ بے کثرت نہیں وحدت کا اظہار

نہ ہو وحدت تو کثرت بھی عدم ہے
حدوثِ آئنہ حُسنِ قِدم ہے

زمین و آسماں کا نُور ہے تُو
مگر خود ناظر و منظُور ہے تُو

سوا تیرے نہیں موجود کوئی
نہ عابد ہے نہ ہے معبُود کوئی

ازل سے دائم المعروف ہے تو
ابد تک خود بخود موصوف ہے تو

تری رحمت ہے یہ جلسے دِکھاتی
ہے قہّاری تری سب کو مِٹاتی

مسلّم ہے تجھی کو حُکم رانی
کہ تیری سلطنت ہے جاودانی

ہو الموجود ہے تجھ سے عبارت
ہو المقصود ہے تجھ سے اشارت

احد ہے تو نہیں زنہار معدود
صمد ہے تو نہ والد ہے نہ مولود

عیاں دیکھا تو پہونچا غیبِ ہُو میں
نہاں ڈھونڈھا تو آیا رنگ و بُو میں

نہ پایا ہے نہ پائے گا کبھی تو
کہ ہے معروف و عارف آپ ہی تو

تصوّر قُرب کا دُوری ہے تجھ سے
خیالِ بُعد مہجُوری ہے تجھ سے

نہ دُوری ہے نہ نزدیکی نہ مابین
عبارت منقطع لا غیر و لا عین

حقیقت سے نہیں ہے کوئی آگاہ
مشبّہ اور موحّد سب ہیں گمراہ

نہ ہو جب فرق ہی تو راہ کیوں ہو
نہ ہو کوئی تو پھر آگاہ کیوں ہو

پتا لگتا نہیں تنزیہ میں بھی
خبر مِلتی نہیں تشبیہ میں بھی

یہ ہنگامہ اور اُس پر بے نشانی
ہوا ہے عقلِ کل کا خُون پانی

تیمم کر کہ خاکستر ہے دریا
لگا غوطہ کہ ہے گرداب صحرا

نہ صحرا ہے نہ دریا ہے نہیں تُو
نہ یاد و بود باقی ہے نہ ہا ہُو

(۴) مُناجات[1]

خُداوندگارا جہازِ جہاں | ہے تیری مشیّت کی رَو میں رواں
سمندر ہے قدرت کا تیری بڑا | اور اُس بحر میں یہ سفینہ پڑا
ہم اُس میں سفر ختم کرتے ہوئے | مُسافر ہیں چڑھتے اُترتے ہوئے
تو ہی اُس سفینہ کا ہے ناخدا | ہمارے تردّد سے ہوتا ہے کیا
ترے حکم سے گرم رفتار ہے | مُسافر کا اندیشہ بیکار ہے
جدھر تُو جُھکا دے اُدھر وہ جُھکے | جہاں روک دے تُو وہاں وہ رُکے
جو ملّاح تُو ہے تو گھبرائیں کیوں؟ | نگہبان تُو ہے تو چلّائیں کیوں؟
نہیں موج و طوفان کا کُچھ خطر | کہ تُو آپ ہے راہ رَو راہ بر
اَزل سے اَبد تک ہے بس تُو ہی تُو | ترا جلوہ ہے عالمِ رنگ و بُو
نہ ہوتا اگر تیرا لُطفِ نہاں | تو ہم بزمِ ہستی میں ہوتے کہاں
ہیں تیری حمایت میں محفُوظ سب | ہیں تیری عنایت سے محظُوظ سب
نہ تھا عہدِ طفلی میں کُچھ بھی وقوف | تُو ہی پالتا تھا ہمیں اے رؤف
سبھی آفتوں سے بچایا ہمیں | کِھلایا پِلایا بڑھایا ہمیں

---

[1] بفرمائش مولوی کریم بخش صاحب ڈپٹی کلکٹر مرحوم ۱۲-

دیئے تُو نے ماں باپ کیسے شفیق
مہیّا کیئے تُو نے کیا کیا رفیق

ہماری نہ کوشش نہ تدبیر تھی
ترا حُکم تھا تیری تقدیر تھی

مگر جب سے پیدا ہوا کچھ شعور
تو جمعیّتِ دِل میں آیا فتور

غلط کار تھی یہ ہماری نظر
کہ ہم اپنی کوشش کا سمجھے اثر

ہمارے تشخّص نے کھویا ہمیں
ہماری خودی نے ڈبویا ہمیں

پڑے حرصِ دُنیا کے گرداب میں
رہے مبتلا اِس شکر خواب میں

تردّد میں غوطے لگایا کیئے
تصوّر میں شکلیں بنایا کیئے

ہوا ہم کو دیوانگی کا خلل
یہ تھوڑی سی فرصت یہ طولِ امل

نہ سمجھا کبھی ہائے اپنا حساب
کہ ہم موج ہیں بحر ہیں یا حباب

کہاں سے ہم آئے کدھر جائیں گے
جئیں گے بھی کل تک کہ مر جائیں گے

یہ دُنیا کے دھندے معیشت کا غم
یہ دَولت کے چسکے یہ جاہ و حشم

یہ عزّت کی خواہش یہ راحت کی چاہ
ہمارے لئے بن گئیں سنگِ راہ

تعلّق کے پھندوں میں ہم پھنس گئے
تکلّف کی دلدل میں ہم دھنس گئے

ہمیں نفس نے سخت دھوکا دیا
نہ کرنا تھا جو کام ہم نے کیا

گئی رائیگاں مُفت عمرِ عزیز
نہ کی چیز ناچیز میں کچھ تمیز

گیا وقت اور ہاتھ آیا نہ کچھ
بہت کھو کے بھی ہم نے پایا نہ کچھ

یہ دُنیا کہ دھوکے کی ٹٹّی ہے سب
ہمیشہ رہی ہم کو اِس کی طلب

دیا مشکِ خالص کو مٹّی کے بھاؤ　　بگڑنے کو سمجھا کئے ہم بناؤ
جسے عیش سمجھے تھے نکلا عذاب　　جسے آب سمجھے تھے پایا سراب
دئے بے بہا لعل ہم نے فضول　　عوض میں لیا کیا؟ یہی خاک دُھول
جواہر دئے سنگ ریزے لئے　　نکمّے کئے کام جتنے کئے
مگر بھیس میں گُل کے آیا تھا خار　　خزاں بن کے آئی تھی فصلِ بہار
جسے اصل سمجھے تھے بے اصل تھا　　جسے وصل سمجھے تھے وہ فصل تھا
یہ تھا مرحلہ جس کو سمجھے تھے گھر　　مُہیّا کیا کچھ نہ زادِ سفر
کٹی عمر غفلت میں اپنی تمام　　گیا دِن گزر ہونے آئی ہے شام
پڑے بے خبر ہائے سوتے رہے　　عبث نقدِ اوقات کھوتے رہے
کُھلا بھید ہم کو نہ اِس بات کا　　کہ ہے یہ تماشا طلسمات کا
نہ سمجھے کہ ہے شعبدہ یہ جہاں　　نیا سانگ ہوتا ہے ہر دم یہاں
توہّم نے رستہ بُھلایا ہمیں　　کہ فانی کو باقی دِکھایا ہمیں
یہ تیری ہی قدرت کا نیرنگ ہے　　کہ نابود میں بود کا ڈھنگ ہے
سُنے اِس چمن میں عجب چہچہے　　کہ چلتے مسافر کھڑے ہو رہے
ہے اُستادِ کامل کی بازی گری　　کہ خالی تھی مٹھّی دِکھادی بھری
کِھلایا سرِ راہ کیسا چمن　　ہوا راہ رو کے لئے راہ زن
ہوس نے مچائی عجب دُھوم دھام　　سفر کو سمجھنے لگے ہم قیام

عجب نیستی نے دِکھائی بہار ۔۔۔ کہ پھُولوں کے بدلے چُنے ہم نے خار
گیا قافلہ دُور ہم چھُٹ گئے ۔۔۔ چلے ایسے رستے کہ بس لُٹ گئے
بسا اپنے کانوں میں ہے ایسا رس ۔۔۔ سُنائی نہ دی ہم کو بانگِ جرس
کیا ناتوانی نے اب چُور چُور ۔۔۔ ہوا وقت ناوقت منزل ہے دُور
سفر کیونکہ تنہا کروں رات میں ۔۔۔ لگے چُور ہیں ہر طرف گھات میں
جو ٹھیروں تو بستی ہے بالکل اُجاڑ ۔۔۔ کھنڈر اور ویرانہ جنگل پہاڑ
نہ رہنے کا یارا نہ چلنے کی تاب ۔۔۔ خداوندگارا! خبر لے شتاب
خدایا! نہیں کوئی جائے پناہ ۔۔۔ مگر تیرا دَر اور تری بارگاہ
خدایا! کوئی یار و یاور نہیں ۔۔۔ مگر تو۔ کہ موجود ہے ہر کہیں
خدایا! نہیں ہے کوئی چارہ گر ۔۔۔ مگر تو۔ کہ ہے تجھ کو سب کی خبر
خدایا! نہیں ہے کوئی دستگیر ۔۔۔ مگر تو۔ کہ ہے تو سمیع و بصیر
خدایا! نہیں ہے کوئی غمگسار ۔۔۔ مگر تو۔ کہ ہے سب کا پروردگار
ازل میں نہ تھا میں نہ میری دُعا ۔۔۔ ترا لُطف تھا اور تیری عطا
دیا جسم بھی تو نے اور جان بھی ۔۔۔ دیا زندگانی کا سامان بھی
کیا تو نے آراستہ یہ مکاں ۔۔۔ بُلایا کرم سے ہمیں میہماں
کیا میہمانی کا سامان خوب ۔۔۔ مُرتّب کیا خوانِ الوان خوب
ہوائے لطیف اور آبِ زُلال ۔۔۔ دیئے اپنے مہمان کو بے سوال

دیے خاک نے کیا ذخیرے اُگل | خوش آیندہ پھول اور پسندیدہ پھل
دیے جس نمونہ کے دانے بکھیر | اُسی جنس کا لگ گیا ایک ڈھیر
یہ عُمدہ غذا اور فاخر لباس | یہ رہنے کو ایوانِ مُحکم اساس
بتانے کو رستہ دیے راہ بر | بُلایا جنھوں نے تری راہ پر
نہ تھا کوششوں کا ہماری صِلہ | عنایت سے تیری مِلا جو مِلا
دیا تو نے کیا کچھ بغیر التماس | غرض تیرے الطاف ہیں بے قیاس
لجاجت سے خاموش کیونکر ہوں میں | کہ تیری عنایت کا خوگر ہوں میں
بھلا اب کروں وہم و وسواس کیوں | قبولِ دُعا کی نہ ہو آس کیوں
شہنشاہ کا جب کرم عام ہو | تو درویش کو کیوں نہ اِبرام ہو
وہ غم دے کہ ہو جائیں سب غم غلط | نہ ہو اور کچھ۔ تو ہی تو ہو فقط
نہ کچھ فکر شادی و غم کا رہے | نہ کچھ دغدغہ بیش و کم کا رہے
چلیں شادی و غم کے جھونکے ہزار | مِرے دِل کو جُنبش نہ ہو زینہار
اگر غرقِ طوفاں ہو کُل کائنات | نہ پھسلے کبھی میرا پائے ثبات
ترے لطف کا ہو سہارا اگر | تو غالب ہو تنکا بھی سیلاب پر
جو تیری حمایت کا فانوس ہو | تو آندھی سے کیا خوف ہے شمع کو
اگر فضل کا تیرے لنگر مِلے | تلاطم سے ہرگز نہ کشتی ہِلے
جو ہو بادباں تیری تائید کا | دبے پانو پلٹے مخالف ہوا

جو تیری مدد نا خدائی کرے — تو پھر کوئی طوفان سے کیوں ڈرے
مرے دِل پہ برسا دے ایسی پھُوار — کہ دَب جائے غفلت کا گرد و غُبار
مرے دِل کو اوہام سے پاک کر — مجھُے اپنے رستہ میں چالاک کر
تیقّن کا یارب نکال آفتاب — توہّم کا دِل سے اُٹھا دے حجاب
ترے عشق سے گرم سینہ رہے — نہ مرنا رہے اور نہ جینا رہے
کہوں دردِ دل کس سے اے بے نیاز — نہیں کوئی تیرے سوا چارہ ساز
جَلادے معاصی کے سب خار و خس — ہے نارِ محبّت کا اِک شعلہ بس
خدایا وہ کامل نظر دے مجھُے — کہ میں ذرّہ ذرّہ میں دیکھُوں تجھے
مرے سر کو تسلیم کا تاج دے — مجھُے قرب کی اپنے معراج دے
ریاضِ رضا کی دِکھا دے بہار — شکایت کا دِل سے مٹا دے غبار
رہے کچھُ نہ فکرِ کثیر و قلیل — پڑھوں حسبی اللہ نعم الوکیل
مجھُے صبر دے جو کبھی کم نہ ہو — بلاؤں کے حملہ کا کچھُ غم نہ ہو
خُدایا عطا کر وہ نیّت کھری — طمع سے منزّہ ریا سے بری
مجھُے صدق دے حُسنِ اخلاص دے — مجھُے فضل کا خلعتِ خاص دے
مرے عزم کو شوق کے پَر لگا — کہ دُوں بازیِ عشق میں سر لگا
تمنّا ہے جب تک رہے دم میں دم — طلب میں رہوں تیری ثابت قدم
میں سوؤں تو سوؤں ترے فکر میں — میں جاگوں تو جاگوں ترے ذکر میں

لگا دے مرے مُنہ سے وہ جامِ پاک — پڑھے ہر بُنِ مو ترا نامِ پاک
رہے دھیان میں کچھ نہ دُوزخ بہشت — تری دید بن جائے میری سرشت
مجھے رنگ دے پانو سے تا بفرق — خُمِ صبغۃ اللہ میں کر کے غرق
مرے دِل سے زنگِ دوئی دُور کر — مرے دِل کو وحدت سے معمُور کر
نہ لیلیٰ رہے اور نہ مجنوں رہے — فقط عشق کا ایک مضموں رہے
رہے عشق میں رات دِن سوز و ساز — کروں شوق کی میں حکایت دراز
دیارِ محبّت سے چل اے نسیم — سُنگھا دے گُلِ معرفت کی شمیم
گلستاں نہیں پنکھڑی ہی سہی — ہمیشہ نہیں دو گھڑی ہی سہی
سُنا دے طیورِ صفا کی چہک — گلِ معرفت کی اُڑا لا مہک
نکالوں کلیجہ سے ہجراں کا خار — مَلوں مُنہ پہ گلگونۂ وصلِ یار
یقیں کی لپٹ سے بسا دے دِماغ — طریقِ وطن کا لگا دے سُراغ
پڑی کُنجِ فرقت میں ہے عندلیب — نہیں سیرِ گلزار اُس کو نصیب
قفس میں کرے تا بکے اعتکاف — کرا دے حطیمِ چمن کا طواف
لگے روضۂ اُنس کی جب ہوا — تو ہوں پچھلے شکوے گِلے سب ہوا
ہوا و ہوس دِل سے برباد ہو — ترا شغل ہو اور تری یاد ہو
نہ ساغر رہے اور نہ ساقی رہے — سوا تیرے کوئی نہ باقی رہے
نگاہوں میں ہو جلوہ گر تو ہی تُو — ہر اِک گل میں پاؤں ترا رنگ و بو

کروں فہم تجھ کو ہر اک بات سے — سُنوں تیرا نغمہ جمادات سے
چڑھے جامِ وحدت کا ایسا خُمار — کہ اغیار سمجھوں کسی کو نہ یار
کہوں اور سُنوں خود بنوں چشم و گوش — مری بے خودی پر ہوں قرباں ہوش
ترا جلوہ دیکھوں نہاں اور عیاں — نہ پائے مگر مجھ کو میرا نشاں
تری یاد میں محو ہو جاؤں میں — کسی شے کو ڈھونڈوں تجھے پاؤں میں
ملے مجھ کو ہرگز نہ میرا پتا — نہ سمجھوں کہ میں کون تھا اور کیا
ترے بادۂ عشق سے ہو کے مست — سُنوں گوشِ جاں سے ندائے اَلَست
رہے ماسوا کا نہ ذرّہ خیال — مجھے ایک ہو جائے ماضی و حال
خلا اور ملا میں نہ ہو وہمِ غیر — کروں بے خودی میں خدائی کی سیر
مرے وصف بن جائیں تیری صفات — مری زیست ہو جائے تیری حیات
یہاں تک میں یکساں و یکسو بنوں — کہ تو میں بنے اور میں تو بنوں
بصارت ہو تیری بصارت میں غرق — سماعت ہو تیری سماعت میں غرق
مری بات بن جائے تیرا کلام — مری چال ہو جائے تیرا خرام
مٹے وہمِ باطل نظر آئے حق — پڑھوں پتّے پتّے سے تیرا سبق
چمک تیری دیکھوں ہر اک سنگ میں — سُنوں راگ تیرا ہر آہنگ میں
تری شان پاؤں ہر انداز سے — ترا لہجہ سمجھوں ہر آواز سے
لگا دل پہ دردِ محبّت کی چوٹ — جو پتّا بھی کھڑکے تو میں جاؤں لوٹ

جو بلبل کا نغمہ پڑے کان میں
تو ہو شور برپا مری جان میں

نوا سنج ہو طوطیِ سبز پر
تو میں اپنی ہستی سے جاؤں گزر

جو شاخوں پہ قمری کی کوکو سنوں
تری یاد میں اپنے سر کو دھنوں

جو گلشن میں دیکھوں کہ ہیں گل کھلے
ترے ذوق میں میری گردن ہلے

کرے چہچہے طائروں کا ہجوم
کروں وجد میں خاک پر جھوم جھوم

جو دیکھوں کہ ہلتی ہے شاخِ نہال
گزر جائے پردوں سے میرا خیال

جو دیکھوں میں تاروں بھری رات کو
کروں دل سے ساقط اضافات کو

چمکتے ہوئے دیکھ کر مہر و ماہ
کروں پیرویِ خلیلِ الٰہ

رہِ راست کی کر ہدایت مجھے
سلامت روی کر عنایت مجھے

غضب سے ترے مانگتا ہوں پناہ
الگ ان سے رکھ جو گئے بھول راہ

اگر مغفرت سے نہ پیش آئے تو
اگر رحم مجھ پر نہ فرمائے تو

تو میرا ٹھکانا نہیں پھر کہیں
نہ دنیا نہ عقبےٰ نہ ایمان و دیں

مجھے اپنی دانش کا ساغر پلا
رہے تشنگی کا نہ باقی گلا

نہ چھوڑوں گا دامن ترا اے کریم
ترا لطف شامل ہے رحمت عمیم

خدایا مری خواہشوں پر نہ جا
جو تیری رضا ہے وہی ہے بجا

تقاضا مرا سخت معیوب ہے
جو مرضی ہے تیری وہی خوب ہے

تری ذات دانائے اسرار ہے
سبھی نیک و بد سے خبردار ہے

کر اپنی ہی مرضی سے ردّ و قبول — کہ سائل ہے تیرا ظلوم و جہول
وہی خوب ہے جو ہے تجھ کو پسند — ہو آسودگی ظاہرا یا گزند
جس احوال سے تو رضا مند ہے — اگر زہر بھی ہو تو گلقند ہے
بقولِ نظامیٔ غُفراں مآب — رکھ اپنے ہی قبضہ میں میرا حساب
"سپُردم بتو مایۂ خویش را — تو دانی حسابِ کم و بیش را"
کروں کس لئے غم رہوں کیوں اُداس — کہ تو شاہ رگ سے زیادہ ہے پاس
زہے قرب تیرا زہے ہمدمی — نہ اُس کو زوال اور نہ اِس میں کمی
پتا اپنے ہوتے تری ذات کا — ہے سودا پکانا محالات کا
فنا سب کو دیتی ہے اِس جا تھپک — کہ کانِ نمک میں نہیں جُز نمک
مگر جو نظر میں سمایا ہے یہ — کمالات کا تیرے سایہ ہے یہ
نظر چاہئے اور صفا چاہئے — دل آئینہ ہے دیکھنا چاہئے
کروں مرکزِ قلب پر میں نگاہ — کہ نکلی یہاں سے دو عالم کی راہ
مگر دونوں عالم سے تو پاک ہے — نہ احساس ہے واں نہ ادراک ہے
کروں زمزمہ لَے میں شیراز کی — کہ مستانہ دُھن ہے اِس آواز کی
رہِ عقل جز پیچ بر پیچ نیست — برِ عارفاں جز خدا ہیچ نیست
میں تیری طلب کا طلب گار ہوں — مشوّش ہوں، بے چین ہوں، زار ہوں
پڑی اپنی صُورت پہ اپنی نظر — ہُوا عکس آئینہ میں جلوہ گر

میں خود آئینہ خود نظر باز ہوں
میں خود سوز ہوں اور خود ساز ہوں

اِدھر بھی ہوں میں اور اُدھر بھی ہوں میں
مؤثّر ہوں میں اور اثر بھی ہوں میں

فقط میں ہی میں ہوں کہاں غیر ہے
بنے ایک کے دو عجب سیر ہے

میں جنبش کروں تو وہ جُنبش کرے
مرے حُکم سے وہ جئے اور مرے

نہ اُس سے جُدا میں نہ وہ مجھ سے دُور
وہ میرے حضور اور میں اُس کے حضور

نہ کچھ اُس کے ہونے سے مجھ کو کمال
نہ اُس کے نہ ہونے سے نقص و زوال

کیا آپ پر میں نے اپنا ظہور
نُمایاں ہیں دو پھر دُوئی مُجھ سے دُور

دوئی میں بھی ہے میری وحدت عیاں
کہ میں جلوہ گر ہوں یہاں اور وہاں

عدم میں بھی میں آپ موجود ہوں
کہ شاہد بھی ہوں اور مشہود ہوں

میں ظاہر میں کرتا ہوں اُس کو خطاب
پسِ پردہ دیتا ہوں خُود ہی جواب

ہے یہ بھی مری کبریائی کی شان
یہاں بندگی واں خدائی کی شان

وہ بندہ ہے اور میں خُداوندگار
میں سبّوح و قُدّوس وہ خاک سار

مُحبّت سے کھیلا ہے میں نے یہ کھیل
دیا قعرِ اُسفل میں اُس کو ڈھکیل

کرے ہجر میں تا رہے جُستجو
مِری جُستجو میں پھرے کو بکو

کبھی راہِ خُشکی کو وہ طے کرے
تری کا کبھی وہ سپاٹا بھرے

کبھی جنگلوں میں کبھی کوہ میں
پھرے ہر طرف وہ مِری ٹوہ میں

جو بہکا تو کِس نے بھلایا اُسے
جو آیا تو کِس نے بُلایا اُسے

ہے القصّہ فعل اُس کا میرا ہی کام
بس آگے خبر کچھ نہیں والسّلام

(۵) رحمۃ للعالمین[1]

بنامِ خداوندِ حیّ و قدیر — علیم و کلیم و سمیع و بصیر
قدیمُ الوجود و عدیمُ المثال — جلیل الصّفات و کثیر الکمال
شہنشاہِ خلّاق ربُّ الجلیل — جہاندار رزّاق نعم الوکیل
حکیمِ قوی غالب بے نیاز — نگہبانِ عالم خداوندِ راز
اُسی کو عبادت اُسی کو سجود — رکوع و تحیّت قیام و قعود
وہی ہے سزاوارِ حمد و سپاس — ورائے خیال و برونِ قیاس
بنایا ہے جس نے طلسمِ جہاں — یہ خاکی زمیں نیل گوں آسماں
یہ روشن ستارے ہزاروں ہزار — کہ جن سے فلک ہے جواہر نگار
یہ مہرِ درخشاں یہ ماہِ منیر — یہ پھیلی ہوئی کہکشاں جوئے شیر
کہیں شام کی زُلف بکھری ہوئی — کہیں طلعتِ صبح نکھری ہوئی
کہیں چاندنی رات ڈھلتی ہوئی — کہیں دھوپ اور چھاں بدلتی ہوئی
کبھی دِن بڑا اور کبھی شب طویل — کسی کی ہے آمد کسی کا رحیل
کہیں ہے کڑاکے کا جاڑا ہنوز — کہیں فصلِ گرما و حرِّ تموز

[1] یہ نظم ہے تو پرانی یعنی ۸۰-۱۸۷۰ء کے درمیان کی تصنیف لیکن کلّیات کے پہلے اڈیشن میں طبع نہیں ہو سکی تھی۔ اُس وقت دستیاب نہیں ہوئی تھی۔

کہیں منجمد بحر مثلِ بلور — کوئی گرم خطّہ مثالِ تنور
کہیں ہے نسیم و صبا کا تپاک — کہیں بادِ صرصر اُڑاتی ہے خاک
کہیں بحر خاموش سُنسان ہے — کسی جا تلاطم ہے طوفان ہے
کہیں بادِ صرصر سے طوفاں بپا — کہیں چل رہی ہے نسیم و صبا
کہیں دن ہے اور سر پہ ہے آفتاب — کہیں رات ہے اور ہنگامِ خواب
یہ تبدیل ہے کیمیائے شگرف — یہ اولا یہ پالا یہ پانی یہ برف
یہ بادل یہ بجلی یہ سایہ یہ دھوپ — کبھی کچھ سماں اور کبھی کچھ ہے روپ
گھٹاؤں کا اُٹھنا ہواؤں کا زور — یہ نالوں کا بہنا یہ دریا کا شور
یہ سبزہ یہ کھیتی یہ جھاڑی یہ بن — یہ بیل اور بوٹے یہ باغ و چمن
یہ شاخیں یہ پتّے یہ گل یہ ثمر — یہ چارہ یہ غلّہ یہ قند و شکر
یہ اِتنا سا تخم اور نخلِ بلند — عجب سحر ہے حکمتِ نخل بند
یہ تارِ شعاعی یہ گرمی یہ رنگ — روانیٔ آب و گرانیٔ سنگ
یہ تشریح و تفہیمِ اجسام کی — یہ تحریک و تحویلِ اجرام کی
یہ ترکیب و تحلیل اور اِمتزاج — اِمالہ اِزالہ مداوا عِلاج
مبادی و سائط نتائج عِلَل — شرائع مذاہب مناہج مِلَل
تشخّص تعیّن تمیز و شعور — تضاد و تناقص خفاؤ ظہور
فنا و بقا و وجود و عدم — طبیعی الٰہی ریاضی حِکَم

اجنّا ملائک نفوس و عقول بسیط و مرکّب فروع و اصول

اساسِ تعقّل بنائے عُلوم نظامِ کواکب حسابِ نجوم

مدارِ کشش محور و مُستقر زمان و مکان و جہات و صُوَر

ہبوط و قِران و نزول و عُروج سماء پُراَشکال، ذات البُروج

خُسوف و کسوف و طُلوع و غُروب مشارق مغارب شمال و جُنوب

موالیدِ حیّ و جماد و نبات توالد تناسل حیات و مُمات

مدارِ زمین و مسیرِ قمر ظُہور و فُصول و نزولِ مطر

شُمارِ مہ و سال، لیل و نہار خریف و ربیع و خزان و بہار

مقاماتِ قُطبین اور اِستوا مُمالک، اقالیم، آب و ہوا

محیط و بحیرہ خلیج آبنائے صحارا جزیرہ جزیرہ نُمائے

سواحل مراحل جبالِ رفیع عمیق و عریض و طویل و وسیع

صفِ کوہساراں و وادیٔ ذیل روانیٔ دریا و تُندیٔ سیل

گل و لالہ و سبزہ و مرغزار طیورِ خوش الحاں سرِ شاخسار

چمن زارِ خوش قطع مینو سواد گُلستانِ سیراب و تحریکِ باد

شکر خندۂ برق و رُشحِ سحاب بخار بحار و تُفِ آفتاب

سُراب و بیابان و ریگِ رواں دد و دام و ویرانۂ بے نِشاں

یہ نیرنگِ عالم نہیں سرسری ہے اُستادِ کامل کی جادوگری

کسی گنج پر ہے مگر یہ طلسم — کسی جان کے واسطے ہے یہ جسیم
کوئی گُل ہے مقصودِ باغ و بہار — ہے اِس معرکہ میں کوئی شہ سوار
ہے اِس بحر میں کوئی دُرِّ یتیم — کہ ہے جس کی خاطر یہ ناز و نعیم
ہے اِس جشن میں کوئی سُلطاں حضور — کہ ہے دم قدم کا یہ جس کے ظہور
محمدؐ ہے وہ تاج دارِ ھُدیٰ — مدارِ نبوّت رسولِ خدا
بشیر و نذیر و رؤف و رحیم — امین و شفیع و حبیب و کریم
وہی ہے ثمر نخلِ اظہار کا — وہی ہے گہر بحرِ انوار کا
وہی میہمانِ گرامی ہے یہاں — اُسی کے لئے ہے یہ بزمِ جہاں
جمالِ الٰہی کا مظہر ہے وہ — کمالِ خدائی کا منظر ہے وہ

اُسی کی بدولت ہے یہ سب نمود
کہاں کا عدم اور کہاں کا وجود

(۶) مثنوی فی العقائد[1]

ذاتِ حق اپنے آپ ہے موجود — کوئی اُس کے سوا نہیں معبود
اُس کا جوڑا نہیں مثال نہیں — اُس کو گھاٹا نہیں زوال نہیں
اُس کا جو وصف ہے سو کامل ہے — نہ کسی سے جُدا نہ شامل ہے
اُس کا ساجھی نہیں شریک نہیں — اور کو مانیے تو ٹھیک نہیں

[1] مرتبہ سنہ ۱۸۷۰ء بمقام میرٹھ ۱۲

جانتا ہے وہ اَن ہوئی باتیں — دیکھتا ہے ڈھکی چھپی گھاتیں
ہے وہ بے آنکھ دیکھتا سب کو — ہے وہ بے کان سُنتا مطلب کو
اپنی مرضی سے کام کرتا ہے — بے زباں وہ کلام کرتا ہے
اُونگھتا ہے کبھی نہ سُوتا ہے — سب اِرادہ سے اُس کے ہوتا ہے
وہ قوی ہے کبھی نہیں تھکتا — وہ ہر اِک چیز کو ہے کر سکتا
زندہ ہے زندگی کا مالک ہے — جو ہے اُس کے سوا سو ہالک ہے
کہہ سکے کون اُس کو کیسا ہے — آپ ہی جانتا ہے جیسا ہے
اُس نے یہ آسماں بنایا آپ — اُس نے فرشِ زمین بچھایا آپ
کئے اُونچے پہاڑ اُس نے کھڑے — میخ کی طرح جو زمیں میں گڑے
اُس نے بادل سے بُوند ٹپکائی — اُس نے پانی پہ ناؤ تیرائی
مُردہ مٹّی میں اُس نے ڈالی جان — لہلہاتے ہرے بھرے میدان
ہے مسلّم اُسی کو سُلطانی — عرشِ اعظم ہے تختِ ربّانی
ہے وہی۔ تھا وہی۔ وہی ہوگا — کون اُس کی برابری جو گا
جس کو چاہے کرے وہ ملیا میٹ — نہیں اُس کو کسی سے لاگ لپیٹ
اُس نے پیدا کیا ہے عالم کو — آسماں کو زمین کو ہم کو
اُس کا احسان و فضل ہے دِن رات — اُس پہ واجب نہیں ہے کوئی بات
اُس نے دُنیا میں انبیاء بھیجے — اپنے رستہ کے رہ نما بھیجے

خاتمِ انبیاء محمدؐ ہے — جس کا احسان ہم پہ بےحد ہے
اُس نے حکمِ خدا کیا تلقین — تھا وہ اللہ کا رسولِ امین
اُس نے تعمیلِ حکم کر دی ہے — ٹھیک ہے اُس نے جو خبر دی ہے
دِل سے مانو جو عقل بینا ہے — کہ موئے بعد پھر بھی جینا ہے
زندگی جس نے دی ہے اوّل بار — دُوسری بار دے تو کیا دُشوار
بعد مرنے کے حشر کا ہونا — ہے مثال اُس کی جاگنا سونا

اُس کی ہستی سے سب کی ہستی ہے
خلقت اُس کی بسائی بستی ہے

(۷) شمعِ ہستی

اے شمعِ ہستی! اے زندگانی! — بھاتی ہے دِل کو تیری کہانی
ہے کُوچ تیرا ہر لمحہ جاری — جاتی ہے بگ ٹُٹ تیری سواری
بجلی سے بڑھ کر بےتاب ہے تُو — یا واہمہ ہے یا خواب ہے تُو
کیوں چُھپ چُھپاتی ہر دم رواں ہے؟ — آئی کہاں سے جاتی کہاں ہے؟
ظاہر ہیں یوں تو سب تیرے گُن — لیکن نہ پایا تیرا اسرو بُن
گزرا نہ کوئی اِس ہفت خواں سے — جاہل ہیں تیرے سِرِّ نہاں سے
فی الجملہ ہمّت سب ہار بیٹھے — ہیں سر بزانو ناچار بیٹھے

اے زندگانی! اے شمعِ ہستی!
سونی پڑی تھی تجھ بِن یہ بستی

چاروں طرف تھی چھائی اندھیری
ناگاہ اُٹھی اِک ڈیک تیری

وہ ڈیک تھی بس نورٌ علیٰ نور
کاہے کو رہتی پردہ میں مستوُر

پھُولوں میں جھلکی تاروں میں چمکی
بخشی جہاں کو رونق اِرم کی

ہوتا نہ یہاں جو تیرا ٹھکانا
چوپٹ ہی رہتا یہ کارخانہ

کیا پھُونک ماری دُنیا کے تن میں!
گویا لگادی دَوں خشک بن میں

بزمِ جہاں میں رُونق ہے تجھ سے
اِس میکدہ میں ہاؤ حق ہے تجھ سے

ہے تیرے دم سے اے عالم آرا!!
بزمِ عروسی آفاق سارا

سرگرم ہے تُو جادُوگری میں
ہیں تیرے عشوے خشکی تری میں

مٹّی کا جوبن تُو نے نکھارا
دے دے کے چھینٹے اُس کو ابھارا

بے حِس کو بخشا اِحساس تُو نے
دی مُشتِ گِل کو بُوباس تُو نے

تھی بھُولی بھالی بھونڈی بہنگم
تُو نے سکھایا اُس کو خم وچم

کرتب سے تیرے سانچے میں ڈھلکر
کُندن سی نکلی رنگت بدل کر

ٹھکرا کے تُو نے جب کہدیا "قُم"
اُٹھ بیٹھی فوراً کرتی تبسّم

بھُولی ہے اپنی اَوقات پہلی
پھرتی ہے خوش خوش کیا اہلی گہلی

پاتی ہے خلقت جب تیری آہٹ
ہوتی ہے پیدا اِک گدگداہٹ

مچتا ہے پھر تو اودھم غضب کا
بجتا ہے ڈنکا عیش وطرب کا

کہتی ہے دُنیا۔ "تُو ہے تو کیا غم
تُو آئے بنت بنت تُو آئے جم جم"

جیتے ہیں جب تک مرتے ہیں تجھ پر
سب کچھ تصدّق کرتے ہیں تجھ پر

کیا مال ہے جو تیرے سوا ہے
تُو ہی نہ ہو تو سب پر دھتا ہے

اے سب کی پیاری سب کی چہیتی
کہہ مُنہ زبانی کچھ آپ بیتی

"قدرت کے گھر کی میں لاڈلی ہوں
ناز و نعم سے برسوں پلی ہوں

تقویمِ احسن میرا لگن تھا
فردوسِ اعلیٰ میرا وطن تھا

حُور و مَلَک کی آبادیاں تھیں
بے فکریاں تھیں آزادیاں تھیں

چلتی تھی ہر دم بادِ بہاری
شیر و عسل کی نہریں تھیں جاری

میری ادا پر مرتے تھے قُدسی
سجدہ پہ سجدہ کرتے تھے قُدسی

تکریم میری ہوتی تھی از حد
ہیں داستانیں جس کی زباں زد

پھر دیس چھُوٹا گزری سو جھیلی
پردیسیوں کا اللہ بیلی!

پل مارنے کا ہے یاں بسیرا
حُبِّ وطن ہے ایمان میرا

آب و ہوا میں دشت و جبل میں
میری رسائی ہے ہر محل میں

لیکن یہاں میں خلوت نشیں ہوں
ہوں اِس طرح پر گویا نہیں ہوں

خوابِ گراں کی حالت ہے طاری
مستی میں گم ہے سب ہوشیاری

جب آتے آتے سبزہ میں آئی
کروٹ بدل کر میں لہلہائی

انگڑائیاں لیں مُنہ کھول ڈالا
پر آنکھ سے کچھ دیکھا نہ بھالا

داخل ہوئی جب جیوا اس کے تن میں
اک شور اُٹھا اِس انجمن میں

انساں کا جامہ جب میں نے پہنا
اللہ رے میں کیا میرا کہنا!

کِس کِس جتن سے میں نے بنایا
رُتبہ بہ رُتبہ پایہ بہ پایہ

جامد کو نامی نامی کو حیواں
حیواں کو وحشی وحشی کو انساں

پھیلایا میں نے کیا کیا بکھیڑا
شادی و غم کے ارگن کو چھیڑا

نیکی بدی کے میلے جمائے
جھوٹ اور سچ کے سکے چلائے

جو ناچ میں نے جس کو نچایا
وہ ناچتے ہی اُس کو بن آیا

القصہ ہوں میں وہ اِسمِ اعظم
ہے جس کے بس میں تسخیرِ عالم

کُچھ کُچھ کھُلے ہیں انداز میرے
دیکھے ہیں کِس نے اعجاز میرے

مُجھ کو نہ سمجھو تُم آج کل کی
ہوں موجِ مضطر بحرِ ازل کی

رکھوں گی جاری یونہی سفر میں
قعرِ ابد کی لوں گی خبر میں

ہے میری ہستی اک طرفہ مضموں
کُچھ بھی نہیں ہوں پر میں ہی میں ہوں

سُنتے رہو گے میری کہانی
جب تک ہے باقی دُنیائے فانی"

(۸) یادِ الٰہی

اُسے جس نام سے چاہو کرو یاد — کہ نام اُس کا ہے سب ناموں کی بنیاد
وہ اچھّا اور اُس کا نام اچھّا — خود اچھّا بات اچھّی کام اچھّا
اُسی کے نام سے باقی ہیں سب نام — اُسی کی یاد سے چلتے ہیں سب کام
اُسی کی ذات ہے ہر ذات کی جان — اُسی کی بات ہے ہر بات کی کان

اُسی کا نام ہے کوئی زباں ہو
اُسی کا ذکر ہے کوئی بیاں ہو

---

(۹) شمعِ ہدایت

حمد و سپاس حصّہ اُس پاک ذات کا ہے — جو آسرا سہارا کُل کائنات کا ہے
جب کچھ نہ تھا وہی تھا اُس کے سوا نہ تھا کچھ — کچھ ہو نہ ہو وہ ہوگا۔ قدرت ہے اُسکی کیا کچھ
کن خوبیوں سے اُس نے اِس بزم کو سجایا — اور خلعتِ شرافت اِنسان کو پہنایا
اللہ رے اُس کی قدرت! اللہ رے بے نیازی! — دی بعض کو بہ نسبت بعضوں کے سرفرازی
پھر خاص خاص بندے جو اُس نے چُن لئے ہیں — کیا کیا بلند رُتبے اُن کو عطا کئے ہیں
یاں بندگی ہے اور واں بندہ نوازیاں ہیں — یاں سر جھکا ہوا ہے واں سرفرازیاں ہیں
اِنسان ہی نہ ہوتا جو بندگی نہ ہوتی — اندھیر تھا جو دِل میں یہ لَو لگی نہ ہوتی
طاعت کا آدمی کو فرمان کیوں ملا ہے — بے حد وہاں مہیّا اِنعام اور صلہ ہے

ہے اذنِ عام لوگو! خوانِ کرم پہ ٹوٹو
بھر بھر کے جھولیاں لو۔ دوڑو ثواب لوٹو

تم بھی نہیں ہو محروم۔ آؤ گناہ گارو!
گر صدقِ دل سے اپنے غفار کو پکارو

تو پاؤ گے ہمیشہ توبہ کا در کھلا تم
رحمت ہے اُس کی بے حد کرتے ہو فکر کیا تم

ہر وقت باڑھ پر ہے لطف و کرم کا دریا
دو چار ہاتھ مارو۔ لگتا ہے پار کھیوا

پھر اُس کی نعمتیں ہیں اور عیش ہیں جناں کے
افسوس! جو نہ مانیں گُن ایسے مہرباں کے

میں حمد اُس کی ہر دم کرتا ہوں جان و دل سے
اور شکر ہے ٹپکتا اِس میری آب و گل سے

میں اُس کی مغفرت کا ہوں جی سے آرزو مند
توبہ ہے اُس کے آگے توبہ کا در نہیں بند

میں اُس سے چاہتا ہوں دُنیا میں تندرستی
دے اپنی راہ میں وہ میرے قدم کو چستی

بادل برس پڑے کاش اُس کی عنایتوں کا
اُبلے زمینِ دل سے چشمہ ہدایتوں کا

رہنا گواہ تم بھی دیتا ہوں میں شہادت
ہے پاک ذات اُس کی بس قابلِ عبادت

اُس کے سوا تو کوئی معبود ہی نہیں ہے
ہاں! اُس کے ہوتے کوئی موجود ہی نہیں ہے

یکتا ہے وہ۔ کہاں ہے؟ اُس کا شریک کوئی
میرے ہر ایک دُکھ کی کرتا ہے چارہ جوئی

ہاں یہ بھی سُن رکھو تم دیتا ہوں میں گواہی
ہادی مرا محمّد ہے بندۂ الٰہی

تاجِ رسالت اُس کے سر پر خدا نے رکھا
اوروں سے اُس کو برتر صدق و صفا نے رکھا

اُس کو خدا نے اپنا پیغام بر بنایا
بے کم و کاست اُس نے جو حکم تھا سنایا

وہ خاتمِ نبوّت وہ سرورِ دو عالم
درگاہِ ایزدی کا تھا اِک سفیرِ اعظم

حلم و وقار و نرمی خوش خوئی مہربانی
پیغمبری کی اُس میں تھی یہ کھلی نشانی

(۱۰) نورِ عرفان

لوگو! سُنو کہ کوچ کی ساعت قریب ہے
جو جمع کرلے توشہ وُہی خوش نصیب ہے

جی بندگیٔ حق سے چُراتے ہو واہ وا!
حالانکہ دُوستی کا بھی کرتے ہو ادّعا

دُوزخ سے نفرت اَور یہ افعالِ زشت بھی!
کو تک تو ایسے اور اُمیدِ بہشت بھی!

دِین کا مُعاملہ ہو تو گویا ہیں نیم جاں
دُنیا کے کاروبار ہیں یہ جاں فشانیاں

دار البقاء کا بھُول گئے اہتمام تم
دار الفنا کو سمجھے ہو اپنا مقام تم

واللہ ہو گئی ہے تُمھاری سمجھ خراب
پوچھا گیا وہاں تو بھلا دو گے کیا جواب

افسوس اِس سمجھ پہ عجب پُر غرور ہو
موت آرہی ہے تُم ابھی غفلت میں چُور ہو

سُوتے ہیں زیرِ خاک پڑے کس قدر عزیز
تُم اپنے مستِ عیش ہو کرتے نہیں تمیز

چھوٹے بھی اور بڑے بھی جو تُم سے تھے چل بسے
کیا سمجھے ہو؟ رہیں گے تُمھارے محل بسے

ہیہات اُن کے حال سے عبرت نہیں تمھیں
تحصیلِ جاہ و مال سے فرصت نہیں تمھیں

قرآں سُنو۔ تو ہو تُمھیں اِس بات پر عُبور
اللہ کی طرف ہمیں جانا ہے بالضرور

اللہ کا کلام ہے سب سے بلیغ تر
مالک ہے سب کا۔ ہے اُسے ہر بات کی خبر

قُرآنِ پاک کوئی پڑھے تو سُنو خموش
اللہ تم پہ رحم کرے ہے وہ عیب پوش

(۱۱) موعظت

کرے دُشمنی کوئی تُم سے اگر
جہاں تک بنے تم کرو در گزر
کرو تُم نہ حاسد کی باتوں پہ غور
جلے جو کوئی - اُس کو جلنے دو اور
اگر تُم سے ہوجائے سرزد قصور
تو اِقرار و توبہ کرو بالضّرور
بدی کی ہو جس نے تمہارے خلاف
جو چاہے معافی - تو کردو معاف
نہیں بلکہ تم اَور احساں کرو
بھلائی سے اُس کو پشیماں کرو
ہے شرمندگی اُس کے دِل کا عِلاج
سزا اور ملامت کی کیا احتیاج
بھلائی کرو تو کرو بے غرض
غرض کی بھلائی تو ہے اِک مرض
جو محتاج مانگے تو دو تم اُدھار
رہو واپسی کے نہ اُمّیدوار

جو تم کو خُدا نے دیا ہے تو دو
نہ خسّت کرو اِس میں جو ہو سو ہو

(۱۲) مثنوی آبِ زُلال

خُدا نے دی ہے تُم کو عقل و تمیز
ذرا دیکھو تو یہ پانی ہے کیا چیز
دِکھاؤ کُچھ طبیعت کی رَوانی
جو دانا ہو تو سمجھو کیا ہے پانی
یہ مِلکر دو ہَواؤں سے بنا ہے
گرہ کُھل جائے تو فوراً ہَوا ہے
نظر ڈھونڈے مگر کچھ بھی نہ پائے
زباں چکھّے مزہ ہرگز نہ آئے

ہواؤں میں لگایا خوب پھندا — انوکھا ہے تیری قدرت کا دھندا
نہیں مشکل اگر تیری رضا ہو — ہوا پانی ہو اور پانی ہوا ہو
مزاج اُس کو دیا ہے نرم کیسا — جگہ جیسی ملے بن جائے ویسا
نہیں کرتا جگہ کی کچھ شکایت — طبیعت میں رسائی ہے نہایت
نہیں کرتا کسی برتن سے کھٹ پٹ — ہر اک سانچہ میں ڈھل جاتا ہے جھٹ پٹ
نہ ہو صدمہ سے ہرگز ریزہ ریزہ — نہ ہو زخمی اگر لگ جائے نیزہ
نہ اُس کو تیر سے تلوار سے خوف — نہ اُس کو توپ کی بھرمار سے خوف
تواضع سے سدا پستی میں بہنا — جفا سہنا مگر ہموار رہنا
نہیں ہے سرکشی سے کچھ سروکار — نہ دیکھو گے کبھی تم اُس کا انبار
خزانہ گر بلندی پر نہ ہوتا — تو فوّارہ سے وہ باہر نہ ہوتا
جو ہلکا ہو اُسے سر پر اُٹھائے — جو بھاری ہو اُسے غوطا کھلائے
نہ جلتا ہے نہ گلتا ہے نہ سڑتا — نرا پانی نہیں ہرگز بگڑتا
اُسے بھینچو دباؤ یا ٹٹولو — اُسے چھیڑو اُچھالو یا گھنگولو
اُسے رگڑو گھسو پیسو بہاؤ — جھکولے دو مسل ڈالو دباؤ
کسی عنوان سے ہوگا نہ نابود — وہی پانی کا پانی دودھ کا دودھ
لگے گرمی تو اُڑ جائے ہوا پر — پڑے سردی تو بن جاتا ہے پتھّر
ہوا میں مل کے غائب ہو نظر سے — کبھی اُوپر سے بادل بن کے برسے

ہَوا پر چڑھ کے پہنچے سیکڑوں کوس
کبھی اُولا کبھی پالا کبھی اوس

کُہر ہے بھاپ ہے پانی ہے یا برف
کئی صیغوں میں ہے ایک اصل کی صرف

اُسی کے دم سے دُنیا میں تری ہے
اُسی کی چاہ سے کھیتی ہری ہے

پھلوں میں پھول میں ہر پنکھڑی میں
ہر اِک ٹہنی میں ہر بُوٹی جڑی میں

ہر اِک ریشہ میں ہے اُس کی رسائی
غذا ہے جڑ سے کونپل تک چڑھائی

پھلوں کا ہے اُسی سے تازہ چہرہ
اُسی کے سر پہ ہے پھُولوں کا سہرہ

اُسی کو پی کے جیتے ہیں سب انساں
اُسی سے تازہ دم ہیں سارے حیواں

یہی معدہ کو پہنچاتا رَسَد ہے
یہی تحلیل میں کرتا مَدد ہے

عمارت کا بسایا اُس نے کھیڑا
تجارت کا کیا ہے پار بیڑا

زراعت اُس کی مَوروثی اسامی
صناعت کے بھی اَوزاروں کا حامی

کہیں ساگر کہیں کھاڑی کہیں جھیل
کہیں جمنا کہیں گنگا کہیں نیل

کہیں نالہ کہیں ندّی کہیں سیل
ہے یہ دُنیا کی کمسریٹ کا جرنیل

یہی پہلے زمیں پر مَوجزن تھا
نہ مَیداں تھا نہ پربت تھا نہ بَن تھا

زمیں سب غرق تھی پانی کے اندر
جدھر دیکھو سمندر ہی سمندر

زمیں پوشیدہ تھی اُس کی بغل میں
نہ تھا کچھ فرق جل میں اور تھل میں

نہ بستی تھی نہ ٹاپو تھا کہیں پر
اُسی کا دور دورہ تھا زمیں پر

نہ افریقہ نہ امریکہ نہ یورپ
رہی تھی ایشیا اوشینیا چھُپ

ہمالہ نے بھی تھی ڈُبکی لگائی / نہ دیتی تھی کہیں چوٹی دِکھائی
نہ طارس تھا نہ بندھیاچل نہ اَلطین / نہ فارِس تھا نہ ہندوستان نے چین
مگر دُنیا میں یکسانی کہاں ہے / جو اَب دیکھو تو وہ پانی کہاں ہے
یہاں ہر چیز ہے کروٹ بدلتی / ہر ایک حالت ہے چڑھتی اور ڈھلتی
کوئی شے ہو ہوا ہو یا ہو پانی / سبھی کو ہے بڑھاپا اور جوانی
رہا باقی نہ وہ پانی کا ریلا / اُسے خشکی نے پستی میں دھکیلا
زمیں آہستہ آہستہ گئی چُوس / چھُپائے مال کو جس طرح کنجوس
تری کا جب کہ دامن ہو گیا چاک / تو خُشکی نے اُڑائی جا بجا خاک
پہاڑ اُبھرے ہوئے میدان پیدا / ہوئے میداں میں نخلستان پیدا
تری کا گو ابھی پلّہ ہے بھاری / لڑائی ہے مگر دونوں میں جاری
کیا کرتے ہیں دونوں کاٹ اور چھانٹ / چلی جاتی ہے باہم لاگ اور ڈانٹ
تری ہر دم چلی جاتی ہے اَٹتی / کبھی خُشکی بھی ہے کایا پلٹتی
تری کا تین چوتھائی میں ہے راج / تو خُشکی ایک چوتھائی میں ہے آج
نہیں چلتی تری کی سینہ زوری / زمیں اک روز رہجائے گی کوری
پہن رکھا تھا جب آبی لبادہ / مُٹاپا بھی زمیں کا تھا زیادہ
مگر اب دِن بدن چڑھتی ہے خشکی / تری گھٹتی ہے اور بڑھتی ہے خشکی
کمی بیشی نہیں آتی نظر کچھ / بُہت عمروں میں ہوتا ہے اثر کچھ

(۱۳) نذرِ عقیدت[1]

لب پہ آیا نامِ شاہِ غوث علی — بے تکلف کھل گئی دل کی کلی
پھر صبا سبزہ کو لہرانے لگی — باغِ معنی میں بہار آنے لگی
پھر لگا دی ابرِ رحمت نے جھڑی — پھر وہی بادِ بہاری چل پڑی
پھر وہی محمل وہی ہے کارواں — ناقہ سرمست و حدی خواں سارواں
پھر اُسی منزل میں جا کھولی کمر — دشت چٹیل اور ویرانہ نگر
پھر کھُلا درِ حجرۂ انوار کا — قفل ٹُوٹا قبۂ اسرار کا
پھر وہی صحبت وہی لیل و نہار — پھر لگے ہونے دُرِ معنی نثار
پھر خزانہ غیب کا لُٹنے لگا — رشک سے حاتم کا دَم گھُٹنے لگا
پھر لگی سانچہ میں ڈھلنے بات بات — عارفانہ رمز و مردانہ نکات
پھر الاپے نئے نئے اسرارِ قدم — ذرّہ ذرّہ بن گیا منصُور دم
پھر وہی ساغر وہی بزمِ سُرور — پھر لگا بہنے وہی دریائے نُور
پھر وہی ساقی وہی دیرینہ خُم — کُفر و ایماں کا ہُوا سررشتہ گم
ہو گئے مِل جُل کے سب پھر ایک شے — دورِ ساغر دستِ ساقی مستِ مے
مدح حاضر میں بھی لکھ اب چند بیت — تُو ہی لکھ خود مَا رَمَیتَ اِذْ رَمَیتَ
اے تجلّیٔ اخیرِ ذوالجلال — تھا کمالِ بندگی تیرا کمال
ہاں محمّد وار تو نامِ خُدا — کر گیا ہے بندگی کا حق ادا

---

[1] مولٰنا نے اپنے شیخ مولانا و مرشدنا سیّد غوث علی شاہ پانی پتی قدس سرہ العزیز کی توصیف میں یہ مثنوی ۱۹۱۰ء میں لکھی تھی۔

ترکِ دُنیا ترکِ عقبیٰ ترکِ جاں
قول و فعل و حال سے تیرے عیاں

خوب توڑا تُو نے ہر بندِ کُہن
تھا مگر تو حیدرِ خیبر شکن

ہر توسّل سے تجھے اعراض تھا
شیر خوارِ مبدأ فیّاض تھا

دادِ حق تھی تیری قوّت اور قُوت
تھا خیالِ غیر بیتِ عنکبوت

فَقرِ فخری کی صَدا بھائی تجھے
حق نے بخشی اِرثِ آبائی تجھے

مُدّتوں کے بعد ایک آدم بنا
ہفت خوانِ فقر کا رُستم بنا

شاذ و نادر کوئی شہ بازِ جلال
کھولتا ہے اِس ہَوا میں پَرّ و بال

شیخ و صُوفی رند و زاہد پارسا
سیکڑوں ہیں پر کہاں مردِ خدا

غوثِ اعظم یا جُنید و بایزید
یا نظام الدین یا بابا فرید

یا معین الدین و عطّار و شہاب
اپنے اپنے وقت کے تھے آفتاب

مجمع البحرین تجھ سا بعد ازاں
گردشِ دوراں نے دیکھا تھا کہاں

اَے محیطِ اوّلین و آخریں
آفریں! صد آفریں!! صد آفریں!!!

ذات کا آئینۂ کامل بنا
یہ اَمانت تھی کہ تُو حامل بنا

حامل و محمُول میں یاں فرق کیا
شمسِ رَبّانی کو غرب و شرق کیا

تھا نہایت معتبر پکّا اَمیں
تیرا پیمانہ کبھی چھلکا نہیں

ظرفِ عالی بسکہ دریا نوش تھا
خُم کدے خالی کئے پر ہوش تھا

ہے تری آواز آوازِ خُدا
اور خاموشی تری رازِ خُدا

تھے لبِ شیریں لبِ دریائے ذات / اس لئے ہر بات تھی آبِ حیات
جو حکایت جو مَثَل جو بات تھی / عالَمِ معنی کی اِک سوغات تھی
مُردہ رُوحوں کے لئے تھی زندگی / زندگی وہ جس کو ہو پائندگی
تیرے دَم سے حشرِ رُوحانی ہُوا / صاف و صیقل گوہرِ کانی ہُوا
صُور پُھونکا تُو نے جس کی جان میں / جو ہُوا سو ہو گیا اِک آن میں
جذبِ حق ہو سعیِ طالب سے غلط / چشمِ حق بیں کا اِشارہ تھا فقط
جس کسی پر تُو نے پُھونکا کُچھ فسوں / اِک نہ اِک دِن اُس کو اُبھریگا جنوں
رسم و عادت کا گریباں پھاڑ کر / دینِ تقلیدی سے دامن جھاڑ کر
کُفر پر یاروں کے اِیماں لائے گا / وار مَردوں کا نہ خالی جائے گا
اَے مُقلّد تُجھ کو اِیماں کی قسم! / کافرِ دیرِ فنا کے لے قدم
جو نہ دے تُجھ کو کُھلا کافر بنا / تو مری تکفیر کا محضر بنا
فقر کو ہے کُفر سے نِسبت قوی / ہے مگر وہ کُفر کُفرِ معنوی
فقر محتاجِ خُدا ہرگز نہیں / فقر عینِ ذاتِ حق ہے بالیقیں
ہے یقیں بھی عینِ یکتائی میں عار / فقر سے بھی چاہیئے پھر افتقار
فقرِ فقر آیا تو کیا باقی رہا / بادہ کش باقی نہ خود ساقی رہا
سر گیا تو دردِ سر جاتا رہا / اُٹھ گئی اُمّید ڈر جاتا رہا
اے فنائے فقر تُجھ کو مرحبا / عینِ عُریانی ہے بس تیری عبا

مرحبا اے خازنِ اسرارِ غیب — کیا چھپایا ہے ہنر کو مثلِ عیب
ہاں خزانہ کا چھپانا فرض تھا — گرچہ بیرونِ سما و ارض تھا
یہ چھپانا کم نہ تھا اظہار سے — آگ بھڑکی گرمیٔ بازار سے
وہ چھپے کیا جو کہ ہو خود پردہ در — با ہمہ بے پردگی ہو مستتر
دیکھ کیا کہنا تھا کیا کہنے لگا — نالہ بل کھا کھا کے کیوں بہنے لگا
کچھ نہ تھا واں کچھ نہ ہونے کے سوا — کچھ نہ ہونا بھی وہاں باقی نہ تھا
تو نہ تھا کچھ عینِ عین اللہ تھا — ظاہراً بندہ نہانی شاہ تھا
بندگی کے بھیس میں اے جامہ زیب — دے گیا واللہ تو سب کو فریب
تجھ کو دیکھا پر نہ دیکھا خلق نے — لب نے چکھا پر نہ کھایا حلق نے
تو دھنتّر بید تھا کھاتے اگر — سب دھنتّر بید بن جاتے مگر
کس کی طاقت تھی کہ تجھ کو دیکھتا — لاکھ پردوں میں ہیں خاصانِ خدا
سب گنوں میں تو فریدِ دہر تھا — جاں فزا امرت سے تیرا زہر تھا
تو قلندر رند تھا کونین سوز — سیفِ قاطع (توحید ۱۲) تھا نہ تھا تو بخیہ دوز
تو بھری محفل میں سب کچھ کہہ گیا — گوشِ جاں میں کہہ جو باقی رہ گیا
مَنْ رَّاٰنِیْ کے معانی صاف صاف — شرح فرما تو ہی اے عنقائے قاف
مَنْ رَّاٰنِیْ منہ زبانی جس کی ہے — ہے اسی کا آئنہ ہر ایک شے
تو ہی خود کہہ یا نہ کہہ سن یا نہ سن — لوٹ ہے جب آسماں برسائے ہن

سطح پر جاری ہے ساری لہر بہر — قعر میں چُپ رہ کہ ہے دریائے قہر
سطح کیسی قعر کیا ساحل کجا — بحر ہے لا ابتدا لا انتہا
تیری مجلس مجلسِ اللہ تھی — دونوں عالم کی جہاں گُم راہ تھی
اُس کے ہوتے ہستیٔ عالم کہاں — دِن نِکل آیا تو پھر شبنم کہاں
آپ غالب ہے وہ اپنے امر پر — لیکن اکثر آدمی ہیں بے خبر
تالبِ دریا ہیں آثار و طریق — عین دریا میں ہیں سب راہیں غریق
راہ گُم ہونا ہے راہِ مُستقیم — حاشَ لِلّٰہ ثُمَّ باللہ العظیم

آپ کو گُم کر کہ تُو ہی راہ ہے
راہ کو طے کر حریمِ شاہ ہے

(۱۴) صفتِ شیخ

شیخ کہتے ہیں اُسے جو پیر ہو — بال بال ایسا کہ جوئے شیر ہو
کچھ نہ باقی ہو سیاہی کی جھلک — بن گیا ہو برف سر سے پاؤں تک
وہ سیاہی کیا ہے؟ اوصافِ بشر — مونچھ داڑھی کی سیاہی سے نہ ڈر
مونچھ داڑھی یا سیہ ہو یا سُفید — ہو نہ ہو یاں کچھ نہیں اس کی بھی قید
ہے سیہ بالوں سے ہستی مُدّعا — پیر ہے وہ جس نے دی ہستی مِٹا
چھُٹ گیا جو ہستیٔ موہوم سے — مسندِ پیری پہ بیٹھا دھوم سے
اور اگر باقی ہے ہستی بال بھر — پیر نا بالغ ہے وہ یعنی بشر

جس میں اوصافِ بشر کی ہو لتھیڑ
شیخ وہ ہرگز نہیں اِلّا اَدھیڑ

کر ٹر بڑی داڑھی نہیں مقبولِ حق
ہے ابھی تک اُس میں ہستی کی رمق

جب نہ ہو باقی رُواں کوئی سیاہ
تو سمجھئے اُس کو شیخ دیں پناہ

لا کی کنگھی کر ٹربڑی داڑھی میں کر
تاکہ پرِّ زاغ ہوں بگلے کے پر

(۱۵) تھوڑا تھوڑا مِل کر بہت ہو جاتا ہے

بنایا ہے چڑیوں نے جو گھونسلا
سو ایک ایک تنکا اِکھٹّا کیا

گیا ایک ہی بار سُورج نہ ڈُوب
مگر رفتہ رفتہ ہُوا ہے غروب

قدم ہی قدم طے ہُوا ہے سفر
گئیں لحظہ لحظہ میں عمریں گذر

سمندر کی لہروں کا تانتا سدا
کنارے سے ہے آکے ٹکرا رہا

سمندر سے دریا سے اُٹھتی ہے موج
سدا کرتی رہتی ہے دھاوا یہ فوج

کراروں کو آخر گرا ہی دیا
چٹانوں کو بالکل صفاچٹ کیا

برستا جو مینھ موسلا دھار ہے
سو یہ ننّھی بُوندیوں کی بوچھار ہے

درختوں کے جھُنڈ اور جنگل گھنے
یونہیں پتّے پتّے سے مِل کر بنے

ہوئے ریشہ ریشہ سے بن اور جھاڑ
بنا ذرّہ ذرّہ سے مِل کر پہاڑ

لگا دانہ دانہ سے غلّہ کا ڈھیر
پڑا لمحہ لمحہ سے برسوں کا پھیر

جو ایک ایک پل کر کے دِن کٹ گیا | تو گھڑیوں ہی گھڑیوں برس گھٹ گیا
لِکھا لِکھنے والے نے ایک ایک حرف | ہوئیں گڈّیاں کتنی کاغذ کی صرف
ہوئی لکھتے لکھتے مُرتّب کتاب | اِسی پر ہر اِک شے کا سمجھو حساب
ہر اِک علم و فن اور کرتب ہنر | نہ تھا پہلے ہی دِن سے اِس ڈھنگ پر
یونہیں بڑھتے بڑھتے ترقّی ہوئی | جو نیزہ ہے اب۔ تھا وہ پہلے سُوئی
جولاہے نے جوڑا تھا ایک ایک تار | ہوئے تھان جس کے گزوں سے شُمار
یونہیں بھوئیوں بھوئیوں بھرے جھیل تال | یونہیں کوڑی کوڑی ہُوا جمع مال

اگر تھوڑا تھوڑا کرو صُبح و شام
بڑے سے بڑا کام بھی ہو تمام

(۱۶) ایک وقت میں ایک کام

ہے کام کے وقت کام اچھّا | اور کھیل کے وقت کھیل زیبا
جب کام کا وقت ہو کرو کام | بھُولے سے بھی کھیل کا نہ لو نام
ہاں کھیل کے وقت خُوب کھیلو | کُودو پھاندو کہ ڈنڈ پیلو
خوش رہنے کا ہے یہی طریقہ | ہر بات کا سیکھئے سلیقہ
ہمّت کو نہ ہار یو خُدارا | مت ڈھونڈیو غیر کا سہارا
اپنی ہمّت سے کام کرنا | مُشکل ہو تو چاہیئے نہ ڈرنا

جو کچھ ہو سو اپنے دم قدم سے | کیا کام ہے غیر کے کرم سے
مت چھوڑیو کام کو اَدھورا | بے کار ہے جو ہُوا نہ پُورا
ہر وقت میں صرف ایک ہی کام | پا سکتا ہے بہتری سے انجام
جب کام میں کام اور جھیڑا | دونوں ہی میں پڑ گیا بکھیڑا
جو وقت گزُر گیا اَکارت | افسوس! ہوا خزانہ غارت

ہے کام کے وقت کام اچّھا
اور کھیل کے وقت کھیل زیبا

(۱۷) داناؤں کی نصیحت دِل سے سُنو

راوی نے ہے اِس طرح خبر دی | اِک شب لگی بندروں کو سَردی
سَردی نے دیا جو سخت آزار | جویا ہوئے آگ کے وہ ناچار
ہر چار طرف دوا دوش کی | پائی نہ کہیں دوا خلش کی
ناگہہ چمکا جو کرمِ شب تاب | اخگر اُسے جان کر لیا داب
ناچے کُودے خوشی سے باہم | اِتنکے پتّے کئے فراہم
رکھکر اُسے خار و خس کے اندر | پھُونکیں لگے مارنے وہ بندر
لیکن ہُوا فائدہ نہ کچھ بھی | اُٹّھا نہ دُھواں نہ آگ سُلگی
کرتے رہے پھر بھی کام اَپنا | چھُوڑا نہ خیالِ خام اَپنا

صحرا میں جو اور جانور تھے
وہ تجربہ کار و باخبر تھے
سمجھانے لگے ز روئے شفقت
یُوں وقت کو رائیگاں کرو مت
اِس کام سے کیجئے کِنارہ
جُگنو کو نہ جانئے شرارہ
سمجھانے سے وہ مگر نہ سمجھے
جب تک نہ ہوئی سحر نہ سمجھے
یاروں نے کہی تھی بات ڈھب کی
غُرّا کے انھیں دِکھائی بھبکی
ناداں رہے رات بھر اکڑتے
سَر مارتے ایڑیاں رگڑتے
جب صُبح ہوئی تو شک ہوا دُور
شرمندہ ہوئے بہت وہ مغرُور

سُن لو نہ سُنے گا جو نصیحت
ہوگا وہ اِسی طرح فضیحت

(۱۸) چھوٹے سے کام کا بڑا نتیجہ

ایک بچّہ کہ ابھی کچھ اُسے تمیز نہ تھی
لہو و بازی سے پسندیدہ کوئی چیز نہ تھی
کھیلنا۔ کُودنا۔ کھانا۔ یہی معمُول تھا بس
اِنہیں طفلانہ تمنّاؤں میں مشغول تھا بس
ایک تالاب تھا دو چار قدم گھر سے پَرے
دِل میں لہر آئی لبِ آب ذرا سیر کرے
صاف پانی سے جو تالاب کو پایا لبریز
کھیل کا شوق طبیعت میں ہوا اور بھی تیز
اُس پاس اپنے جو پایا کوئی کنکر پتھّر
پھینک مارا اُسے پانی میں بہت خوش ہو کر
کھیل تھا پہلے تو اب طُرفہ تماشا دیکھا
دِل ہی دِل میں متحیّر تھا کہ یہ کیا دیکھا

دائرہ ایک بنا ایسا کہ بڑھتا ہے محیط
گھیر لی جس نے کہ تالاب کی سب سطح بسیط

پھر تو کھیل اُس کا اِسی شغل پہ موقوف رہا
اِسی نظّارہ میں تا دیر وہ مصروف رہا

اِسی اثنا میں ہُوا بچّہ کی ماں کا بھی گزر
بولا امّاں مجھے آئی ہے عجب چیز نظر

جو نہ دیکھی نہ سُنی تھی کبھی اب سے پہلے
شاید آئی ہے نظر مجھ کو ہی سب سے پہلے

اِک ذرا سی حرکت اور یہ تاثیر عجیب
دائرہ بڑھ کے پہونچتا ہے کنارے کے قریب

بسکہ جی جان سے اِس شعبدہ پر تھا شیدا
وُسعتِ دائرہ کی اپنے عمل سے پیدا

تھی وہ ماں اہلِ دل اور نیک منش نیک نہاد
ہنس کے فرمایا مری جان یہ نصیحت رکھ یاد

یونہیں ہر کام کا ہو جاتا ہے انجام بڑا
گو کہ آغاز میں ہوتا نہیں وہ کام بڑا

کبھی ادنیٰ حرکت زلزلہ بن جاتی ہے
کبھی ناچیز سی اک بات غضب ڈھاتی ہے

یہ ہی انداز نکوکاری و بدکاری ہے
اولاً خاص تھی اب عام میں وہ جاری ہے

(۱۹) ترکِ تکبّر

بلندی سے چلا سیلابِ پُرزور
پہاڑی گھاٹیوں میں مچ گیا شور

ہُوا اِس تیزی و تندی سے جاری
کہ تھی سنگِ گراں پر ہول طاری

شجر تو کیا اُٹھاتے اُس کی ٹکّر
بہم ٹکرا دئے پتھر سے پتھّر

غرض ڈھایا بہایا اور توڑا
پڑا جو سامنے اُس کو نہ چھوڑا

چلا وادی کی جانب موج در موج
جلو میں تھی خس و خاشاک کی فوج

اُسی زمرہ میں اِک لکڑی بھی بہتی
چلی جاتی تھی اور یُوں دِل میں کہتی

"میں راہ و رسمِ منزل سے ہوں آگاہ
یہ سارا قافلہ ہے میرے ہمراہ

اِشاروں پر مرے چلتا ہے پانی
ہے میرے بس میں دریا کی روانی

مرے دم سے رواں یہ کارواں ہے
مرا تابع ہے جو کوئی یہاں ہے"

قضارا موج نے پلٹا جو کھایا
تو اِک پتھّر نے لکڑی کو دبایا

کہا لکڑی نے او گستاخ مغرور
مرے دامن سے اپنا ہاتھ رکھ دُور

کہ میں ہی بدرقہ ہوں رہنما ہوں
امیرِ بحر ہوں اور ناخدا ہوں

مجھے او بے ادب کیوں تو نے چھیڑا
جو میں ڈوبی تو بس ڈوبا یہ بیڑا

رُکوں گی میں تو رُک جائے گا دریا
کُڑھے گا اور پچھتائے گا دریا

کہا پتھّر نے کہہ ساحل سے احوال
کہ ہے ہم سب میں وہ پیرِ کہن سال

کہی لکڑی نے ساحل سے وہی بات
تو ساحل نے صدا یوں دی کہ ہیہات!

ہزاروں مدّعی آگے بھی آئے
بہت جوش و خروش اپنے دِکھائے

گیا سالم نہ کوئی اِس بھنور سے
یہی دیکھا کیا ہوں عُمر بھر سے

ہوئے یاں غرق لاکھوں تجھ سے فرعون
نہ پُوچھا پھر کسی نے یہ کہ تھے کون

مگر دریا کی باقی ہے وہی آن
وہی رونق وہی عظمت وہی شان

نہیں دریا کی موّاجی میں کچھ فرق
اُسے کیا غم ترے کوئی کہ ہو غرق

(۲۰) حیا

او حیا! او پاسبانِ آبرُو! نیکیوں کی قوّتِ بازو ہے تُو
پاک دامانی پہ تُجھ کو ناز ہے کیا ہی تیرا دِل پذیر انداز ہے
کھُب گئی جس آنکھ میں تو مثلِ نُور بدنگاہی سے رہی وہ آنکھ دُور
دامنِ عِصمت کو تُو رکھتی ہے پاک ہے سدا جُرم و گُنہ سے تجُھ کو باک
گر نہ ہوتا درمیاں تیرا حجاب فِعلِ بد سے کون کرتا اِجتناب
خواہشوں کو جو نہ تُو دیتی لگام آدمی حیوان بن جاتے تمام
جب خطا کرتی ہے دِل میں شور و شر تو ہی بن جاتی ہے واں سینہ سپر
ذِلّت و خواری تجُھے بھاتی نہیں تابِ رُسوائی کی تُو لاتی نہیں
تُو مذلّت کو سمجھتی زہر ہے اور ملامت تیرے حق میں قہر ہے
مُفلسوں کی ہے تُو ہی پُشت و پناہ تُو سُجھاتی ہے عرق ریزی کی راہ
گو تہی دستی کے ہو جائیں شکار ہے مگر تجُھ کو گدائی ننگ و عار
ہے ترے نزدیک مرجانا پسند پر نہیں ہے ہاتھ پھیلانا پسند
اِس قدر تجُھ کو نہیں پروائے نان جس قدر تو آن پر دیتی ہے جان
آبرُو کھوتی نہیں از بہرِ قُوت لب پہ بن جاتی ہے تُو مُہرِ سکوت
اَغنیا کے دِل کو گرماتی ہے تُو بُخل اور خِسّت سے شرماتی ہے تُو
تُو سِکھا دیتی ہے اُن کو بذلِ مال زخمِ خنجر ہے تجُھے ردِّ سوال

(۲۱) بارش کا پہلا قطرہ

گھنگھور گھٹا تُلی کھڑی تھی
پر بُوند ابھی نہیں پڑی تھی

ہر قطرہ کے دِل میں تھا یہ خطرہ
ناچیز ہوں میں غریب قطرہ

تر مجھ سے کِسی کا لب نہ ہو گا
مَیں اَور کی گوں نہ آپ جُو گا

کیا کھیت کی مَیں بجھاؤں گا پیاس
اپنا ہی کروں گا ستیاناس

آتی ہے برسنے سے مجھے شرم
مٹّی پتھّر تمام ہیں گرم

خالی ہاتھوں سے کیا سخاوت
پھیکی باتوں میں کیا حلاوت

کِس برتے پہ مَیں کروں دلیری
مَیں کون ہوں کیا بساط میری

ہر قطرہ کے دِل میں تھا یہی غم
سرگوشیاں ہو رہی تھیں باہم

کھچڑی سی گھٹا میں پک رہی تھی
کچھ کچھ بجلی چمک رہی تھی

اِک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور
ہمّت کے محیط کا شناور

فیّاض و جواد و نیک نیّت
بھڑکی اُس کی رگِ حمیّت

بُولا للکار کر! کہ آؤ!
میرے پیچھے قدم بڑھاؤ

کر گزرو جو ہو سکے کچھ احسان
ڈالو مُردہ زمین میں جان

یارو! یہ ہچر مچر کہاں تک
اپنی سی کرو بنے جہاں تک

مِل کر جو کرو گے جانفشانی
میدان پہ پھیر دو گے پانی

کہتا ہوں یہ سب سے برملا مَیں
آتے ہو تو آؤ لو چلا مَیں

یہ کہہ کے وہ ہو گیا روانہ "دُشوار ہے جی پہ کھیل جانا"
ہر چند کہ تھا وہ بے بضاعت کی اُس نے مگر بڑی شجاعت
دیکھی جُرأت جو اُس سخی کی دو چار نے اور پیروی کی
پھر ایک کے بعد ایک لپکا قطرہ قطرہ زمین پہ ٹپکا
آخر قطروں کا بندھ گیا تار بارش لگی ہونے موسلا دھار
پانی پانی ہُوا بیاباں سیراب ہوئے چمن خیاباں
تھی قحط سے پائمال خلقت اُس مینہ سے ہوئی نہال خلقت
جُرأت قطرہ کی کر گئی کام باقی ہے جہاں میں آج تک نام
اے صاحبو! قوم کی خبر لو قطروں کا سا اِتفّاق کر لو

قطروں ہی سے ہو گی نہر جاری
چل نکلیں گی کشتیاں تمہاری

(۲۲) مثنوی بادِ مُراد

چل اے بادِ بہاری سمتِ گلزار تمنّائی ہے تیرا ہر گُل و خار
نہال و نخل و سبزہ سب ہیں سُنساں گیاہِ مُردہ میں تُو ڈال دے جاں
نہیں گُلشن میں پتّے کا بھی کھڑکا ذرا شاخیں ہِلا۔ طائر کو بھڑکا
لہک تیزی سے اے بادِ بہاری کہ ہو جائے چمن پر وجد طاری
جو تُو لہکے تو سبزہ لہلہائے چمن کا بیل بُوٹا سر ہلائے

لچک جائے کمر نازک شجر کی
زمیں پر جھک پڑے ڈالی ثمر کی

ٹپک جائے جو ہو پکّا ہُوا پھل
کہ شاخیں ہو رہی ہیں سخت بوجھل

سُنا۔ بادِ صبا! کیا کیا خبر ہے
قلمرو میں تیری کُل بحر و بر ہے

ذرا کر دامنِ صحرا میں راحت
بہت کی تُو نے دریا کی سیاحت

بس اب آرام کر لوگوں کے گھر میں
رہی تا دیر تُو سیر و سفر میں

تیرے ہمراہ چلے آتے ہیں پیہم
یہی ہیں کیا سفیرِ بحرِ اعظم

جلو میں ہے تیرے اِک فوجِ جرّار
تُو ہی ہے ابر کے لشکر کی سردار

اُٹھایا ہے سمندر تو نے سر پر
گھٹا کو لاد کر لائی کمر پر

تیری تیزی سے ہیں بادل لپکتے
ترے جھونکوں سے ہیں قطرے ٹپکتے

غزل

چمن ہے ابر ہے ٹھنڈی ہوا ہے
ہجومِ طائرانِ خوش نوا ہے

کبھی جھونکا نکل جاتا ہے سَن سے
کبھی آہستہ روِ موجِ صبا ہے

غبار و گرد سے جو اَٹ گئی تھی
صبا نے غُسل کا سامان کیا ہے

ہوا نے کیا ہوا باندھی چمن میں
کہ خُوبانِ چمن کا سر ہلا ہے

چمن کا پتّا پتّا ہے نوا سنج
صبا کی آمد آمد جا بجا ہے

گُلوں کی ڈالیاں جُھک جُھک گئی ہیں
زمیں پر سبزہ کیسا لوٹتا ہے

کھِلی ہر پنکھڑی گُلہائے تر کی
صبا نے کان میں کیا کہدیا ہے

بکھیری نسترن پر زُلفِ سُنبل
صبا شوخی میں فتنہ ہے بلا ہے

گیاہِ سبز کا طُرّہ پریشاں
صبا تیرے ہی چھیڑے سے ہُوا ہے

نہیں ہے مجھ کو دعویٰ شاعری کا
تو پھر مقطع سے بھی کیا مُدّعا ہے

کبھی اے بادِ مُراد آہنگِ آفاق
جہازِ سُست رو ہے تیرا مشتاق

پھریرے کو اُڑا کش بادباں کو
کہ دیکھیں ساحلِ ہندوستاں کو

خلیج و آبنائے و بحر و ساحل
تیرے دیکھے پڑے ہیں سب مراحل

مقامِ استوا سے تا بہ قطبین
تجھے جُنبش نہیں دیتی کبھی چین

بہت کھوندے ہیں کوہ و دشت تُو نے
کیا بحرین کا گلگشت تُو نے

محیطِ ارض ہے تُو اے سُبک پا
تری موجیں رواں ہیں مثلِ دریا

لطیف و نازک و بےرنگ ہے تُو
اصُولِ نغمہ و آہنگ ہے تُو

رواں ہے تیری موجوں میں ہر آواز
تو ہی کانوں میں ہے ہنگامہ پرداز

جہاں میں تو رسولِ ہر ندا ہے
مذاقِ سامعہ تجھ پر فدا ہے

نہ پہنچے تو اگر تا پردۂ گوش
سب آوازیں رہیں پردہ میں روپوش

وہ بہرا ہے جو تجھ سے بے اثر ہے
وہ سُنتا ہے جو تجھ سے بہرہ ور ہے

زباں کو نُطق کا یارا ہے تجھ سے
جہاں میں شور و شر سارا ہے تجھ سے

حجابِ دیدۂ بینا نہیں تو نگہ سے گرچہ ہے پردہ نشیں تو
ترے کھانے سے دم لیتی ہے خلقت ترے کھانے پہ دم دیتی ہے خلقت
ہمیں تیری ضرورت ہے بہر طور نہیں ایسی ضروری شے کوئی اور
اگر اک لمحہ گزرے ہم پہ تجھ بن تو ہو جائے تنفّس غیر ممکن
ہے تیرا شغل دائم پاسِ انفاس نہیں ہے ورنہ تجھ بن زیست کی آس
تو ہی ہے اے نسیمِ صبح گاہی مثالِ رحمتِ عامِ الٰہی
جہاں میں ہیں ترے الطاف حاوی غریبوں اور امیروں پر مساوی
کبھی بنتی ہے ایسی تند و پُر شور معاذ اللہ! معاذ اللہ! ترا زور
اگر تو خشمگیں اے تند خو ہو تہ و بالا جہازِ جنگ جو ہو
کبھی دریا میں لے جائے بہا کر کبھی ساحل پہ دے پٹکے اٹھا کر
اڑاتی ہے اسے تو راہ بے راہ جہاز آگے ترے مثلِ پرِ کاہ
معاذ اللہ ترا طوفاں غضب ہے تیری تیزی نشانِ قہرِ رب ہے
اجاڑا تو نے گلزار و چمن کو ہلا ڈالا ہے جنگل اور بن کو
یہ چھیڑا نے میں کیسا راگ تو نے نیستاں میں لگا دی آگ تو نے
تیری رفتار ہے بے باک کیسی اڑاتی ہے زمیں کی خاک کیسی
یہ گل کترے ہیں تو نے بے تأمّل کیا اک دم زدن میں شمع کو گُل
کبھی گرمی سے گرما گرم ہے تو کبھی سردی سے سرد و نرم ہے تو

چُرا لیتی ہے تُو پانی کو چُپ چاپ
نظر آتا نہیں جب بن گیا بھاپ

برودت کی پُولیس نے تُجھ کو گھیرا
تو کچُھ کچُھ مالِ مسروقہ بھی پھیرا

جو بادی چور تُو ایسی نہ ہُوتی
نہ پاتے صُبح کو شبنم کے مُوتی

دبائیں تو نہیں دبنے سے اِنکار
تیری عادت نہیں ہے ضِدّ و اصرار

خوشامد تیری خصلت میں نہیں ہے
تری تیزی برابر ہر کہیں ہے

اُجاڑا اگر کِسی مُفلِس کا چھپّر
اُکھاڑا خیمہ و خرگاہِ لشکر

نہ در گزُرے غریبوں کے مکاں سے
نہ جِھجکے طُرّہ تاجِ شہاں سے

نہیں کچُھ تُجھ کو خوفِ شانِ سُلطاں
اُڑایا پردۂ ایوانِ سُلطاں

کِسی کا طُرّۂ طرّار چھیڑا
کِسی کا بُرقعِ زرتار چھیڑا

غرض دِلچسپ تیری ہر اَدا ہے
تیری شوخی و چالاکی بجَا ہے

(۲۳) مناقشہ ہَوا و آفتاب

بادِ صحرا نے کہا یُوں ایک روز
مہرِ تاباں سے کہ اے گیتی فروز

تُو ہے عُلوی اور میں سفلی مگر
زُورِ بازو میں ہوں مَیں تُجھ سے زبر

نیّرِ اعظم نے فرمایا کہ ہاں!
ہو اگر ثابت زروئے اِمتحاں

ورنہ ہے بادر ہوا یہ قال و قیل
ہیچ ہے دعوٰی نہ ہو جب تک دلیل

بُولی جو یُوں ہے تو اچھّا یُوں سہی
ہاتھ کنگن کے لئے کیا آرسی

آئیے زور آزمائی کیجئے
اِس بکھیڑے کی صفائی کیجئے

اِک مُسافر اپنی دُھن میں تھا رواں
اُس کو اِن دونوں نے تاکا ناگہاں

ہو گئے آپس میں طے قول و قرار
جو لبادہ لے مُسافر کا اُتار

بس اُسی کے نام کا ڈنکا بجے
سر پہ دستارِ فضیلت وہ سجے

پھر تو آندھی بن کے چل نکلی ہوا
ایسی بِپھری کر دیا طوفاں بپا

اُونچے اُونچے پیڑ تھرّانے لگے
جھوک سے جھوکوں کی چرّانے لگے

نونہالوں کی کمر بل کھا گئی
پھول پتّوں پر قیامت آ گئی

کانپ اُٹھے اُس دشت کے کُل وحش و طیر
مانگتے تھے اپنے اپنے دم کی خیر

ہو گیا دامانِ صحرا گرد برد
گِھر گیا آفت میں وہ صحرا نورد

چاہتی تھی یُوں لبادہ کو اُچک
مُدّعی کو دوں سرِ میدان زک

جب ہوا لیتی تھی چکّر میں لپیٹ
بیٹھ جاتا تھا وہ دامن کو سمیٹ

سینہ زوری سے نہ چوری سے ڈری
کر سکی لیکن نہ کچھ غارت گری

باندھ لی کس کر مُسافر نے کمر
تا ہوا کا ہو نہ کپڑوں میں گزر

تھک گئی آخر نہ اُس کا بس چلا
ٹل گئی سر سے مُسافر کے بلا

اب تھما جھکڑ تو نکلا آفتاب
رُوئے نُورانی سے سرکائی نقاب

تمکنت چہرے سے اُس کے آشکار
چال میں اِک بُردباری اور وقار

وہ ہوا کی سی نہ تھی یاں دُھوم دھام
کر رہا تھا چُپکے چُپکے اپنا کام

دھیمی دِھیمی کرنیں چمکانے لگا — رفتہ رفتہ سب کو گرمانے لگا
اُس مُسافر کو پسینا آ گیا — کھول ڈالے بند جی گھبرا گیا
اور آگے کو بڑھا تو دُھوپ سے — تن بدن میں کچھ پتنگے سے لگے
اب لبادہ کو لیا کاندھے پہ ڈال — بدلی یُوں نوبت بہ نوبت چال ڈھال
جب چڑھا خورشید سمت الرّاس پر — بیٹھ کر سایہ میں پھر تو گھاس پر
دُور پھینکا اُس لبادہ کو اُتار — واہ رے سُورج! لیا میدان مار
تیزی و تُندی کے گرویدہ ہیں سب — کامیابی کا مگر ہے اور ڈھب

اُس کا گُر ہے نرمی و آہستگی
سرکشی کی رگ اُسی سے ہے دبی

(۲۴) مکالمۂ سیف و قلم

سیف و قلم میں جو ہوئی دُو بدُو — شوق ہے تم کو تو سُنو مُو بمُو
خامہ لگا کہنے کہ او تیغ تیز — تجھ سے بھلا کس کو مجالِ ستیز
آب وہ تیری کہ نہ ٹھیرے نگاہ — آنچ وہ تیری۔ کہ خُدا کی پناہ
رہزنِ سفّاک کی یاور ہے تُو — خُون کے دریا کی شناور ہے تُو
سیکھے ستم کس ستم ایجاد سے — شور ہے برپا تری بیداد سے
شوخی و بے باکی و تیزی میں برق — آگ ہے اور آب میں رہتی ہے غرق
تُند مزاجی میں تو شدّاد ہے — بیضۂ فولاد کی اولاد ہے

آتشِ سوزاں کا پیا تو نے دُود
اِس لئے جاں سوز ہے تیرا وجُود

حیف تیری سختی و آہن دِلی
نوعِ بشر کی ہے تو دشمن دِلی

خرمنِ ہستی میں لگاتی ہے آگ
عافیت و امن سے رکھتی ہے لاگ

گو کہ مُجلّا ہے تو آئینہ وار
تیرہ درونی ہے تیری آشکار

تیری گھُٹی میں پڑا زہر ہے
چال قیامت تو ادا قہر ہے

فتنۂ عالم ہے تیرا بانک پن
شوخی و شنگی ہے تیرا خاص فن

شکل انوکھی تو نرالی ہے دھج
جسم بھی خمدار طبیعت بھی کج

قحط زدوں کا سا تن و توش ہے
کھانے پہ ڈھوکے تو بلا نوش ہے

عرصۂ راحت ہے ترے دم سے تنگ
ایسی لڑاکا کہ بنی خانہ جنگ

تیری جبلّت ہے فسوق و جدال
ناحق و حق کا نہیں تجھ کو خیال

قتل کا رکھتی ہے بہت چاؤ تو
رَن میں کیا کرتی ہے ستھراؤ تو

اُف نہ کرے لاکھ گلے کاٹ کر
جی نہ بھرے تیرا لہو چاٹ کر

خلقِ خدا تجھ سے ہے آزار کش
کرتی ہی رہتی ہے سدا چپقلش

بحرِ فنا کہئے ترے گھاٹ کو
جس نے دیے سیکڑوں بیڑے ڈبو

گرچہ سراپا ہے ترا آب گوں
پر تری چتون سے ٹپکتا ہے خوں

تو نے اُجاڑیں بہت آبادیاں
چھین لیں اقوام کی آزادیاں

تو نے کروڑوں کئے بچّے یتیم
لاکھوں ہی باپوں کے کئے دل دو نیم

لے گئی ماؤں کی کمائی کو لُوٹ
رہ گئیں بیچاریاں چھاتی کو کوٹ

دُلہنیں رُوتی ہیں تری جان کو
ساتھ ہی لے جائیں گی ارمان کو

مُوتیوں سے مانگ تھی جن کی بھری
اُن سے کراتی ہے تُو گدیہ گری

تُو نے رفیقوں کو رُلایا ہے خُوں
غم سے عزیزوں کو ہُوا ہے جُنوں

تفرقہ پرداز! یہ کیا کر دیا؟
گوشت کو ناخُن سے جُدا کر دیا

شیوہ ترا شُہرۂ آفاق ہے
خُون خرابہ میں تو مشّاق ہے

چاہتی ہے بُغض و عداوت کو تُو
اُنس و محبّت کی نہیں تجھ میں بُو

تیری دغا بازی ہے ضرب المثل
غیر ہے قبضہ سے گئی جب نکل

تُو نے وفا کی نہیں پٹّی پڑھی
اُس کی ہوئی جس کے تُو ہتّے چڑھی

کون کرے تجھ سے رفاقت کی آس
کُچھ نہیں تجھ کو حقِ صُحبت کا پاس

رکھتی نہیں سابقۂ لُطف یاد
کور نمک ہے ترا کیا اعتماد

میل حریفوں سے یگانوں سے چھُوٹ
نکلے گا مالک کا نمک پھُوٹ پھُوٹ

مملکتیں خاک سیہ تُو نے کیں
تیری قساوت نے اُجاڑی زمیں

بستیاں کرتی ہیں پڑی بھائیں بھائیں
مقبرے آباد ہیں کچھ دائیں بائیں

اُٹھّے تیری ذات سے جو جو فساد
اہلِ تواریخ کو کچھ کچھ ہیں یاد

ثبتِ جریدہ اُنھیں میں نے کیا
ہے وہ خُلاصہ تری روداد کا

تُو ہی بھرت کھنڈ کی بھارت میں تھی
تیری خوشی جانوں کی غارت میں تھی

ہند کے جودھا تھے بڑے سور بیر
کھا گئی تُو سب کو دمِ دار و گیر

تُو نے نصیحت نہ کسی کی سُنی
چَٹ گئے اُس عہد کے گیانی گُنی

وادیِ توران میں چمکی کبھی
دیتی رہی ایران کو دھمکی کبھی

باڑھ پہ تیری جو چڑھا پہلواں
نام کو بھی اُس کا نہ چھوڑا نشاں

تیری جو ضحّاک سے گہری چھنی
قوم کا ہر فرد بنا کُشتنی

معرکۂ رُستم و افراسیاب
تیری بدولت ہوا زیبِ کتاب

قتل کا دھبّا ترے دامن پہ ہے
خُونِ سیاوش تری گردن پہ ہے

خاک اُڑائی یہ تری آب نے
جان دی ناشاد ہی سُہراب نے

تُو جو طرفدارِ سکندر ہوئی
خاک میں دارا کو مِلا کر ہوئی

تختِ کیاں کا دیا تختہ اُلٹ
کردی یُونان کی کایا پلٹ

لشکرِ یُوناں کی جِلو جب پھری
باختر و بلخ پہ بجلی گری

تُو نے عرب سے جو کیا اتّفاق
فارس و رُوما کی مٹی طمطراق

جب ہوئی فارس پہ تیری دست بُرد
دخمہ بنی بارگہِ یزدجرد

شوکتِ ساسان کے ڈیرے لدے
بُجھ گئے زردشت کے آتشکدے

غرب کی جانب کو جو تُو جھٹ پڑی
شام پہ اِک ضرب لگائی کڑی

رُوم میں برپا کیا شورِ نشور
دولتِ ہرقل کا ہوا شیشہ چُور

تُوڑ دیا رُوم کا سارا طلسم
رہ گیا بے جان سا مُردار جسم

ہاشمیوں کا نہ دیا تُو نے ساتھ
آلِ اُمیّہ کا پڑا تجھ پہ ہاتھ

ڈھایا ہے کیا تُو نے غضب برملا
گرم کیا معرکۂ کربلا

طُرفہ ستمگار ہے عالم میں تُو
عید مناتی ہے محرّم میں تُو

پھٹ نہ گیا کیوں ترا ظالم جگر
ڈُوب مَری کیوں نہ تُو اے خیرہ سر

قہرِ الٰہی سے جو ڈرتی کبھی
مرتی پہ یہ کام نہ کرتی کبھی

ہند پہ محمُود کی لشکر کشی
یاد دِلاتی ہے تری سرکشی

بدلی ہوا ایک تیری چال میں
لُوٹ پڑی دولتِ جے پال میں

کیا ہی نظر سوز تھی تیری چمک
دھاک تھی کالنجر و قنّوج تک

یاد ہیں کچھ تجھ کو عجب داؤ گھات
توڑ دیا بُت کدۂ سومنات

تو نے ہڑپ کر لئے لاکھوں ہی سر
کم نہ ہوئی پر تری جوع البقر

غور سے جس دم تری آندھی چلی
ہند کی سینا میں مچی کھلبلی

رائے پتھورا کا وہ جاہ و جلال
ہو گیا بَل مارتے خواب و خیال

بن گئی ہر بزمِ طرب غم کدہ
دہلی و اجمیر تھے ماتم کدہ

سوگ میں رانی نے کیا سینہ چاک
آتشِ سوزاں میں ہوئی جل کے خاک

رائے رہا اور نہ رانی رہی
زیبِ سخن تیری کہانی رہی

چونک پڑا فتنۂ جنگِ تتار
لشکرِ چنگیز کا اُٹھّا غبار

چھا گیا اِک ابرِ ستم چار سو
خون کے سیلاب بہے کُو بکُو

کٹ گئے خوارزم و خراساں کے باغ ‏ زمزمۂ بلبل کا بنا شورِ زاغ
دیلم و بغداد پہ ٹوٹا غضب ‏ درہم و برہم ہوئی بزمِ عرب
صرصرِ تاراج چلی سربسر ‏ آگ وہ بھڑکی کہ جلے خشک وتر
تیرے ہی کوتک تھے یہ اے نابکار! ‏ کیا کہوں بس تجھ کو خدا کی سنوار
کشورِ یورپ سے اُٹھا غلغلہ ‏ وادیٔ یردن میں پڑا زلزلہ
حربِ صلیبی تھی وہ خونخوار جنگ ‏ ٹوٹ پڑا جس کے لئے کُل فرنگ
تو جو برہنہ ہوئی او فتنہ گر! ‏ تن سے جُدا ہو گئے نو لاکھ سر
نکلا تجھے لے کے جو تیمورِ لنگ ‏ پھونک دیا چار طرف صورِ جنگ
چوس لیا رُوس کا خونِ جگر ‏ داب دئے قاف میں دیوؤں کے سر
خون سے گُل خاکِ صفاہاں ہوئی ‏ کانپ اُٹھی تختگہِ ہند بھی
ناحیۂ شام سے تا حدِّ چیں ‏ مقتلِ انساں بنا دی زمیں
تو جو بنی ہمدمِ نیپولین ‏ بول دی یورپ میں صدائے بزن
تاجورِ اطراف کے تھرّا گئے ‏ ناک میں ہمسایوں کے دَم آ گئے
جب ہوئی نادر کی تو زیبِ کمر ‏ خلقِ خدا بول اُٹھی الحذر
حضرتِ دہلی کنفِ عدل و داد ‏ جس کو کیا تھا کبھی خسرو نے یاد
اُس کی یہ حالت ہوئی زار و زبوں ‏ کوچہ و برزن میں بہی جوئے خوں
دینے لگے اُس میں صدا خوف و بیم ‏ زلزلۃ السّاعۃ شیءٌ عظیم

بیکہئے القصّہ کہاں تک بیاں　　فردِ مظالم ہے تری داستاں
میری غرض تیری فضیحت نہیں　　بلکہ بجز پند و نصیحت نہیں
تُند تھی ازبسکہ صریرِ قلم　　سُن کے ہوئی تیغ دودم بھی عَلَم
آتشِ غیظ اُس کی بھڑکنے لگی　　بجلی کی مانند کڑکنے لگی
ڈانٹ کے بولی کہ خبردار ہو!　　اب مری باری ہے لے ہُشیار ہو!
بد ہوں خدا جانے کہ ہوں نیک میں　　رکھتی ہوں دل اور زباں ایک میں
مُجھ کو دورنگی نہیں بھاتی ذرا　　میل ملاتی نہیں کھوٹا کھرا
مہر ہو تو مہر جو کیں ہو تو کیں　　یک جہتی ہے مرا آئین و دیں
بات کی ہرگز نہیں زنہار پیچ　　میرا خمیر اور مرا کس بل ہے سچ
حُجّتِ قاطع ہوں میں سرتا بپا　　چھوڑتی باقی نہیں تسمہ لگا
جبکہ نہ ہو فصلِ خصومت بہم　　میرے سوا کون بنے واں حَکَم
عیب کہو میرا اِسے یا ہُنر　　فیصلہ دو ٹوک اِدھر یا اُدھر
تیری طرح کاہے کو باتیں گھڑوں　　لڑنے پہ آؤں تو میں سنمکھ لڑوں
خوب کیا تو نے نکالی جو چھیڑ　　دونگی ابھی میں تیرے بخیے اُدھیڑ
جنگ کا بوتی ہوں اگر بیج میں　　سینچ کے پھر اِس کو بتدریج میں

پود بڑھاتی ہوں وہ نِعم البَدل
رِفق و مُدارا کے لگیں جس میں پھَل

(۲۵) ایک گنوار اور قوسِ قزح

تھی شام قریب اور دہقاں میداں میں تھا گلّہ کا نگہباں
دیکھی اُس نے کمان ناگاہ جو کرتی ہے مینہ سے ہم کو آگاہ
رنگت میں اُسے عجیب پایا ظاہر میں بہت قریب پایا
پہلے سے وہ سُن چکا تھا اکثر ہے قوس میں اِک پیالۂ زر
مشہور بہت ہے یہ کہانی افسانہ تراش کی زبانی
ملتی ہے جہاں کماں زمیں سے ملتا ہے وہ جامِ زر وہیں سے
سوچا لو جام اور بنو جم چھوڑو بُز و گوسفند کا غم
بیہودہ گنوار اِس گماں پر سیدھا گیا تیر سا کماں پر
دن گھٹنے لگا قدم بڑھایا اُمّید کہ اب خزانہ پایا
جتنی کوشش زیادہ تر کی اُتنی ہی کماں پرے کو سرکی
پنہاں ہوئی قوس آخرِ کار اور ظلمتِ شب ہوئی نمودار
ناکام پھرا وہ سادہ دہقاں
حسرت زدہ غم زدہ پشیماں

(۲۶) سچ کہو

سچ کہو سچ کہو ہمیشہ سچ
ہے بھلے مانسوں کا پیشہ سچ

سچ کہوگے تو تم رہوگے عزیز
سچ تو یہ ہے کہ سچ ہے اچھّی چیز

سچ کہوگے تو تم رہوگے شاد
فکر سے پاک رنج سے آزاد

سچ کہوگے تو تم رہوگے دلیر
جیسے ڈرتا نہیں دلاور شیر

سچ سے رہتی ہے تقویت دل کو
سہل کرتا ہے سخت مشکّل کو

سچ ہے ساری معاملوں کی جان
سچ سے رہتا ہے دل کو اطمینان

سچ میں راحت ہے اور آسانی
سچ سے ہوتی نہیں پشیمانی

سچ ہے دُنیا میں نیکیوں کی جڑ
سچ نہ ہو تو جہان جائے اُجڑ

سچ کہوگے تو دل رہے گا صاف
سچ کرا دے گا سب قصور معاف

سچ سے زنہار در گزر نہ کرو
دل میں کچھ خوف اور خطر نہ کرو

جس کو سچ بولنے کی عادت ہے
وہ بڑا نیک باسعادت ہے

وہی دانا ہے جو کہ ہے سچّا
اس میں بڈّھا ہو یا کوئی بچّا

ہے بُرا جھوٹ بولنے والا
آپ کرتا ہے اپنا مُنہ کالا

فائدہ اُس کو کچھ نہ دے گا جھوٹ
جائے گا ایک روز بھانڈا پھوٹ

جھوٹ کی بھول کر نہ ڈالو خو
جھوٹ ذلّت کی بات ہے اَخ تھو!!

(۲۷) شفق

شفق پھولنے کی بھی دیکھو بہار
ہوا میں کھِلا ہے عجب لالہ زار

ہوئی شام بادل بدلتے ہیں رنگ — جنھیں دیکھکر عقل ہوتی ہے دنگ
نیا رنگ ہے اور نیا روپ ہے — ہر ایک روپ میں یہ وہی دھوپ ہے
طبیعت ہے بادل کی رنگت پہ لوٹ — سُنہری لگائی ہے قدرت نے گوٹ
ذرا دیر میں رنگ بدلے کئی — بنفشی و نارنجی و چنپئی
یہ کیا بھید ہے! کیا کرامات ہے — ہر اک رنگ میں اِک نئی بات ہے
یہ مغرب میں جو بادلوں کی ہے باڑ — بنے سونے چاندی کے گویا پہاڑ
فلک نیلگوں اُس میں سُرخی کی لاگ — ہرے بن میں گویا لگادی ہے آگ

اب آثار ظاہر ہوئے رات کے
کہ پردے چھُٹے لال بانات کے

(۲۸) رات

گیا دن ہوئی شام آئی ہے رات
خدا نے عجب شے بنائی ہے رات

نہ ہو رات تو دن کی پہچان کیا
اُٹھائے مزہ دن کا انسان کیا

ہوئی رات خلقت چھُٹی کام سے
خموشی سی چھائی سرِ شام سے

لگے ہونے اب ہاٹ بازار بند
زمانے کے سب کاروبار بند

مُسافر نے دن بھر کیا ہے سفر
سرِ شام منزل پہ کھولی کمر

درختوں کے پتّے بھی چُپ ہو گئے
ہَوا تھم گئی پیڑ بھی سو گئے

اندھیرا اُجالے پہ غالب ہوا
ہر اک شخص راحت کا طالب ہوا

ہوئے روشن آبادیوں میں چراغ
ہُوا سب کو محنت سے حاصل فراغ

کسان اب چلا کھیت کو چھوڑ کر
کہ گھر میں کرے چین سے شب بسر

تھپک کر سُلایا اُسے نیند نے
تردّد بھُلایا اُسے نیند نے

غریب آدمی جو کہ مزدُور ہیں
مشقت سے جن کے بدن چوُر ہیں

وہ دن بھر کی محنت کے مارے ہوئے
وہ ماندے تھکے اور ہارے ہوئے

نہایت خوشی سے گئے اپنے گھر
ہوئے بال بچّے بھی خوش دیکھ کر

گئے بھول سب کام دھندے کا غم
سویرے کو اُٹھّیں گے اب تازہ دم

کہاں چین یہ بادشہ کو نصیب
کہ جس بے غمی سے ہیں سوتے غریب

(۲۹) گرمی کا موسم

مئی کا آن پہنچا ہے مہینہ
بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینا

بجے بارہ تو سورج سر پہ آیا
ہُوا پیروں تلے پوشیدہ سایا

چلی لُو اور تڑاقے کی پڑی دھوپ
لپٹ ہے آگ کی گویا کڑی دھوپ

زمیں ہے یا کوئی جلتا توا ہے
کوئی شُعلہ ہے یا پچھوا ہوا ہے

در و دیوار ہیں گرمی سے تپتے
بنی آدم ہیں مچھلی سے تڑپتے

پرندے اُڑ گئے ہیں پانی پہ گرتے
چرندے بھی ہیں گھبرائے سے پھرتے

درندے چھُپ گئے ہیں جھاڑیوں میں
مگر ڈوبے پڑے ہیں کھاڑیوں میں

نہ پوچھو کچھ غریبوں کے مکاں کی
زمین کا فرش ہے چھت آسماں کی

نہ پنکھا ہے نہ ٹٹّی ہے نہ کمرہ
ذرا سی جھونپڑی محنت کا ثمرہ

امیروں کو مبارک ہو حویلی
غریبوں کا بھی ہے اللہ بیلی

(۳۰) برسات

وہ دیکھو اُٹھی کالی کالی گھٹا
ہے چاروں طرف چھانے والی گھٹا

گھٹا کے جو آنے کی آہٹ ہوئی
ہوا میں بھی اک سنسناہٹ ہوئی

گھٹا آن کر مینہ جو برسا گئی
تو بے جان مٹّی میں جان آگئی

زمیں سبزے سے لہلہانے لگی
کسانوں کی محنت ٹھکانے لگی

جڑی بوٹیاں پیڑ آئے نکل
عجب بیل پتّے عجب پھول پھل

ہر اک پیڑ کا اِک نیا ڈھنگ ہے
ہر اک پھول کا ایک نیا رنگ ہے

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا
کہ جنگل کا جنگل ھرا ہو گیا

جہاں کل تھا میدان چٹیل پڑا
وہاں آج ہے گھاس کا بن کھڑا

ہزاروں پُھدکنے لگے جانور
نکل آئے گویا کہ مٹّی کے پر

(۳۱) ہوا چلی

ہونے کو آئی صُبح تو ٹھنڈی ہوا چلی
کیا دھیمی دھیمی چال سے یہ خوش ادا چلی

لہرا دیا ہے کھیت کو ہلتی ہیں بالیاں
پودے بھی جھومتے ہیں لچکتی ہیں ڈالیاں

پھلواریوں میں تازہ شگوفے کِھلا چلی
سویا ہُوا تھا سبزہ اُسے تو جگا چلی

سرسبز ہوں درخت نہ باغوں میں تجھ بغیر
تیرے ہی دم قدم سے ہے بھاتی چمن کی سیر

پڑ جائے اِس جہان میں ہوا کی اگر کمی
چوپایہ کوئی زندہ بچے اور نہ آدمی

چڑیوں کو یہ اُڑان کی طاقت کہاں رہے
پھر کائیں کائیں ہو نہ غُٹرغوں نہ چہچہے

بندوں کو چاہیئے کہ کریں بندگی ادا
اُس کی کہ جس کے حُکم سے چلتی ہے یہ ہَوا

(۳۲) کوہ ہمالہ

ہے ہمالہ پہاڑ سر جبین
جس کے اُوپر تلے کھڑا ہے بن

بیل بوٹوں سے بن رہا ہے چمن
سبز چوٹی ہرے بھرے دامن

ہے ہر اِک ڈھانگ اُس کی پھلواری
سرد چشمے اِدھر اُدھر جاری

لالہ خودرو ہے اور اُس کے پاس
لہلہاتی ہے خوبصورت گھاس

سیکڑوں قسم کے ہیں پھول کھلے
پیڑ باہم کھڑے ہوئے ہیں ملے

کہیں بن مالنا کہیں بیلا
کہیں اخروٹ اور کہیں کیلا

سال کا کیا ہی خوب جنگل ہے
سورماؤں کا بن کے دنگل ہے

سرو و شمشاد ہیں قطار قطار
ریچھ پھرتے ہیں بن کے چوکیدار

ہیں چٹانوں پہ کودتے لنگور
ایک ہی جست میں وہ پہنچے دور

ہیں ترائی میں ہاتھیوں کے غول
کوئی پائل ہے اور کوئی بنجھول

شیر خونخوار شاہ ہے یاں کا
پارھے چیتل کو خوف ہے جاں کا

بارہ سنگے غریب پر ہے لتاڑ
سینگ ہیں اُس کے جھاڑ اور جھنکاڑ

وہ جو ہے ہند کا بڑا ساگر
واں سے چلتا ہے ابر کا لشکر

کوچ در کوچ روز بڑھتا ہے
پھر ہمالہ پہ آکے چڑھتا ہے

کبھی دیتا ہے باندھ مینہ کا تار
کبھی کرتا ہے برف کی بھرمار

جا چڑھا یوں پہاڑ پر پانی
کی ہے قدرت نے کیا ہی آسانی

واں سے چشمے بہت اُبل نکلے ندّی نالے ہزار چل نکلے
سندھ و ستلج ہیں مغربی دریا اور پورب میں میگھنا گنگا
ہیں یہ دریا بہت بڑے چاروں جن میں بہتا ہے پانی اگھاروں
پس سمندر سے جو رسد آئی یوں ہمالہ نے بانٹ کر کھائی
ہُوا سرسبز ہند کا میدان تیری حکمت کے اے خدا قرباں
ہند کی سرزمیں ہے اَن داتا اور ہمالہ پہاڑ جل داتا
اے ہمالہ پہاڑ! تیری شان دنگ رہ جائے دیکھ کر انسان
ساری دُنیا میں ہے تو ہی بالا پُہنچے جب پاس دیکھنے والا
سامنے اِک سیاہ دل بادل دیو کی طرح سے کھڑا ہے اٹل
گھاٹیاں جن میں گونجتی ہے صدا آبشاروں کا شور ہے برپا
دبدبہ اپنا تو دکھاتا ہے گویا میدان کو ڈراتا ہے
ہے مرے دل میں یہ خیال آتا کاش چوٹی پہ تیرے چڑھ جاتا
واں سے نیچے کا دیکھتا میدان جس میں گنگ و جمن ہیں تیز رواں
دو لکیریں سی وہ نظر آتیں دائیں بائیں کو صاف لہراتیں
اِس تماشے سے جب کہ جی بھرتا تو شمالی طرف نظر کرتا
شام کو دیکھتا بہار بڑی گویا سونے کی ہے فصیل کھڑی
پھر وطن میں جب آن کر رہتا دوستوں سے یہ ماجرا کہتا

(۳۴۳) کیڑا[۱]

تم اِس کیڑے کو دیکھو تو لگاتار — تمھاری راہ میں ہے گرمِ رفتار
چلا کترا کے کیا کیا پیچ و خم سے — جھجکتا ہے یہ آوازِ قدم سے
کسی سوراخ میں دن کاٹتا ہے — سویرے اُٹھ کے شبنم چاٹتا ہے
کرو چشمِ حقیقت بیں سے تمیز — کہ سمجھے ہو جسے تم سخت ناچیز
اُسے قدرت نے زرّیں پر دیئے ہیں — کچھ اِک سبزی و سُرخی بھی لئے ہیں
تمھیں لگتی ہے اچّھی مور کی دُم — کہ خوش ہوتے ہو اُس کو دیکھ کر تم
جو دیکھو ناچ اُس کا دُور ہی سے — تو اِس پر لوٹ ہو جاتے ہو جی سے
مگر کیڑے کو بھی سمجھو نہ ہیٹا — یہ مانا خاک مٹّی میں ہے لیٹا
نہ بے پروائی سے چلیے جھپٹ کر — قدم رکھیے ذرا کیڑے سے ہٹ کر
کہ ہے دونوں سے دانا دیکھ سکتا — نمونے دو ہیں کاریگر ہے یکتا
ہے دونوں ہی میں یکساں دستکاری — کسے ہلکی کہیں اور کِس کو بھاری
ہے ان دونوں کو اُس کا لطف حاصل — کہ بخشا ہے برابر عیشِ کامل
اگر ہے خوبصورت مور پیارا — تو کیڑا بے گنہ کیوں جائے مارا
بظاہر کچھ نہیں اُس کی حقیقت — مگر جب اُس کی کرتے ہو بُری گت

تو ہے ننھّی سی جاں اُس کی تڑپتی
ہے تم جیسا ہی اک جاندار وہ بھی

[۱] یہ نظم ۱۸۶۷ء میں ایک انگریزی پوئٹری سے ترجمہ کی گئی تھی ۱۲

(۳۴) ایک قانع مفلس[1]

سو ہزار ایکڑ ہے کلّن کی زمیں — مِلک میری ایک بھی ایکڑ نہیں
ہے محل اُس کا نہایت شان دار — اور ہمارا جھونپڑا ہے تنگ و تار
اَن گنت ہے اُس کی نقدی اور مال — ایک پائی کے لئے میں پائمال
اُس کا رتبہ ہے بڑا عزّت بڑی — میرے سر پر خاک ذلّت کی پڑی
ہے زمیندار آج کلّن واقعی — زر سے پُر ہے اُس کا دامن واقعی
پر جہاں تک میری جاتی ہے نظر — مِلک سب اپنی ہی آتی ہے نظر
لطف جو اِس حال میں ہے بالیقیں — دولتِ دُنیا میں آدھا بھی نہیں
سُست ہے کلّن بایں ناز و نعم — میں ہوں چاق و چُست ہر دم تازہ دم
واں امیرانہ ہے مخمل کا لباس — میں ہوں مفلس میری پوشش ہے پلاس
وہ ہے قیدی پائے بندِ مِلک و مال — اور میں آزاد ہوں مثلِ خیال
ڈاکٹر واں بیٹھے ہیں بہرِ علاج — یاں نہیں ہے ایک کی بھی احتیاج
ہے مُصیبت مال و دولت میں بڑی — موت کا دھڑکا ہے اُس کو ہر گھڑی
لطف قدرت کا نہیں اُس کو نصیب — یہ بہارِ بے خزاں بھی ہے عجیب
یہ بیاباں یہ سمندر یہ ہوا — گو بجتی ہے اِن میں قدرت کی نوا
کان سے کلّن کی لیکن دور ہے — وہ تو دولت کے نشہ میں چور ہے
راگنی قدرت کی ہر دم ہے چھڑی — میں تو ہوں اِس لے کا دیوانہ بڑی

[1] یہ نظم بھی سنہ ۶۷ء میں ایک انگریزی پوئٹری سے ترجمہ کی گئی تھی ۱۲

(۳۵) موت کی گھڑی[1]

جب کہ طوفاں ہو زندگی میں بپا — گھیر لیں ہر طرف سے موج و ہوا
جب کہ لغزش میں پانو تیرا ہو — اور آنکھوں تلے اندھیرا ہو
بلکہ ہوش و حواس بھی ہوں جُدا — ڈر نہ زنہار۔ رکھ نظر بخُدا
تھام دل کو نہ خوف کر نہ ہراس — کہ نگہباں ہے تیرا تیرے پاس
تھا جو ایّامِ عیش کا ہمدم — ہم پیالہ شریکِ شادی و غم
لہو و بازی میں ساتھ رہتا تھا — ہر گھڑی نرم و گرم سہتا تھا
آنکھ تجھ سے اگر چُرا جائے — ابرِ غم جب کہ تجھ پہ چھا جائے
اُس محبّت کا دل میں باندھ خیال — جس کو ہرگز نہیں ہے بیم و زوال
آرزوئیں تھیں وہ جو دل میں بھری — ٹمٹماتے چراغ تھے سحری
کر دے اِن وسوسوں کو دل سے دور — اُس محبت کو دیکھ جو ہے سرور
ہے شگفتہ ازل سے تا بہ ابد — نہ کبھی خاتمہ نہ اُس کی حد
جب عزیز و قریب یار نہ ہوں — دوستداری میں استوار نہ ہوں
یعنی فرزند جیسا لختِ جگر — اور ہم خانہ جیسے جاں پرور
گردمِ واپسیں جُدا ہو جائیں — وقت کے وقت سب ہَوا ہو جائیں
کر توقّع نہ غم گُساری کی — یاد کر گور کی وہ تاریکی

[1] یہ نظم بھی ۶۷ء میں ایک انگریزی پوئٹری سے ترجمہ کی گئی۔ ۱۲

اُس وطن کی طرف ہو راہ سپر
کہ محبّت جہاں ہے تازہ و تر
آہ جب آئے موت کی نوبت
آنے والی گھڑی ہو پُر ہیبت
اور گزرے ہوئے زمانہ پر
ڈالتی آئے پردہ سر تا سر

دل کو رکھ تو اُمید پر شیدا
ہو نہ حسرت نگاہ سے پیدا

(۳۶) فادر ولیم

نوجواں آدمی نے کی تقریر
اے پدر ولیم اب تو ہو تم پیر
چند موئے سفید ہیں باقی
کہ نمایاں ہے جن میں برّاقی
لیک وُیسے ہی تندرست ہو تم
خوب چاق و دلیر و چُست ہو تم
سُن کے ولیم نے یوں زبان کھولی
گرہِ پُرسشِ نہاں کھولی
تھی جوانی میں یہ نصیحت یاد
کہ ہے عہدِ شباب صورتِ باد
اِس لئے طاقت و توانائی
کی نہ ضائع بعہدِ برنائی
تاکہ انجامِ کار وقتِ اخیر
ہوں نہ محتاج اِن کا بن کر پیر
بولا پھر وہ جوانِ نیک شیم
تم تو ہو پیر اے پدر ولیم
اور ناپائدار لطفِ شباب
ہوتے ہیں کوئی دم کے مثلِ حباب
مگر اِن کا الم نہیں تم کو
حسرتِ بیش و کم نہیں تم کو

لہ یہ نظم بھی ۱۸۶۷ء میں ایک انگریزی پوئٹری سے ترجمہ کی گئی تھی ۱۲

کچھ بیاں کیجیے گا صاف اس کا — تاکہ ہو مجھ پہ انکشاف اس کا
ولیمِ پیر نے جواب دیا — کیا پسندیدہ باصواب دیا
میں جوانی میں کہتا تھا ہر بار — کہ یہ دن دیرپا نہیں زنہار
اِس لئے تھا خیالِ آیندہ — سوچتا تھا مآلِ آیندہ
تاکہ پاؤں غم و الم سے اماں — نہ رہے حسرتِ گزشتہ زماں
پھر بھی گویا ہوا جوانِ لطیف — اے پدر تم تو ہو گئے ہو ضعیف
اور گزرتی ہے زندگانی جلد — چھوڑنی ہے سرائے فانی جلد
ظاہرا کس قدر مُسن ہو تم — مگر اِس پر بھی مُطمئن ہو تم
ہے تمھیں ذوقِ داستانِ اجل — اور پسندیدہ ہے بیانِ اجل
مدّعا یہ ہے کچھ بیاں ہو جائے — رازِ پوشیدہ تا عیاں ہو جائے
وہ مخاطب ہوا بسوئے جواں — کہ ہے البتّہ مجھ کو اطمیناں
کیونکہ ایّامِ نوجوانی میں — موسمِ عیش و کامرانی میں
میں نے اپنے خدا کو رکھّا یاد — نہ کیا اُس سے نفس کو آزاد

وہی اب میرا دستگیر ہوا
لطفِ یزداں عصائے پیر ہوا

(۳۷) حبِّ وطن ۱؎

دل میں اِک چاشنی محبّت کی — جملہ جاندار کو خدا نے دی
قلبِ انسان ہی پہ کیا ہے مدار — کہ ہر اِک دل میں ہے اُسی کا شرار
ایک اسپین کی جواں طوطی — جو کہ بچپن سے تھی اسیر ہوئی
وہ درخشاں پرِ خجستہ نوا — ہوئی وارد بملکِ سردِ بَلا
اُس نے وہ پُر شمیم نخلستاں — کہ نکالے تھے پرّ و بال جہاں
اور وہ ملک و میوہ ہائے وطن — آسمانِ وطن ہوائے وطن
سب فراموش کر دئے ناچار — تھا یہاں اور رنگِ لیل و نہار
تیرہ و تار وادیِ پُر دود — ساحتِ آسماں بخار آلود
اور بسیطِ زمیں پُر از خاشاک — قُلّۂ کوہ و موجِ دہشت ناک
یاں کے القصّہ دیکھ کر یہ ساز — چشمِ زرّیں سے تھی نظر انداز
اِس دیارِ غریب میں آکر — سرد خطّہ میں پرورش پاکر
رہی شکّر شکن وہ خوش گفتار — باعثِ طولِ عُمر آخر کار
اُس کے زرّیں زمرّدیں پر و بال — بھورے بھورے سے ہو گئے فی الحال
عاقبت ایسی صُمّ و بُکم بنی — چہچہے وہ نہ وہ شکر شکنی
اِسی اثنا میں ایک مردِ غریب — آیا اسپین سے ملا کے قریب

۱؎ یہ نظم بھی ۱۸۶۸ء میں ایک انگریزی پوئٹری سے ترجمہ کی گئی۔ ۱۲

اُس نے طوطی سے جا کلام کیا حرفِ اسپین میں سلام کیا
دیا اُس نے اُسی زباں میں جواب اور کُنجِ قفس میں ہو بیتاب
کیا ہی مسرور چہچہا کے ہوئی
آخر آخر پھڑک پھڑک کے موئی

(۳۸) انسان کی خام خیالی[۱]

اَے دیدہ ورانِ دانش آثار دُنیا میں ہیں کیسے کیسے جاندار
ہاتھی چیونٹی عُقاب مکّھی قدرت نے ہے سب میں بات رکّھی
ایسا تو بتاؤ کوئی حیواں جیسا نادان ہے یہ انساں
ہر ایک ہے اپنی راہ چلتا جس رہ سے ہے مُدّعا نکلتا
آرام و خورش جو چاہتے ہیں قدرت کی روش نباہتے ہیں
جس چیز سے ہے گزند اُن کو آتی ہی نہیں پسند اُن کو
جس شے سے ہیں فائدہ اُٹھاتے دھوکا نہیں اُس میں گاہ کھاتے
انساں ہے اگرچہ سب پہ فائق مشہور ہے اشرف الخلائق
اُڑتا ہے مگر اُسی کا خاکا پُتلا ہے یہ سہو اور خطا کا
ممکن ہی نہیں خیالِ پرواز کرنے لگے ہیئت صورتِ باز
یا چھوڑ کے عرصۂ چراگاہ غوّاص ہو مچھلیوں کے ہمراہ

[۱] ۱۸۶۸ء میں انگریزی پوئٹری کا ترجمہ کیا گیا۔ ۱۲

انسان بخلافِ حکمِ قدرت کرتا ہے خیالِ ترکِ فطرت
ہو دل کو خوشی نہیں یہ ممکن جب تک کہ نہ ہو صفائے باطن
یا نفس کہ تابعِ خرد ہو حاصل تب راحتِ ابد ہو
یا وہ دلِ صاف اور فیّاض ہو خود غرضی سے جس کو اعراض
یا صبر کہ خندہ زن ہو اکثر مجبوریٔ بختِ نارسا پر
شاکر قسمت ہی پر رہے وہ قدرت کو اُلاہنا نہ دے وہ
یا عقل۔ کہ ہو سلیم و یک سو اندوہ سے ہو نہ چیں بابرو
یہ رمز کہ ہو چکے ہویدا ہے اصل خوشی انہیں ہیں پیدا
جو لوگ ہیں عقل سے گزرتے بیہودہ خوشی پہ ہیں وہ مرتے

گر ہو وے خلاف اِس کے مضموں
باطل ہیں دلائلِ فلاطوں

(۳۹) جنگ[۱] روم و روس

حالاتِ روم سے ہمیں دن رات کام ہے اخبار کا ورق نہیں خوانِ طعام ہے
کیسے خیالِ جنگ میں روزے گزر گئے معلوم بھی نہیں کدھر آئے کدھر گئے
سوجھا نہ اور کچھ ہمیں اِس بھوک پیاس میں دن کاٹتے رہے انہیں خبروں کی آس میں

[۱] یہ مثنوی یکم شوال ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۷۷ء میں لکھی گئی ۱۲

روزہ خبر بغیر ہمیں بار ہو گیا / آیا جو تارِ فتح تو افطار ہو گیا

چھٹکی ہوئی ہے چاندنی اور صاف آسماں / چپ چاپ ہے زمین تو سنسان ہے جہاں

پتّا بھی دیکھیے تو کھڑکتا نہیں کوئی / طائر بھی آشیاں میں پھڑکتا نہیں کوئی

خلقِ خدا پڑی ہوئی سوتی ہے بے خبر / بجنے لگا ہے اتنے میں نقّارۂ سحر

اس وقت جاگتے ہیں تو آتا ہے یہ خیال / اے ماہ کیا ہے خطّۂ بلگیریا کا حال

کیا اب بھی گونجتا ہے وہ میدان توپ سے / آتش فشاں ہے لشکرِ عثمان توپ سے

بلقان کے دروں میں سلیمانِ صف شکن / کیا اب بھی ہے غنیم کے لشکر میں شعلہ زن

کیا خیمہ زن ہوئی ہے محمد علی کی فوج / یا جنترہ کی سمت رواں ہے مثالِ موج

بیکر کے شہسوار ہیں کس دار و گیر میں / کیا غلغلہ ہے کوچ کا ترکی بہیر میں

کیا اب بھی ہیں مجاہدِ اسلام جاگتے / ہیبت سے جن کی روسیہ پھرتے ہیں بھاگتے

کیا اب بھی ترکتاز میں ترکی سوار ہیں / جن غازیوں کی تیغ سے روسی فگار ہیں

کیا کر رہی ہے احمدِ مختار کی سپاہ / فیروزمند غازیٔ جرّار کی سپاہ

اے ماہِ نور بار سفر میں ہے تو مدام / حالات جنگ کے تجھے معلوم ہیں تمام

تو جا کے معرکہ میں چمکتا ہے رات بھر / اور سیر دیکھنے کو ٹھٹکتا ہے رات بھر

کرتے تھے اس طرح سے خیالی خطاب ہم / جب دیکھتے تھے لطفِ شبِ ماہتاب ہم

لیکن ہجوم اب تو ہے ابرِ بہار کا / ہے آسماں نمونہ صفِ کارزار کا

بجلی کے کوندنے میں ہے شمشیر کی ادا / اور بادلوں کی گھور گرج توپ کی صدا

یوں ابر جھوم جھوم کے آتا ہے بار بار   شپکا پہ جیسے حملۂ تُرکانِ ذی وقار
بد دل ہے فوجِ روس تو ہو اور بھی خراب   عُثمانیوں کا دبدبہ ہو جائے کامیاب
ہے یہ دُعائے شام یہی نالۂ سحر   ہوں تُرک فتحیاب خدایا بکرّ و فر
عُثمان پر جو لشکرِ روسی کا ہے ہجوم   ابرِ سیہ کی طرح سے آتا ہے جھوم جھوم
خود زار بھی گیا ہے کمالِ غُرور سے   اور فوج جمع کی ہے بہت دُور دُور سے
عُثمان یا خدا انھیں زیر و زبر کرے   سیلاب خونِ روس سے مٹّی کو تر کرے
ترکوں کو ایسی شوکت و شان و جلال دے   جو زلزلہ غنیم کے لشکر میں ڈال دے
مشرق کی سمت سے ہو سُلیمان گرم کار   افواجِ زار وچ کو دکھا دے رہِ فرار
بلگیریا میں ختم ہو ہنگامہ جنگ کا   رومانیہ نشانہ ہو تُرکی تفنگ کا
دم بند روسیوں کا ہو صمصامِ تُرک سے   بھاگے سپاہِ روس فقط نامِ ترک سے
محمودؔ[1] روزِ عید ہے دل سے دُعا کرو   حامدؔ[2] یہ التجا بحضورِ خدا کرو

تُرکی سپاہ میں علمِ فتح ہو بلند
پُہنچے سپاہِ زار کو آزار اور گزند

(۴۰) ناقدردانی

کہیں اِک لعل کیچڑ میں پڑا تھا   نہ قامت بلکہ قیمت میں بڑا تھا
کوئی دہقاں اُٹھا کر لے گیا گھر   وہ کیا جانے یہ پتّھر ہے کہ جوہر
نیا تحفہ جو بچّے کو دِکھایا   اہا ہا ہا! کھلونا ہم نے پایا

[1] محمد محمود سیفی فرزند اکبر مصنف۔ [2] محمد حامد سیفی فرزند مصنف۔

ہوئی جب لعل کی واں یہ مدارات
تو بولا حسرتا! ہیہات! ہیہات!

نہیں اِس گھر میں میری قدر ممکن
کہ اندھوں کے لئے کیا رات کیا دن

اگر پاتا مجھے کوئی نظر باز
تو کرتا اپنی قسمت پر وہ سَو ناز

جو لے جاتا مجھے تا درگہِ شاہ
تو مالا مال ہوتا حسبِ دلخواہ

اری ناقدردانی تجھ پہ لعنت
کہ ہے تجھ کو مساوی نور و ظلمت

سمجھ لیتی ہے عیبوں کو ہُنر تو
ہُنر کی توڑ دیتی ہے کمر تو

خُدا محفوظ رکھّے ہر بلا سے
خصوصاً تیری نالائق جفا سے

کہ ہے اندھے کی لاٹھی تیری بیداد
جہاں میں داد ہے جس کی نہ فریاد

(۴۱) اسلم کی بلّی

چھوٹی سی بلّی کو میں کرتا ہوں پیار
صاف ہے سُتھری ہے بڑی ہے کِھلاڑ

گود میں لیتا ہوں تو کیا گرم ہے
گالے کی مانند رُواں نرم ہے

میں جو نہ چھیڑوں تو نہ جھلّائے وہ
میں نہ ستاؤں تو نہ غُرّائے وہ

کھینچ کے دُم اب نہ ستاؤں گا میں
گھر میں سے باہر نہ بھگاؤں گا میں

اب نہ ڈرے گی وہ مری مار سے
کھیلیں گے ہم دونوں بہت پیار سے

صحن میں گھر میں کبھی میدان میں
کھیلیں گے در میں کبھی دالان میں

دُم کو ہلا میرے پڑے گی وہ پاؤں
بولے گی پھر پیار سے یوں "میاؤں میاؤں"

دوں گا اُسے گیند میں جب آن کر
جھپٹے گی وہ اُس کو چوہا جان کر

تاک لگائے گی۔ دبوچے گی خوب
مارے ٹُہنّے اُسے نوچے گی خوب

ہم نے بڑے پیار سے پالا اِسے
کہتے ہیں سب چوہوں کی خالا اِسے

(۴۲) ہمارا کُتّا ٹیپو

ٹیپو ہے اِس کا نام یہ کُتّا عجیب ہے
بڈّھا ہے باادب ہے نہایت غریب ہے

ہم دونوں بھائی بہنوں سے اُلفت ہے اِس قدر
جب دیکھتا ہے دُور سے آتا ہے دوڑ کر

افسوس میرے ٹیپو! حیراں ہوں کیا کروں
کِس ڈھب سے تیرے ساتھ محبّت کیا کروں

آتا ہے کم جہان میں تجھ سا رفیق ہاتھ
جاتا ہوں جب میں سیر کو رہتا ہے میرے ساتھ

میں دودھ پی رہا ہوں تو بیٹھا ہے میرے پاس
کچھ شک نہیں کہ تو ہے وفادار حق شناس

البتّہ میں بھی کرتا ہوں صرف اِس قدر سلوک
دیتا ہوں ایک ٹکڑا کہ دب جائے تیری بھوک

لیکن مجھے یقیں ہے اگر کچھ نہ دوں تجھے
دیکھے گا پھر بھی پیار کی نظروں سے تو مجھے

اِس واسطے کہ تو ہے وفادار حق شناس
مالک کا اپنے تجھ کو بہت ہے لحاظ و پاس

ٹیپو ہمارے گھر کا پُرانا رفیق ہے
بڈّھا ہے باوفا ہے نہایت شفیق ہے

جنگل کو جائیں ڈھور تو جاتا ہے ساتھ ساتھ
جب گھر کو واپس آئیں تو آتا ہے ساتھ ساتھ

بیچارہ گھر کی چوکسی کرتا ہے رات بھر
اور دن میں کھیلتا ہے مرے ساتھ اِدھر اُدھر

(۴۳) کچھوا اور خرگوش

ایک کچھوے کے آگئی جی میں
کیجیے سیر و گشت خشکی میں

جا رہا تھا چلا ہوا خاموش
اُس سے ناحق اُلجھ پڑا خرگوش

میاں کچھوے! تمھاری چال ہے یہ
یا کوئی شامت اور وبال ہے یہ

یوں قدم پھونک پھونک دھرتے ہو
گویا اُتّو زمین پہ کرتے ہو

کیوں ہوئے چل کے مُفت میں بدنام
بے چلے کیا اٹک رہا تھا کام

تم کو یہ حوصلہ نہ کرنا تھا
چُلّو پانی میں ڈوب مرنا تھا

یہ تن و توش اور یہ رفتار
ایسی رفتار پر خدا کی مار

بولا کچھوا کہ ہوں خفا نہ حضور
میں تو ہوں آپ معترف بہ قصور

اگر آہستگی ہے جرم و گناہ
تو میں خود اپنے جُرم کا ہوں گواہ

مُجھ کو جو سخت سُست فرمایا
آپ نے سب دُرست فرمایا

مُجھ کو غافل مگر نہ جانیئے گا
بندہ پرور بُرا نہ مانیئے گا

یوں زبانی جواب تو کیا دوں
شرط بد کر چلو تو دکھلا دوں

تم تو ہو آفتاب میں ذرّہ
پر مٹا دوں گا آپ کا غرّہ

سُن کے خرگوش نے یہ تلخ جواب
کہا کچھوے سے یوں ز روئے عتاب

تو کرے میری ہمسری کا خیال
تیری یہ تاب یہ سکت یہ مجال

چیونٹی کے جو پر نکل آئے
تو یقیں ہے کہ اب اجل آئے

ارے بیباک! بدزبان! مُنھ پھٹ،
تو نے دیکھی کہاں ہے دوڑ جھپٹ

جب میں تیزی سے جست کرتا ہوں
شہسواروں کو پست کرتا ہوں

گرد کو میری بادپا نہ لگے
لاکھ دوڑے مرا پتہ نہ لگے

ریل ہوں برق ہوں چھلاوا ہوں
میں چھلاوے کا بلکہ باوا ہوں

تیری میری نبھے گی صحبت کیا
آسماں کو زمیں سے نسبت کیا

جس نے بھگتے ہوں تُرکی و تازی
ایسے مریل سے کیا بدے بازی

بات کو اب زیادہ کیا دوں طول
خیر کرتا ہوں تیری شرط قبول

ہے مناسب کہ اِمتحاں ہو جائے
تاکہ عیب و ہُنر عیاں ہو جائے

الغرض اِک مقام ٹھیرا کر
ہوئے دونوں حریف گرمِ سفر

بسکہ زوروں پہ تھا چڑھا خرگوش
تیزی پھُرتی سے یوں بڑھا خرگوش

جس طرح جائے توپ کا گولا
یا گرے آسمان سے اولا

ایک دو کھیت چوکڑی بھر کے
اپنی چُستی پہ آفریں کر کے

کسی گوشہ میں سو گیا جا کر
فکر "کیا ہے چلیں گے سستا کر"

اور کچھوا غریب آہستہ
چلا سینہ کو خاک پر گھستا

سوئی گھنٹے کی جیسے چلتی ہے
یا بتدریج چھاؤں ڈھلتی ہے

یوں ہی چلتا رہا بہ استقلال
نہ کیا کچھ اِدھر اُدھر کا خیال

کام کرتا رہا جو پے در پے
کر گیا رفتہ رفتہ منزل طے

حیف! خرگوش رہ گیا سوتا
ثمرہ غفلت کا اور کیا ہوتا
جب کھلی آنکھ تو سویرا تھا
سخت شرمندگی نے گھیرا تھا
صبر و محنت میں ہے سرافرازی
سُست کچھوے نے جیت لی بازی
نہیں قصّہ یہ دل لگی کے لئے
بلکہ عبرت ہے آدمی کے لئے

ہے سخن اِس حجاب میں روپوش
ورنہ کچھوا کہاں کہاں خرگوش

(۴۴) دو مکھّیاں[2]

ایک مکھّی کہ ہے نِری احمق
فکرِ انجام اُسے نہیں مطلق
کوتہ اندیش - لالچی - ناداں
دیتی پھرتی ہے مُفت اپنی جاں
گری شیرہ پہ حرص کے مارے
پاؤں اور پَر لتھڑ گئے سارے
آنکھ اُس کی ہیئے کی پھوٹ گئی
اُکھڑے بازو تو ٹانگ ٹوٹ گئی
آخرش پھنس کے رہ گئی مکھّی
کیا حماقت کی چاشنی چکھی
ایک مکھّی ہے سخت دور اندیش
سوچ لیتی ہے کام کا پس و پیش
اُس پہ غالب نہیں ہوسنا کی
اُڑتی پھرتی ہے وہ بہ چالاکی
کہیں مصری کی جب ڈلی پائی
تو بہ آہستگی اُتر آئی
گرچہ اِس کام میں لگی کچھ دیر
چاٹ کر ہو گئی مگر وہ سیر

چاٹ کے کھا کے اُڑ گئی پھُر پھُر
دور بیٹی کا اُس کو یاد ہے گُر
کِس مزہ سے گزارتی ہے دِن
شکر کا گیت گاتی ہے بھِن بھِن

(۴۵) اُونٹ

اونٹ تو ہے بس حلیم و خوش خصال
تربیت میں چھوٹے بچّوں کی مثال
تیری پیدائش رفاہِ عام ہے
آدمی کے حق میں اِک انعام ہے
کھانے کپڑے کا بھی تجھ پر ہے مدار
تو نے دی ہے اُس کو تیری مستعار
لق و دق صحرا میں یا میدان میں
یا عرب کے گرم ریگستان میں
سایہ افگن ہے نہ واں کوئی چٹان
سرد پانی کا نہ دریا کا نشان
چلچلاتی دھوپ ہے اور چُپ ہوا
واں پرندہ بھی نہیں پَر مارتا
تو وہاں کے مرحلے کرتا ہے طے
دن بدن اور ہفتہ ہفتہ پے بہ پے
قیمتی اشیا ہیں تیری پشت پر
تاجروں کا ریشم اور شاہوں کا زر
تودہ تودہ تیرے اوپر لد رہا
ہے بھرا گویا جہازِ پُر بہا
چند ہفتے جب کہ جاتے ہیں گزر
اور تھکا دیتا ہے راکب کو سفر
اونٹ! گھبراتا نہیں تو بار سے
دیکھتا ہے اُس کی جانب پیار سے
گویا کہتا ہے کہ اے میرے سوار
ایک دن تو اور بھی ہمّت نہ ہار
ہاں نہ بیدل ہو نہ رستے میں ٹھٹک
صاف سرچشمہ ہے آگے دھر لپک

مُجھ کو آتی ہے ہَوا سے بوئے آب | نا اُمیدی سے نہ کر تو اضطراب
اونٹ تو کرتا ہے اُس کی رہبری | یوں بنا دیتا ہے راکب کو جری
آخرش منزل پہ پہنچا تا ہے تو | اور سوکھے خار و خس کھاتا ہے تو
صبر سے کرتا ہے طے راہِ دراز | سچ کہا ہے تو ہے خُشکی کا جہاز

الغرض تو ہے حلیم و خوش خصال
تربیت میں چھوٹے بچّوں کی مثال

(۴۶) شیر

اے شیر تیرے تن پہ ہے طاقت کا پوستیں | شاہی کے حق میں کوئی بھی سا جھی تر نہیں
پیدا ہے تیرے رُخ سے تری شوکت اور جلال | ظاہر ہے تیری شکل سے باطن کا تیرے حال
دل تیرا بزدلی و غلامی سے ہے بری | پھٹکے نہ تیرے پاس کبھی خوف بے اجری
تیرا حریف کون ہے جو تو ہٹے نہ بچے | جھپکے نہ تیری آنکھ نہ گردن تری لچے
حق نے عطا کیا ہے تجھے زورِ بے خلل | فولاد کی رگیں ہیں تو ہے دل ترا اٹل
گر سورما سجے کوئی میدان کا دھنی | جوشن۔ کہ چار آئینہ یا خود آہنی
حملہ سے تیرے بچنے کو کافی نہ ہو مگر | اللہ رے تیرا حوصلہ بل بے ترا جگر
غُرّا کے شیر کرتا ہے جب جوش اور خروش | جنگل تمام ہوتا ہے سُنسان اور خموش
پہچانتے ہیں جانور آواز شیر کی | وہ ہولناک ہے کہ دہلتا ہے سب کا جی
جاتی ہے اُن کے پاؤں تلے کی زمیں نکل | ہیں بھاگتے کہ گویا تعاقب میں ہے اجل

اے شیر گرم خطّہ ہے تیرے لئے وطن
بیہڑ ہو نیستان ہو جھاڑی ہو یا ہو بن

تُو ہو۔ کہ گرم دُھوپ ہو یا ریگ زار ہو
تینوں غضب ہیں کیوں نہ مسافر شکار ہو

اے شیر تو ہے شاہ ترا تخت ہے کچھار
ہے کس کو تیرے مُلک میں دعوئ گیر و دار

(۴۷) ہماری گائے

رب کا شُکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

اُس مالک کو کیوں نہ پکاریں
جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں

خاک کو اُس نے سبزہ بنایا
سبزہ کو پھر گائے نے کھایا

کل جو گھاس چری تھی بن میں
دودھ بنی اب گائے کے تھن میں

سُبحان اللہ دودھ ہے کیسا
تازہ گرم سفید اور میٹھا

دودھ میں بھیگی روٹی میری
اُس کے کرم نے بخشی سیری

دودھ دہی اور مٹّھا مسکا
دے نہ خدا تو کس کے بس کا

گائے کو دی کیا اچھّی صورت
خوبی کی ہے گویا مورت

دانہ دُنکا بھوسی چوکر
کھا لیتی ہے سب خوش ہو کر

کھا کر تنکے اور ٹھیرے
دودھ ہے دیتی شام سویرے

کیا ہی غریب اور کیسی پیاری
صبح ہوئی جنگل کو سدھاری

سبزہ سے میدان ہرا ہے
جھیل میں پانی صاف بھرا ہے

پانی ہو جیسیں مار رہا ہے
چروا ہا چمکار رہا ہے
پانی پی کر چارہ چر کر
شام کو آئی اپنے گھر پر
دوری میں جو دن ہے کاٹا
بچّہ کو کس پیار سے چاٹا
گائے ہمارے حق میں ہے نعمت
دودھ ہے دیتی کھا کے بنسپت
بچھڑے اُس کے بیل بنائے
جو کھیتی کے کام میں آئے

رب کی حمد و ثنا کر بھائی
جس نے ایسی گائے بنائی

(۴۸) بچّہ اور ماں

اچھی امّاں! مجھے بتادو ابھی
کیوں ہے بچّہ کی مامتا اِتنی؟
تم کو بچّہ سے کیوں یہ اُلفت ہے؟
کس لئے اِس قدر محبّت ہے؟
ماں نے بچّہ کو یوں جواب دیا
حیف! تم جانتے نہیں بیٹا
کیسا لیٹا ہے یہ خوش و خُرّم
نہ کوئی فکر ہے نہ کوئی غم
نہ تو روتا نہ بلبلاتا ہے
گود میں کیا ہُمک کے آتا ہے
مُسکراتا ہے کیا ہی خوش ہو کر
جیسے چڑیا مگن ہو ڈالی پر
جبکہ سونے کا وقت ہے آتا
میرے سینہ سے ہے چمٹ جاتا
جبکہ آنکھوں میں نیند آتی ہے
بستر اُس کا میری چھاتی ہے
نیند لے کر ہنسی خوشی سے اُٹھا
پھول گویا کِھلا چنبیلی کا

لگ گئی بھوک کہہ نہیں سکتا پیاری نظروں سے ہے مجھے تکتا

پیار کا میرے بس یہی ہے سبب
نہیں آتا بیان میں مطلب

(۴۹) ماں اور بچّہ

بولی بچّہ سے ماں مرے پیارے صدقے امّاں! جواب دو بارے
کہ ہے بچّہ کو ماں سے اُلفت کیوں؟ رکھتا ہے اِس قدر محبّت کیوں؟
دیا بچّے نے یوں جواب سُنو! اے ہے! امّاں خبر نہیں تم کو
مُجھ کو تکلیف سے بچاتی ہو پیار سے گود میں بٹھاتی ہو
جی مرا بدمزہ اگر ہو جائے میرے دُکھ کا تمھیں اثر ہو جائے
مجھ کو ہو درد تم کو حیرانی چُھپکے چُھپکے کرو نگہبانی
اچھّے اچھّے کِھلاتی ہو کھانے پیار کرتی ہو تم۔ خدا جانے!
اور سب سے کہ آرہے ہیں نظر تم زیادہ ہو مہرباں مجھ پر
جانتا ہوں عزیز سب سے تمھیں چاہتا ہوں اِسی سبب سے تمھیں

پیاری امّاں کہا نہیں جاتا
نہیں مطلب بیان میں آتا

(۵۰) مور اور کلنگ

دُم مور نے پھول کر دکھائی
اور بولا کلنگ سے کہ بھائی!
کیا خوب ہیں نقش! اور کیا رنگ!
دُنیا مجھے دیکھ کر ہوئی دنگ
میری سی کہاں ہے آپ کی دُم
کر سکتے نہیں مقابلہ تم
بولا اُس سے کلنگ ہنس کر
ہاں! آپ کے لاجواب ہیں پر
لیکن نہیں کچھ بھی کام آتے
بچّوں ہی کے دل کو ہیں لُبھاتے
اُڑنے نہیں دیتی دُم تمھاری
لیتے ہیں پکڑ تمھیں شکاری
یہ کہہ کے پروں کو پھٹپھٹا کے
بولا! اونچا ہوا پے جا کے
آؤ! کریں آسماں کا پھیرا
کچھ دَم ہے تو ساتھ دو نہ میرا
مُنہ اپنا سا لے کے رہ گیا مور
تھا اُس میں کہاں اُڑان کا زور
بھاتا ہے جنھیں زرا دکھاوا
وہ لوگ ہیں مور کے بھی باوا
بس اُن کو ہے ٹیپ ٹاپ کی دُھن
شیخی کے سوا نہیں کوئی گُن
دیکھیں کسے یاد ہے زبانی
مور اور کُلنگ کی کہانی

(۵۱) عجیب چڑیا

چڑیا ہم نے عجیب پالی — زنجیر اُس کے گلے میں ڈالی
دن رات ہو۔ شام یا سویرا — لیتی ہے وہ جیب میں بسیرا
چڑیا سے بھی قد ہے اُس کا چھوٹا — ہے اُس کا بدن تمام پوٹا
پوٹے پہ جو غور سے نظر کی — پوٹا نہیں پوٹ ہے ہنر کی
گویا ہے۔ اگرچہ بے زبان ہے — ناداں ہے مگر حساب داں ہے
دانہ پانی نہیں وہ کھاتی — ہر دم ہے خوشی سے چہچہاتی
دن رات میں چھیڑ دو کسی آن — یہ چھیڑ ہے اُس کے جسم کی جان
جب تک جیتی ہے جاگتی ہے — لو کام تو چیز کام کی ہے
کہتی ہے کہ وقت کی خبر لو — جو کچھ کرنا ہے جلد کر لو
غفلت کیجے تو ٹوکتی ہے — عُجلت کیجے تو روکتی ہے
اِس طور سے کرتی ہے گزارہ — انڈے دیتی ہے دن میں بارہ
پھر اِتنے ہی رات کو ہے دیتی — دیتے ہی ہر ایک کو ہے سیتی
انڈے ہیں تمام اُس کے سچّے — ایک ایک سے نکلے ساٹھ بچّے
ہر بچّہ نے اُگلے ساٹھ دانے — ہر دانہ میں ہیں بھرے خزانے
جو دانہ گرا سو ہو گیا گُم — ڈھونڈا کرو پھر نہ پاؤ گے تم
دانہ کی بتاؤں کیا میں قیمت — دانہ سمجھیں اُسے غنیمت

جس نے اُسے پالیا کہا واہ! کیا بات ہے تیری بارک اللہ!
سچ مچ تو لعلِ بے بہا ہے گویا ہر درد کی دوا ہے

القصّہ ہے وہ عجب پرند
مُردہ اُسے کہہ سکیں نہ زندہ

(۵۲)

کوّا

کوّے ہیں سب دیکھے بھالے چونچ بھی کالی پر بھی کالے
کالی کالی وردی سب کی اچھّی خاصی اُن کے ڈھب کی
کالی سینا کے ہیں سپاہی ایک سی صورت ایک سیاہی
لیکن ہے آواز بُری سی کان میں جا لگتی ہے چھُری سی
یوں تو ہے کوّا حرص کا بندہ کچھ بھی نہ چھوڑے پاک نہ گندہ
اچھّی ہے پر اُس کی یہ عادت بھائیوں کی کرتا ہے دعوت
کوئی ذرا سی چیز جو پالے کھائے نہ جب تک سب کو بُلا لے
کھانے دانے پر ہے گرتا پیٹ کے کارن گھر گھر پھرتا
دیکھ لو! وہ دیوار پہ بیٹھا غُلّہ کی ہے مار پہ بیٹھا

کیونکر باندھوں اُس پہ نشانا
بے صبرا چوکنّا سیانا
کائیں کائیں پنکھ پسارے
کرتا ہے یہ بھوک کے مارے
تاک رہا ہے کونا کھُترا
کچھ دیکھا تو نیچے اُترا
اُس کو بس آتا ہے اُچھلنا
جانے کیا دو پانوں سے چلنا
اُچھلا کوُدا لپکا سُکڑا
ہاتھ میں تھا بچّہ کے ٹکڑا
آنکھ بچا کر جھٹ لے بھاگا
واہ رے تیری پھرتی کاگا!
ہا ہا کرتے رہ گئے گھر کے
یہ جا وہ جا چونچ میں بھر کے
پیڑ پہ تھا چڑیا کا بسیرا
اُس کو ظالم نے جا گھیرا
ہاتھ لگا چھوٹا سا بچّا
نوچا پھاڑا کھا گیا کچّا
چڑیا رو رو جان ہے کھوتی
ہے ظالم کی جان کو روتی
چیں چیں چیں چیں دے کے دُہائی
اپنی بپتا سب کو سُنائی
کون ہے جو فریاد کو پہنچے
بے چاری کی داد کو پہنچے
پکنے پر جب مکّا آئی
کوّوں نے جا لوٹ مچائی
دُودھیا بھُٹا چونچ سے چیرا
سَچ مُچ کا ہے اُٹھائی گیرا
رکھوالے نے پائی آہٹ
گوپھن لے کر اُٹھا جھٹ پٹ
"ہریا ہریا" شور مچا کر
ڈھیلا مارا تڑ سے گھما کر
سُن کے تڑاقا کوّا بھاگا
تھوڑی دیر میں پھر جا لاگا

لالچ خور ڈھیٹ نڈر ہے ڈانکو سے کچھ اِس میں کسر ہے؟
ڈانکو ہے یا چور اُچکّا
پَر ہے اپنی دُھن کا پکّا

(۵۳) ایک لڑکا اور بیر

ایک لڑکا ہے بڑا ایمان دار آزمائش ہو چکی ہے چند بار
ایک دن وہ نیک دل اور باحیا اپنے ہمسایہ کے گھر میں تھا گیا
آدمی بالکل نہیں واں نام کو کیونکہ ہمسایہ گیا ہے کام کو
تازہ تازہ بیر ڈلیا میں بھرے بے حفاظت گھر کے اندر ہیں دھرے
لیکن اُس نے بیر کو چھیڑا نہیں ہو نہ جائے شبہ چوری کا کہیں
آگیا اتنے میں ہمسایہ وہاں کھیل میں مصروف ہے لڑکا جہاں
اپنے بیروں میں نہ پائی کچھ کمی ہو کے خوش لڑکے سے بولا آدمی
بیر یہ تم نے چُرائے کیوں نہیں؟ کیوں چُراتا؟ چور تھا کیا میں کہیں؟
چور جب بنتے کہ کوئی دیکھتا دیکھنے کو میں ہی خود موجود تھا
کچھ بُرائی آپ میں گر پاؤں میں پانی پانی شرم سے ہو جاؤں میں
واہ وا! شاباش! لڑکے واہ وا!
تو جواں مردوں سے بازی لے گیا

(۵۴) ایک پودا اور گھاس

اتّفاقاً ایک پودا اور گھاس باغ میں دونوں کھڑے ہیں پاس پاس
گھاس کہتی ہے کہ اے میرے رفیق کیا انوکھا اِس جہاں کا ہے طریق
ہے ہماری اور تمھاری ایک ذات ایک قدرت سے ہے دونوں کی حیات
مٹّی اور پانی ہوا اور روشنی واسطے دونوں کے یکساں ہے بنی
تجھ پہ لیکن ہے عنایت کی نظر پھینک دیتے ہیں مجھے جڑ کھود کر
سر اُٹھانے کی مجھے فرصت نہیں اور ہوا کھانے کی بھی رخصت نہیں
کون دیتا ہے مجھے یاں پھیلنے کھا لیا گھوڑے گدھے یا بیل نے
تجھ پہ مُنہ ڈالے جو کوئی جانور اُس کی لی جاتی ہے ڈنڈے سے خبر
اولے پالے سے بچاتے ہیں تجھے کیا ہی عزّت سے بڑھاتے ہیں تجھے
چاہتے ہیں تجھ کو سب کرتے ہیں پیار کچھ پتا اِس کا بتا اے دوستدار
اُس سے پودے نے کہا یوں سر ہلا گھاس! سب بیجا ہے یہ تیرا گلا
مجھ میں اور تجھ میں نہیں کچھ بھی تمیز صرف سایہ اور میوہ ہے عزیز
فائدہ اِک روز مجھ سے پائیں گے سایہ میں بیٹھیں گے اور پھل کھائیں گے
ہے یہاں عزّت کا سہرا اُس کے سر
جس سے پہنچے نفع سب کو بیشتر

(۵۵) ایک جگنو اور بچّہ کی باتیں

سُناؤں تمھیں بات اِک رات کی / کہ وہ رات اندھیری تھی برسات کی
چمکنے سے جگنو کے تھا اک سماں / ہوا پر اُڑیں جیسے چنگاریاں
پڑی ایک بچّہ کی اُن پر نظر / پکڑ ہی لیا ایک کو دوڑ کر
چمک دار کیڑا جو بھایا اُسے / تو ٹوپی میں جھٹ پٹ چھپایا اُسے
وہ جھم جھم چمکتا اِدھر سے اُدھر / پھرا۔ کوئی رستہ نہ پایا مگر
تو غمگین قیدی نے کی التجا / کہ چھوٹے شکاری! مجھے کر رہا

جگنو

خدا کے لئے چھوڑ دے چھوڑ دے! / مری قید کے جال کو توڑ دے!

بچّہ

کروں گا نہ آزاد اُس وقت تک / کہ میں دیکھ لوں دن میں تیری چمک

جگنو

چمک میری دن میں نہ دیکھو گے تم / اُجالے میں ہو جائے گی وہ تو گم

بچّہ

ارے چھوٹے کیڑے نہ دے دم مجھے / کہ ہے واقفیت ابھی کم مجھے
اُجالے میں دن کے کھُلے گا یہ حال / کہ اتنے سے کیڑے میں ہے کیا کمال

دُھواں ہے نہ شُعلہ نہ گرمی نہ آنچ
چمکنے کی تیرے کروں گا میں جانچ

جگنو

یہ قدرت کی کاریگری ہے جناب
کہ ذرّہ کو چمکائے جوں آفتاب

مُجھے دی ہے اِس واسطے یہ چمک
کہ تم دیکھ کر مجھ کو جاؤ ٹھٹک

نہ اَلّڑھ پنے سے کرو پائمال
سنبھل کر چلو آدمی کی سی چال!

(۵۶) ایک گھوڑا اور اُس کا سایہ

ایک گھوڑا تھا نہایت عیب دار
اپنے سایہ سے بدکتا بار بار

اُس سے مالک نے خفا ہو کر کہا
سُن تو احمق! جس سے تو ہے ڈر رہا

جسم کا تیرے ہی تو سایہ ہے وہ
کُچھ درندہ ہے نہ چوپایہ ہے وہ

جسم رکھتا ہے نہ اُس کے جان ہے
تو بڑا ڈرپوک۔ او نادان! ہے

یوں دیا گھوڑے نے مالک کو جواب
سچ کہا یہ آپ نے لیکن جناب!

آدمی سے بڑھ کے میں وہمی نہیں
اَن ہوئی باتوں کا ہے جس کو یقیں

بھُوت کا قصّہ کہانی کے سوا
کُچھ نشاں گھر میں نہ جنگل میں پتا

بھُوت سے ڈرنا بھی کوئی بات ہے
کیا ہی وہمی آدمی کی ذات ہے

سایہ تو آنکھوں سے آتا ہے نظر
کیا عجب ہے جو ہُوا مجھ پر اثر

اپنے دُکھ کا کیجئے اوّل علاج
دوسروں کا پوچھئے پیچھے مزاج

(۵۷) ایک کتّا اور اُس کی پرچھائیں

مُنہ میں ٹکڑا لئے ہوئے کُتّا
ایک دریا کو تیر کر اُترا

پانی آئینہ سا رہا تھا چمک
نظر آتی تھی تہ کی مٹّی تک

اپنی پرچھائیں پر کیا جو غور
اُس کو سمجھا کہ ہے یہ کُتّا اور

مُنہ میں ٹکڑا دبا رہا ہے یہ
گہرے پانی میں جا رہا ہے یہ

حرص نے ایسا بے قرار کیا
جھٹ سے غُرّا کے اُس پہ وار کیا

جونہیں ٹُکڑے پہ اُس کے مُنہ مارا
اپنا ٹکڑا بھی کھو دیا سارا

واں نہ ٹکڑا نہ اور کُتّا تھا
وہم تھا۔ وہم کے سوا کیا تھا

یونہیں جتنے ہیں لالچی ناداں
کر کے لالچ اُٹھاتے ہیں نُقصاں

باندھتے ہیں کہاں کہاں کے خیال
اور کھو بیٹھتے ہیں اپنا مال

تم ہوس میں سڑی نہ بن جاؤ
جو مِلے اُس کو کام میں لاؤ

(۵۸) ریل گاڑی

حیواں ہے وہ نہ انساں جن ہے نہ وہ پری ہے
سینہ میں اُس کے ہر دم اِک آگ سی بھری ہے

کھا پی کے آگ پانی چنگھاڑ مارتی ہے
سَر سے دُھوئیں اُڑا کر غصّہ اتارتی ہے

وہ گھورتی گرجتی بھرتی ہے اِک سپاٹا
ہفتوں کی منزلوں کو گھنٹوں میں اُس نے کاٹا

آتی ہے شور کرتی جاتی ہے غُل مچاتی
وہ اپنے خادموں کو ہے دور سے جگاتی

بے خوف بے محابا ہر دم رواں دواں ہے
ہاتھی بھی اُس کے آگے اِک مورِ ناتواں ہے

آندھی ہو یا اندھیرا ہے اُس کو سب برابر
یکساں ہے نور و ظلمت اور روز و شب برابر

اُتّر سے لے دکن تک پورب سے لے پچھاں تک
سب ایک کر دیا ہے پہنچی ہے وہ جہاں تک

بجلی ہے یا بگولا۔ بھونچال ہے کہ آندھی
ٹھیکہ پہ ہے پہنچتی بجنوں کی ہے وہ باندھی

ہر آن ہے سفر میں کم ہے قیام کرتی
رہتی نہیں معطّل۔ پھرتی ہے کام کرتی

پردیسیوں کو جھٹ پٹ پہنچا گئی وطن میں
ڈالی ہے جان اُس نے سوداگری کے تن میں

ہر چیز سے نرالی ہے چال ڈھال اُس کی
پاؤ گے صنعتوں میں کمتر مثال اُس کی

برکت سے اُس کی بے پر پردار بن گئے ہیں
ملک اُس کے دم قدم سے گلزار بن گئے ہیں

ہم کہہ چکے مفصّل۔ جو کچھ ہے کام اُس کا
جب جانیں تم بتا دو بن سوچے نام اُس کا

جی ہاں سمجھ گیا میں۔ پہلے ہی میں نے تاڑی
وہ دیکھو آگرہ سے آتی ہے ریل گاڑی

(۵۹) پن چکّی

نہر پر چل رہی ہے پن چکّی
دُھن کی پوری ہے کام کی پکّی

بیٹھتی تو نہیں کبھی تھک کر
تیرے پہیّہ کو ہے سدا چکّر

پیسنے میں لگی نہیں کچھ دیر
تو نے جھٹ پٹ لگا دیا اِک ڈھیر

لوگ لیجائیں گے سمیٹ سمیٹ
تیرا آٹا بھرے گا کتنے پیٹ

بھر کے لاتے ہیں گاڑیوں میں اَناج
شہر کے شہر ہیں ترے مُحتاج
تو بڑے کام کی ہے اے چکّی!
کام کو کر رہی ہے طے چکّی
ختم تیرا سفر نہیں ہوتا
نہیں ہوتا مگر نہیں ہوتا
پانی ہر وقت بہتا ہے ڈھل ڈھل
جو گھماتا ہے آ کے تیری کَل
کیا تجھے چین ہی نہیں آتا
کام جب تک نبڑ نہیں جاتا
مینہ برستا ہو یا چلے آندھی
تو نے چلنے کی شرط ہے باندھی
تو بڑے کام کی ہے اے چکّی!
مُجھ کو بھاتی ہے تیری لَے چکّی!
عِلم سیکھو سبق پڑھو بچّو
اور آگے چلو بڑھو بچّو
کھیلنے کودنے کا مت لو نام
کام جب تک کہ ہو نہ جائے تمام
جب نبڑ جائے کام تب ہے مزہ
کھیلنے کھانے اور سونے کا
دِل سے محنت کرو خوشی کے ساتھ
نہ کہ اُکتا کے خامُشی کے ساتھ
دیکھ لو چل رہی ہے پن چکّی
دُھن کی پوری ہے کام کی پکّی

(۶۰) دال کی فریاد

ایک لڑکی بگھارتی ہے دال
دال کرتی ہے عرض یوں احوال
ایک دن تھا ہری بھری تھی میں
ساری آفات سے بری تھی میں
تھا ہرا کھیت میرا گہوارہ
وہ وطن تھا مجھے بہت پیارا

پانی پی پی کے تھی میں لہراتی دھوپ لیتی کبھی ہوا کھاتی
مینہ برستا تھا جھوکے آتے تھے گودیوں میں مُجھے کھلاتے تھے
یہی سورج زمیں تھے ماں باوا مُجھ سے کرتے تھے نیک برتاوا
جب کیا مُجھ کو پال پوس بڑا آہ ظالم کسان آن پڑا
گئی تقدیر یک بیک جو پلٹ کھیت کا کھیت کر دیا تلپٹ
خوب لوٹا دھڑی دھڑی کر کے مُجھ کو گونوں میں لے گئے بھر کے
ہو گئی دم کے دم میں بربادی چھن گئی ہائے میری آزادی!
کیا بتاؤں کہاں کہاں کھینچا دال منڈی میں مجھکو جا بیچا
ایک ظالم سے واں پڑا پالا جس نے چکّی میں مُجھ کو دَل ڈالا
ہُوا تقدیر کا لکھا پورا دونوں پاٹوں نے کر دیا چورا
نہ سُنی میری آہ اور زاری خوب بنیئے نے کی خریداری
چھانا چھلنی میں چھاج میں پھٹکا قید خانہ میرا بنا مٹکا
پھر مُقدّر مجھے یہاں لایا تُم نے تو اور بھی غضب ڈھایا
کھال کھینچی الگ کیئے چھلکے زخم کیونکر ہرے نہ ہوں دل کے
ڈالیں مرچیں نمک لگایا خوب رکھ کے چولھے پہ جی جلایا خوب
اُس پہ کفگیر کے ٹھوکے ہیں اور ناخن کے بھی کچوکے ہیں
میرے گلنے کی لے رہی ہو خبر دانت سے آپ کا مرے اوپر

گرم گھی کر کے مجھ کو داغ دیا
ہائے تم نے بھی کچھ نہ رحم کیا

ہاتھ دھو کر پڑی ہو پیچھے تم
جان پر آبنی حواس ہیں گم

اچھی بی بی تمھیں کرو انصاف
ظلم ہے یا نہیں (قصور معاف)

کہا لڑکی نے میری پیاری دال
مجھ کو معلوم ہے ترا سب حال

تو اگر کھیت سے نہیں آتی
خاک ہیں ملکے خاک ہو جاتی

یا کوئی گائے بھینس چر لیتی
پیٹ میں اپنے تجھ کو بھر لیتی

میں تو رُتبہ ترا بڑھاتی ہوں
اب چپاتی سے تجھ کو کھاتی ہوں

نہ ستانا نہ جی جلانا تھا
یوں تجھے آدمی بنانا تھا

اگلی بیتی کا تو نہ کر کچھ غم
مہربانی تھی سب نہ تھا یہ ستم

(۱۶) دال چپاتی

اور سنو ایک حکایت نئی
دال چپاتی میں جھڑپ ہو گئی

دال لگی کہنے کہ میرا مزہ
کرتا چپاتی کو بھی ہے بامزہ

میرے بدوں اس کو بھلا کھائے کون
روکھی چپاتی میں مزہ پائے کون

بلکہ نری دال اگر کھائیے
ہونٹ ہی بس چاٹتے رہ جائیے

کرتا ہے درویش جو روٹی طلب
دال چپاتی اُسے دیتے ہیں سب

دیکھ لو اس وقت میری برتری
نیچے ہے وہ اور میں اوپر دھری

بیٹھتی ہوں چڑھ کے چپاتی پہ میں — مونگ دلا کرتی ہوں چھاتی پہ میں
اِس کے سوا دیکھئے میرا سنگار — پہلے مصالح ہے پھر اُس پر بگھار
مُجھ کو پکاتے ہیں سبھی ادبدا — کھاتے ہیں سب شاہ سے لے تا گدا
میری فضیلت میں نہیں کوئی شک — واہ رے میں اور مرا آب و نمک
ذائقہ خوشبو پہ مری لوٹ ہے — دل پہ چپاتی کے یہ ہی چوٹ ہے
دال نے شیخی جو بگھاری بڑی — سُن کے چپاتی بھی اُچھل ہی پڑی
بے ادبی کر نہ میری شان میں — میری طفیلی ہے تو ہر خوان میں
دال ہو سالن ہو کہ چٹنی اچار — سب ہیں میرے ساتھ کے خدمت گزار
کوفتہ ہو قورمہ ہو یا کباب — تھام کے چلتے ہیں یہ میری رکاب
چٹ پٹی ترکاریاں جب ہوویں ساتھ — دال کو پھر کون لگاتا ہے ہاتھ
دال کا دانہ بھی نہ چکھے کوئی — بلکہ رکابی میں نہ رکھے کوئی
دال تو اِک ہارے کا ہتھیار ہے — کھائے وہی اِس کو جو بیمار ہے
دال میسّر نہیں ہوتی جنھیں — صرف چپاتی کو غنیمت گنیں
جس کی فقط دال پہ گزران ہے — آدمی کاہے کو وہ حیوان ہے
یوں تو سبھی کھانوں میں افضل ہوں میں — دال سے سو مرتبہ اوّل ہوں میں
دونوں میں القصّہ بہت بڑھ گئی — ایک پہ ایک آن کے پھر چڑھ گئی
لُقمہ بنا دونوں کو میں کھا گیا — قصّہ ہوا فیصلہ جھگڑا گیا

(۶۲) ملمّع کی انگوٹھی

چاندی کی انگوٹھی پہ جو سونے کا چڑھا جھول
اوچھی تھی لگی بولنے اِترا کے بڑا بول
چاندی کی انگوٹھی کے نہیں ساتھ رہوں گی
وہ اور ہے میں اور یہ ذلّت نہ سہوں گی
میں قوم کی اونچی ہوں بڑا میرا گھرانا
وہ ذات کی گھٹیا ہے نہیں اُس کا ٹھکانا
میری سی چمک اُس میں نہ میری سی دمک ہے
چاندی ہے کہ ہے رانگ مجھے اِس میں بھی شک ہے
میری سی کہاں چاشنی میرا سا کہاں رنگ
وہ مول میں اور تول میں میرے نہیں پاسنگ
اے دیکھنے والو تمھیں انصاف سے کہنا
چاندی کی انگوٹھی بھی ہے کچھ گہنوں میں گہنا
یہ سُنتے ہی چاندی کی انگوٹھی بھی گئی جل
اللہ رے ملمّع کی انگوٹھی تیرے چھل بل
سونے کے ملمّع پہ نہ اِترا میری پیاری
دو دن میں بھڑک اُس کی اُتر جائے گی ساری
کُچھ دیر حقیقت کو چھپایا بھی تو پھر کیا
جھوٹوں نے جو سچّوں کو چڑایا بھی تو پھر کیا
مت بھول کبھی اصل کو اپنی اری احمق!
جب تاؤ دیا جائے گا ہو جائے گا مُنہ فق
سچّے کی تو عزّت ہی بڑھے گی جو کریں جانچ
مشہور مثل ہے کہ نہیں سانچ کو کچھ آنچ

کھوٹے کو کھرا بن کے نکھرنا نہیں اچھّا
چھوٹے کو بڑا بن کے اُبھرنا نہیں اچھا

(۶۳) غصّہ کا ضبط

دل میں جب کوند جائے برقِ غضب
اور طبیعت ہو انتقام طلب

اِس خطرناک راہ میں جو مرد
کر سکے آتشِ غضب کو سرد

ڈانٹ کر دیوِ نفس کو لے تھام
اور نہ لائے زباں پہ سخت کلام

مشورت عقل کی سُنے اُس دَم
ہے وہی اپنے وقت کا رُستم

(۶۴) ادب

ادب ہی سے انسان انسان ہے
نہ سیکھے ادب جو۔ وہ حیوان ہے

جہاں میں ہو پیارا نہ کیونکر ادب
کہ ہے آدمیّت کا زیور ادب

نہ ہو جس کو اچھے بُرے کی تمیز
نہ وہ گھر میں پیارا نہ باہر عزیز

بٹھاتے نہیں بے ادب کو قریب
یہ سچ بات ہے۔ بے ادب بے نصیب

(۶۵) چغلخوری

چغلی ہے بُرا کام بچو اِس سے ہمیشہ
جو لوگ ہیں بے شرم اُنھیں کا ہے یہ پیشہ

یہ لت ہے بُری۔ اِس سے نہیں ہاتھ کچھ آتا
اکثر تو چغلخور ہی ذلّت ہے اُٹھاتا

(۶۶) آزادی غنیمت ہے

مِلے خُشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو وہ خوف و ذلّت کے حلوے سے بہتر

جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو
بھلی اُس محل سے۔ جہاں کُچھ خطر ہو

(۶۷) طلبِ خیر میں قناعت سے حرص بہتر ہے

جو طلبِ خیر میں قانع ہوا اپنی ترقّی کا وہ مانع ہوا
ایسی قناعت سے طمع خوب ہے حرص ہی اِس راہ میں محبوب ہے

(۶۸) تکبّر میں ذلّت ہے اور تواضع میں عزّت

تکبّر کیا ہے؟ - اِک ایوانِ عالی مگر ناموس اور عزّت سے خالی
تواضع ایک تہ خانہ ہے جس میں چھپی بیٹھی ہیں سب عزّت کی قسمیں

(۶۹) خیر خواہِ خلق[۱]

کہتے ہیں ایک شخص تھا ہردلعزیز خیر خواہِ خلق لیکن بے تمیز
ہر کسی کے کام کو تیّار تھا اُس کے مذہب میں حرام انکار تھا

(۷۰) نقّاد

وہ دانا کہ جن کا ہُوا ہے گذر نشیب و فرازِ تواریخ پر
نہیں جنسِ مشکوک کے مُشتری روایت درایت کے ہیں جوہری
کسوٹی پہ کستے ہیں دیتے ہیں آنچ
ہر اک چاشنی کی مُقرر ہے جانچ

(۷۱) ساون کی جھڑی

گھٹا کا تن گیا ہے شامیانہ بجایا رعد نے نقّار خانہ

نوٹ [۱] برائے علی گڈھ گزٹ - مرتبہ ۲۳ نومبر ۱۹۱۱ء - ناتمام

گھٹا کس سوچ میں چپکی کھڑی ہے برس۔ آخر تو ساون کی جھڑی ہے
بھنبیری اُڑ کہ ساون آگیا اب گھٹا اُنڈی ہے، بادل چھا گیا اب
کہو کویل سے امرویوں میں بولے پھُدک ٹہنی پہ تو بھی او ! ممولے
کٹورا سا ہُوا تالاب لبریز کہو مینڈک سے اپنی لے کرے تیز
زباں اپنی بھگولے او ٹٹیری
بجادے تو بھی او جھینگر نفیری

۲۔ مثلّث

(۷۲) اب آرام کرو

جھٹ پٹا سا ہو گیا ہے شام کا اب کہاں باقی ہے موقع کام کا
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

قصد چڑیوں نے بسیرے کا کیا ڈھونڈتی ہیں اپنا اپنا گھونسلا
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

دیکھنا سورج ہے چھپنے کے قریب تھم گئے چلتے مسافر بھی غریب
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

لو! کبوتر بھی گرے پر جوڑ کر لیں گے اپنے چھوٹے بچّوں کی خبر
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

شام کو بستی سے باغوں کی طرف اُڑ چلے کوّے بھی مل کر صف بہ صف
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

کھلبلی جو دن میں تھی مدّھم پڑی بھنبھناہٹ مکّھیوں کی کم پڑی
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

جانور دن بھر قلانچیں بھر چکے اپنا اپنا کام پورا کر چکے
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

یہ جو کُٹ کُٹ کر رہی ہیں مُرغیاں ڈھونڈتی ہیں اپنے دڑبے کا نشاں

صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

بھیڑ۔ بکری۔ اونٹ گھوڑا گاؤ خر　　آن پہنچے اپنے اپنے تھان پر

صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

اب ہوا کے تیز جھونکے رُک گئے　　سو گئے پیڑ اور پتّے جُھک گئے

صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

لو سویرے تک ہمارا بھی سلام　　وقت ہے ناوقت کیا کیجے کلام

صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

(۳۷) خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

خوشی اِک مشغلہ ہو رات دن کا　　شمار افزوں ہو اُس کے سال و سِن کا

خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

ہے امن اُس کی شہنشاہی میں ہر جا　　سُکھی ہیں آج راجا اور پرجا

خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

کوئن دُنیا کے ہر خطّہ میں نامی　　غریبوں اور مسکینوں کی حامی

خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

رعایا تن کوئن اِس تن کی جاں ہے　　خدا کی خلق پر وہ مہرباں ہے

خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

دُعاگو اُس کا پورب اور پچھاں بھی　　فرنگستان بھی ہندوستان بھی

خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

رہے زندہ کوئن با دولت و بخت — رہے محفوظ اُس کا تاج اور تخت
خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

ہیں اکثر ساکنانِ رُبعِ مسکوں — کوئن کے حکم میں مامون و مصئوں
خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

ہے اُس کا مُلک راحت کا ٹھکانا — زمانہ اُس کا ہے طُرفہ زمانہ
خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

سبھی احسان اُس کا مانتے ہیں — اُسے پیارا شہنشہ جانتے ہیں
خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

ہیں اُس کے عہد میں انسان بڑھتے — نہالِ تازہ ہیں پروان چڑھتے
خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

سمندر، شہر، جنگل، اور پربت — بنے گلزار ہیں اُس کی بدولت
خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

نظام[1] الدین کی ہے التجا یہ — نکلتی ہے تہِ دل سے دُعا یہ
خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

---

[1] یہ نظم شیخ نظام الدین صاحب نبیرۂ خان بہادر حافظ عبد الکریم مرحوم سی۔ آئی۔ ای رئیس لال کرتی نے جلسہ سالگرہ ملکہ معظمہ کوئن وکٹوریا میں پڑھی تھی۔ ۱۲

(۳) مربّع

(۴۷) اچھّا زمانہ آنے والا ہے

(۱)

تنے گا مسرّت کا اب شامیانہ بجے گا محبّت کا نقّارخانہ
حمایت کا گائیں گے مل کر ترانہ کرو صبر آتا ہے اچھّا زمانہ

(۲)

نہ ہم روشنی دن کی دیکھیں گے لیکن چمک اپنی دکھلائیں گے اب بھلے دن
رُکے گا نہ عالم ترقّی کئے بن کرو صبر آتا ہے اچھّا زمانہ

(۳)

ہر اِک توپ سچ کی مددگار ہو گی خیالات کی تیز تلوار ہو گی
اسی پر فقط جیت اور ہار ہو گی کرو صبر آتا ہے اچھّا زمانہ

(۴)

زبانِ قلم سیف پر ہو گی غالب دبیں گے نہ طاقت سے پھر حق کے طالب
کہ محکوم حق ہو گا دُنیا کا قالب[ل] کرو صبر آتا ہے اچھّا زمانہ

(۵)

زمانہ نسب کو نہ پوچھے گا ہے کیا مگر وصفِ ذاتی کا ڈنکا بجے گا
اُسی کو بڑا سب سے مانے گی دُنیا کرو صبر آتا ہے اچھّا زمانہ

[ل] اصل میں با لفتح ہے مگر روزمرّہ اُردو کا بالکسر ہے۔

(۶)

لڑائی کو انسان سمجھیں گے ڈائن
تفاخر پہ ہوگی نہ قوموں میں اَن بن
مشیخت کی خاطر اُڑے گی نہ گردن
کرو صبر آتا ہے اچھّا زمانہ

(۷)

عقیدوں کی مٹ جائے گی سب رقابت
مذاہب کو ہوگی تعصّب سے فرصت
مگر اُن کی بڑھ جائے گی اور طاقت
کرو صبر آتا ہے اچھّا زمانہ

(۸)

کریں سب مدد ایک کی ایک مل کر
یہی بات واجب ہے ہر مرد و زن پر
لگے ہاتھ سب کا تو اُٹھ جائے چھپّر
کرو صبر آتا ہے اچھّا زمانہ

(۷۵) بچپن میں خُدا کی یاد

(۱)

اے زمیں ۔ آسمان کے مالک
ساری دُنیا جہان کے مالک
تن بدن ۔ اور جان کے مالک
میں نہیں جانتا ۔ کہاں ہے تو؟

(۲)

روز سُنتا ہوں سب سے تیرا نام
تو بناتا ہے سب کے بگڑے کام
تو ہی دیتا ہے رات دِن آرام
جانتا ہوں کہ مہرباں ہے تو؟

(۳)

ذکر تیرا ہر ایک زباں پر ہے　　تیرا چرچا ہمیشہ گھر گھر ہے
تو سمایا دلوں کے اندر ہے　　چار ہم ہیں۔ تو پانچواں ہے تو؟

(۴)

ندّی۔ نالے۔ پہاڑ اور میداں　　پھُول پتّے۔ درخت اور حیواں
تیری کاری گری کے ہیں یہ نشاں　　ہم نے مانا کہ بے نشاں ہے تو؟

(۴) مُخمّس[1]

(۷۶) میرا خدا میرے ساتھ ہے

ہے ہمیشہ مری خدا پہ نظر ۔ رات ہو دن ہو شام ہو کہ سحر
نہ اُجالے میں ہے کسی کا ڈر ۔ نہ اندھیرے میں کوئی خوف و خطر
کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

شام کا وقت یا سویرا ہو ۔ چاندنی ہو کہ گُپ اندھیرا ہو
مینہ نے آندھی نے مجھ کو گھیرا ہو ۔ لیک پُر ہول دل نہ میرا ہو
کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

جبکہ طوفان کا ہو سنّاٹا ۔ سخت اندھیاؤ کا چلے جھونکا
جڑ سے پیڑوں کو دے اُکھیڑ ہوا ۔ میرے دل میں نہ خوف ہو اصلا
کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

ٹوٹ کر آسمان سے تارے ۔ شب کو گرتے ہیں جیسے انگارے
وہم کرتے ہیں لوگ بے چارے ۔ میں نہ گھبراؤں خوف کے مارے
کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

چاند سورج کا دیکھ کر گہنا ۔ میرے ہمجولیوں کو ہے کھٹکا
لوگ کرتے ہیں خوف کا چرچا ۔ پر مجھے اس کی کچھ نہیں پروا

[1] مرتبہ ۲۰ جولائی ۱۸۸۷ء

کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

جب ستارہ طلوع ہو دُم دار — دُم ہو ایسی کہ چھوٹتا ہے انار
سر پہ طاری ہوں خوف کے آثار — میرے بھاویں مگر نہ ہو زنہار

کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

میرے رستہ میں ہو اگر میداں — یا پُرانا کوئی کھنڈر سُنسان
کوئی مرگھٹ ہو یا ہو قبرستاں — نہ خطا ہوں وہاں مرے اوسان

کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

ہو بیابان میں گزر میرا — یا سمندر پہ ہو سفر میرا
دور رہ جائے مجھ سے گھر میرا — رہے پھر بھی قوی جگر میرا

کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

جب کہ دریا میں آئے طغیانی — اور ہاتھی ڈباؤ ہو پانی
پار کھیوا نہ ہو بآسانی — مجھ کو اندیشہ ہو نہ حیرانی

کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

لشکروں کی جہاں چڑھائی ہو — شہ سواروں نے باگ اُٹھائی ہو
اور گھمسان کی لڑائی ہو — واں بھی ہیبت نہ مجھ پہ چھائی ہو

کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

(۷۷) صبح کی آمد

خبر دن کے آنے کی میں لا رہی ہوں اُجالا زمانہ میں پھیلا رہی ہوں
بہار اپنی مشرق سے دکھلا رہی ہوں پکارے گلے صاف چلّا رہی ہوں
اُٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

میں سب کاربہوار کے ساتھ آئی میں رفتار و گفتار کے ساتھ آئی
میں باجوں کی جھنکار کے ساتھ آئی میں چڑیوں کی چہکار کے ساتھ آئی
اُٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

اذاں پر اذاں مُرغ دینے لگا ہے خوشی سے ہر اک جانور بولتا ہے
درختوں کے اوپر عجب چہچہا ہے سُہانا ہے وقت اور ٹھنڈی ہوا ہے
اُٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

یہ چڑیاں جو پیڑوں پہ ہیں غُل مچاتی اِدھر سے اُدھر اُڑ کے ہیں آتی جاتی
دُموں کو ہِلاتی پروں کو پھُلاتی میری آمد آمد کے ہیں گیت گاتی
اُٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

جو طوطے نے باغوں میں ٹیں ٹیں مچائی تو بلبل بھی گلشن میں ہے چہچہائی
اور اونچی منڈیروں پہ شاما بھی گائی میں سو سو طرح دے رہی ہوں دہائی
اُٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

ہر ایک باغ کو میں نے مہکا دیا ہے نسیم اور صبا کو بھی لہکا دیا ہے

چمن سُرخ پھولوں سے دہکا دیا ہے مگر نیند نے تم کو بہکا دیا ہے
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

ہوئی مجھ سے رونق پہاڑ اور بن میں ہر ایک مُلک میں دیس میں ہر وطن میں
کِھلاتی ہوئی پھول آئی چمن میں بُجھاتی چلی شمع کو انجمن میں
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

جو اِس وقت جنگل میں بوٹی جڑی ہے سو وہ نولکھا ہار پہنے کھڑی ہے
کہ پچھلے کی ٹھنڈک سے شبنم پڑی ہے عجب یہ سماں ہے عجب یہ گھڑی ہے
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

ہرن چونک اُٹھے چوکڑی بھر رہے ہیں کِلولیں ہرے کھیت میں کر رہے ہیں
ندی کے کنارے کھڑے چر رہے ہیں غرض میرے جلوہ پہ سب مر رہے ہیں
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

میں تاروں کی چھاؤں آن پہنچی یہاں تک زمیں سے ہے جلوہ مرا آسماں تک
مجھے پاؤ گے دیکھتے ہو جہاں تک کرو گے بھلا کاہلی تم کہاں تک
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

پوجاری کو مندر کے میں نے جگایا مؤذّن کو مسجد کے میں نے جگایا
بھٹکتے مسافر کو رستہ بتایا اندھیرا گھٹایا ۔ اُجالا بڑھایا
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

لدے قافلوں کے بھی منزل ہیں ڈیرے کسانوں کے ہل چل پڑے منہ اندھیرے
چلے جال کندھے پہ لے کر مچھیرے دِلدّر ہوئے دور آنے سے میرے
اُٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

بِگل اور طنبور سنکھ اور نوبت بجانے لگے اپنی اپنی سبھی گت
چلی توپ بھی دن سے حضرت سلامت نہیں خوب غفلت۔ نہیں خوب غفلت
اُٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

لو ہُشیار ہو جاؤ اور آنکھ کھولو نہ لو کروٹیں اور نہ بستر ٹٹولو
خدا کو کرو یاد اور مُنہ سے بولو بس اب خیر سے اُٹھ کے منہ ہاتھ دھولو
اُٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

بڑی دھوم سے آئی میری سواری جہاں میں ہُوا اب مرا حکم جاری
ستارے چھُپے رات اندھیری سِدھاری دکھائی دئے باغ اور کھیت کیاری
اُٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

میں پورب سے پچّھم پہ کرتی ہوں دھاوا زمیں کے کُرہ پر لگاتی ہوں کاوا
میں طے کر کے آئی ہوں چین اور جاوہ نہیں کہتی کچھ تم سے اِس کے علاوہ
اُٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

(۷۸) کوشش کیے جاؤ

دُکاں بند کر کے رہا بیٹھ جو تو دی اُس نے بالکل ہی لٹیا ڈبو
نہ بھاگو کبھی چھوڑ کر کام کو توقّع تو ہے خیر جو ہو سو ہو
کیے جاؤ کوشش مرے دوستو

جو پتھّر پہ پانی پڑے متّصل تو بے شبہ گھس جائے پتّھر کی سل
رہو گے اگر تم یونہیں مستقل تو اِک دن نتیجہ بھی جائے گا مل
کیے جاؤ کوشش مرے دوستو

یہ مانا کہ مشکل بہت ہے سبق بُرا ہے مگر اضطراب اور قلق
دوبارہ پڑھو پھر پڑھو ہر ورق پڑھے جاؤ جب تک ہے باقی رمق
کیے جاؤ کوشش مرے دوستو

اگر طاق میں تم نے رکھ دی کتاب تو کیا دو گے کل امتحاں میں جواب
نہ پڑھنے سے بہتر ہے پڑھنا جناب کہ ہو جاؤ گے ایک دن کامیاب
کیے جاؤ کوشش مرے دوستو

نہ تم ہچکچاؤ نہ ہرگز ڈرو جہاں تک بنے کام پورا کرو
مشقّت اُٹھاؤ مصیبت بھرو طلب میں جیو جستجو میں مرو
کیے جاؤ کوشش مرے دوستو

جو تم شیر دل ہو تو مارو شکار کہ خالی نہ جائے گا مردوں کا وار

مشقّت میں باقی نہ رکھنا اُدھار　　جو ہمّت کروگے تو بیڑا ہے پار
کیے جاؤ کوشش مرے دوستو

نہ بھاگو اگر مُشکل آجائے پیش　　خوشی سے گوارا کرو نوش و نیش
بنو کاہلی سے نہ گوبر گنیش　　وہی دے گا مرہم دیا جس نے نیش
کیے جاؤ کوشش مرے دوستو

جو بازی میں سبقت نہ لے جاؤ تم　　خبردار! ہرگز نہ گھبراؤ تم
نہ ٹھٹکو نہ جھجکو نہ پچھتاؤ تم　　ذرا صبر کو کام فرماؤ تم
کیے جاؤ کوشش مرے دوستو

مقابل میں خم ٹھوک کر آؤ ہاں　　پچھڑنے سے ڈرتے نہیں پہلواں
کرو پاس تم صبر کا امتحاں　　نہ جائے گی محنت کبھی رائیگاں
کیے جاؤ کوشش مرے دوستو

زیاں میں بھی ہے فائدہ کچھ نہ کچھ　　تمھیں مل رہے گا صلہ کچھ نہ کچھ
ہر ایک درد کی ہے دوا کچھ نہ کچھ　　کبھی تو لگے گا پتا کچھ نہ کچھ
کیے جاؤ کوشش مرے دوستو

تردّد کو آنے نہ دو اپنے پاس　　ہے بیہودہ خوف اور بیجا ہراس
رکھو دل کو مضبوط قائم حواس　　کبھی کامیابی کی چھوڑو نہ آس
کیے جاؤ کوشش مرے دوستو

کرو شوق و ہمّت کا جھنڈا بلند کودا ؤ اولوالعزمیوں کا سمند
اگر صبر سے تم سہو گے گزند تو کہلاؤ گے ایک دن فتح مند
کئے جاؤ کوشش مرے دوستو

(۷۹) چھوٹی چیونٹی

بڑی عاقلہ ہے بہت دور بیں ہے کہ فکر اپنی روزی کا تیرے تئیں ہے
اسی دُھن میں پہنچی کہیں سے کہیں ہے کبھی اپنے دھندے سے غافل نہیں ہے
اری چھوٹی چیونٹی تجھے آفریں ہے
نہیں کام سے شام تک تجھ کو فرصت ذرا سی تو جان اور اُس پر یہ محنت
بہت جھیلتی ہے مشقّت مُصیبت نہیں ہارتی پر کبھی اپنی ہمّت
اری چھوٹی چیونٹی تجھے آفریں ہے
کبھی کام تو نے ادھورا نہ چھوڑا کبھی تو نے تکلیف سے مُنہ نہ موڑا
بہت کام تو نے کیا تھوڑا تھوڑا ذخیرہ یہ جاڑے کی خاطر ہے جوڑا
اری چھوٹی چیونٹی تجھے آفریں ہے
جو گرمی کی رُت میں نہ کرتی کمائی تو جاڑے کے موسم میں مرتی بن آئی
تجھے ہوشیاری یہ کس نے سکھائی سمجھتی ہے اپنی بھلائی بُرائی
اری چھوٹی چیونٹی تجھے آفریں ہے
نہ کھو وقت سُستی میں مہلت ہے تھوڑی وہی کام کر جس سے مالک ہو راضی

یہ عمدہ سبق ہم کو دیتی ہے چیونٹی
کہ جس نے تجھے زندگانی عطا کی
اری چھوٹی چیونٹی تجھے آفریں ہے

(۸۰) خُدا قیصرۃ الہند کو سلامت رکھے

کون بھلا جبر کسی کا سہے
عیش و طرب کے ہیں یہاں چہچہے
جب تک اِس اقلیم میں گنگا بہے
کیوں نہ تہِ دل سے رعایا کہے
قیصرۃ الہند سلامت رہے

عدل نے اِس دور میں پایا رواج
ہند کا اِس عہد میں بدلا مزاج
سب کی تمنّا ہے کہ با تخت و تاج
جُملہ مفاسد کا ہوا ہے علاج
قیصرۃ الہند سلامت رہے

کرتی رعایا ہے نثار اُس پہ جاں
بس کہ رعایا پہ ہے وہ مہرباں
ملک اِس آہنگ میں ہے نغمہ خواں
شرق سے تا غرب کراں تا کراں
قیصرۃ الہند سلامت رہے

صُلح سے اور امن سے معمور ہے
فتنہ تو اِس دور سے بس دُور ہے
اِس لئے افواہ میں مذکور ہے
عافیت اِس وقت کا دستور ہے
قیصرۃ الہند سلامت رہے

غرب میں ہے سدِّ سکندر کھڑی
شرق میں ہے فوجِ مظفّر پڑی

نظم و سیاست میں نہیں گُلجھڑی
سلطنتِ ہند نہ کیوں ہو بڑی

قیصرۃ الہند سلامت رہے

پرچم اقبال ہے اس کا بلند
دولت و حشمت کا رواں ہے سمند
دھاک ہے تا چین و خطا، یا رقند
ہند کو ہو کس لئے خوفِ گزند

قیصرۃ الہند سلامت رہے

زورِ قلم یا دمِ صمصام ہے
مدِّ نظر منفعتِ عام ہے
نیکیوں کا نیک سرانجام ہے
سب کی دُعا صبح سے تا شام ہے

قیصرۃ الہند سلامت رہے

(۶) مُسدّس

(۸۱) ماں کی مامتا

مامتا ماں کی جانتے ہیں سب ماں ہے بچّے کی پرورش کا سبب
بھوک ننّھے کو ہے ستاتی جب ماں سے کرتا ہے رو کے دودھ طلب
دودھ دیتی ہے پیار کرتی ہے
جان اُس پر نثار کرتی ہے

بچہ سینہ سے جو رہا ہے چمٹ نہیں لے سکتی بے دھڑک کروٹ
پانو کی بھی نہ ہو ذرا آہٹ کبھی ننّھے کی نیند جائے اُچٹ
اُوں اُوں کرتی تھپکتی جاتی ہے
ہولے ہولے سرکتی جاتی ہے

جب رہا وہ نہالچہ پر سو چھوٹے تکیے لگا دیے دو دو
کئے سب کام تھے ضروری جو پر نہیں بھولتی ہے ننّھے کو
لیتی رہتی ہے ماں خبر ہر دم
اپنے ننّھے پہ ہے نظر ہر دم

ماں کو آرام کی کہاں فرصت سوئی بے ڈھب تو آگئی شامت
کپڑے لتّوں کی ہوگئی کیا گت ہے بچھونا بھی تر بتر لت پت

صبح اُٹھ کر کھنگالتی ہے تمام
جاڑے پالے کا وقت اور یہ کام

بچّہ اتنے میں چونک اُٹھا سو کے ناک میں دم کیا ہے رو رو کے
ماں نے پھر لے لیا ہے خوش ہو کے نیا کُرتہ بدل کے مُنہ دھو کے

باتیں کرتی ہے پیار سے جوں جوں
بولتا ہے جواب میں آغوں

رات کو لوریاں سُناتی ہے گود میں لے کے بیٹھ جاتی ہے
کس قدر زحمتیں اُٹھاتی ہے بچّہ ہے اور ماں کی چھاتی ہے

کبھی کُنڈی بجا کے بہلایا
کبھی کندھے لگا کے ٹہلایا

ماں کو داتی اُچھالتی ہے اُسے دیکھتی اور بھالتی ہے اُسے
ہر طرح پر سنبھالتی ہے اُسے اللہ آمین سے پالتی ہے اُسے

دیکھ کر اُس کا چاند سا مُکھڑا
بھول جاتی ہے اپنا سب دُکھڑا

جب لگایا ہے آنکھ میں کاجل پڑا بچّہ کی تیوری میں بل
دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ڈالیں مل بچّہ بے چین ہے تو ماں بے کل

چُپ کیا جھنجنا بجا کے اُسے

سوئی خود پیشتر سُلا کے اُسے

ماں پکائے تو کھانا پکتا ہے اور بچّہ اِدھر بلکتا ہے
کبھی پرچھائیں ماں کی تکتا ہے کبھی روتا کبھی ٹھنکتا ہے

کھانا پکتا ہے نام ہی کو بس
لگتے ہاتھوں لیا ہے بھون جُھلس

اُس کا ہَپّا جُدا پکاتی ہے اُنگلیوں سے اُسے چٹاتی ہے
باتیں کرنا اُسے بتاتی ہے پانوٗں چلنا اُسے سکھاتی ہے

ماں کو بچّہ سے جو محبّت ہے
درحقیقت خدا کی رحمت ہے

اِتّفاقاً جو ہو گیا بیمار پھوڑا پُھنسی ہے یا زکام بخار
پھر تو ہر وقت ہے گلے کا ہار ماں کو اُس سے زیادہ ہے آزار

اپنے آپے کا کچُھ نہیں ہے ہوش
بیٹھی ہے بُت بنی ہوئی خاموش

وہم سے دل ہے کانپتا تھر تھر اُڑ رہی ہیں ہوائیاں مُنہ پر
ہے فقط فضل پر خدا کے نظر مانگتی ہے دعائیں رو رو کر

پڑ گئی کان میں کچُھ اور بھنک
لگی ہونے کلیجہ میں دَھک دَھک

دشمنوں کا نہیں ہے جی اچھا ماں کو اِک ہول ہو گئی پیدا
پھر تو دُنیا جہان کی ہے دوا ٹوم چھلّے کا مُنہ ذرا نہ کیا

ہوت اَن ہوت کا نہیں کُچھ غم
رہے بچّہ کی خیریت جم جم

چاؤ اور چونچلوں سے پلتا ہے آخرش پاؤں پاؤں چلتا ہے
گھر سے باہر بھی جا نکلتا ہے کھیلتا۔ کودتا۔ اُچھلتا ہے

جب کہیں چوٹ پھینٹ ہے کھاتا
ماں ہی ماں کہہ کے ہے وہ چِلّاتا

چیخ کو سُن کے دوڑی بیچاری آنسو ٹپ ٹپ ہیں آنکھ سے جاری
ہوئی بچّہ پہ صدقے اور واری کون کرتا ہے یوں خبرداری

جھٹ کلیجے لگا لیا ماں نے
جھاڑا۔ پونچھا اُٹھا لیا ماں نے

اب تو اِک اور ہو گیا کھٹکا جا کے اونچی مُنڈیر پر لٹکا
ماں نے بہتیرا اپنا سر پٹکا گر پڑا تو نہ کھائے گا پھٹکا

پھر دبے پاؤں جا کے لائی اُتار
دیا آہستہ ایک طمانچہ مار

خیر سے اب تو کام کرتا ہے روز مکتب میں شام کرتا ہے

کیا ادب سے کلام کرتا ہے
سب کو جُھک کر سلام کرتا ہے
ماں چپٹا چپٹ بلائیں لیتی ہے
پیار کرتی دُعائیں دیتی ہے

(۸۲) میدانِ کارزار[لہ]

تھی صبح شبِ تار کی مانند کہر سے
آتی تھی نظر فوج اِدھر سے نہ اُدھر سے
جو چیز کہ تھی سامنے غائب تھی نظر سے
دشوار تھا اِس وقت گزر راہ گزر سے
ناگاہ قدم روس کے لشکر نے بڑھایا
جنگاہ میں لشکر کو ہر افسر نے بڑھایا

اِس معرکۂ سخت میں تھا زار بھی موجود
اور لشکرِ روسی کا سپہدار بھی موجود
رومانیہ کا والیِ غدّار بھی موجود
جنرل تھے بڑے نامی و جرار بھی موجود
رومانیہ اور روس کے لشکر ہوئے باہم
دو بحر تھے اک کوہ کی جنبش پہ فراہم

رشیا نے کئے جمع سوا لاکھ سپاہی
تھی شاق زبس حملۂ اوّل کی تباہی
نقصانِ گزشتہ کی مکافات جو چاہی
دکھلائی بڑی دھوم سے اب شوکتِ شاہی
باقی نہ رہی جائے بجز خیمہ و خرگاہ
صحرائے پلونہ میں ہوئی بند گزرگاہ

لہ اِس کے بہت سے بند تھے جو اتّفاق سے گم ہو گئے یہ چند متفرق بند اُن لوگوں سے دستیاب ہوئے جن کو یاد تھے۔

میداں میں ہوئی تین طرف فوج مقرّر جنگ آور و جرّار مقرّر ہوئے افسر
تھا سلسلہ توپوں کا ہر اک سمت برابر یوں وادی و کہسار میں پھیلے تھے ستمگر
پلٹن پہ تھی پلٹن تو رسالہ پہ رسالہ
روسی تھے پلونا پہ کہ مہتاب پہ ہالہ

اُس وقت دیا دمدمۂ ترک نے پیغام ہے مستعدِ جنگ صفِ لشکرِ اسلام
او! روس خبردار بس آگے نہ بڑھے گام یہ توپ کا گولہ ہے تمھارے لئے انعام
عثمانِ دلاور کے وہی شیر کھڑے ہیں
پہچانتے ہو حملۂ اوّل میں لڑے ہیں

جب زار نے عثمان پہ کی تاخت دوبارہ جو زور تھا لشکر کا وہ ڈالا وہیں سارا
اور آن کے میداں میں ہوا خوب ہی صف آرا لیکن نہ دیا قسمتِ واژوں نے سہارا
ہر حملہ میں اوندھا ہی پڑا زار کا لشکر
قسمت نہ لڑی گرچہ لڑا زار کا لشکر

برّاقیِ سنگین سے تھی آنکھ جھپکتی شمشیر بھی تھی صاعقہ کردار لپکتی
اور گولی پہ گولی متواتر تھی ٹپکتی میداں میں قضا پھرتی تھی کُشتوں کو تھپکتی
بندوقِ شرربار سے جلتا تھا بیاباں
توپوں کے گرجنے سے دہلتا تھا بیاباں

لشکر کی چڑھائی تھی کہ دریا کی چڑھائی تھی کوہ و بیاباں پہ گھٹا سی اُمنڈ آئی

دھوں دھاں کے سوا کچھ بھی نہ دیتا تھا سنائی
فوجوں کے سوا کچھ بھی نہ دیتا تھا دکھائی

ہتھیار ہر اک سمت چمکتے تھے جھما جھم
اور حادثۂ جنگ تھا تیزی پہ دمادم

(۸۳) حسیاتِ غم[۱]

شب کو تھی تپ کے سبب سے مجھے آشفتہ سری
جب سحر ہونے کو آئی تو ہوئی بے خبری

ناگہاں آئی صدا کان میں وحشت کی بھری
برقِ جاں سوز تھی وہ تار کی پیغام بری

ہائے اقبال ترے نام کے تھے ساتھ لکھے
ایسے الفاظ کہ کٹ جائے اگر ہاتھ لکھے

آنکھ اے کاش نہ آتے تجھے وہ حرف نظر
کان بہرا نہ ہوا کیوں کہ نہ سنتا یہ خبر

عقل کھوئی نہ گئی کیوں کہ نہ کرتی باور
دل ہی اے کاش نہ ہوتا تو نہ ہوتا مضطر

ہائے اقبال! اسے نا گو کہ ترے مرنے کو
جی نہیں چاہتا زنہار یقیں کرنے کو

تیرے بچوں کو نہیں حادثۂ غم کی خبر
گو کہ سیلابِ بلا سر سے گیا اُن کے گزر

جب بڑے ہوں گے کڑھائے گی انھیں یادِ پدر
تو ہی بتلا! کہ تسلّی انھیں ہوگی کیونکر

اس مصیبت کی نہیں ہے انھیں پہچان ابھی
پوچھتا پھرتا ہے سب سے تجھے احسان ابھی

---

۱ سیّد اقبال احمد ہمشیر زادہ مصنّف نے بعمر ۲۲ سال ۱۹۰۳ء میں انتقال کیا۔ مصنّف کو اس عزیز سے خاص اُلفت تھی۔ اس مرثیہ کا مسودہ بھی گم ہوگیا یہ چند بیت جو یاد تھے یہاں لکھے گئے۔

تیری کشتی میں کئی ایک مسافر تھے غریب　　حیف پہنچا نہ گیا اُن کو تو ساحل کے قریب
کشتی ٹوٹی ہوئی اور جوش پہ طوفانِ مہیب　　ڈھونڈتے ہیں تجھے گھبرا کے وہ برگشتہ نصیب
آہ منجدھار میں چھوڑا ہے سفینہ تو نے
کئی بدبختوں کا کٹوایا ہے سینہ تو نے

(یہ دو شعر دستیاب نہیں ہوئے)

جو ابھی حلقۂ ماتم کو سمجھتے ہیں برات
اُن کے چہرے پہ جمی گردِ یتیمی ہیہات
سینہ کہتا ہے کہ شعلے مجھے بھڑکانے دو　　آہ کہتی ہے کہ مجھ کو بھی نکل جانے دو
آنکھیں کہتی ہیں کہ آنسو ہمیں برسانے دو　　دل کی خواہش ہے کہ چُپ چاپ ہی غم کھانے دو
صبر کہتا ہے کہ لو میں تو چلا ہاتھوں سے
مُنہ کو آتا ہے کلیجہ مرا ان باتوں سے

(۸۴) انسان[۱]

میں بھی کیا خوب ہوں مجھ پر نہ کھلا راز اپنا　　نہ تو انجام ہے معلوم نہ آغاز اپنا
شاید اِس بزم میں ہے مرتبہ ممتاز اپنا　　لیکن اوروں سے نرالا ہے کچھ انداز اپنا
ہوں تو بے قدر پہ مجموعۂ کل عالم ہوں
میں ہی مسجودِ ملائک ہوں اگر آدم ہوں

---

[۱] صرف دو بند ایک مسودہ میں ملے جو یہاں درج کیے گئے۔ مرتبہ ۸۰ء

ابر و باد و مہ و خورشید مِرے کام میں ہیں
مرغ و ماہی و دد و دام مِرے دام میں ہیں
آب و آتش میری خدمت کے سر انجام میں ہیں
کُل جمادی و نباتی مِرے خدّام میں ہیں
مُجھ میں قدرت نے عجب فضل و شرف رکھّا ہے
میں نے فردوس کے میووں کا مزہ چکھا ہے

(۸۵) محنت کرو

مکڑی نے کیا جالا تانا
کیسا اچھّا! تانا بانا
آخر اِس نے کیوں کر جانا
"اِس سے ملے گا مجھ کو کھانا"
جس نے مکڑی پیدا کی ہے
اُس نے اِتنی عقل بھی دی ہے
روزی کا کیوں تجھ کو غم ہے
مکڑی سے بھی کیا تو کم ہے
جب تک تیرے دم میں دم ہے
ہاتھ میں کاغذ اور قلم ہے
سیکھ لے بابا۔ علم ہُنر تو
محنت کر تو۔ محنت کر تو

(۸۶) نفسِ سرکش

ضعیفوں پہ زور آزمایا تو کیا
ستائے ہوؤں کو ستایا تو کیا
کسی دل جلے کو جلایا تو کیا
فساد اور فتنہ اُٹھایا تو کیا
نہ پکڑا کبھی دل کے اندر کا چور
نہ توڑا کبھی نفسِ سرکش کا زور

(۶) مُثمّن

(۸۷) آثارِ سلف

(مُشعر کیفیتِ قلعۂ اکبر آباد)

یارب! یہ کسی مشعلِ کشتہ کا دھواں ہے یا گلشنِ برباد کی یہ فصلِ خزاں ہے
یا برہمیِ بزم کی فریاد و فغاں ہے یا قافلۂ رفتہ کا پس خیمہ رواں ہے
ہاں دَورِ گزشتہ کی مہابت کا نشاں ہے بانیِ عمارت کا جلال اس سے عیاں ہے
اُڑتا تھا یہاں پرچمِ جم جاہیِ اکبر
بجتا تھا یہاں کوسِ شہنشاہیِ اکبر

باہر سے نظر ڈالئے اس قلعہ پہ یک چند برپا ہے لبِ آبِ جمن صورتِ الوند
گویا کہ ہے اک سورما مضبوط تنو مند یا ہند کا رجپوت ہے یا ترکِ سمرقند
کیا بارۂ سنگین کا پہنا ہے قزاگند رینی کا قزاگند پہ باندھا ہے کمربند
مسدود ہے خندق سے رہِ فتنہ و آشوب
اربابِ تمرّد کے لئے بُرج ہیں سر کوب

تعمیرِ درِ قلعہ بھی البتہ ہے موزوں پُرشوکت و ذی شان ہے اس کا رخِ بیروں
کی ہے شُعرا نے صفتِ طاقِ فریدوں معلوم نہیں اس سے وہ کمتر تھا کہ افزوں
گو ہم سرِ کیواں ہے نہ ہم پلۂ گردوں محراب کی ہیئت سے ٹپکتا ہے یہ مضموں

پیلانِ گراں سلسلہ باہودجِ زرّیں
اِس در سے گزرتے تھے بصد رونق و تزئیں

اکبر سا کبھی مخزنِ تدبیر یہاں تھا　　یا طنطنۂ دورِ جہاں گیر یہاں تھا
یا شاہِ جہاں مرجعِ توقیر یہاں تھا　　یا مجمعِ ذی رُتبہ مشاہیر یہاں تھا
القصّہ کبھی عالمِ تصویر یہاں تھا　　دُنیا سے سوا جلوۂ تقدیر یہاں تھا

بہتا تھا اِسی کاخ میں دولت کا سمندر
تھے جشنِ ملوکانہ اِسی قصر کے اندر

وہ قصرِ معلّٰی کہ جہاں عام تھا دربار　　آئینہ نمط صاف ہیں جس کے در و دیوار
اور سقفِ زر اندود ہے مانندِ چمن زار　　اور فرش ہے مرمر کا مگر چشمۂ انوار
اب بانگِ نقیب اُس میں نہ چاؤش کی للکار　　سرہنگِ کمر بستہ نہ وہ مجمعِ حضّار

کہتا ہے کبھی مرکزِ اقبال تھا میں بھی
ہاں! قبلہ گہِ عظمت و اجلال تھا میں بھی

جب تک کہ مشیّت کو مرا اوج تھا منظور　　نافذ تھا زمانہ میں مری جاہ کا منشور
شاہانِ معاصر کا معیّن تھا یہ دستور　　کرتے تھے سفیرانِ ذوی القدر کو مامور
تا میری زیارت سے کریں چشم کو پُر نور　　آوازہ میری شان کا پہونچا تھا بہت دور

اکنافِ جہاں میں تھا مرا دبدبہ طاری
تسلیم کو جھکتے تھے یہاں ہفت ہزاری

وہ چتر وہ دیہیم وہ سامان کہاں ہیں — وہ شاہ وہ نوئین۔ وہ خاقان کہاں ہیں
وہ بخشی و دستور۔ وہ دیوان کہاں ہیں — خدّامِ ادب اور وہ دربان کہاں ہیں
وہ دولتِ مغلیہ کے ارکان کہاں ہیں — فیضی و ابوالفضل سے اعیان کہاں ہیں
سُنسان ہے وہ شاہ نشیں آج صد افسوس
ہوتے تھے جہاں خان و خوانین زمیں بوس

وہ بارگہہِ خاص کی پاکیزہ عمارت — تاباں تھے جہاں نیّرِ شاہی و وزارت
بڑھتی تھی جہاں نظم و سیاست کی مہارت — آتی تھی جہاں فتحِ ممالک کی بشارت
جوں شحنۂ معزول پڑی ہے وہ اکارت — سیّاح کیا کرتے ہیں اب اُس کی زیارت
کہتا ہے سخن فہم سے یوں کتبہ دروں کا
تھا مخزنِ اسرار یہی تاج وروں کا

اورنگِ سیہ رنگ جو قائم ہے لبِ بام — بوسہ جسے دیتا تھا ہر اِک زُبدۂ عظام
اشعار میں ثبت اُس پہ جہانگیر کا ہے نام — شاعر کا قلم اُس کی بقا لکھتا ہے مادام
پر صاف نظر آتا ہے کچھ اور ہی انجام — سالم نہیں چھوڑے گی اسے گردشِ ایام
فرسودگیٔ دہر نے شق اب تو کیا ہے
آئندہ کی نسلوں کو سبق خوب دیا ہے

ہاں کس لئے خاموش ہے او تختِ جگر ریش — کس غم میں سیہ پوش ہے؟ کیا سوگ ہے درپیش
کملی ہے ترے دوش پہ کیوں صورتِ درویش — جوگی ہے ترا پنتھ۔ کہ صوفی ہے ترا کیش

بولا کہ زمانہ نے دیا نوشِ کبھی نیش صدیاں مجھے گزری ہیں یہاں تین کم و بیش
صدقے کبھی مجھ پر گہر و لعل ہوئے تھے
شاہانِ معظم کے قدم میں نے چھوئے تھے

وہ رنگ محل بُرجِ مُثمّن کا وہ انداز صنعت میں ہے بے مثل تو رفعت میں سرافراز
یاں مطربِ خوش لہجہ کی تھی گونجتی آواز گہ ہند کی دُھرپت تھی کبھی نغمۂ شیراز
اب کون ہے بتلائے جو کیفیتِ آغاز زنہار کوئی جاہ و حشم پر نہ کرے ناز
جن تاروں کے پرتو سے تھا یہ بُرج منوّر
اب اُن کا مقابر میں تہِ خاک ہے بستر

اُس عہد کا باقی کوئی ساماں ہے نہ اسباب فوّارے شکستہ ہیں تو سب حوض ہیں بے آب
وہ جامِ بلوریں ہیں نہ وہ گوہرِ نایاب وہ چلمنِ زرتار نہ وہ بسترِ کمخواب
ہنگامہ جو گزرا ہے سو افسانہ تھا یا خواب یہ معرضِ خُدّام تھا وہ موقفِ حجّاب
وہ بزم نہ وہ دور نہ وہ جام نہ ساقی
ہاں طاق و رواق۔ اور در و بام ہیں باقی

مستورِ سراپردۂ عصمت میں تھے جو گُل سودودۂ تُرک اور مغل ہی سے نہ تھے کُل
کچھ خیریٔ فرغانہ تھے۔ کچھ لالۂ کابل پھر مولسری ہند کی اُن میں گئی مِل جُل
تعمیر کے انداز کو دیکھو بہ تامّل تا تاری و ہندی ہے بہم شان و تجمّل
سیّاحِ جہاں دیدہ کے نزدیک یہ تعمیر

اکبر کے خیالاتِ مرکّب کی ہے تصویر

درشن کے جھروکے کی پڑی تھی یہیں بنیاد
ہوتی تھی تُلا دان میں کیا کیا دہش و داد

وہ عدل کی زنجیر ہوئی تھی یہیں ایجاد
جو سمعِ شہنشاہ میں پہنچاتی تھی فریاد

وہ نور جہاں اور جہاں گیر کی اُفتاد
اِس کاخِ ہمایوں کو بہ تفصیل ہے سب یاد

ہر چند کہ بے کار یہ تعمیر پڑی ہے
قدر اِس کی مؤرّخ کی نگاہوں میں بڑی ہے

اب دیکھئے وہ مسجد و حمّامِ زنانہ
وہ نہر۔ وہ حوض اور وہ پانی کا خزانہ

صنعت میں ہر اک چیز ہے یکتا و یگانہ
ہے طرزِ عمارت سے عیاں شانِ شہانہ

کیا ہو گئے وہ لوگ کہاں ہے وہ زمانہ؟
ہر سنگ کے لب پر ہے غم اندوز ترانہ

چغتائیہ گلزار کی یہ فصلِ خزاں ہے
ممتاز محل ہے نہ یہاں نور جہاں ہے

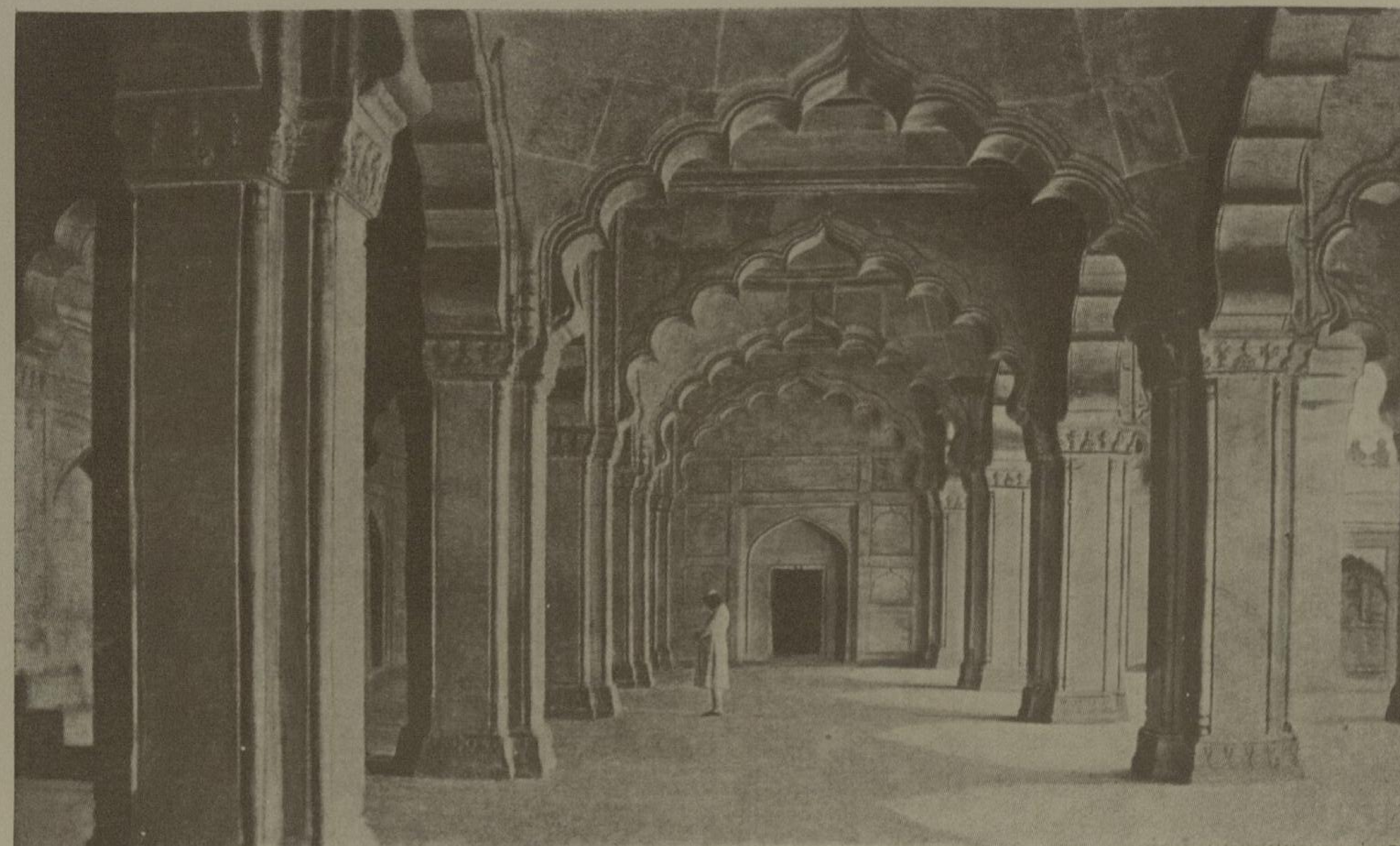
وہ قصر جہاں جودھپوری رہتی تھی بائی
تھی دولت و ثروت نے جہاں دھوم مچائی

دیکھا اُسے جا کر تو بُری گت نظر آئی
صحنوں میں جمی گھاس تو دیواروں پہ کائی

گویا درو دیوار یہ دیتے ہیں دہائی
ممکن نہیں طوفانِ حوادث سے رہائی

جس گھر میں تھے نسرین و سمن یا گل و لالہ
اب نسلِ ابابیل میں ہے اُس کا قبالہ

وہ مسجدِ زیبا کہ ہے اِس نرم کی دلہن
خوبی میں یگانہ ہے ولے سادہ و پُرفن



موتی مسجد۔ قلعہ آگرہ۔

مقابل صفحہ ۱۳۸ کلیات

محراب و در و بام ہیں سب نور کا مسکن
موتی سے ہیں دالان تو ہے دود سا آنگن
کافور کا تودہ ہے کہ الماس کا معدن
یا فجر کا مطلع ہے۔ کہ خود روز ہے روشن

بلور کا ہے قاعدہ یا نور کا ہے راس
باطل سی ہوئی جاتی ہے یاں قوّتِ احساس

ہاتھوں نے ہنر مند کے اک سحر کیا ہے
سانچہ میں عمارت کو مگر ڈھال دیا ہے
یا تارِ نظر سے کہیں پتھّر کو سیا ہے
مر مر ہیں مہ و مہر کا سا نور و ضیا ہے
گو شمع نہ فانوس نہ بتّی نہ دیا ہے
ہاں! چشمۂ خورشید سے آب اس نے پیا ہے

چلیئے جو یہاں سے تو نظر کہتی ہے فی الفور
نظّارہ کی دو مجھ کو اجازت کوئی دم اور

مسجد نے اشارہ کیا پتھّر کی زبانی
اس قلعہ میں ہوں شاہجہاں کی میں نشانی
کچھ شوکتِ ماضی کی کہی اس نے کہانی
کچھ حالتِ موجودہ بایں سحر بیانی
ان حجروں میں ہے شمع نہ اس حوض میں پانی
فوّاروں کے دل میں بھی ہے اک دردِ نہانی

تسبیح نہ تہلیل نہ تکبیر و اذاں ہے
بس گوشۂ تنہائی ہے اور قفلِ گراں ہے

جمگھٹ تھا کبھی یاں وزرا و اُمرا کا
مجمع تھا کبھی یاں صُلحا و عُلما کا
چرچا تھا شب و روز یہاں ذکرِ خدا کا
ہوتا تھا ادا خطبہ سدا حمد و ثنا کا
اک قافلہ ٹھیرا تھا یہاں عزّو علا کا
جو کچھ تھا۔ گذر جانے میں جھونکا تھا ہوا کا

ہیں اب تو نمازی میرے باقی یہی دو تین
یا دھوپ ہے یا چاندنی یا سایۂ مسکیں

وہ دَور ہے باقی نہ وہ ایّام و لیالی
جو واقعہ حِسّی تھا سو ہے آج خیالی
ہر کوشک و ایوان ہر اِک منزلِ عالی
عبرت سے ہے پُر اور مکینوں سے ہے خالی
آقا نہ خداوند۔ اہالی نہ موالی
جز ذاتِ خدا کوئی نہ وارث ہے نہ والی

یہ جُملہ محلّات جو سنسان پڑے ہیں
پتّھر کا کلیجہ کئے حیران کھڑے ہیں

جب کُند ہوئی دولتِ مُغلیّہ کی تلوار
اور لوٹ لیا جاٹ نے ایوانِ طلا کار
تب لیک جو تھا لشکرِ انگلش کا سپہدار
افواجِ مخالف سے ہوا بر سرِ پیکار
یہ بارہ و برج اور یہ ایوان یہ دیوار
کچھ ٹوٹ گئے ضرب سے گولوں کی نہ چارا

ہے گردشِ ایّام کے حملوں کی کسے تاب
پھر قلعۂ اکبر ہی میں تھا کیا پرِ سُرخاب

آخر کو لٹیروں کی شکستہ ہوئی قوّت
اونچا ہوا سرکار کے اقبال کا رایت
لہرانے لگا پھر عَلَمِ امن و حفاظت
آثارِ قدیمہ کی لگی ہونے مرمّت
یہ بات نہ ہوتی تو پہنچتی وہی نوبت
دیوار گری آج۔ تو کل بیٹھ گئی چھت

حُکّامِ زماں کی جو نہ ہوتی نگرانی
رہ سکتی نہ محفوظ یہ مغلیہ نشانی

اربابِ خرد چشمِ بصیرت سے کریں غور
اکبر کی بنا اس سے بھی پائندہ ہے اک اور
سردی کی جفا جس پہ نہ گرمی کا چلے جور
ہر چند گزر جائیں بہت قرن بہت دور
برسوں یونہیں پھرتے رہیں برجِ حمل و ثور
اُس میں نہ خلل آئے کسی نوع کسی طور

انجینیروں کی بھی مرمّت سے بری ہے
وہ حصنِ حصیں کیا ہے؟ فقط ناموری ہے

او اکبرِ ذیجاہ! تیری عزّت و تمکیں
محتاجِ مرمّت ہے نہ مستلزمِ تزئین
کندہ دلوں میں تری اُلفت کی فرامیں
ہے تیری مُحبّت کی بنا اِک ذرِ روئیں
گو حملۂ بے سود کرے بھی کوئی کم بیں
زائل نہیں ہونے کی ترے عہد کی تحسیں

پُشتوں سے رعایا میں یہ آئینِ وراثت
قائم چلی آتی ہے تیرے نام کی عظمت

بکرم کی سبھا کو تیری صحبت نے بھلایا
اور بھوج کا دورہ تری شُہرت نے بھلایا
ارجن کو تری جرأت و ہمّت نے بھلایا
کسریٰ کو ترے دورِ عدالت نے بھلایا
اسکندر و جم کو تری شوکت نے بھلایا
پچھلوں کو غرض تیری عنایت نے بھلایا

آتے ہیں زیارت کو تو اب تک ہے یہ معمول
زائر تری تربت پہ چڑھا جاتے ہیں دو پھول

ہو کُہنہ و فرسودہ ترا قلعہ تو کیا غم
شہرت ہے ترے نام کی سو قلعوں سے محکم
بھرتا ہے ہر اِک فرقہ محبّت کا تری دم
لکھتے ہیں مورّخ بھی تجھے اکبرِ اعظم

رُتبہ ہے ترا ہند کے شاہوں میں مُسلّم
یہ فخر ترے واسطے زنہار نہیں کم
گو خاک میں مل جائے ترے عہد کی تعمیر
ہے کتبۂ عزّت ترا ہر سینہ میں تحریر

ہاں! قوم کے نوعمر جوانو اِدھر آؤ
ہے دیدۂ بینا تو اُسے کام میں لاؤ
آثارِ صنادید کی عینک کو لگاؤ
عبرت کی نگاہوں کو پس و پیش پھراؤ
راہِ طلب و شوق میں اک شمع جلاؤ
گنجینۂ اعزاز کو پانا ہے تو پاؤ
یہ نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ
دیکھو! تمھیں دکھلاتے ہیں آیندہ کا رستہ

اَسلاف نے ملکوں پہ اگر کی تھی چڑھائی
یا کاخِ حکومت کی تھی بُنیاد اُٹھائی
یا طرح کئے کوشکِ سیمین و طلائی
یا بحر میں کشتیِ تجارت تھی چلائی
یا کشورِ تہذیب میں کی قلعہ کشائی
کس برتے پہ یہ کام تھے آخر مرے بھائی
جب بحرِ مصائب کو شناکر کے ہوتے پار
تب دہرِ مخالف بھی ہوا غاشیہ بردار

عزّت کی ملی تھی اُنھیں جاگیرِ دوامی
دولت کے طرفدار تھے اور دین کے حامی
خصلت میں خوشامد تھی نہ عادت میں غلامی
رسموں میں خرابی تھی نہ اطوار میں خامی
گر فہم و فراست کی مجالس میں تھے نامی
تدبیرِ ممالک میں تھے وہ صدرِ گرامی
گر فتح و ظفر میں تھے سکندر سے زیادہ

تھے دانش و حکمت میں اُرسطو کے بھی دادہ

کیا کیا طلبِ علم میں کرتے تھے جگر خوں
لیلیٰ تھا اگر علم تو وہ لوگ تھے مجنوں

کچھ بوعلیٰ سینا ہی نہ تھا رشکِ فلاطوں
بہتوں نے کُدایا یونہیں تحقیق کا گلگوں

مدّت کی کہانی ہے اگر سیرتِ ماموں
تاریخ میں دیکھو سببِ مرگِ ہمایوں

اکبر بھی تھا آخر اسی تہ جُرعہ کا مخمور
تھا فیضیٔ علّامہ اِسی کام پہ مامور

یہ کہنہ عمارات کہ ہیں وقفِ تباہی
اَسلاف کے اوصاف پہ دیتی ہیں گواہی

صرف اہل و نسب ہی پہ نہ تھے اپنے مباہی
مکتب میں تھے اُستادِ ریاضی و الٰہی

میدانِ مساعی میں تھے اک مردِ سپاہی
زیبا تھا انھیں چترِ جہاں بانی و شاہی

کنیاتے تھے محنت سے نہ آلام سے تھکتے
کوشش کی گھٹا میں تھے وہ بجلی سے کڑکتے

وہ عیش کے مملوک تھے نے بندۂ راحت
گلگشتِ چمن زار تھی گویا انھیں عزّت

برداشت جفا کرتے تھے سہتے تھے صعوبت
اوروں کے بھروسے پہ نہ کرتے تھے معیشت

دُنیا کے کسی کام میں ہیٹی نہ تھی ہمّت
بے غیرتی زنہار نہ تھی اُن کی جبلّت

ہمّت میں تھے شاہین تو جرأت میں تھے شہباز
عزّت کی بلندی پہ کیا کرتے تھے پرواز

وہ صولت و سطوت میں تھے جوں شیرِ نیستاں
عزّت کے لئے جان کیا کرتے تھے قرباں

تھا انجمنِ عیش سے خوشتر انھیں میداں محنت کے تھے بودے نہ مشقّت سے گُریزاں
دشوار تھی بے حرمتی اور ننگ مگر ہاں! آسان تھی نیزہ کی انی تیر کا پیکاں
خیرات کے ٹکڑے پہ نہ گرتے تھے وہ حاشا
تھا نعلِ بہا اُن کو یہ دولت کا تماشا

وہ کعبۂ مقصود تھے یا قبلۂ حاجات کس مُنہ سے بزرگوں پہ کریں فخر و مباہات
سر اپنے گریباں میں فرا ڈالئے ہیہات اوصافِ اضافی سے نہیں کچھ شرفِ ذات
تلوار میں جب کوئی اصالت کی نہ ہو بات گاہک تو نہ پوچھیگا۔ یہ کس کان کی ہے دھات
بندوق دمِ صید گر اچھّی نہ چلی ہو
مردود ہے گو لندن و پیرس میں ڈھلی ہو

دل اپنی ستایش سے نہ بہلائیے حضرت اِس راہ میں دھوکا نہ کہیں کھائیے حضرت
شیخی کو بہت کام نہ فرمائیے حضرت شعلہ کو تعلّی کے نہ بھڑکائیے حضرت
آبا کی بزرگی پہ نہ اترائیے حضرت یہ گو ہے یہ میدان۔ اِدھر آئیے حضرت
اب بھی تو وہی خیر سے نسلِ شُرفا ہے
آخر سبب اِس ننگ سر انجام کا کیا ہے

کیوں قوم کی حالت میں تنزّل کا پڑا ڈھنگ کیوں انجمنِ عیش پرستی کا جما رنگ
کیوں تیغِ شرافت کو دنائت کا لگا زنگ مغلوبِ سفاہت ہوئے کیوں دانش و فرہنگ
روباہ ہے کس لئے شیرانِ صفِ جنگ کیوں بارگیِ عزم ہوا دونِ خرِ لنگ

کیوں ٹوٹ گئے بازِ عمل کے پر و بازو
کیوں ذروۂ عزّت پہ لگا بولنے اُلّو

جڑ پہلے زمانہ میں جمی جیسے شجر کی — لذّت ہمیں چکھنی ہے ضرور اُس کے ثمر کی
بے شک ہے یہ پاداش اُسی شور کے شر کی — ہاں مستحق اولاد ہے میراثِ پدر کی
تفتیش کرو دوستو! اخبار و سیر کی — فہرست مرتّب کرو ہر عیب و ہنر کی

دو ڈیڑھ صدی پہلے سے جو اپنا ڈھچر تھا
انصاف سے دیکھو اُسے کیا پوچ و لچر تھا

جو راہ نمائی کو چلے آپ تھے گمراہ — حالات سے واقف نہ مقامات سے آگاہ
شیروں کی جگہہ جمع ہوا گلۂ روباہ — ہر کرمکِ شب تاب بنا مدّعیِ ماہ
ہر شخص کو تھی خود غرضی سے طلبِ جاہ — ویسے ہی امیر الامرا جیسے شہنشاہ

رسمِ حسد و بغض و عداوت ہوئی تازہ
آخر کو اُٹھا دولت و عزّت کا جنازہ

وہ غور کے غزنیں کے دلیرانِ ظفر مند — وہ شاہ سوارانِ بخارا و سمرقند
جو ہند کے خطّے میں ہوئے خاک کے پیوند — جی اُٹھتے دوبارہ اگر اُن میں سے تنے چند
ہاں وہلۂ اوّل میں تو ہوتے ہی وہ خرسند — پھولے نہ سماتے کہ ہمارے ہیں یہ فرزند

پر دیکھتے جب اِن کے بُرے فعل بُرے قول
جا بیٹھتے قبروں ہی میں پڑھتے ہوئے لاحول

کیا حال تھا حضراتِ ملوک اور اُمرا کا | انبوہ تھا بیہودہ مشاغل کی بلا کا
یا فوج کنیزوں کی تھی اِک قہر خدا کا | یا بولتا طوطی تھا کسی خواجہ سرا کا
یا شور خوشامد کا تھا یا مدح وثنا کا | تھا غول گویوں کا۔ تو جمگھٹ شُعرا کا

سِفلے تھے مشیر اور مصاحب تھے چھچھورے
وہ عقل کے دشمن تو حضور اُن سے بھی کورے

کاسد ہوا بازار ہر اِک طرز عمل کا[1] | عالم نظر آتا ہے بتر آج سے کل کا
مفلس ہیں تو پیشہ ہے فریب اور دغل کا | اندیشہ نہیں کچھ انھیں ایمان کے خلل کا
مدّت سے گیا ڈھانچ بگڑ اہلِ دول کا | چکّھا ہے مزہ خوب ہی اِسراف کے پھل کا

اب کوئی اگر دولتِ قومی کی کرے جانچ
ٹٹ پونجیے البتہ نکل آئیں گے دس پانچ

اب نام کو ہم میں جو گروہِ شرفا ہے | سو حالتِ افلاس میں جینے سے خفا ہے
یا شامتِ اعمال سے پامالِ جفا ہے | کچھ حسنِ معیشت نہ کہیں صدق وصفا ہے
کچھ دولتِ دُنیا ہے تو بے مہر و وفا ہے | کچھ دین کا چرچا ہے تو وہ رو بہ قفا ہے

چھائے گی تنزّل کی ابھی ہم پہ گھٹا اور
ہم اور ہوا ہیں ہیں۔ زمانہ کی ہوا اور

جو لوگ یہ سمجھے کہ ہیں صرف اپنے لئے ہم | اغراض و مقاصد ہیں فقط اپنے مقدّم

---

[1] پہلے ایڈیشنس میں یہ پانچ بند غلطی سے شائع نہیں ہوئے تھے۔ ۱۲

یاروں کی اُنھیں فکر نہ غیروں کا اُنھیں غم
ہمدردِ عشیرت ہیں نہ ہمسایوں کے ہمدم
وہ فہم و فراست میں بہائم سے بھی ہیں کم
یا سنگ ہیں یا خشت ہیں جائیں یہ جہنّم

اِن مُردہ دلوں سے تو کرو قطعِ نظر بس
لے ڈوبیں گے تم کو بھی چلے اِن کا اگر بس

جو قوم کے اوصاف تھے۔ سو اُن میں سے اکثر
آپس کی کشاکش میں گلا گھٹ کے گئے مر
غمخواری و احسان و مروّت کا لُٹا گھر
انصاف کا اور دین و دیانت کا کٹا سر
نیکوں سے ہوئے بد۔ تو بدوں سے ہوئے بدتر
کاشانۂ دولت کی جگہ رہ گئے چھپّر

جو کام تھے یاروں کے سو گردن زدنی تھے
خود اپنے لئے مستعدِ بیخ کنی تھے

جرأت تھی سو آپس کی عداوت میں ہوئی صرف
قوّت تھی۔ سو رشک اور رقابت میں ہوئی صرف
شوکت تھی سو خود بینی و نخوت میں ہوئی صرف
فرصت تھی۔ سو بیکاری و غفلت میں ہوئی صرف
عزّت تھی۔ سو افلاس و فلاکت میں ہوئی صرف
دولت تھی سو عیّاشی و عشرت میں ہوئی صرف

اُس وقت ہمیں عاقبت الامر ہوا ہوش
جب رہ گئے ہم لوگ بیک بینی و دو گوش

مدّت سے زمانہ میں ترقّی کا پھنکا صور
عالم میں بجا اور ہی تحقیق کا طنبور
آفاق میں پھیلا نئی ایجاد کا منشور
خورشید برآمد ہوا بھاگی شبِ دیجور
ہم دبکے ڈھئی کلبۂ احزاں میں مستور
سوتے رہے غفلت میں پڑے بے خود و مخمور

ناوقت کُھلی آنکھ تو حیراں ہیں اب ہم
ہم کون ہیں کیا چیز ہیں اے وائے عجب ہم

ہم چاہتے ہیں عیش بھی اور ناموری بھی
دولت بھی ہمیں چاہیئے اور بے ہنری بھی
اعزاز بھی مطلوب ہے بیہودہ سری بھی
آوارگی منظور ہے اور راہبری بھی
مقصود رفو بھی ہے مگر جامہ دری بھی
گر پستیِ ہمّت ہے تو عالی نظری بھی
یہ بات تو ہوگی نہ ہوئی ہے کبھی آگے
پھرتے ہیں محالات کے پیچھے یونہیں بھاگے

خیر اب کوئی تدبیر بھی ہے یا کہ نہیں ہے
کفّارۂ تقصیر بھی ہے یا کہ نہیں ہے
کچھ چارۂ تاخیر بھی ہے یا کہ نہیں ہے
اِس حال کو تغئیر بھی ہے یا کہ نہیں ہے
فریاد میں تاثیر بھی ہے یا کہ نہیں ہے
اِس خواب کی تعبیر بھی ہے یا کہ نہیں ہے
کچھ بھی نہیں دشوار اگر ٹھان لو جی میں
گھنٹوں میں ہو وہ کام جو ہوتا ہو صدی میں

بے کوشش و بے جہد ثمر کس کو ملا ہے
بے غوطہ زنی گنجِ گہر کس کو ملا ہے
بے خون پیئے لقمۂ تر کس کو ملا ہے
بے جور کشی تاجِ ظفر کس کو ملا ہے
بے خاک کے چھانے ہوئے زر کس کو ملا ہے
بے کاوشِ جاں علم و ہنر کس کو ملا ہے
جو رتبۂ والا کے سزاوار ہوئے ہیں
وہ پہلے مصیبت کے طلبگار ہوئے ہیں

کوشش ہی نے اجرام سماوی کو ہے تولا | کوشش ہی نے طبقاتِ زمیں کو ہے ٹٹولا
کوشش ہی نے رستہ نئی دُنیا کا ہے کھولا | کوشش ہی نے گوہر ہے تہ بحر سے رولا
کوشش ہی کا طوطی ہے سدا دہر میں بولا | کوشش ہے غرض طرفہ طلسمات کا گولا

قدرت نے فتوحات کی رکھی ہے یہی راہ
سعی اپنی طرف سے ہو تو اتمام من اللہ

ہیں آج کل اسکول کے کمرے صفِ ہیجا | سرمایۂ علم و ہنر و فضل ہے یغما
ہر قوم کا پُر مالِ غنیمت سے ہے کیسا | لیکن تمھیں کچھ سود و زیاں کی نہیں پروا
کیوں قوم کے اعزاز کی لٹیا کو ڈبویا | کیوں کسبِ کمالات میں تم ہوگئے پسپا

اوروں سے تو بودے نہ تھے مانا کہ تم ایسے
میدان سے کیوں بھاگ گئے نوک دُم ایسے

ہر چند کہ دعویٰ تھا تمھیں سیف و قلم کا | تھا فخر تمھیں نسلِ عرب اور عجم کا
لیکن نہ رہا طرز وہ عادات و شیم کا | سیکھا نہ و تیرہ کوئی اربابِ ہمم کا
ناچار ہر اک قوم نے تم کو لیا دھمکا | بے سعی کسی کا بھی ستارہ نہیں چمکا

تم راہِ طلب میں ہو اگر اب بھی شتاباں
ہو کوکبِ عزّت اُفقِ دھر پہ تاباں

ابتک بھی سکت ہے وہی ہڈّی میں تمھاری | ابتک بھی وہی خون ہے شرائین میں جاری
افغانی و تُرکی و حجازی و تتاری | ایرانی و تورانی و بلخی و بخاری

اے دوستو! ہمّت ہی مگر تم نے تو ہاری
اِس واسطے بس کر کری شیخی ہوئی ساری
مدِّ علما دفترِ قومی میں ہے خالی
فارابی و طوسی ہیں نہ رازی و غزالی

تلواروں کا سایہ تھا جنھیں سایۂ طوبیٰ!
جولاں گہِ ہمّت تھی جنھیں وسعتِ دنیا
تھا ریگِ رواں جن کے لئے بسترِ دیبا
اور خیمۂ اطلس تھا یہی قبّۂ خضرا
ہے تم کو اگر اُن کے خلف ہونے کا دعوےٰ
دکھلاؤ حریفوں کے مقابل ہنر اپنا
ترتیب سے جم جاؤ قرینہ بقرینہ
میدانِ ترقی میں لڑو سینہ بہ سینہ

یہ جنگ نہیں توپ کی یا تیغ و تبر کی
اِس جنگ میں کچھ جان کی جوکھوں ہے نہ زر کی
یہ جنگ ہے اخلاق کی اور علم و ہنر کی
یہ جنگ ہے تحصیلِ عمل اور نظر کی
اِس جنگ میں آسودگی ہے نوعِ بشر کی
آزادی ہے ملکوں کی تو آبادی ہے گھر کی
یہ جنگ نہیں وضعِ مُروّت کے منافی
اِس جنگ سے مافات کی ممکن ہے تلافی

ہے جنگ سے مقصود بلندیٔ ارادہ
وہ ہم سے زیادہ ہوں تو ہم اُن سے زیادہ
رستہ ہو تعصّب کا نہ کینہ کا ہو جادہ
نقشِ حسد و بغض سے افعال ہوں سادہ
دل صاف رہے اور طبیعت بھی کشادہ
اِس طور سے حاصل کرو عزّت کا وسادہ
گر جوہرِ ہمّت ہے تو سبقت میں کرو کد

نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد

باقی ہے اگر جوشِ حمیّت کا حرارہ
تو معرکۂ علم میں ہو جاؤ صف آرا

جاں ڈال دو ناموس کے قالب میں دوبارا
پیچھے نہ ہٹاؤ قدمِ عزمِ خدارا

ذلّت نہیں ہوتی کبھی مردوں کو گوارا
چمکو فلکِ جاہ پہ تم بن کے ستارا

آبا نے کیا فتح جو بنگال و دکن کو
تسخیر کرو تم عمل و علم کو فن کو

ادنیٰ سا بھی ہر کام ہے اب علم کا محکوم
بے علم ہے جو قوم سو حال اُس کا ہے معلوم

دولت سے ہے بیگانہ تو عزّت سے ہے محروم
اقوال کمینہ ہیں تو افعال ہیں مذموم

اربابِ ہنر کی کُرۂ ارض پہ ہے دھوم
حلقے بگوش اُن کے ہیں وہ سب کے ہیں مخدوم

دُنیا میں اُسی قوم کا گلزار ہے پھولا
جو رکھتی ہے دانش میں ہنر میں یدِ طولا

تم جانتے ہو خوب کہ انسان ہے فانی
فانی ہے بلاشبہ مگر اُس کی نشانی

کیا اُس کی نشانی ہے سنو میری زبانی
امثال میں مذکور ہے پچھلوں کی کہانی

خوش بخت تھے وہ کر گئے جو فیض رسانی
بدبخت تھے مغلوبِ صفاتِ حیوانی

گر تم بھی یونہیں اُٹھ گئے حیوان سے ہو کر
آیندہ کی نسلیں تمھیں کیا روئیں گی کہہ کر

پھل خدمتِ قومی ہے اگر نخل ہیں اقوال
تن خدمتِ قومی ہے اگر جامہ ہیں افعال

جاں خدمتِ قومی ہے اگر جسم میں اعمال
ملحوظ رکھو خدمتِ قومی کو بہر حال
پُر نفع یہ ہی شغل ہے من جملۂ اشغال
جو زندۂ جاوید ہیں اُن کی ہے یہی چال
پُر الفتِ قومی سے ہے جن کا رگ و ریشہ
مرنے کو تو مرتے ہیں۔ پہ جیتے ہیں ہمیشہ

قوّت ہے اگر دل میں دماغوں میں ہے طاقت
پہنچاؤ بہم حسنِ بیاں اور طلاقت
اصلاحِ معائب میں کرو صرف لیاقت
دکھلاؤ مریضوں کے مداوا میں حذاقت
رکھو نہ غریبوں پہ روا طعنِ حماقت
قومی ضُعفا کی نہ کرو ترک رفاقت
کیا دولتِ ہستی ہے پئے نفس پرستی
آباد کرو قوم کی اُجڑی ہوئی بستی

ہے قوم اگر باغ تو تم اُس کے شجر ہو
ہے قوم اگر نخل تو تم اُس کے ثمر ہو
ہے قوم اگر آنکھ تو تم نورِ بصر ہو
ہے قوم اگر چرخ تو تم شمس و قمر ہو
ہے قوم اگر کان تو تم لعل و گہر ہو
نظّارگی ہے قوم۔ تو تم مدِّ نظر ہو
موسیٰ بنو اور قوم کو ذلّت سے بچاؤ
گوسالۂ غفلت کی پرستش کو چھڑاؤ

او باغِ خزاں دیدہ کے نوخیز نہالو!
او ساحتِ ہستی کے نئے دوڑنے والو!
مضبوط کرو دل کو طبیعت کو سنبھالو
کچھ دور نہیں منزلِ مقصود کو جالو
ہاں! مدِّ مقابل بنو ہتھیار نہ ڈالو
میدانِ ترقّی کی زمیں سر پہ اُٹھالو

زنہار گوارا نہ کرو ننگِ ہزیمت
موقع ہے ابھی گرم کرو رخشِ عزیمت

غیرت ہو تو گر کر بھی سنبھلنا نہیں مشکل
جرأت ہو تو نرغہ سے نکلنا نہیں مشکل
ہو صبر تو آفات کا ٹلنا نہیں مشکل
ہو آنچ تو پتّھر کا پگھلنا نہیں مشکل
ہمّت ہو تو حالت کا بدلنا نہیں مشکل
انجن ہو تو گاڑی کا بھی چلنا نہیں مشکل

گرمی سے کرو پہلے بخارات مہیّا
پیدا حرکت ہو تو لگے گھومنے پہیّا

ہمّت ہی حرارت ہے وہی ہے حرکت بھی
ہمّت ہی سے ہر قوم نے پائی ہے ترقّی
گر چیونٹی تیمور کی ہمّت نہ بندھاتی
ہتھیار بھی بے کار تھے اور فوج نکمّی
ہمّت ہے سر انجامِ مہمّات کی کُنجی
ہمّت ہی حقیقت میں ہے توفیقِ الٰہی

ہمّت ہی بنا دیتی ہے مفلس کو تونگر
ہمّت کے سفینہ کا اُٹھا دیجئے لنگر

ہمّت ہے اگر تم میں تو میدان لیا مار
ڈٹ جاؤ کمر باندھ کے ہُشیار! خبردار!
اوروں ہی کے گنڈے پہ نہ رہنا کبھی زنہار
ہونے نہ دو اعزاز کے جھنڈے کو نگونسار
لوہا تھا میں اب تم بھی کو ٹل چین کی تلوار
اس معرکۂ سخت میں مردانہ کرو وار

ہاں قوّتِ بازو سے بلا شرکتِ غیرے
آگے کو بڑھو کھول دو نصرت کے پھریرے

قسمت کی برائی ہے نہ تقدیر کا ہے پھیر — خود اپنے ہی کرتوت سے برپا ہے یہ اندھیر
تحصیلِ فضائل میں جوانو! نہ کرو دیر — فرصت کو اگر اور مگر میں نہ کرو تیر
بزدل نہ بنو حق نے بنایا ہے تمھیں شیر — کہسار بھی ہو تو اُسے کر دو زبر و زیر
یلغار کرو علم کے میداں میں عزیزو
آخر تو ہو تم قوم مسلماں میں عزیزو

جس[1] بستی میں دیکھو کہ نحوست ہے برستی — غالب ہے کہ ہوگی وہ اِسی قوم کی بستی
گرتی چلی جاتی ہے ابھی جانبِ پستی — چلتی ہے فضولی کی سدا تیغ دو دستی
لے دے کے یہی جنس ہے اِس دور میں سستی — فاقہ پہ ہے فاقہ مگر اب تک وہی مستی
مل بیٹھ کے اندیشۂ انجام نہ کرنا
روٹی ملے جس کام سے وہ کام نہ کرنا

خیلِ عُلَما کی بھی حمیّت ہوئی زائل — تبدیل رذائل سے ہوئے جملہ فضائل
مرتے ہیں مشیخت پہ تفاخر پہ ہیں مائل — چھپتے ہیں فریقین سے پُر زہر رسائل
لاکھوں ہیں پڑے خنجرِ تکفیر کے گھائل — باعث ہیں جدل کے یہی فقہیہ مسائل
برپا ہے شب و روز یہاں چپقلش ایسی
عالِم ہے لقب اور بہم کشمکش ایسی

---

[1] یہ دو بند بھی منجملہ اُن پانچ بندوں کے ہیں جو ابتک آثارِ سلف کے کسی اڈیشن میں شائع نہیں ہوئے تھے۔ ۱۲

(۷) ترجیع بند

(۸۸) ہفت درودِ محمود

خلیلِ حق کی تھی جو اشارت ۱ اور ابنِ مریم کی جو بشارت
ظہورِ احمد سے تھی عبارت سمجھ گئے صاحبِ بصارت
کہ اب گری کفر کی عمارت گھٹے گی فارس کی اب حرارت
ہٹے گی روما کی اب شرارت لُٹے گی اب مصر کی اِمارت
خزانہ ہرقل کا ہوگا غارت بڑھے گا تقویٰ بھی اور طہارت
ہے باغِ اسلام کو نضارت نیا ہے سلطاں نئی وزارت
صلوٰۃ اُس پر سلام اُس پر اور اُس کے سب آلِ باصفا پر
اور اُس کے اصحابِ باوفا پر اور اُس کے احبابِ اتقیا پر

وہ اوجِ پیغمبری کا تارا ۲ ہوا ہے مکّہ میں جلوہ آرا
کرے گا جو ماہ کو دو پارا ہے جس کا قوسین تک گزارا
وہ اُمّتوں کے لئے سہارا وہ جس نے اخلاق کو سنوارا
کرے جو صورت کوئی نظارا مہابت اُس پہ ہو آشکارا
ہے زلزلہ میں جہان سارا محلِّ کسریٰ و ملکِ دارا
نہیں اطاعت سے اُس کی چارا یہود ہو یا کوئی نصاریٰ

صلوٰۃ اُس پر سلام اُس پر — اور اُس کے سب آلِ باصفا پر
اور اُس کے اصحابِ باوفا پر — اور اُس کے احبابِ اتقیا پر

۳
وہ جلوۂ نورِ کبریائی — وہ صاحبِ دعوتِ خدائی
وہ عینِ تقویٰ و پارسائی — بناءِ بُت خانہ اُس نے ڈھائی
وہ قُربِ حق میں جسے رسائی — بمجتبائی و مصطفائی
ہے دھوم توحید کی مچائی — کہ خود بتوں نے بھی دی دُہائی
عرب کو انسانیت سکھائی — دلوں سے کینہ کی کی صفائی
ہر ایک بُرائی کی جڑ مٹائی — مَری ہوئی قوم پھر جلائی
صلوٰۃ اُس پر سلام اُس پر — اور اُس کے سب آلِ باصفا پر
اور اُس کے اصحابِ باوفا پر — اور اُس کے احبابِ اتقیا پر

۴
وہ علم و حکمت سکھانے والا — پیامِ حق کا وہ لانے والا
کلامِ حق کا سُنانے والا — عذابِ حق سے ڈرانے والا
وہ رسمِ بد کا چھڑانے والا — وہ جہل و بدعت مٹانے والا
وہ بُت پرستی اُٹھانے والا — وہ سیدھا رستہ چلانے والا
خدا پرستی بتانے والا — وہ عاصیوں کا بچانے والا
مقامِ محمود پانے والا — وہ بیتِ اقصیٰ کا جانے والا
صلوٰۃ اُس پر سلام اُس پر — اور اُس کے سب آلِ باصفا پر

اور اُس کے اصحابِ باوفا پر
اور اُس کے احبابِ اتقیا پر

۵ وہ جلوہ ہے نورِ کبریا کا
وہ صدر ہے بزمِ اصطفا کا
امام ہے خیلِ انبیا کا
ہے پیشوا مسلکِ ہدٰے کا
معینِ انصاف اور وفا کا
مٹانے والا ہے وہ جفا کا
طبیب ہے شرک اور ریا کا
کہ خاص بندہ ہے وہ خدا کا
ہے آئینہ صدق اور صفا کا
وہ شاہ تسلیم اور رضا کا
وہ قبلہ ہر شاہ کا گدا کا
وہ کعبہ ابرار و اصفیا کا
صلوٰۃ اُس پر سلام اُس پر
اور اُس کی سب آلِ باصفا پر
اور اُس کے اصحابِ باوفا پر
اور اُس کے احبابِ اتقیا پر

۶ نبیٔ اُمّی لقب ہے اُس کا
نسب میں خورشیدِ ہاشمی تھا
نہ کچھ کسی سے پڑھا نہ لکھّا
وہ اَن پڑھوں میں ہُوا تھا پیدا
نہ اُس کے سر پر پدر کا سایا
نہ اُس کو اُستاد نے پڑھایا
کہ اُس پہ روح الامین آیا
کلامِ ربّی اُسے سکھایا
وہ بحرِ اعظم تھا علمِ حق کا
نہ تھا وہ محتاجِ علمِ اشیا
اُسے تھا مکشوف رمزِ اولیٰ
اُسے تھا معلوم سرِّ اُخریٰ
صلوٰۃ اُس پر سلام اُس پر
اور اُس کی سب آلِ باصفا پر
اور اُس کے اصحابِ باوفا پر
اور اُس کے احبابِ اتقیا پر

وہ فخرِ آدم امانِ عالم ۷ امینِ محکم رسولِ اکرم
محیطِ اعظم زغیب ملہم بوحی محرم شہِ مسلّم
عرب کے اندر وہی معظّم عجم کے اندر وہی مکرّم
لگا کے آدم سے تا بایں دم ظہور اُس کا ہے بعدِ آدم
وجود اُس کا مگر مقدّم وہ نورِ حق تھا ولے مجسّم
کیا مدینہ کو سبز و خُرّم درود محمود بھیج پیہم
صلوٰہ اُس پر سلام اُس پر اور اُس کی سب آلِ باصفا پر
اور اُس کے اصحابِ باوفا پر اور اُس کے احبابِ اتقیا پر

(۸۹) جذباتِ الم

اے! شاہِ یگانۂ زمانہ اے! بحرِ محیطِ بے کرانہ
کیوں اہلِ نیاز کے سروں سے خالی ہے یہ سنگِ آستانہ
وہ محفلِ اُنس اب کدھر ہے یارب ہے! کہاں وہ کارخانہ
وہ بزم نہ وہ جمالِ ساقی وہ جام نہ وہ مئے مغانہ
وہ طور ہے اب نہ وہ تجلّی وہ وقت ہے اب نہ وہ زمانہ
کیا ہوگیا؟ جلوۂ سحر گاہ کیا ہوگئی؟ صحبتِ شبانہ
ہے دِل میں ابھی وہی تصوّر ہے یاد ہنوز وہ فسانہ
وہ فصل نہ وہ بہار باقی وہ گل نہ چمن نہ آشیانہ

رہتی ہے اُچاٹ سی طبیعت ملتا ہی نہیں کہیں ٹھکانہ
جاں حسرتِ دید میں طپاں ہے دل تیرِ فراق کا نشانہ
ساحل پہ پڑے ہیں سب مسافر کشتی ہوئی کس طرف روانہ

ہے جوش میں ہجر کا سمندر
یا غوثِ علی شہِ قلندر

اے! کعبۂ خاص و قبلۂ عام تھی تیری گلی مقامِ اِحرام
تھا مامنِ جاں حریمِ اقدس آغاز کا غم نہ خوفِ انجام
سب محو تھے ظلِّ عاطفت میں خطرات و خیال و فکر و اوہام
اُس بحرِ محیط میں تھے سب گم نیکی و بدی و کفر و اسلام
پُر شور تھے بے لب و دہاں ہم سرمست بدونِ بادہ و جام
مشغولِ جمال بے سر و چشم مصروفِ سفر بغیرِ اقدام
دریا ہوا اِک عطا سے قطرہ پختہ ہوا اِک نگاہ سے خام
کیخسرو و کیقباد سے بھی تھے بخت بلند تیرے خدّام
دیکھا اب ہجر چار ناچار دیکھی فرقت بھی کام ناکام
کہہ دیجیو اے نسیم! یہ بات لے جائیو اے صبا! یہ پیغام

ہے جوش میں ہجر کا سمندر
یا غوثِ علی شہِ قلندر

ہوتی ہے جہاں میں کم کوئی ذات
بے علّت و نسبت و اضافات
خورشید تھا وہ وجودِ باجود
دریا تھی وہ ذاتِ فیض آیات
دیرینہ نہنگِ بحرِ توحید
مردانہ قلندرِ خرابات
سلطانِ جہانِ ترک و تجرید
شہبازِ معارفِ نہایات
نے میلِ مراتب و مدارج
نے رغبتِ کشف نے کرامات
ملتی تھی مراد طالبوں کو
اُس در سے بدونِ عرضِ حاجات
اُس بات کی ہو گئی گرہ وا
دل میں بھی نہ تھی ہنوز جو بات
خلوت میں ترا جمال مفتاح
جلوت میں ترا کلام مشکوٰۃ
کیا تھی؟ وہ نظر سحابِ رحمت
کیا تھا؟ وہ زمانہ فصلِ برسات
وہ وقت نہ وہ زمانہ افسوس
وہ لطف نہ وہ بہار ہیہات
اِک آن کی آن تھی حضوری
اِک بات کی بات تھی ملاقات

ہے جوش میں ہجر کا سمندر
یا غوثِ علی شہِ قلندر

اے! بحرِ حقیقتِ خدائی
اے! جلوۂ شانِ کبریائی
باقی نہیں کوئی مشغلہ اب
رندی ہی رہی نہ پارسائی
شاہی کا نہیں خیال سر میں
جی میں نہیں حسرتِ گدائی
نے بندِ قفس نہ شوقِ پرواز
باقی ہے نہ قید نے رہائی

نے حرص و ہوا نہ کچھ توکّل | نے برگ و نوا نہ بے نوائی
نے فکرِ قصیدہ ہائے عطّار | نے ذکرِ حدیقۂ سنائی
نے قُربِ نوافل و فرائض | نے تنگ دلی نہ دلکشائی
بندہ نہ خدا نہ دین و دُنیا | کی آپ نے خوب ہی صفائی
لیکن نہ مٹا غبارِ فرقت | ہر چند کہ طاقت آزمائی
مشکل ہوا کاٹنا دنوں کا | دشوار ہوئی تری جُدائی
دل سینہ میں ہے کہ برقِ بیتاب | اندوہ کی اِک گھٹا ہے چھائی

ہے جوش میں ہجر کا سمندر
یا غوثِ علی شہِ قلندر

ایّامِ وصال بھی تھے کیا دن | راتیں تھیں مرادِ مدّعا دن
محسوس نہ تھا کہاں کٹی رات | معلوم نہ تھا کدھر گیا دن
کیا جلد گزر گئے وہ دن حیف | ہوتا کوئی اور بھی سوا دن
تھی رات بہت دنوں سے اچّھی | راتوں سے زیادہ خوب تھا دن
تھی بزمِ وصال دن ہو یا رات | تھی دیدِ جمال شب ہو یا دن
دُنیا میں بزرگ تھی وہی رات | تھا عُمر میں بس وہی بڑا دن
ہر صبح عجیب۔ شام نادر | ہر رات جدید۔ اور نیا دن
تھی دن کو خوشی کہ اب ہوئی رات | تھی شب کو مسرّت اب ہُوا دن

عالم کو زبس کہ ہے تغیّر — رہتے نہیں ایک سے سدا دن
تھا خواب و خیال وہ زمانہ — بجلی ہوئی رات اور ہوا دن
دن رات یہی فغاں ہے لب پر — وہ رات رہی نہ وہ رہا دن

ہے جوش میں ہجر کا سمندر
یا غوثِ علی شہِ قلندر

اے قبلۂ عالمِ معانی — سلطانِ جہانِ بے نشانی
اے ابحرِ معارف و حقائق — شاہنشہِ ملکِ جاودانی
آگاہِ مقاصدِ برونی — دانائے خواطرِ نہانی
یک رنگ و یگانہ و یک آئین — بے فرقِ مکانی و زمانی
خصلت میں عجیب دلنوازی — عادت میں کمال مہربانی
تھی آپ پہ ختم بذلہ سنجی — تھی آپ پہ ختم نکتہ دانی
باتوں میں طریقِ دلکشائی — لفظوں میں ادائے خوش بیانی
تھے گوہرِ قدس وہ اشارات — اور غیب سے تھی وہ دُر فشانی
القصّہ وہ احسن القصص تھی — جو بات سُنی تری زبانی
آیا نہ پسند یاں کا رہنا — برباد ہو یہ سرائے فانی
جو کچھ گزرا سو تھا فسانہ — جو کچھ دیکھا سو تھی کہانی

ہے جوش میں ہجر کا سمندر

یا غوثِ علی شہِ قلندر

اے بحرِ کرم محیطِ نایاب — لب تشنہ ہیں ماہیانِ بے آب
اے نوحِ سفینۂ مسرّت — طوفاں زدہ ہیں تمام اصحاب
پانی پت تھا بقا کا چشمہ — اب کیا ہے غم و الم کا گرداب
روتے ہیں یہاں کے سب درو بام — حوض و حجرہ ستون و محراب
آتے تھے مدام تیرے مہماں — بنگالہ سے لے کے تا بہ پنجاب
جلوہ تھا یہ تیرے دم قدم کا — اب کیا ہے کہ مجتمع ہوں احباب
وحشت زدہ پھرتا ہے غلامی — اور غم زدہ مضطرب ہے نوّاب
ملفوظِ مبارک و گرامی — ہے زندگی حسن کا اسباب
ساحل ہے کہیں نہ تھل نہ بیڑا — سب بحرِ فراق میں ہیں غرقاب
افسوس ہوا نظر سے پنہاں — وہ شمسِ منوّرِ جہاں تاب
اے مُلکِ بقا کے جانے والو — کہہ دیجیو بعدِ عرضِ آداب

ہے جوش میں ہجر کا سمندر
یا غوثِ علی شہِ قلندر

(۸) قصائد

(۹۰) جریدۂ عبرت

عذرِ تقصیر- ابتدائی اشعار سے ظاہر ہے کہ اِس ناچیز قصیدہ کے موزوں کرنے کا خیال کس طرح میرے دل میں پیدا ہوا- اُس وقت طبیعت پر ایک ایسی کیفیت طاری تھی جس نے اِس ہرزہ گوئی پر مجبور کیا ورنہ مجھ کو نہ شعر و شاعری سے رغبت نہ اِس فن کی مہارت نہ اتنی فرصت- اور سچ یہ ہے کہ نہ اِس کام کی لیاقت جو کچھ لکھا گیا صرف مقتضائے طبیعت تھا- (اقتباس از دیباچہ طبع اوّل- یکم نومبر ۱۸۸۵ء)

میں شاعرانہ روش پر نہیں قصیدہ نگار
یہ ایک سادہ گزارش ہے یا اولی الابصار

کہ اب کے ماہِ محرّم کی ساتویں تاریخ
گیا جو گھر سے قضارا بجانبِ بازار

تو دیکھتا ہوں کہ گزری میں ایک اکھاڑہ ہے
اور اتنی بھیڑ کہ جس کا نہیں حساب و شمار

ہیں دو حریف مقابل لئے پھری گتکا
ہر ایک فنِّ پھکیتی میں طاق و طرّار

جو اِس نے پانوں بچایا تو اُس نے سر تاکا
دکھایا چہرہ تو پہلو پہ جا گیا ہے وار

عجب ٹھاٹھ نئے پینترے غضب پُھرتی
نرالے ڈھنگ سے کرتب کا کرتے ہیں اظہار

چلا ہے ایک بنیٹی کا باندھ کر چکّر
کھڑا ہے ایک لئے سیف، لڑ رہا ہے کوئی

میں اپنے دل میں لگا کہنے کیا حماقت ہے　　مٹے ہوئے ہیں جو اس فن پہ یہ خدائی خوار
یہ کھیل محض نکمّا ہے۔ بلکہ بیہودہ　　جو دیکھتا ہے سو ہنستا ہے زیرِ لب ناچار
سپہ گری کا یہ فن تھا کسی زمانہ میں　　نہ وہ زمانہ رہا اب۔ نہ صورتِ پیکار
کہاں ہیں اب وہ دلیرانِ صف شکن باقی　　کہ اِن فنون پہ ہوتے تھے جان و دل سے نثار
ہزار سے نہ دبے لاکھ سے نہ مُنہ موڑا　　جو ڈٹ گئے کسی میداں میں کھینچ کر تلوار
نہ اب بکیت کو پوچھے کوئی نہ راوت کو　　نہ تیر ہے نہ کماں ہے نہ بانک ہے نہ کٹار
نہ اِس کمال کی پرسش نہ اِس ہنر کی قدر　　نہ جنگ کا یہ طریقہ رہا۔ نہ یہ ہتھیار
نہ جس میں دین کا ہو فائدہ نہ دُنیا کا　　تو پاس پھٹکے نہ اُس کام کے کوئی ہُشیار
جواب دل نے دیا یوں۔ کہ مت تعجّب کر　　میں اِس سے بڑھ کے سُناؤں زمانہ کے اطوار

شاعر

سخنورانِ زماں کی بھی ہے یہی حالت　　کہ اِس قدیم ڈگر کو نہ چھوڑئیے زنہار
سوائے عشق نہیں سوجھتا انہیں مضموں　　سو وہ بھی محض خیالی گھڑت کا اِک طومار
نہ لکھتے ہیں کبھی نیرنگِ حکمت و قدرت　　نہ واقعات کے وہ کھینچتے ہیں نقش و نگار
ہے شاعری میں یہ پہلا اصولِ موضوعہ　　کہ جھوٹ موٹ کے بنجائیں ایک عاشقِ زار
تمام اگلے زمانہ کا ہے یہ پس خوردہ　　کہ کر رہے ہیں جُگالی وہ جس کی سو سو بار
کمال اپنا سمجھتے ہیں خودستائی کو　　نہ ننگ ہے نہ حیا ہے نہ شرم و غیرت و عار
جو اپنے فخر پہ آئیں۔ تو بس کریں تسخیر　　حدودِ ہند سے لے تا بفارس و تاتار

ہے ایک غار میں پانی سڑا ہوا لبریز ۔۔۔ پڑا ہے نیم کا پتّہ اور اُس پہ پشّہ سوار
وہ پشّہ آپ کو سمجھا ہے ناخدائے جہاز ۔۔۔ اور اُس سڑے ہوئے پانی کو لُجّۂ زخّار
اسی طرح سے ہمارے زمانہ کے شاعر ۔۔۔ سمجھتے اپنی خرافات کو ہیں عینِ وقار
مبالغہ ہے تو بیہودہ عقل سے خارج ۔۔۔ ہے استعارہ تو بے لطف اور دور از کار
کیا ہے نام زٹل قافیہ کا اپنے سخن ۔۔۔ وہ کنکری ہے جسے کہتے ہیں دُرِ شہوار
جو ان کے دیکھئے دیواں تو بور کے لڈّو ۔۔۔ غلیظ و گندہ سراسر نتیجۂ افکار
وہی ہے شاعرِ غرّا جو بے تُکی ہانکے ۔۔۔ یہی ہے شعر کا اس دور میں بڑا معیار
یہ ان کی طبع بلند اور معنی رنگین ۔۔۔ جو طبع گِدھ ہے تو معنی سڑا ہوا مُردار

نہ جس سے طبع کو تفریح ہو نہ دل کو خوشی
غزل ہے یا کوئی ہذیان ہے بوقتِ بخار

نمونہ غزل

صفت ہے دوست کی جلّاد و ظالم و غدّار ۔۔۔ ستم شعار۔ دل آزار۔ بے وفا۔ مکّار
ہے دلبروں کی بھی شامت نہ منہ رہا نہ کمر ۔۔۔ بجائے زلف کے دو اژدہوں کی ہے پھنکار
یہ آپ کے گُلِ عارض وہی ہیں باسی پھول ۔۔۔ پڑی ہے نزع کی حالت میں نرگسِ بیمار
جو ٹون ہال کی محراب ہے خمِ ابرو ۔۔۔ تو ہے مژہ بھی پولیس کے سپاہیوں کی قطار
زنخ کنواں ہے کہ جس میں ڈبو چکے لُٹیا ۔۔۔ بھنور ہے ناف۔ کہ جس سے نہ ہوگا بیڑا پار
شبِ فراق کا دُکھڑا اگر کریں تحریر ۔۔۔ تو ایشیا کو ڈبو دیوے دیدۂ خوں بار

وہی لنڈوری ہے قمری۔ تو پر نُچی بلبل ۔۔۔ وہی ہے سرو کا ٹھنٹھ اور طولِ قامتِ یار
جو ناصحوں سے ہے کھٹ پٹ تو زاہدوں سے چخ ۔۔۔ جو ساقیوں سے لگاوٹ تو مغبچوں سے پیار
غریب شیخ پہ ہر دم دُلتّیاں جھاڑیں ۔۔۔ کریں مساجد و کعبہ سے دُم دبا کے فرار
کہاں ہے اِن کا ٹھکانا۔ کدھر ہے اِن کا مقام ۔۔۔ وہی ہے بیتِ صنم اور خانۂ خُمّار
بگھارتے ہیں تصوّف تو کون دے گا داد ۔۔۔ کہاں ہیں سعدیؔ و حافظؔ سنائیؔ و عطّارؔ
کریں گے اِس قدر ایمان و دین کی تفضیح ۔۔۔ کہ گویا ہیں کوئی ہفتا دہشت کے کُفّار
اگرچہ ہاتھ میں تسبیح لب پہ ہو توبہ ۔۔۔ بنینگے شعر میں ہاں مے پرست و بادہ گسار
ہے چرخِ پیر تو مُدّت سے شاعروں کا پیر ۔۔۔ پہ کوستے ہیں اُسے یہ مُریدِ ناہنجار
جمالِ یوسف و اعجازِ عیسیٰ و موسیٰ ۔۔۔ ہیں اِن کی گندہ دہانی کے سامنے سب خوار
نہ کچھ خدا کا لحاظ اور نہ انبیا کا ادب ۔۔۔ یہ اِن کی نور بھری شاعری! خُدا کی مار
ہے اِن کی طبعِ دنی عنکبوت کا جالا ۔۔۔ اور اِن کی بندشِ مضمون ہے مکھیوں کا شکار
کسی عمارتِ رسمی کا گر بیان کریں ۔۔۔ محیطِ کون و مکان اُس سے تنگ ہوئے ناچار
جو اُس کی نیو ہو گاوِ زمین کے سُم سے پرے ۔۔۔ تو اُس کا کنگرہ بالائے گنبدِ دوّار
وہ توڑتے نہیں لُقمہ مبالغہ کے بدوں ۔۔۔ بغیر بہنگی کے جس طرح چل سکے نہ کہار
سدا دروغ کی کرتی ہیں مکھیاں بھن بھن ۔۔۔ چپک رہا ہے لبوں پر جو شیرۂ گفتار
لکھیں جو قصّہ تو دیو و پری کا افسانہ ۔۔۔ لگا دیں کذب کے ڈھیر اور جھوٹ کے انبار
کریں چڑیل کو حورانِ خُلد سے نسبت ۔۔۔ بنائیں اونٹ کٹیلی کو گلشنِ بہار

جب اِن پہ ہوتے ہیں مضمونِ مبتذل وارد ۔۔۔ تو گویا عرش سے اُتری چمار کو بیگار
کریں جو مدح کسی چرکٹے کی وہ بالفرض ۔۔۔ تو پھر سکندر و دارا ہیں اُس کے باج گزار
بنائیں اُس کے تئیں بر و بحر کا سُلطان ۔۔۔ جو فی المثل ہو کسی کوردہ کا نمبردار
لکھیں وہ دھوم کہ ہو گرد جشنِ جمشیدی ۔۔۔ جو رقعہ شادی کا لکھوائے کوئی ساہوکار
بنانا پر کا کبوتر تو ہے بہت آسان ۔۔۔ سوئی کو پھاوڑہ کہنا تو کچھ نہیں دشوار
ہے سچ تو یہ کہ اِنھیں شاعروں کے قالب میں ۔۔۔ لیا ہے جھوٹ نے کلجگ میں آن کر اوتار
مشاعرہ ہو۔ تو لڑتے ہیں جیسے ٹینی مُرغ ۔۔۔ لہولہان ہیں پنجے شکستہ ہے منقار
وہ خود فروش بنے آج اوستادِ زماں ۔۔۔ کہ جن سے کوئی ٹکے سیکڑا نہ لے اشعار
اگر سُنیں کہ ہُوا ہے فلاں رئیس علیل ۔۔۔ تو پہلے قطعۂ تاریخ کر رکھیں تیّار
اُجڑ گئے ہیں وہ تھان اور لد گئے ڈیرے ۔۔۔ جہاں گداتے تھے یہ بھانڈ کاغذیں ہوار
جہاں خوشامدیوں شاعروں کی تھی بھرتی ۔۔۔ اب ایسی کاٹھ کی اُلّو نہیں کوئی سرکار
تو اب وہ پھرتے ہیں ناچار مانگتے کھاتے ۔۔۔ بنا کے کاسۂ گدائی کا پرچۂ اخبار
کسی کی مدح سرائی کسی کی بدگوئی ۔۔۔ اڈیٹری کی بھی کرنے لگے ہیں مٹّی خوار

کلام دیکھو تو صورتِ حرام سر تا سر
سلاح بر دو کس نیست درمیانِ حصار

فلسفی علماء

نہ شاعروں ہی پہ تنہا پڑے ہیں یہ پتھّر ۔۔۔ کہ عالموں کا بھی اِس دور میں یہی ہے شعار

وہیں ہیں آج جہاں تھے یہ دس صدی پہلے
گیا ہے قافلہ دور۔ اب ٹٹولتے ہیں غبار

وہی ہیں یاد پورانے اصول یونانی
جنھیں علوم جدیدہ نے کر دیا بے کار

وہی قدیم زمانہ کا فلسفہ سڑیل
ہو جیسے کہنہ کھنڈر کی ڈھئی ہوئی دیوار

ہنوز فخر و مباہات اِس پہ کرتے ہیں
وہ جن کے سر پہ فضیلت کی ہے بندھی دستار

ہے درس میں وہی ترتیب مادّہ اب تک
کہ پہلے خاک ہے پھر آب۔ پھر ہوا پھر نار

اگرچہ ہو گئے تحلیل خاک و باد اور آب
مگر ہیں علم میں اِن کے وہی عناصر چار

ہے آسمان طوافِ زمین میں مصروف
ہے آفتاب ابھی چرخِ چارمیں پہ سوار

وہی ہے ڈھانچ پرانا نظام ہیئت کا
جڑے ہوئے ہیں فلک میں ثوابت و سیّار

وہی ہے مسئلہ خرق و التیام ہنوز
کہ جس کا اب نہ کوئی مدّعی نہ جانب دار

وہی حساب ہے لکھا ہے جو خلاصہ میں
گھٹے بڑھے گا نہ اِک صفر تا بروزِ شمار

جو کہہ گئے ہیں فلاطون اور بطلیموس
اُسی کی بحث ہے اب تک۔ اُسی کی ہے تکرار

جو شرح چغمنی و میبذی میں لکھا ہے
ز روئے کشف کھُلے تھے وہ غیب کے اسرار

جو شمس بازغہ میں آچکا سو ہے الہام
کہ ہے مسائل حکمت کا اسی پہ مدار

بھرا ہوا انھیں کج بحثیوں سے ہے منطق
کہ ایک کو جو کہیں دو تو پھر نہ ہو انکار

ہوا دلائلِ وہمیہ سے جو کچھ ثابت
تو پھر مشاہدہ بے سود تجربہ بے کار

نہ جن کے ہاتھ میں پیسہ نہ شکل کھانے کی
وہ کھائے بیٹھے ہیں اشکال منطقی پہ ادھار

دماغ خشک میں اُن کے جو کچھ سمایا ہے
اُسی کی پچ ہے وہی ڈینگ اور وہی اصرار

بسی ہوئی ہے ابھی تک وہی پرانی بو
کچھ ایسی پی ہے کہ گھٹتا نہیں ہے جس کا خمار

ہیں عاقلوں کے لئے آیتِ خداوندی
یہ آسمان و زمیں اور نجومِ پُرانوار

نہیں ہے گوشۂ خاطر کا اِس طرف میلان
کہ غور کیجئے قدرت کے دیکھ کر آثار

ہے کس طریق یہ ارض و سما کی پیدائش
ہے کس کے قبضہ میں جمّازۂ جہاں کی مہار

ہے موسموں کی بھلا یہ اُلٹ پلٹ کیوں کر
کبھی عمل ہے خزاں کا کبھی ہے دخلِ بہار

کبھی کا دن ہے بڑا اور کبھی کی رات بڑی
یہ کس روش سے ہُوا اختلافِ لیل و نہار

یہ کس نے پھیر دیا موسمی ہوا کا رُخ
یہ کیوں ہے بادِ تجارت کی متصل رفتار

نسیم برّی و بحری میں چھیڑ چھاڑ ہے کیوں
کہ رات دن نہ اِسے چین ہے۔ نہ اُس کو قرار

ہُوا ہے بحر سے کیوں کر ہوا کا دامن تر
اُڑائے تارِ شعاعی نے کس طرح یہ بخار

کیا ہے کس نے بتاؤ سحاب کو تسخیر؟
میانِ ارض و سما مثلِ طائرِ پردار

ہے کیونکہ گرم یہ ہنگامہ برف و باراں کا
سدا بروئے زمین خاص کر سرِ کُہسار

یہ اوس کیا ہے۔ کُہر کیا ہے۔ اور بادل کیا؟
یہ بادلوں سے برستی ہے کس طرح بوچھار

دیا ہے کس نے یہ آبِ حیات کا چھینٹا
کہ لہلہائے زمیں پر ہرے بھرے اشجار

بہے پہاڑ سے چشمے رواں ہوئے دریا
اُگے نہال۔ کِھلے پھول۔ اور لگے اثمار

رواں ہے ساحتِ دریا پہ کس طرح کشتی
چڑھے ہوئے ہیں مسافر۔ لدا ہُوا ہے بار

کہ جس کے فیض سے دولت سمیٹتے ہیں لوگ
اِسی کے نفع سے قائم ہے فرقۂ تجّار

ہُوا ہے بحر میں کیوں کر یہ جذر و مد پیدا
یہ کیا ہیں زلزلۃ الارض۔ اور جبال النّار

دبے پڑے ہیں فلزّات اور جواہر کیوں؟ ہُوا زمیں سے پہاڑوں کا کس طرح اُبھار
ہوئی ہے کب طبقات زمین کی ترتیب؟ نئی زمین بناتا ہے کون سا معمار
غرض کہ صنعتِ حق کے نکات ہیں بیحد کہ جن سے عالمِ کون و فساد ہے سرشار
نہ اِن مظاہرِ قدرت پہ ڈالتے ہیں نگاہ نہ اُن رموز کی تحقیق ہے نہ استفسار
ہے جن علوم سے انسان کے حال میں برکت ہیں جن فنون سے گلزار شہر و ملک و دیار
ہیں جو علوم صنائع کے قبلۂ و کعبہ ہے جن فنون سے حسنِ معاشرت کا سنگار
ہے جن علوم سے انساں کی زندگی سرسبز ہیں جن فنون سے اہلِ زمانہ برسرِ کار
یہ اُن کے نام پہ کہتے ہیں د-ف اور ع یہ اُن پہ کرتے ہیں لاحول اور استغفار
یہ نعمتوں سے خدا کی ہوئے ہیں سخت نفور یہ خوبیوں سے تمدّن کی ہیں بہت بیزار
یہ ڈھونڈتے ہیں وہی لیکھ اور وہی چھکڑا! اگرچہ ریل کی سیٹی نے کر دیا بیدار
یہاں پڑا ہے ابھی مرغِ نامہ بر بسمل! وہاں پیام اُڑی لے کے برق کی رفتار
رفل کے سامنے کچھ کام دے سکے گی بھلا! پُرانی وضع کی بندوق وہ بھی توڑے دار
ہلے گا ہاتھ وہ کیا! جس پہ گر چکا فالج چلے گی تیغ وہ کب! جس کو کھا گیا زنگار

کیا ہے گردشِ گیتی نے جس کو ملیا میٹ
سمجھ رہے ہیں اُسے یہ بزرگوار حصار

معلّم

معلّموں کو جو دیکھو تو روح دقیانوس! ہیں وہ بھی دخمۂ فارس کے اُستخواں بردار

وہی ہے اِن کا پُرانا طریقۂ تعلیم　　کہ جس میں زندہ دلی کے نہیں رہے آثار
وہی خوشامدی القاب اور وہی آداب　　کہ جن سے تازہ ہے انشائے دل کشا کی بہار
ہو ایک اِنچ کا مطلب تو ہاتھ بھر کی دُعا　　اور ایک گز کی تمنّائے دولتِ دیدار
طریق ترجمہ اب تک وہی ہے اُوٹ پٹانگ　　پڑھیں جو لڑکے تو ہل ہل کے اور پکار پکار!
نہ چلنے پھرنے کی عادت نہ خو ریاضت کی　　جواں ہیں پیر سے بدتر تو پیر زار و نزار
سوائے ضعفِ دماغ اور بھی مرض ہیں کئی　　فتورِ ہاضمہ۔ آشوبِ چشم۔ نزلۂ حار
مکاں وہ جس میں کھچا کھچ بھرے ہوئے لونڈے　　ہے جیلخانہ کی مانند تنگ و تیرہ و تار
ہوئے جو پڑھ کے مکاتب میں فارغ التحصیل　　تو نوکری کے لئے کر رہے ہیں سوچ بچار
نہ ایسے علم سے واقف کہ کچھ کما کھائیں　　نہ ایسے فن کی مہارت کہ کر سکیں بیوپار

نہ ہو سکیں گے مُلازم کسی کچہری میں
کہ اِس کے واسطے ہے مڈل کی سند درکار

طبیب

اِسی روش پہ اطبّا کا ہے مرض مزمن　　ہنوز نبضِ طبابت کی سست ہے رفتار
وہی سدیدی و قانون و تحفہ و مخزن　　خدا نے اِن پہ لگا دی ہے مُہرِ استمرار
مجرّبات وہی اور وہی ہیں دستورات　　اِنھیں بھی مُردہ پرستی کا ہے بڑا آزار
وہی ہے فصد وہی منضج اور وہی مُسہل　　وہی سنا و گلِ سُرخ و شربتِ دینار
معالجہ میں ترقی نہ کچھ مداوا میں　　وہی سبب۔ وہی تشخیص اور وہی تیمار

غذا بتائیں وہی دال مُونگ یا کھچڑی
بلا سے اِن کی مرے یا جیے کوئی بیمار

اگر مریض کی قسمت سے ہو گیا بُحران
تو راس آئی دوا۔ ورنہ اشتدادِ بخار

نہ کچھ دوا کی ہے تحقیق۔ نے دواسازی
وہی دوا ہے جو پُڑیا میں باندھ دے عطّار

نہ ٹھیک طور سے اجسام کی ہوئی تشریح
نہ تیز فنِّ جراحت کے کر سکے اوزار

نہ کیمیا کے ہوئے حل و عقد سے آگاہ
نہ مفردات کی ترکیب کے کھلے اسرار

نہ فنِّ قابلہ میں دستِ قابلیّت ہے
نہ ان کو شرحِ نباتات پر نظر زنہار

توہّمات بھی داخل ہیں یاں طبابت میں
بڑا طبیب ہے گر ہو منجّم و جفّار

نظر بروج و کواکب پہ کر کے دے نسخہ
کہ ہیں دوا پہ مؤثر نجوم کے آثار

دُنیا پرست دیندار

ہر ایک علم و عمل میں پڑی ہے یہ ٹہکی
ہر ایک طرز و روش پر پڑی ہے یہ پھٹکار

امام و حافظ و واعظ مؤذّن و مفتی
نہ کوئی دین میں پورا نہ ٹھیک دُنیا دار

زبس کہ دعوت و نذر و نیاز پر ہے معاش
ہوئے ہیں قوم میں پیدا بہت سے مفت خوار

جو اینڈتے ہیں پڑے کھا کے لقمۂ خیرات
گئی حمیّت و غیرت دلوں سے اِن کے سدھار

وہ پھولتے ہیں۔ اپھرتے ہیں فخر کرتے ہیں
فقط اسی پہ کہ ہم ہیں بڑے نماز گزار

نہ خُلقِ نیک۔ نہ ہمّت بجا۔ نہ عزم درست
نہ حُبِّ قوم۔ نہ حُبِّ وطن۔ نہ حُبِّ تبار

لکھیں گے ٹھیک وہی اُن کا دفترِ اعمال
یہ دو فرشتے مقرّر جو ہیں یمین و یسار

تھے پہلے صاحبِ تقویٰ تو خلق کی تصویر | نہ آج کل کے سے مُلّائے خشک دِل آزار

کہاں ہیں دین و دیانت طہارت و تقویٰ | کہاں ہیں اگلے زمانہ کے باصفا ابرار

مدارِ دین ہے اِس پر کہ جھٹ کتر ڈالیں | جو پائیں ٹخنے سے نیچی ذرا کسی کی ازار

فقط مسائلِ غسل و وضو و استنجا | یہی ہیں وحیِ الٰہی کہ آج کل اسرار

کہیں تو ضاد کی قرأت پہ غُل غپاڑہ ہے | کہیں ہے جہر پہ آمیں کے جوتی اور پیزار

کسی گروہ میں ہے ضمِّ فاتحہ پر جنگ | کہیں ہے مجلسِ میلاد موجبِ تکرار

کہیں تو کفر کے فتوؤں کا چل رہا ہے گراب | کہیں ہے طعن و ملامت کی ہو رہی بھرمار

یہ مولوی ہیں۔ کہ بغض و نفاق کے جرنیل! | کہ جاہلوں کو لڑاتے ہیں یہ سپہ سالار!

بلا سے اِن کی اگر مضحکہ کریں مُلحد | بلا سے اِن کی اگر دین پر ہنسیں کُفّار

مناظرہ کی تصانیف قابلِ نفرت | مباحثہ کی کتابیں سزائے استحقار

جبیں پہ اِن کی توہُّم کا ہے کھنچا قشقہ | کمر پہ اِن کی تعصّب کا ہے بندھا زُنّار

ہیں سُنّتوں میں یہی سُنّتیں اِنھیں مرغوب | نکاح و دعوت و قیلولہ عُجلتِ افطار

گھٹی جو دور میں اِن کے۔ تو راستی کی قدر! | بڑھی جو عہد میں اِن کے تو ریش کی مقدار!

ملے ٹکا تو کریں ثبت مہر فتوے پر | غضب ہے! نقدِ علیہ السّلام کی جھنکار

بنائیں حیلہ گری سے حلال رشوت کو | یہاں تو مات ہیں اِن سے وکیل اور مختار

سُنائیں دوزخ و جنّت کا حال۔ لیکر فیس | ہے اِس زمانہ میں چلتا ہوا یہی اوزار

یہی ہے وعظ و نصیحت کی علّتِ غائی | کہ بعد کھانے کے مِلجائیں نقد بھی دو چار

نہیں ہے جن کو میسّر یہ وعظ کا لاسہ تو کرتے پھرتے ہیں وہ اور ہتکھنڈوں سے شکار
دکھا کے فضلِ قناعت جتا کے صبرِ جمیل وہ بھیک مانگتے ہیں بن کے حاجی و زوّار
مصافحہ کے لئے ہے یہ پیش دستی کب؟
اِسی میں حُسنِ طلب ہے دیا جو ہاتھ پسار

مشائخ

بہت سے راہزنی کر رہے ہیں بن کر پیر غریب قوم کو ہیں مارتے یہ شاہ مدار!
لیا ہے معتقدوں کی نجات کا ٹھیکہ کہ گویا ہیں یہی باغِ جناں کے ٹھیکہ دار
ہزار دانہ کی تسبیح ۔ گیروا کپڑے یہی ہیں اِن میں علاماتِ اولیائے کبار
کسی سے نقد ۔ کہیں جنس اور کہیں دعوت جو بس چلے تو نہ چھوڑیں مُرید کا گھر بار
یہ مومنوں سے بھی جزیہ وصول کرتے ہیں فتوحِ غیب رکھیں اس کا نام یا ادرار
کریں جو ذکر تو پھر ایسی بولیاں بولیں کہ شب کو چونک پڑیں سا کنانِ قرب و جوار
جو دعوت اِن کی کریں معتقد تو ہے واجب کہ اِن کے کھانے کو ہو شوربا بھی چھلّہ دار
اگر ہیں یاد تصوّف کی اصطلاحیں چند تو پہنچا عرشِ معلّٰی پہ گوشۂ دستار
یہی ہیں آج ! ابوالوقت اور قطبِ زماں یہی ہیں شیخِ شیوخ اور زبدۃ الاحرار
ملا جو گانٹھ کا پورا کوئی ارادتمند تو نقد وقت ہیں شغل و وظیفہ و اذکار
کبھی جو خوابِ پریشاں میں وہ لگے اُڑنے تو اپنے زعم میں ہیں مثلِ جعفرِ طیّار
کبھی جو عالمِ رؤیا میں دیکھ لی بیری مقامِ سدرہ کو طے کر چکے زہے پندار!!

بنائیں پہلے تو شیطاں کی جھونپڑی دل میں — کریں خیال کا لُوکا لگا کے پھر فی النّار
اگر ہیں شرع پہ قائم تو ہیں جُنیدِ زماں — جو بھنگ نوش ہے کوئی تو ہے قلندر وار
برجوعِ خلق کی خاطر ہوئے ہیں گوشہ گزیں — کہ جیسے جھیل پہ بیٹھے شکر کے بوتیمار
ہے جو شیخ تو پھر وجد و حال بھی ہے ضرور — دکھائیں رقصِ جمل وہ۔ کہ دنگ ہوں حُضّار

یہ ناز ہے کہ بزرگوں کے نام لیوا ہیں
اگرچہ ننگِ بزرگاں ہوں آپ کے اطوار

عوام

عوام کی ہے یہ صورت کہ بس خدا کی پناہ! — ہر ایک پیشۂ بے غیرتی میں کار گزار
ہر ایک لہو میں شامل ہر اک لعب میں شریک — کہیں کا سانگ تماشا کسی کا ہو تہوار
دغا۔ فریب ہو۔ چوری ہو۔ یا اُچکّا پن — نہیں ہے باک کسی کام سے انھیں زنہار

اب اِن کے واسطے ہیں یہ مدارجِ اعلیٰ
پیسمین۔ قلی۔ کوچوان۔ خدمت گار

انگریزی فیشن والے

رہا وہ جرگہ۔ جسے چڑ گئی ہے انگریزی — سو واں خدا کی ضرورت! نہ انبیا درکار!!
وہ آنکھ میچ کے برخود غلط بنے ایسے — کہ ایشیا کی ہر اِک چیز پر پڑی دھتکار
جو پوششوں میں ہے پوشش تو پیش ریڈ کو — سواریوں میں سواری تو دم کٹا رہوار
جو اردلی میں ہے کُتّا تو ہاتھ میں اک بید — بجائے جاتے ہیں سیٹی سلگ رہا ہے سگار

وہ اپنے آپ کو سمجھے ہوئے ہیں جنٹلمین | اور اپنی قوم کے لوگوں کو جانتے ہیں گنوار
نہ کچھ ادب ہے۔ نہ اخلاق۔ نے خدا ترسی | گئے ہیں اِن کے خیالات سب سمندر پار
وہ اپنے زعم میں لبرل ہیں یا ریڈیکل ہیں | مگر ہیں قوم کے حق میں بصورتِ اغیار
نہ انڈین ہیں رہے وہ نہ وہ بنے انگلش | نہ اُن کو چرچ میں آنے نہ مسجدوں میں بار
ہے استفادہ مکالے سے جن کو انشا میں | قلم کے زور سے بنتے ہیں قوم کے غم خوار
جو ہے بھی کوئی۔ تو لاکھوں میں ایک یہ ایسا ادھ | کہ تیرِ درد ہوا ہے جگر میں جس کے دوبار
وگرنہ کس کو یہ غم ہے؟ کہ میری پیاری قوم | ہوا ہے زرد یہ کیوں تیرا چہرۂ گلنار
یہ تیرے پھول سے پنڈے پہ کیوں ہے میل کچیل؟ | یہ تیرے چاند سے مکھڑے پہ کیوں ہے گرد و غبار؟
کدھر ہے تیری طبیعت؟ کہاں ہے تیرا دل؟ | خموش کیوں ہیں؟ یہ تیرے لبِ شکر گفتار
اٹا ہے خاک سے کیوں؟ تیرا دامنِ دولت | چبھے ہیں کیوں ترے تلووں میں مفلسی کے خار؟
کہاں ہے وہ تری عزّت کا گوہرِ رخشاں؟ | کہاں ہے وہ تری حشمت کا خلعتِ زرتار
تری معاش کی کشتی ہوئی ہے طوفانی | نہ بادبان ہے۔ نہ لنگر۔ نہ ڈانڈ۔ نے پتوار
ہوا ہے گلشنِ اخلاق جل کے خاکستر | چلی ہے کب سے یہ ایسی سمومِ آتش بار
بجائے سنبل و ریحاں کے اٹھ رہا ہے دھواں | بجائے پھول کے شعلہ۔ عوض کلی کے شرار
یہ تیرے علم کا دار الجلال کیوں ہے خراب؟ | چھتوں پہ گھاس، تو ٹوٹے ہوئے در و دیوار
ترے مرض کی یہاں تک پہنچ گئی نوبت | کہ تیرے حال پہ روتے ہیں یار اور اغیار
رسوم بد نے ترے ہاتھ پاؤں جکڑے ہیں | فضولیوں نے تیرا کر دیا ہے سینہ فگار

تری مٹرک نے پنپنے دیا نہ تجھ کو حیف!!
تری اٹک سے تری ناؤ جا پڑی منجدھار

وہ اہلِ فضل کہ تھے افتخارِ ہندوستاں
اب اُن کی نسل کو دیکھو تو ہے وہ ٹھیٹ گنوار

وہ جن کے نام سے نامی تھے شہر اور قصبات
گداگری میں ہے مصروف اُن کا خیل و تبار

وہ دودمانِ امارت کے تھے جو چشم و چراغ
اب اُن کے ہاتھ میں ڈھولک ہے یا بغل میں ستار

جو منتخب تھے نجابت میں اور شرافت میں
اب اُن کی آل کو دیکھو تو سخت بدکردار

یہ ہانکتے ہیں جو گاڑی کسی مہاجن کی
اِنھیں کے مورثِ اعلیٰ تھے صوبہ دارِ بہار

ہے آج ٹکڑے کو محتاج اُن کی ذُرّیّت
کہ جن کی دھاک تھی سلہٹ سے لیکے تا قندھار

امارت اپنی امیروں نے قرض میں کھو دی
عوض میں دس کے دئے سَو تو سَو کے ایک ہزار

بہت سے بن گئے عیاش ہو گئے برباد
بہت سے بن گئے اوباش کھیلتے ہیں قمار

قمار میں بھی نہ سیدھا پڑے کبھی پانسہ
یہاں بھی خوبیِ قسمت سے جائیں بازی ہار

میں کیا کہوں کہ وہ بھرتے ہیں کس کی جلمیں آج
یہ کل جو پھرتے تھے چھیلا بنے سرِ بازار

وہ آج کرتے ہیں فاقے جو تھے بڑے ملکی
نہ گھر میں گیہوں کے دانے نہ باجرا نہ جوار

ہے ٹھیکرا وہی روٹی کا پیرزادوں کی
جو گانوں ہے کوئی باقی بطورِ وقفِ مزار

ہوئی تمام بتدریج منتقل جاگیر
کہ جیسے روم کے قبضہ سے صوبۂ بلغار

نہ کوئی علم نہ صنعت۔ نہ کچھ ہنر نہ کمال
تمام قوم کے سر پر سوار ہے ادبار

اگرچہ نشو و نما پا رہی ہے آزادی
کھُلا ہے امن و حفاظت کا قیصری دربار

اگرچہ ملک میں علم و ہنر کا ہے چرچا
حصولِ عزت و دولت کا گرم ہے بازار

ہر ایک قوم میں گھوڑ دوڑ ہے ترقّی کی
درست سازو یراق اور وردیاں تیّار

لگا کے شوق کا ہنٹر۔ اُمنگ کی مہمیز
سمندِ جہد کو سرپٹ اڑا رہے ہیں سوار

ہے اِن کا رخش طلب دوڑ دھوپ میں آندھی
بہت فراخ ہے میداں۔ زمین ہے ہموار

اور اِن کے ناقۂ ہمّت کی ہیں ڈگیں لمبی
اب اِن کو طے مراحل نہیں ہے کچھ دشوار

پلٹ گیا ہے زمانہ بدل گئی ہے رُت
نمو کا وقت ہے اور ابتدائے فصلِ بہار

نہیں بعید کہ ہو جائیں ایک سب جل تھل
برس رہا ہے ترقی کا ابرِ گوہر بار

ہر ایک زاغ نے سیکھا ترانہ بلبل
بھبیریوں نے اُڑائی نوائے موسیقار

غرض کہ سب ہیں صلاح و فلاح کے جویا
دیا ہے ولولۂ شوق نے دلوں کو اُبھار

زمانہ چونک پڑا ہے۔ پر اے مُسلمانو!
جھنجوڑنے سے بھی ہوتے نہیں ہو تم بیدار

نہیں ہو فہم و درایت میں تم کسی سے کم
مگر چہ کار کند شیر شرزہ در بُنِ غار

اور ایسا غار کہ بالکل جہاں اندھیرا ہے
پھر اُس میں شیر مرے یا جیے بدونِ شکار

کروں گا اب میں قصیدہ کو اِک دُعا پر ختم
کہ جس کے طرزِ بیاں میں ہوں تازہ نقش و نگار

دُعاء

رہے زمانہ میں جب تک زمین کو گردش
بنائیں زاویہ تا محور اور سطحِ مدار

رہے زمین پہ تا ایک سال کے اندر
برابری میں سدا امتدادِ لیل و نہار

رہے زمین میں تا قوتِ کشش باقی
اور اِس کشش سے گریں ٹوٹ ٹوٹ کر اثمار

یہ ایک چاند رہے تا زمین کا خادم — جلو میں تا زحل و مشتری کے ہوں اقمار
رہے نجوم میں جب تک زمین سیّارہ — اور آفتاب رہے مثلِ نقطۂ پرکار
خدا ہر ایک مسلمان کو کرے روزی — معاشِ نیک و دلِ پاک و خوبیٔ کردار

حصولِ علم و رہِ مستقیم و فہمِ سلیم
جمالِ صورت و معنی۔ کمالِ عز و وقار

(۹۱) نوائے زمستاں ۱؎

سوارِ جہاں گردِ خورشیدِ رخشاں — گیا تا جدی جب بہ تقدیرِ یزداں
تو ماہِ دسمبر کی پچّیسویں کو — ہوا جانبِ استوا گرمِ جولاں
مگر استوا پر نہ ٹھہرے گا ہرگز — کرے گا سفر تا گزرگاہِ سرطاں
نہیں خطِّ سرطان بھی جائے توقّف — وہاں سے بھی پلٹے گا اُفتاں و خیزاں
رہے گی اِسی طرح اُس کی تگ و دو — کہ ہے گردشِ گوئے محکومِ چوگاں
کبھی بُقعۂ نور ارضِ جنوبی — کبھی سرزمینِ شمالی دُرخشاں
اگر ایک جانب خزاں کا عمل ہے — تو ہے دوسری سمت فصلِ بہاراں
اگر صُبحدم شرق ہے اُس کا منظر — تو ہے شام کو غرب اُس کا شبستاں
کہیں دن ہے مستورِ ظلماتِ شب میں — کہیں رات دن کی تجلّی میں پنہاں
کسی منطقہ میں ہے گرمی کی شدّت — کسی جا ہے آغازِ فصلِ زمستاں

نوٹ ۱؎ دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء

جو سوچو تو یہ اختلافاتِ بیّن
ہیں دَر اَصل آثارِ الطافِ رحماں

کرو حمدِ خلّاقِ عالم کہ جس نے
بنائے مہ و مہر و مرّیخ و کیواں

چُنی دستِ قدرت نے کن جو ہوں سے
جبینِ فلک پر ستاروں کی افشاں

زمیں کے کُرے پر کیئے اُس نے پیدا
جماد و نبات اور انسان و حیواں

پھر انساں کو اپنا خلیفہ بنایا
کیا اُس کو ماٴمورِ عدل اور احساں

سُنو عدل اقرارِ توحیدِ حق ہے
اور احساں ہے تصدیق و تکمیلِ ایماں

زباں سے بھی دل سے بھی افعال سے بھی
کرو پہلے ثابت کہ ہم ہیں مسلماں

مسلمانِ کامل کی ہے کیا نشانی؟
کرے خدمتِ خلق تا حدِّ امکاں

مگر ایسی خدمت کہ پُر منفعت ہو
نہ ایسی کہ جس کا نتیجہ ہو نقصاں

گدایانِ مُبرَم کو گر آج دوگے
تو پاؤ گے کل صبح پھر اِن کو نالاں

نہ دیتے تو کچھ یہ بھی کھاتے کماتے
یہ دُنیا ہے مُستلزِمِ قتلِ انساں

جو منگتا گدا ہیں تو داتا گدا گر
گدا اگر کے معنی انھیں پر ہیں چسپاں

امیرانِ ماضی بھی تھے بادشا گر
تفاوت بہ بیں و مکن شکوہ چنداں

گدایانِ مُلتاں کی شہرت تھی آگے
مگر اب تو ہر شہر و قصبہ ہے مُلتاں

ذرا جمعہ کے روز مسجد میں دیکھو
کہ ہر صف میں ہیں کتنے سائل خراماں

خطیب اور واعظ کو ہوتی ہے دِقّت
مچاتے ہیں جب شور پھیلا کے داماں

نہیں اِن سے خالی گلی اور کوچے
نہیں اِن سے محفوظ بازار و دکّاں

نہیں کوئی ہنگامۂ شادی و غم
نہ ہو جس میں جوش و خروشِ گدایاں

ترقّی پہ ہے مُفت خوری کا پیشہ
گدائی کا سیلاب ہے رو بطغیاں

اِنھیں کھو دیا دین و دُنیا سے تم نے
ہزار آفریں ہے کیا خوب احساں

نہیں جورِ دشمن کی حاجت کچھ اُس کو
کہ جس قوم کے ہوں شفیق ایسے ناداں

غلط بخشیوں نے بنایا اپاہج
ہے اوروں کے کندھے پہ اک نعشِ بیجاں

مُبرّات و خیرات ہرگز نہیں یہ
بفتوائے عقل و بفحوائے قرآں

لہو قوم کا جو پیئے جونک بن کر
تو امداد اُس کی ہے بدتر زِ عصیاں

جو دی ایک کوڑی بھی نا مُستحق کو
چُبھویا غریبوں کے پہلو میں پیکاں

حقیقت میں مُحتاجِ امداد ہیں جو
نہیں کوئی احوال کا اُن کے پُرساں

کوئی آستیں اُن کے آنسو نہ پونچھے
ہے اشکِ مصائب سے نم جن کی مژگاں

دلوں ہی میں کھاتے ہیں جوش اُن کے نالے
لبوں سے نکلتی نہیں اُن کے افغاں

خوراک اور پوشاک اُن کی نہ پوچھو
دمِ آب حاصل نہ پیدا لبِ ناں

نہ گرمی میں چادر نہ جاڑے میں کملی
نہ ثابت ہی دامن نہ سالم گریباں

نہ تنکے نہ پتّے کہ تاپیں جلا کر
نہیں مہرباں کوئی جُز مہرِ تاباں

کرے کون یاد اُن کو وقتِ ضیافت
کرے کون اُن کی جڑاول کا ساماں

وہ گرمی میں ہیں مثلِ ماہی تڑپتے
وہ جاڑے میں ہیں صورتِ بید لرزاں

مُعاون ہیں جو پیشہ ور بھک منگوں کے
سمجھتے نہیں یہ بزرگ اُن کو انساں

نہیں غم کسی کو مصیبت زدوں کا نہ فکرِ ایامٰے، نہ ذکرِ یتیماں
عیالِ خدا کی مدارات ایسی؟ اور اُس پر یہ دعویٰ کہ ہم ہیں مسلماں
پھر اِن سے بھی اک فرقہ محتاج تر ہے کہ حاجات ہیں جس کی از بس نمایاں
وہ علمی فلاکت کے مارے ہوئے ہیں جہالت نے کاٹی ہے اُن کی رگِ جاں
حمیّت بہت مُضمحل ہو گئی ہے شرافت بھی ہے اب کوئی دن کی مہماں
بنا کر رہے گی زمانہ کی گردش اُنھیں خلعتِ آدمیت سے عُریاں
جو اُن کی طرف سے رہی قوم غافل تو کُل قوم کہلائے گی ننگِ حیواں
نہ ہوگا کوئی چارۂ کار ہرگز جو بعد از خرابی ہوئے بھی پریشاں
کبھی وقتِ فرصت میں سوچا بھی حضرات! کچھ اِس دردِ جاں کاہِ قومی کا درماں
یہ بچّے جو پھرتے ہیں آوارہ جاہل گھسٹتے ہیں کانٹوں میں گُل ہائے خنداں
یہی بننے والے ہیں ارکانِ قومی جو ارکان بودے تو ایوان ویراں
انھیں پر ہے موقوف اعزازِ ملّت بناؤ اِنھیں جلد زیبِ دبستاں
ہُنر ہائے کسبِ معیشت سکھاؤ کہ اِن کو ستائیں نہ سگہائے درباں
جہاں تک بنے اہلِ تقویٰ بناؤ کہ تقویٰ ہے بیعانۂ باغِ رضواں
کرو اِن کی شائستگی پر توجّہ کہ اِن سنگ ریزوں میں ہیں لعل پنہاں
اگر بحرِ معنی میں دو غسل اِن کو تو بن جائیں یہ غیرتِ دُرّ و مرجاں
جو کوشش کرو تو انھیں میں سے پیدا ابوالفضل و فیضی ہوں اور خانِ خاناں

کرو تربیت تو اِنھیں میں سے اُٹھّیں
فلاطونِ عہد اور بُقراطِ دوراں

یہی شافعی ہوں یہی بوحنیفہ
سکھاؤ اگر سرِّ احکامِ فرقاں

خُمِ صبغۃُ اللہ گر ہو مُیسّر
تو بن جائیں یہ پیرِ بسطام و خرقاں

جو ہوں اِن کے اعمال و اقوال راسخ
تو دُنیا میں کہلائیں یہ مردِ میداں

جو کسبِ معیشت سے کورا ہی رکھّا
تو فقر اور فاقہ سے ہوں گے پریشاں

گر اوباش و بدراہ اِن کو بنایا
تو ہو جائیں گے رونقِ کُنجِ زنداں

بناؤ گے جو چیز بن جائیں گے یہ
فرشتہ بناؤ اِنھیں خواہ شیطاں

نہ کی ہم نے افسوس اُس وقت پروا
کہ تعلیم و تدریس تھی سخت ارزاں

ہمارے لئے برقِ خرمن بنا وہ
جو اوروں کے کھیتوں میں تھا ابرِ نیساں

ہماری ہی غفلت کا ہے یہ نتیجہ
نہیں کچھ خطائے فلاں اور بہماں

تغافل ہے اب باعثِ شرم و غیرت
تساہل ہے اب مُوجبِ ننگ و خذلاں

گیا دورِ پنجاہ سالہ مگر ہم
اُنھیں مخمصوں میں ہیں غلطان و پیچاں

گرفتارِ جہلِ مُرکّب ہیں یعنی
نہ عالِم نہ جاہِل نہ شہری نہ دہقاں

زمانہ بہت رائے گاں ہم نے کھویا
نہیں حاصلِ وقت جز یاس و حرماں

خلف سُرخ رُو ہوں تو مُنہ لیکے بولیں
سَلَف ہی کے ہیں کارناموں پہ نازاں

کسی کو ہو دعویٰ تو آکر بتائے
کیا کونسا ہم نے کارِ نمایاں

فتوحاتِ علمی میں کچھ نام پایا؟
کیا تازہ خطّہ کوئی زیرِ فرماں

کیا کوئی ایجاد ایسا سفینہ؟ کہ اُڑتا ہو مانندِ تختِ سلیماں
جو ہوتی ضرورت تو ایجاد کرتے مَثَل ہے "ضرورت ہے ایجاد کی ماں"
صناعت میں، حرفت میں، سوداگری میں کیا ہو جو کچھ بھی تو بولو مگر ہاں
ضرورت میں داخل ہے ناول نگاری ہیں ناول نگاری پہ شیدا سخنداں
ہوئے خواب ہر چند اگلے فسانے نہ وہ نجد و ناقہ نہ خارِ مغیلاں
نہ زنبیلِ عیّار و لوحِ طلسمی نہ دیوانِ قاف اور نہ اندر کی پریاں
مگر ناولوں میں بہ تقلیدِ یورپ پُرانا مرض ہے بہ تبدیلِ عنواں
بہا پھوٹ کر دوسری سمت پھوڑا وہی خلطِ فاسد ہے مائل بسیلاں
ہمارے یہ قومی رسالے تو دیکھو کھلاتے ہیں کیا گُل خیابان خیاباں
ہماری غذا ہیں یہ ماہانہ پرچے تغزّل کا تیار ہے خوانِ الواں
جوانانِ نوخواستہ بن گئے ہیں ہزاروں غزل گو ہزاروں غزل خواں
جو واجد علی شاہ کے دور میں تھیں ہیں غزلوں میں اب بھی وہی رنگ رلیاں
قتیلِ دہان و کمر ہیں ہزاروں تو لاکھوں ہیں وارفتۂ چشمِ فتّاں
چراغِ حنر ُدگُل ہے پر اپنے تن کو بناتے ہیں داغوں سے سروِ چراغاں
پڑی گھر میں ہنڈیا تو پکتی ہے پھیکی لبِ زخمِ دل پر ہے شورِ نمکداں
پہر دن چڑھے آپ اُٹھتے ہیں سو کر مگر صبحِ محشر ہے چاکِ گریباں
نہ سیکھا حساب اور نہ فنِ مساحت رہے ناپتے طولِ شب ہائے ہجراں

زمانے میں ہیں پیش مُلکی مسائل
کہ نظم و سیاست کا ہے دَور دَوراں

ہماری ہے یہ نظم اور یہ سیاست
کہ دُرِّ عدن آب ہے پیشِ دنداں

لبِ لعل کو دیکھ لے خواب میں گر
تو بہہ جائے خوں ہو کے لعلِ بدخشاں

کشش اور کوشش کا ہے وقت لیکن
یہاں پیش ہیں یہ خُرافات و ہذیاں

اُڑی پھر رہی ہیں تجارت کی ریلیں
ہے صنعت کی جانب بھی لوگوں کا رُجحاں

ہمیں بھی تو ہیں یاد لفظی صنائع
ہمیں بھی تو از بر ہے سودا کا دیواں

نہیں آنریبل تو کیا غم کہ ہم ہیں
سخن کی قلمرو کے فغفور و خاقاں

دعا ہے کہ دنیا ہو اور شاعری ہو
چہکتے رہیں بُلبلانِ خوش الحاں

نہیں کوئی دُنیا و عقبیٰ کا دھندا
بس اب رہ گئے ہیں ہمارے یہ ارماں

اگر کوئی شاعر کا پوچھے مُرادف
بلا خوفِ تردید کہہ دو مسلماں

خبر لی نہ اب بھی تو بس قوم ڈُوبی
کہ بڑھتا ہی جاتا ہر لمحہ طوفاں

نظامِ تمدّن کا صحرائے اعظم
مہامِ معیشت کا دریائے عُمّاں

ہمیں پار کرنا ہے لیکن کریں کیا؟
نہ کشتی نہ لنگر نہ خر ہے نہ پالاں

گئے قافلے سب مگر ہم کھڑے ہیں
کنارہ پہ انگشتِ حیرت بدنداں

زمانہ کے پُرزور بازو نے کی ہے
عَلَم انقلابات کی تیغِ بُرّاں

نہیں روک سکتا کوئی وار اُس کا
نہ گودرز و رستم نہ سام و نریماں

نہ طُغرل نہ سنجر نہ تیمور و بابر
نہ مصر و مراکو نہ ترکی نہ ایراں

سر و سینہ و دست و بازو بچا کر — نہ لے جائے گا کوئی بے ساز و ساماں
حفاظت کا ساز اور ساماں کیا ہے؟ — ہُنر خود ہے اور ہے علم خفتاں
نہیں غیرِ فضل و ہُنر کوئی مامن — حوادث کا جس وقت ہو تیر باراں
جو باقی حمیّت کی کچھ بھی رمق ہے — تو شیخ اور سیّد مُغل اور افغاں
امیر و غریب اور ادنیٰ و اعلےٰ — قُلی اور تاجر گدا اور سُلطاں
کسان اور مزدور عامی و عالم — جوان اور بڈھے رجال اور نسواں
تقاضائے وقت اور ضرورت کو سمجھیں — بنیں ایک کے ایک انصار و اعواں
فروعی نزاعات کو محو کردیں — بھلا دیں بس اب فرقِ ایران و توراں
جو آپس میں ہوں تفرقے سب مٹا دیں — خصومت پہ اب کھینچ دیں خطِّ بُطلاں
کریں جلد مل جُل کے تدبیر ایسی — کہ بچے بنیں رشکِ اَمثال و اَقراں
بہت اگلی قوموں کو دورِ زماں نے — بنایا ہے گُل دستۂ طاقِ نسیاں
نہیں چھوڑتا اُن کی ہڈّی نہ پسلی — جنھیں کوٹتا ہے زمانہ کا سنداں
جو اپنی مدد کی نہ ہم نے تو ڈر ہے — بنا دے نہ ہم کو بھی گردِ بیاباں
نہیں وقت وہ اب کہ بند آنکھ کرکے — کسی صومعہ میں رہو بن کے رہباں
اُٹھو قوم کی آبرو کو بچاؤ — نہ بننے دو ہرگز غلامِ غلاماں
حدودِ جہالت سے اِن کو نکالو — کرو رہبری مثلِ موسیٰ عمراں
ہُنر کی جہاں دیکھ لو آبیاری — جہاں علم کا تازہ ہو باغ و بُستاں

وہیں ڈال دو قوم کے جا کے ڈیرے | چُنو علم و حکمت کے گُل اور ریحاں
مگر یہ سمجھ لو کہ جینا ہے مُشکل | نہ مُحکم ہوں گر زندگانی کے ارکاں
دماغ اور دل ہو نہ تن میں سلامت | تو بے کار ہیں سب عصب اور شریاں
اِسی طرح تعلیم قومی کا مرکز | اگر ہو نہ قومی ضرورت کے شایاں
تو ہیں سب ہمارے خیالاتِ باطل | ترقّی کا سودا ہے خوابِ پریشاں
کرو ورسٹی اپنی پہلے مُکمّل | اِسی پر ہے موقوف کُل جبرِ نقصاں
بہم تربیت ہو دِلی اور دماغی | رہیں ہم قدم علمِ ادیان و ابداں
اگر قوم کی زندگی چاہتے ہو | تو ہے ورسٹی چشمۂ آبِ حیواں
اطبّائے حاذق کی تجویز ہے یہ | گھٹے گا اِسی سے مذلّت کا یرقاں
تلافئ مافات کا گُر یہی ہے | کمر باندھ لو اور بنو مردِ میداں
اُٹھا دو سمندِ عزیمت کی باگیں | بجا دو بس اب کوسِ ایثار و احساں
گرجنے لگے ابرِ جود و کرم کا | برسنے لگے دام و درہم کا باراں
چمکنے لگیں بجلیاں سیم و زر کی | اُبلنے لگے چشمۂ جیب و ہمیاں
خزینہ دفینہ نہیں ہے تو کیا غم | نہ ہونا نہ ہونا ہراساں
زراہِ خلوص ایک کوڑی بھی دو گے | تو رکھے گی وہ قدرِ لعلِ بدخشاں
کرو جمع جو جو تو ہو جائیں سو سو | بنے قطرہ قطرہ سے دریائے عُمّاں
ہزاروں سے بڑھ کر ہو لاکھوں پہ نوبت | ہو لاکھوں سے بڑھ کر کروڑوں کی میزاں

جو ہمّت کروگے تو حامی خدا ہے　　خدا کے سوا کون ہے میرِ ساماں
ہے اُمّیدِ واثق کہ سرمایہ کافی　　خزانہ میں داخل ہو تا ماہِ رمضاں
جو دریا دلی قوم لے گی تو فوراً　　ہمارے امیر[1] اور نواب[2] اور خاں[3]
کریں گے یہ کوشش کہ اس ورسٹی کا　　مزیّن ہو طغرائے شاہی سے فرماں
بہ نفسِ نفیس آئیں شاہِ معظّم　　کریں حصنِ علمی کی مرصوص بنیاں
کرو جدّ و جہد اب خدا کے بھروسے　　ہمارا تمہارا خدا ہے نگہباں

کمر بستہ ہو کر کرے کام بھی کچھ
سُنے جو کوئی یہ نوائے زمستاں

(۹۲) خدائی لشکر[4]

اے عزیزو کہ ہو تم زیبِ صفِ علم و ہنر　　اک کہانی مجھے کہنی ہے اجازت ہو گر
دم بدم عالمِ دُنیا میں بڑی دھوم کے ساتھ　　کوچ کرتا ہوا آتا ہے خدائی لشکر
جا بجا آکے وہ کرتا ہے تصرّف اپنا　　کاخِ شاہانہ ہو کھپریل ہو یا ہو چھپّر
چپکے چپکے وہ کیا کرتا ہے اپنا حملہ　　ظاہرا ہاتھ میں بندوق نہ خنجر نہ تبر
ایک دن لشکرِ سابق کو وہ دیتا ہے شکست　　یعنی اس ملک سے کر دیتا ہے بالکل باہر
روک تھام ایسے لٹیروں کی ہے اک امرِ محال　　جس کو دیکھو وہ سمجھتا ہے انھیں لختِ جگر

---

[1] جسٹس سیّد امیر علی [2] نواب وقار الملک۔ [3] سر آغا خاں۔

[4] جو ۵ / اگست ۱۹۱۱ء کو مسلم کلب الہ آباد کی ایوننگ پارٹی میں پڑھا گیا یہ پارٹی جناب آنریبل نواب عبدالمجید صاحب نے مولانا کے اعزاز میں دی تھی۔

تازہ مہمان ہو وارد تو مناتے ہیں خوشی
لشکری پہلے سے جو آئے ہیں طے کر کے سفر

آنے والے کا عجب حال ہے اِک مُضغۂ گوشت
اپنے ہر کام میں اغیار کا ہے دست نگر

تن پہ کپڑا ہے نہ ساتھ اُس کے ہے سامانِ سفر
چھولداری ہے نہ ڈیرا نہ بغل میں بستر

لیکن آتے ہی وہ پاتا ہے مُہیّا ہر چیز
خانہ و خادم و احبابِ عنایت گُستر

آسماں ایسا بلند اور زمیں ایسی فراخ
خاک و باد آب و ہوا روشنیٔ شمس و قمر

سر بسر روئے زمیں مائدۂ آب و طعام
سر بسر بطنِ زمیں معدنِ لعل و گوہر

یوں تو ہر چیز کی اِفراط ہے پر شرط ہے یہ
نہ ملے کچھ بھی اُسے جو نہ بنے غارتگر

ہر سپاہی کو ہے سرکار سے یاں لوٹ معاف
سب کی ہوتی ہے، اسی مالِ غنیمت پہ بسر

پہلے حملہ میں وہ کرتا ہے ہوا کو تسخیر
پھینکتا ہے اُسے ہر سانس میں اندر باہر

دوسرے حملہ میں کرتا ہے خوراک اپنی تلاش
چوستا ہے لبِ نازک سے وہ شیرِ مادر

بعد ازاں لُقمہ چبانے کی ورزش لازم
تا قوی جُثّہ بنے عُمدہ غذائیں کھا کر

تیسرے حملہ میں کرتا ہے وہ مشقِ رفتار
گھر کی انگنائی میں پھرتا ہے اِدھر اور اُدھر

کبھی گرنا کبھی اُٹھنا کبھی چوٹیں کھانا
تجربہ دل سے مٹا دیتا ہے سب خوف و خطر

دیکھتا بھالتا ہے فرقِ خواصِ اشیاء
گھر کی جُغرافیہ دانی بھی ہے منظورِ نظر

پے بہ پے راہِ ترقّی میں بڑھاتا ہے قدم
شہر و بازار و عمارات سے کرتا ہے گذر

ہر نئی شکل کا نظّارہ ہے اِک تازہ سبق
جو نئی بات پڑی کان میں ہے تازہ خبر

چھوٹی باتوں کو بھی رکھتا ہے بڑے شوق سے یاد
ہے یہی اُس کے لئے فنِّ تواریخ و سیر

ہر گھڑی کرتا ہے وہ ایک نیا باب شروع — سامنے اُس کے کھلی ہے یہ خدائی ریڈر
ایسی ریڈر کہ نہ الفاظ ہیں جس میں نہ حروف — صرف تصویریں ہی تصویریں ہیں اُس کے اندر
کوئی ہل جوتنے والا ہو کہ علاّمۂ عصر — ہر زمانہ میں بنی ہے یہی سب کی رہبر
اُس میں صنّاع نے کھینچی ہیں عجب تصویریں — جن کے پردہ میں مطالب ہیں ہزاروں مُضمر
جب کہ اُس لوٹ سے کرتا ہے ذخیرہ کچھ کچھ — عقل کہتی ہے۔ نہ رکھ لوٹ میں زنہار کسر
جو ذخیرے کہ یہاں چھوڑ گئے ہیں اَسلاف — اُن کو لا قبضہ میں اپنے کہ ہے میراثِ پدر
اب وہ اِک قلعہ پہ کرتا ہے چڑھائی ہر روز — سج کے ہتھیار نکلتا ہے وہ رَعنا پیکر
بینچ اسکول کی ہے مورچہ اُس کا پہلا — پنسل اُس کی ہے شمشیر سلیٹ اُس کی سپر
دوسرا مورچہ کالج کی ہے اعلیٰ تعلیم — جس سے کچھ ہوتے ہیں منکشف اُمورِ نیچر
پھر ریاضی و طبیعی کے کھلے کچھ اَسرار — ہوئے معلوم کواکب کے مَدار و محوَر
یا فنونِ اَدبیّہ میں کیا کسبِ کمال — خوب میدانِ فصاحت میں لگائے چکّر
یا کیا نظم و سیاست میں توغّل پیدا — یا پڑھا فلسفہ اور عقل نے کھولے شہپر
کیا یہی حاصلِ اوقات ہے سرمایۂ ناز — کیا یہی علم ہے اِنسان کا اصلی زیور
سُنئے سرہنگِ الٰہی ہم اُسے کہتے ہیں — لوٹ سے سیر نہ ہو اور کبھی کھولے نہ کمر
دولتِ علم و عمل کو وہ غنیمت جانے — حملے کرتا ہی رہے صورتِ تُرکانِ تتر
اور اخلاق بھی ہوں نور کے سانچے میں ڈھلے — ورنہ بے اُس کے نکمّے ہیں دماغی جوہر
بات جب ہے کہ بنو آپ مُعلّم اپنے — اپنی ہی خُم سے بھرو اپنا سُبو اور ساغر

فخر کی بات نہیں یہ کہ ہے اب تک موجود — دونوں دریاؤں کے سنگم پہ بنائے اکبر
کوئی فیضی و ابوالفضل تو دکھلائیگا — یا یہی اگلے زمانہ کے مُبارک پتھّر
خالی کرنے کو ہیں سیٹ اپنی کُہن سال بزرگ — بس کہ دُنیا میں نہیں اس سے کسی کو بھی مفر
تم کو موقع ہے کہ پھر زندہ کرو قوم کا نام — بننے والے ہو تُمہیں قوم کے اعلیٰ ممبر

شاملِ حال رہے فضلِ الٰہی ہر آں
تُم سلامت رہو تا دیر باقبال وظفر

(۹۳) طلسماتِ جہاں[لہ]

قعرِ دریا میں نہ طوفاں ہے نہ موج و گرداب — خشک ہے آبِ رواں بحر میں قطرہ نایاب
نہ تو حاصل میں طلب ہے نہ طلب میں حاصل — خبط ہیں جملہ سوال اور ہیں بیہودہ جواب
نہ پتا ہے نہ ٹھکانا نہ کوئی راہ و مقام — یعنی الآن کما کان نہ مبدا نہ مآب
نہ اِدھر کوئی مزہ ہے نہ اُدھر بدمزگی — رونق صومعہ باقی نہ خرابات خراب
ہیں تو ہر قسم کے مطلب مگر اس نسخہ میں — نہ کوئی لفظ نہ جملہ۔ نہ کوئی فصل نہ باب
بھُوکے مرتے ہیں شکم سیر پیاسے ہیں غریق — خاک صحرا میں نہیں آب کے جو یا تالاب
ایک ثمرہ ہے یہاں غفلت و آگاہی کا — خواب اعمیٰ ہے مگر حالتِ بیداری و خواب
وہی ہوتا ہے جو پہلے سے ہُوا رکھا ہے — نہ طریقہ ہے خطا کا نہ کہیں راہِ صواب
نہ تو بے کار تسلّی ہے نہ آرام بکار — نہ سفینہ ہی رواں ہو نہ یہ دریا پایاب

لہ پیرجی غلام محمد صاحب مرحوم وکیل و رئیس لدھیانہ مصنّف کے برادرانِ طریقت میں سے تھے جن کے واسطے یہ نذرانہ ۱۷؍جون ۱۸۸۱ء کو مرتب کیا گیا

خواہشِ وصل غلط۔ سعیِ تقرّب بے سود — نہ کوئی واسطہ حائل ہے نہ پردہ نہ حجاب
نہ مکاں ہے نہ در و بام ہے ویرانہ میں — بُتکدہ ہے نہ کلیسا ہے نہ طاق و محراب
نہ کوئی دوست نہ دشمن نہ مخالف نہ رفیق — نہ کوئی قابلِ رحمت۔ نہ سزاوارِ عتاب
یہ نہیں وہ بھی نہیں کہتے ہیں کہنے والے — اور جو پوچھو کہ وہ ہے کیا؟ تو نہیں کچھ بھی جواب

آج نذرانہ بہ تعجیل کیا ہے تیار
منتظر ریل کے ہیں پیرِ معلّی القاب[۱]

(۹۴) فریبِ خیال

نہ جدائی ہوئی کبھی نہ وصال — ہے یہ قرب و وصال وہم و خیال
کُنجِ وحدت ہے غیر سے خالی — کہ گمانِ دوئی ہے امرِ محال
بحرِ وحدت میں سب ہیں مستغرق — روح و جسم و حواس و علم و کمال
جنبشِ موج ہے یہ ہنگامہ — شادی و رنج و خرّمی و ملال
نقش بر آب ہیں یہ سب حرکات — ذکر و فکر و وظائف و اشغال
کیا ہے اِس جدّ و جہد سے حاصل — ثمر و سبزہ نہر و نخل و نہال
نہ یہاں شاہدی نہ مشہودی — دست بے یارہ پائے بے خلخال
ہے یہاں نسبت و اضافت ہیچ — ہستی و نیستی بھی ہے پامال
نہ بدایت ہے نے نہایت ہے — نہ امیدِ بقا۔ نہ بیمِ زوال

---

۱ پیر جی غلام محمد صاحب مرحوم وکیل و رئیس لدھیانہ مصنّف کے برادرانِ طریقت میں سے تھے جنکے واسطے یہ نذرانہ مرتّب کیا گیا

نہ تو مسلک۔ نہ منزلِ مقصود　　نہ طریق و روش نہ راہ و مجال
آنِ واحد ہے جو ہوا سو ہوا　　وقتِ ماضی یہاں نہ استقبال
جنس خود مشتری و خود قیمت　　مشتری خود ہے جنس کا دلّال
عشقِ گوہر نے کر دیا مفلس　　ورنہ کانِ گہر ہے مالا مال
طلب و جستجو ہے گمراہی　　شوقِ پرواز نے بچھایا جال
بے تعلّق نہیں تلاش و طلب　　بے تخیّل نہیں ہے فکرِ مآل
رہنمائی ہے وجہ راہزنی　　ہو گئے نامہ و پیام وبال
کی جو فکر و قیاس نے حرکت　　ہوئی پیدا شبیہ و شکل و مثال
خالقیّت ہے باعثِ مخلوق　　موجبِ نقص ہو گیا ہے کمال
بُعد ہے قرب کی طلبگاری　　جمع نے تفرقہ دیا ہے ڈال
کامیابی ہے وجہ ناکامی　　بحر اور اشتیاقِ آب زلال
تپشِ آفتاب وحدت سے　　جلتے ہیں مرغِ عقل کے پر و بال
دل ہے گویا زبان ہے خاموش　　سطح میداں فراخ و تنگ مجال

اِس خرافات کو کریں منظور
پیر لُدھیانوی گرو گھنٹال

(۹۵) جاڑہ اور گرمی[1]

ایک دن جاڑے نے گرمی سے کہا
میں بھی ہوں کیا خوب موسم واہ وا!
ہے بجا گر کیجیے میری صفت
ہے روا۔ گر کیجیے میری ثنا
میں جہاں میں ہوں زبس ہر دل عزیز
مانگتے ہیں میرے آنے کی دعا
میرے آنے سے نہ ہو کیوں خرمی
کیا خنک پانی ہے! کیا ٹھنڈی ہوا
چاندنی ہے بے کدورت بے غبار
آسماں ہے صاف نیلا خوشنما
رات گرمی کی تو کچھ ہوتی نہ تھی
دن کی محنت سب کو دیتی تھی تھکا
میری آمد نے کیا شب کو دراز
میرے آنے نے دیا دن کو گھٹا
لو مسافر کا جھلس دیتی تھی منہ
اور زمیں تلووں کو دیتی تھی جلا
اب ہوا بھی اور زمیں بھی سرد ہے
کھو دیا میں نے حرارت کا پتا
مل گئی کتنے بکھیڑوں سے نجات
ٹٹیاں موقوف پنکھا چھٹ گیا
دھوپ کا ڈر ہے نہ لو کا خوف ہے
اِن دِنوں کی دھوپ ہے گویا غذا
سورج اب کترا کے جاتا ہے نکل
فصل تابستاں میں تھا سر پر چڑھا
ہے حضر میں آج کل عیش و نشاط
ہے سفر بھی اِن دنوں راحت فزا
میرے دم سے تندرستی بڑھ گئی
پائی مدت کے مریضوں نے شفا
ڈاکٹر صاحب کو فرصت مل گئی
اب شفاخانہ میں کم ہے جمگھٹا

---

[1] مرتبہ ۱۸۸۸ء ۶ ۱۲۔

ضعف معدے کی شکایت مٹ گئی — بے دوا خود بڑھ گئی ہے اشتہا
مکھیاں بھی رہ گئی ہیں خال خال — بے تکلّف اب ہے کھانے کا مزا
گرم پوشاکوں نے اب پایا رواج — میں نے بخشا آن کر خلعت نیا
سِل گئے توشک لبادے اور لحاف — درزیوں نے پایا محنت کا صلہ
میرے ہوتے کون پوچھے برف کو — باسی پانی برف کا بھی ہے چچا
ندی نالوں کا گیا پانی نتھر — جھیل اور تالاب نے پائی صفا
طالب علم اب کریں گے کوششیں — کوششوں سے ہوگا پورا مدّعا
ٹھیک وقت اُن ورزشوں کا ہے یہی — تندرستی کا ہے جن سے فائدہ
کرکٹ اور فٹ بال اور جمناسٹک — کرتے ہیں مضبوط جسمانی قُوا
حاکموں نے کر دیا دورہ شروع — تا کریں دردِ رعایا کی دوا
جا بجا فوجیں ہوئی ہیں مجتمع — تاکہ میداں میں کریں مشقِ وغا
سیب۔ نارنگی۔ بہی۔ لیمو۔ انار — ذائقہ ہے جن کی صورت پہ فدا
پستہ و بادام انگور و مویز — میوہ ہر اک قسم کا بکنے لگا
تخم ریزی جنس اعلیٰ کی ہوئی — کھیت میں بویا گیا گیہوں چنا
عید کی سی دھوم ہے دیہات میں — پک گئی ایکھ اور کولھو چل پڑا
ہے مٹھائی کی نہایت ریل پیل — چل رہی ہے آج کل میٹھی ہوا
اُنس ہے محنت مشقّت سے مجھے — کاہلی کو میں نہیں رکھتا روا

محنتی ہیں مجھ سے خوش ہیں اُن سے خوش　　کاہلوں کا میں نہیں ہوں آشنا

سُن کے یہ باتیں ہوئی گرمی بھی تیز　　اور جل کر یوں جواب اُس کو دیا

آپ اپنے مُنہ میاں مٹھّو نہ بن　　خودستائی عیب ہے او خودستا

اُس کو ہوتا ہی نہیں حاصِل کمال　　جو کہ اپنے آپ کو سمجھے بڑا

باہنر تو سرکشی کرتے نہیں　　بلکہ سر کو اور دیتے ہیں جُھکا

تیری خود بینی ہوئی تجھ کو حجاب　　خوبیوں کو میری سمجھا بدنُما

تجھ سے عالم میں خزاں کا ہے ظہور　　مجھ سے ہے فصلِ بہاری کی بنا

تو نے شاخوں کے دئے پتّے کھسوٹ　　تو نے پیڑوں کو برہنہ کر دیا

میرے آنے سے پھلے پھولے شجر　　سبز پوشاک اُن کو میں نے کی عطا

میں نے شاخوں میں لگائے برگ و بار　　ورنہ تھا کیا اُن میں ایندھن کے سوا؟

کھیت جاڑے بھر تو کچّے ہی رہے　　ہاں مگر میں نے دیا اُن کو پکا

تو نے رکھّے تھے بخیلوں کی طرح　　برف کے تودے پہاڑوں میں چھپا

میں نے پگھلا کر کیا تقسیم اُسے　　تاکہ پُہنچے سب کو فیض و فائدہ

خشک چشمے بھر گئے دریا چڑھے　　دیکھ لے میرا کرم میری سخا

تجھ سے تھی مخلوق میں افسردگی　　کون خوش تھا؟ جز گروہِ اغنیا

میری آمد نے مساوی کر دئے　　راحت و آرام میں شاہ و گدا

کر دیا میں نے رگوں میں خوں رَوا　　ٹھنڈ سے شل ہو گئے تھے دست و پا

میں نے کھولے آن کر تن کے مسام　کیونکہ تھا رکنا پسینہ کا بُرا
پھینک دی اب دُلق کہنہ خلق نے　غلغلہ جو میری آمد کا سُنا
رات بھر رہتی تھی خلقت گھر میں بند　کر دیا اُس بند سے میں نے رہا
ماری پھرتی تھیں بطیں پردیس میں　میں ہوئی اُن کو وطن کی رہنما
لو۔ اُٹھا کر لے چلے غلّہ کسان　اب کریں گے قرض بنیوں کا ادا
میں نے حکمت سے چلائیں آندھیاں　تا بدل جائے مکانوں کی ہوا
میں سمندر سے اُٹھاتی ہوں بخارُ　جس سے چھا جاتی ہے ملکوں پر گھٹا
چہرۂ گردوں کا یہ گرد و غبار　ابر کے آنے کا دیتا ہے پتا
رات پر دن کو نہ کیوں ترجیح دوں　رات ہے تاریک دن ہے پُر ضیا
ہے ہمیشہ ابتدا میری بہار　ہے سدا برسات میری انتہا
تھیں غرض دونوں کی تقریریں دراز　اور طولانی بیانِ ماجرا
سُن کے اِن دونوں کی یہ کج بحثیاں　ایک دانا نے کیا یوں فیصلہ
کچُھ نہیں ہے اس میں جاڑے کا قصوُر　کچُھ نہیں ہے اِس میں گرمی کی خطا
جب حقیقت پر نہیں ہوتی نظر　یوں ہی رہتا ہے بہم شکوہ گلا

ہے حرارت کی کمی بیشی فقط
ورنہ جاڑا کون؟ اور گرمی ہے کیا؟

(۹۶) خشک سالی[۱]

نہ آئی - پر نہ آئی پر نہ آئی
گھٹا نے بول دی بالکل صفائی

اگر آئی تو کی لے دے ہوا نے
سواری اور جانب کو بڑھائی

گئے دریا اُتر - تالاب سُوکھے
کجائی ابر دریا دل کجائی؟

نہ صحرا میں دل آویزی کا انداز
نہ بُستاں میں ادائے دل کشائی

نہ صحنِ باغ میں طوطی کا نغمہ
نہ شاخِ گل پہ بلبل چہچہائی

زمین چٹیل ہے کورا آسماں ہے
ہوئی اب کے برس اچّھی صفائی

نہ روئے رل کے ساون اور بھادوں
ہوئی ہے ترک باہم آشنائی

نہ تانا شامیانہ ابر تو نے
نہ اب کے رعد نے نوبت بجائی

نہ وہ جگنو نہ وہ راتیں اندھیری
نہ وہ کالی گھٹا گھنگور چھائی

نہ پرنالے چلے اب کے دھڑا دھڑ
نہ گزری کی سڑک رَو نے بہائی

نہ وہ سن سن نہ وہ جھونکے ہَوا کے
نہ بجلی نے چمک اپنی دکھائی

نہ وہ برسات کے کیڑے پتنگے
نہ مینڈک نے زمیں سر پر اُٹھائی

کہاں بادل کہاں بجلی کہاں مینہ!
پریشانی سی ہے دُنیا پہ چھائی

نہ اے بھادوں بھرن برسائی تو نے
نہ اے ساون جھڑی تو نے لگائی

نہ موروں نے کیا کچھ شور برپا
نہ کویل ہی نے دھوم اب کے مچائی

نہ ٹپکیں بوندیاں پتّوں سے ٹپ ٹپ
نہ دل کش راگنی چڑیوں نے گائی

[۱] مرتبہ ۱۸۷۷ء

نہ زنگار رنگ بادل آسماں پر
نہ چھت پر گھاس دیواروں پہ کائی

نہ کیچڑ ہے نہ پانی ہے نہ سبزہ
نہ مینہ برسا نہ کھیتی لہلہائی

ترستے ہیں برستا ہی نہیں مینہ
سسکتی ہے پڑی ساری خدائی

بہت رو کر دعائیں سب نے مانگیں
گھٹا روئی نہ بجلی مسکرائی

ہوئی برباد کھیتی تھک گئے بیل
گئی گزری کسانوں کی کمائی

نہیں بیچارے حیوانوں کو چارہ
ہے انسانوں کو فکرِ بے نوائی

بہت مزدور بیٹھے ہیں نکمّے
نہیں اب کوئی حیلہ جز گدائی

سمندر کیا ہوئے تیرے بخارات
صبا! تو کیوں اُڑا کر لے نہ آئی

بلائے قحط ہے ہندوستاں میں
ہے روم و روس میں برپا لڑائی

خُدایا جلد قحط اور جنگ ہوں دور
ملے سب کو مصیبت سے رہائی

خدایا رحم کر۔ جاں لب پہ آئی
تری مخلوق دیتی ہے دہائی

(۹۷) اختلافِ رائے[1]

اب کے رویت میں آگیا ہے خلل
رمضاں ایک اور عید ڈبل

یعنی اُنتیس تیس[3] اٹھائیس
کیا تواریخ میں پڑا ہے بل

---

[1] بروز سہ شنبہ یکم شوال ۱۲۹۷ھ ہجری۔ مطابق ۷ ستمبر ۱۸۸۰ء بوقت شب۔ بر بالاخانہ منشی نجم الدین صاحب تحریر یافت۔

آج چکھّی کسی نے افطاری | کوئی روزہ ہی کو گیا ہے نگل
دی کسی نے شہادتِ کامل | کوئی سمجھا اُسے کہ ہے یہ زٹل
نو بجے دن کے بج گیا دَہونسہ | روزہ داروں میں پڑ گئی ہل چل
خشکئِ روزہ شدّتِ گرمی | کر رہی ہے دماغ کو مختل
آج برپا ہے عام جوش و خروش | ہوئی آپس میں خوب ردّو بدل
جا پڑا دیوبند میں پہلے | چاند کا بھی گیا تھا پانوں پھسل
ایک دن تک وہیں رہا ناچار | سب کی آنکھوں سے ہو گیا اوجھل
کہیں جھگڑا کہیں لڑائی ہے | ایک کو غصّہ ایک کو جھونجھل
کوئی سمجھا رہا ہے مُلّا جی! | کس لئے کر رہے ہو جنگ و جدل
گوآٹاوہ میں چھپ گیا فتوے | علما کا نہیں ہے اُس پہ عمل
بست و ہفتم کو چاند دیکھ لیا | خود غلط تھی شہادتِ اوّل
دیکھ کر اختلاف دُنیا کا | یاد آئی ہے مجھ کو ایک مثل
کون سی ہے مجھے بتا تو تہی | اونٹ رے اونٹ تیری سیدھی کل
چاند کے اختلاف نے اب کے | میری عیدی کو کر دیا مہمل
کیوں پڑے ہو تم اس بکھیڑے میں | ہوا جو کچھ یہی تھا حکمِ ازل
ہیں زمانے کے کام زنگارنگ | نہ ہُوا ہے نہ ہو یہ عقدہ حل
نہیں چون و چرا کی گنجایش | لنگ ہے اِس جگہ پہ رخشِ عِلَل

عید کے واسطے نہیں درکار — قمر و مشتری و شش و زحل
مدّتِ دہر آنِ واحد ہے — غلطی پر ہے دیدۂ احول
ہے یہ نیرنگ کی نمود اری — آسمان و زمیں مکان و محل
ختم روزے ہوئے نماز پڑھو — بعد حمدِ خدائے عزّوجل
عید ہی عید ہے کوئی دن ہو — ہم کو یکساں ہے پیر اور منگل

وہی ظاہر ہے اور وہی باطن
وہی آخر ہے اور وہی اوّل

(۹۸) عالمِ شہود[1]

بگڑی ہے کیا انار پٹاخوں کی اب کے بات — ساون میں اتفاق سے آئی شبِ برات
بارود ہے خراب پٹاخے ہیں پھُسپھسے — کم زور ہیں انار چھچوندر ہے واہیات
مہتاب میں مزا ہے نہ کچھ پھلجھڑی میں لطف — پیسے ہمارے مفت گئے یوں ہیں آٹھ سات
پیسے گئے فضول تو خیر اِس کا غم نہیں — ہے سال بھر کے کھیل کی گویا یہی زکوٰۃ
پاتا ہے اِس جہان میں کچھ کھو کے آدمی — آئندہ ایسے کھیل پہ ماریں گے ہم بھی لات
بس چھوڑو کھیل کود کہ حلوا ہے گرم گرم — شامل ہے جس میں ذائقۂ قند اور نبات
شیریں ہے خوش قوام ہے چٹ کیجیے اسے — حلوہ کی چاشنی سے ہے مصری بھی آج مات
بدعت کہو گناہ کہو۔ یا چٹورپن — اچھا نہیں سمجھتا اسے زمرۂ ثقات

---

[1] ۱۲۹۷ھ مطابق ۲۲ر جولائی ۱۸۸۰ء موافق ساون سمت ۱۹۳۷۔

بچّوں کے واسطے ہے خور و نوش کھیل کود — اصحابِ اتّقا کے لئے صوم اور صلوٰت
جاگیں گے آج اہلِ عبادت تمام شب — درگاہ کبریا سے کریں گے طلب نجات
سرکارِ حق میں پیش حساب و کتاب ہے — تقسیمِ رزق اور رقمِ موت اور حیات
اِس واسطے دعا و طلب میں مبالغہ — کرتے ہیں تاکہ اُن پہ زیادہ ہو التفات
اہلِ نظر ہیں وہ کہ جنھیں یہ خیال ہے — کیا مانگئے کہ ہیچ ہے یہ جملہ کائنات
برکت ہے اپنے حال میں نے ماہ و سال میں — ہر دم عیاں ہے ذات وہی با ہمہ صفات
کیا ذات کیا صفات نہیں فرق و امتیاز — ہے ایک حال ایک نظر اور ایک بات
صاحب نظر کو فرقِ شب و روز کچھ نہیں — ہر روز روزِ عید ہے ہر شب شبِ برات
جو کچھ کہ ہے خیال میں خواب و خیال ہے — لے کر ازل سے تا بہ ابد کُل معاملات
سرکار کے بنائے ہوئے ہیں یہ سب عدد — اور عالمِ شہود ہے گویا شبِ برات
بارود ایک سی ہے مگر وزن ہیں جُدا — ہیں مختلف ظہور میں آثار اور صفات
سہرا ہو پھلجھڑی ہو پٹاخا ہو یا انار — سب میں بھری ہوئی ہے وہی ایک پاک ذات
ہر چیز کا ہے وزن معیّن جنچا تُلا — اِک آن کی نمود ہے بے اصل و بے ثبات
چُھٹنے کے بعد پھر نہ رہا یہ نہ وہ رہا — آخر کو ڈھاک کے نظر آتے ہیں تین پات
جو زور شور تھا سو حقیقت میں کھیل تھا — جب ہو چکا تمام یہ سرمایۂ حیات
دِکھلا کے اپنا رنگ فنا ہو گئے تمام — عقل و قیاس و فکر و خیال و توہّمات
ہے اصلِ نور و نار فقط ذاتِ بے نشاں — دھوکا نگاہ کا ہے قیود تعیّنات

مستور ہے ظہور میں ظاہر بطون میں
بے رنگ و بے نشان ہے بے کیف و بے جہات

شانیں جُدا جُدا ہیں تجلّی تو ایک ہے
کعبہ ہو ہر دوار ہو یا دیرِ سومنات

عیدی ہو یا قصیدہ رباعی ہو یا غزل
معنی میں مشترک ہیں بکثرت ہیں گو لغات

ظاہر میں شاعری کا ڈھل قافیہ سہی
فہمِ درست کو یہ لطائف ہیں اور نکات

حامد شبِ برات کی عیدی ہے بامزہ
لکھوانی چاہتے ہو۔ تو لاؤ قلم دوات

(۹۹) تہنیت جشن جوبلی حضور ملکہ معظمہ وکٹوریا قیصرِ ہند دام اقبالہا

ہے خداوندِ حقیقی کو سزا وار سپاس
جان نے تن میں کیا حکم سے جس کے اجلاس

پارلیمنٹ کھلی کشورِ دل کے اندر
عقل نے تخت کی اسپیچ پڑھی بیش از حس

ایسے دربارِ مقدس میں اُسے بار ملا
جس کا دانش کی لونڈے سے معطر تھا لباس

تہنیت نامہ سنانے کو بتعظیم و ادب
حاضرِ بزم ہوئے ذہن و ذکا۔ فکر و قیاس

مالک الملک ہے تو اور عزیز و جبّار
تو ہی خلّاق ہے رزّاق ہے اور ربّ النّاس

صحنِ عالم میں کیا خیمۂ اطلس برپا
جس میں قدرت نے جڑے گوہر و لعل و الماس

دشت و کہسار کو دی سبزۂ و گل سے زینت
سامنے جن کے لگیں لعل و زمرد بھی اُداس

شاخِ اشجار میں لٹکائے ثمر رنگارنگ
جس میں حکمت نے کیا جمع مٹھاس اور کھٹاس

تاکہ دامانِ زمیں تازہ و شاداب رہے
تو نے رکھا کمرِ کوہ پہ چشموں کا نکاس

تو نہ مٹّی سے اُگاتا جو چنے اور گیہوں
خاک سے کرتا مہیّا جو نہ سن اور کپاس

کون کر سکتا یہ پُر ذائقہ کھانے طیّار
کون بُن سکتا یہ پُر زیب ردا اور لباس

تیری رحمت کے طلبگار ہیں سب شاہ و گدا
تیری حکمت نے حریر اُس کو دیا اِس کو پلاس

تیری قدرت ہے قوی حکم ہے تیرا ناطق
ہے بھلا نقدِ بقا تیرے سوا کس کے پاس

آج اورنگِ سلیماں ہے نہ تختِ بلقیس
کشتیِ نوح کا تختہ نہ گلیمِ الیاس

ذکرِ خیر اُن کا زبانوں پہ رہے گا جاری
ہاں مگر عزّت و دولت کا یہی ہے مقیاس

بہرہ ور تاجوری سے وہی ذی ہوش ہوا
تیری خلقت کا کیا جس نے دل و جان سے پاس

نیک نامی کی نہ پائی کبھی اُس نے خوشبو
چڑھ گیا مغز میں جس شاہ کے غفلت کا ہُلاس

سُن کے اِس نامۂ پُر مغز کا میں نے مضموں
اور بھی اِس کے تتمّہ میں لکھے شعر پچاس

ہند پر قیصرِ عادل کو تسلُّط بخشا
کس زباں سے ہو تری حمد و ثنا شکر و سپاس

ملک کو تو نے نئے سر سے کیا پھر سر سبز
تیری رحمت سے نہ ہو غمزدہ کوئی بے آس

دور ازیں حال تباہی کی گھٹا چھائی تھی
سیل کی طرح سے طغیان پہ تھے خوف و ہراس

بن گیا تھا چمنستان سے چٹیل میدان
بیل بوٹے تھے نہ پھل پھول نہ ہریالی گھاس

شاہ گلشن تھے مغیلاں تو ولیعہد تھے خار
لالہ و سوسن و نسریں کو ملا تھا بن باس

باغِ شاہنشہی ہند میں آئی تھی خزاں
چیل کوّے تھے مگن بُلبُل و طوطی تھے اُداس

آلِ تیمور کے خورشید کا تھا وقتِ غروب
شام ادبار کی ظلمت سے دلوں میں تھی یاس

ضعفِ پیری سے حکومت کا لبوں پر دم تھا
نہ تو اوسان ٹھکانے تھے۔ نہ قائم تھے حواس

تھے جدا سلطنتِ ہند کے ریزے ریزے — جیسے چینٹوں کی جماعت میں ہو تقسیم مٹھاس
مرزبانوں کے سروں پر نہ تھا کوئی سرتاج — جان اور مال کا تھا حفظ نہ ناموس کا پاس
مغربی گھاٹ سے اُٹھتے تھے جو موجِ پیہم — دامنِ کوہ ہمالہ سے وہ کرتے تھے تماس
غوری و خلجی و تغلق کے مٹے تھے دستور — شیر شاہی کی روش تھی نہ حصارِ رہتاس
نام تھا نظم و نسق کا نہ سیاست کا نشاں — اکبری دَور کی باقی نہ رہی تھی بو باس
جاٹ گردی تھی کبھی۔ گاہ مرہٹہ گردی — کبھی پنڈاروں کا تھا ڈر کبھی سکھوں سے ہراس
پرتگیز اور ولندیز و فرانسیس بھی تھے — ملک گیری کی جنھیں بھوک تھی اور مال کی پیاس
جب کلایو نے پڑھی سیف و قلم کی سیفی — کچھ گھٹے ہند کے دل سے خفقان و وسواس
فرشِ دولت کی لگی ہونے نئی قطع و برید — پھٹ چلا جنگ پلاسی سے وہ پارینہ پلاس
ہیسٹنگز اور ولزلی نے عجب کام کیے — نبضِ دولت کے یہی لوگ تھے رفتار شناس
چارہ فرما ہوئے ڈلہوزی و ولیم بنٹنگ — آگئی طبعِ ممالک کو دوا اُن کی راس
ہند میں کوکبِ انگلش نے کیا خوب عروج! — جس کے مشرق تھے یہ کلکتہ و بمبئی۔ مدراس
واں پڑا سایۂ پرچم کہ جہاں بہتے تھے — ستلج و راوی و چناب۔ اٹک اور بیاس
اس صدی کے گئے جس وقت کہ سینتیس ۳۷ برس — فورتھ ولیم کی ہوئی ختم شمارِ انفاس
ہر مجسٹی دی کوئن وارثِ تاج و دیہیم — تختِ برٹش پہ ہوئی زیب فزائے اجلاس
کمپنی ہند کی ملّاح رہی مدّت تک — لائی پھر غدر کا طوفان ہوائے وسواس
غدر کے بعد ہوا دورۂ شاہی آغاز — نیّرِ دولت و اقبال چڑھا سمت الراس

پھر نئے سر سے ہوا کاخِ حکومت پہ قیم | قیصری قصر کی ہونے لگی مضبوط اساس
اے ترے تاج میں انصاف و عدالت گوہر | اے ترے تخت میں احسان و محبت الماس
عفو تقصیر کا جاری کیا تو نے منشور | بن گئے جان تن ہند کو تیرے انفاس
تیری دولت کے مدبّر تھے فلاطونِ زمن | کھو دیا سب جگرِ ملک سے درد و آماس
کھل گیا سطح حکومت کا نشیب اور فراز | حسنِ تدبیر کی جس وقت لگائی کمپاس
کر دیا ہند کے اجزائے پریشاں کو بہم | جڑ گیا ٹوٹ کے پھر نظم و سیاست کا گلاس
امن و انصاف کا پڑھنے لگے سب مل کے سبق | حاضر اسکولِ اطاعت میں ہوئی جملہ کلاس
سندھ ہے ایک طرف دوسری جانب ہما | قاعدہ کوہِ ہمالہ۔ تو کماری ہے راس
کس دیا ملک کو قانون کی زنجیروں میں | تا شرارت پہ ابھارے نہ کسی کو خنّاس
عہد دولت سے ترے پائی دلوں نے تسکیں | سکۂ زر کی طرح چل گیا تیرا قرطاس
ہیں ہنر تیرے زمانہ کے بغایت روشن | روغن و موم کی جا جلنے لگی برق و گاس
تار کے سامنے یکساں ہے نہ کچھ دیر نہ جلد | ریل کے آگے برابر ہے نہ کچھ دور نہ پاس
گاؤں در گاؤں ہوئیں علم کی نہریں جاری | اوکھ سے پینے لگے جن کو لگی زور کی پیاس
فیض تعلیم سے عالم ہوئے جاہل ہندی | کوئی عالم کوئی منشی تو کوئی حرف شناس
دم بدم ابرِ ترقّی ہوا گوہر افشاں | کوئی ایف اے کوئی بی اے۔ کوئی ایم اے ہے پاس
دورِ شاہی نے ترے اُن کو بنایا انساں | جن میں کھانے کا سلیقہ تھا نہ تمیز لباس
آدمیت کا پڑا اُن کے دلوں پر سایہ | بعض قومیں کہ جو خصلت میں تھیں مثلِ نسناس

اکثر اضلاع میں کھلتی ہیں نمائش گاہیں
جمع ہوتی ہیں جہاں ملک کی صنعی اجناس

گائے۔ بکری کی نہ ہوتی تھی جہاں پر بکری
اب وہاں تازی و ترکی کے ہیں لگتے نخّاس

بحر و بر میں ہے ترے زیرِ نگیں جتنا ملک
شاید اس وقت نہیں اور کسی شاہ کے پاس

بحرِ اعظم میں مہابت ہے ترے بیڑے کی
برِّ اعظم میں تری فوج سے دشمن کو ہراس

مملکت میں تری چھپتا نہیں سورج زنہار
ہے یہ جغرافیہ کی رو سے بہت ٹھیک قیاس

جشنِ جوبلی کا ہوا غلغلہ برپا گھر گھر
خیر سے تخت نشینی کو ہوئے سال پچاس

تیری دولت کی دعا یوں ہے دلوں سے جاری
جیسے گنگوتری کے چشمے سے گنگا کا نکاس

فضل سے اپنے کرے تجھ کو عطا عمرِ دراز
جس کی قدرت کی کچہری میں مہ و خور ہیں اساس

(۱۰۰) تہنیت سالگرہ حضور ملکۂ معظّمہ قیصرِ ہند دام اقبالہا

ذاتِ خداوند ہے قابلِ حمد و ثنا
جس کی حمایت میں ہیں شاہ سے لے تا گدا

امنِ جہاں کے لئے اُس نے بنائے ملوک
عالمِ اسباب میں تھی یہی صورت بجا

خدمتِ فرماں دہی طاعتِ حق ہے مگر
تھوڑے ہی نکلیں گے جو کرتے ہیں خدمت ادا

ایسے بھی ہیں تاج دار جن میں نہیں عدل و رحم
دیتے ہیں بے بات بھی خون کے دریا بہا

ایسی حکومت مگر جسم پہ محدود ہے
قبضہ میں اُس کے نہیں کچھ سر و تن کے سوا

توپ گرجتی ہوئی تیغ چمکتی ہوئی
لازمۂ سلطنت سمجھی گئی ہے سدا

مملکت دل میں ملی جس کا ہے سکّہ رواں　　اُس کی روش اور ہے اُس کا چلن ہے جُدا
عدل وہاں توپ ہے۔ اور کرم تیغ ہے　　لشکرِ شاہنشہی مہر ہے واں اور وِلا
جانتے ہیں ہم سبھی۔ کون ہے ایسا سخی　　قیصرِ ہندوستاں حضرتِ وکٹوریا
ایسے شہنشاہ کا سایہ ہو جس ملک پر　　اُس کے مبارک نصیب۔ ہے وہی عشرت سرا
اپنی رعایا پہ یوں فیض ہے اُس کا محیط　　جوں کرۂ ارض کے چار طرف ہے ہوا
اپنی رعایا اُسے ہے دل و جاں سے عزیز　　اُس کی رعایا اُسے دیتی ہے دل سے دعا

ہم نہیں خسرو پرست ہم نہیں اہلِ غرض
مدح شہنشاہ سے قصد ہے شکرِ خدا

(۱۰۱) نوید مقدم شاہی[1]

نو بہارِ بوستاں آنے کو ہے　　خسروِ گُل ہم عناں آنے کو ہے
بہرِ استقبالِ رایاتِ بہار　　لشکرِ سروِ رواں آنے کو ہے
شاخِ گلبن پر باندازِ خطیب　　عندلیبِ خوش بیاں آنے کو ہے
صحنِ گُلشن میں بطورِ ترجماں　　طوطیِ شیریں زباں آنے کو ہے
پیشِ گُل ہر طائرِ رنگیں نوا　　تہنیت گو، مدح خواں آنے کو ہے
پیکِ ھُدھُد مژدگانی کے لئے　　بالِ افشاں پر زناں آنے کو ہے
ابرِ گوہر بارِ بحرِ مغربی　　سوئے مشرق دُرفشاں آنے کو ہے
راہِ دریا سے سفینوں کی قطار　　صورتِ سیّارگاں آنے کو ہے

---

[1] مرتبہ ۶ جنوری ۱۹۱۱ء روز جمعہ ۴ محرم الحرام ۱۳۲۹ھ۔

نوجواں بنکر نگاہِ خلق میں — داستانِ پاستاں آنے کو ہے
جامِ صحت بنکے بزمِ عیش میں — گردشِ رطلِ گراں آنے کو ہے
خانہ باغوں کے لئے کشمیر سے — کشت زارِ زعفراں آنے کو ہے
بُلدۂ کاشی سے زربفتِ نفیس — از برائے سائباں آنے کو ہے
زینتِ درہائے ایواں کے لئے — ٹوکیو سے پرنیاں آنے کو ہے
طاقہ طاقہ مخملِ روم و فرنگ — فرشِ راہِ دوستاں آنے کو ہے
طبلہ طبلہ مُشکِ تاتار و ختن — حسبِ حکمِ میزباں آنے کو ہے
میوہ کابُل سے تو مَسقط سے رُطب — بہرِ نُقلِ میہماں آنے کو ہے
وہ مہوبہ سے تو یہ قنّوج سے — عطرِ گُل اور برگِ پاں آنے کو ہے
لے کے جنسِ نادراتِ روزگار — مجمعِ بازارگاں آنے کو ہے
خاص کجلی بن سے پیلِ دیوزاد — ساتھ لے کر پیلباں آنے کو ہے
گلّۂ گُل گونِ شبدیز و سمند — ہمرہِ سوداگراں آنے کو ہے
اُشترانِ تُند جیسلمیر سے — لے کے خیلِ سارباں آنے کو ہے
بے شُمار اسٹاک موٹر کار کا — مُلکِ یورپ سے یہاں آنے کو ہے
صنعتِ پرواز کا موجد گروہ — لے کے اپنی کشتیاں آنے کو ہے
مَردُمِ آفاق کا جمِّ غفیر — کارواں درکارواں آنے کو ہے
شہری و دہقاں کا انبوہِ کثیر — مرزباں سے تاشباں آنے کو ہے

جذبۂ شوقِ تماشا دیکھئے تا بہ پیرِ ناتواں آنے کو ہے
خیمہ و خرگاہ کا شہرِ جدید زیرِ سقفِ آسماں آنے کو ہے
ہر طرف سے لشکرِ آراستہ مثلِ دریائے رواں آنے کو ہے
نیزہ برداروں کے پیہم کوچ سے راستوں میں نیستاں آنے کو ہے
رائفل بردوش پیدل کا قشوں ہمدمِ برقِ دماں آنے کو ہے
توپخانوں کا گرجنا گھورنا! گویا بھادوں کا سماں آنے کو ہے
وقتِ ہر شلک دہانِ توپ سے بانگِ دیوِ ہفت خواں آنے کو ہے
عرضِ لشکر کے لئے میدان میں شاہِ با چتر و نشاں آنے کو ہے
موجِ برقِ نامہ بر لائی خبر اِک نیا دورِ زماں آنے کو ہے
دیدۂ و دل منتظر ہیں سچ بتا کون آتا ہے؟ کہاں آنے کو ہے
جارجِ پنجم خسروِ گیتی ستاں جانبِ ہندوستاں آنے کو ہے
وارثِ تاج و نگینِ قیصری داورِ دارانشاں آنے کو ہے
آفتابِ مکنتِ ہندوستاں سمتِ راسِ عزّوشاں آنے کو ہے
از پئے تسلیمِ شاہِ جسم شکوہ ہر امیرِ ملک راں آنے کو ہے
دیرہ جات و سندھ و پنجاب و دکن با سرو با چشم و جاں آنے کو ہے
تبت و برما و بنگال و اودھ بلکہ تا بامِ جہاں آنے کو ہے
عتبۂ علیا کی جانب باخلوص طبقۂ نواب و خاں آنے کو ہے

گرد بر گردِ سرا دقہائے شاہ
جیشِ رائے وراج گاں آنے کو ہے

راجپوتانہ سے باخیل وحشم
ماہ وخور کا خانداں آنے کو ہے

رُبعِ مسکوں سے برسمِ تہنیت
نائبِ ہر قہر وماں آنے کو ہے

تازہ کرائے مُلک پیمانِ وفا
پادشاہِ مہرباں آنے کو ہے

مُژدہ اے دھلی کہ تیرے اُرک میں
مرکزِ امن واماں آنے کو ہے

مستقرِ مُلک میں قرنوں کے بعد
موکبِ صاحبقراں آنے کو ہے

چارسوئے مُلک سے بہرِ نثار
حاصلِ دریا وکاں آنے کو ہے

مہرِ اُلفت کی گراں مایہ متاعُ
بر سبیلِ ارمغاں آنے کو ہے

مَقدمِ شہ میں زبانِ خلق پر
"شادباش و دیرماں" آنے کو ہے

گرمیٔ ہنگامۂ جشنِ جلوس
آخرِ سالِ رواں آنے کو ہے

مدح سنجی کے لئے دربار میں
شاعرِ جادو بیاں آنے کو ہے

(۱۰۲) جشنِ تاج پوشی اعلحضرت جارج پنجم شاہِ قیصر کہ بدارالخلافہ دھلی انعقاد یافتہ[1]

صُبحِ صادق کا کھُلا ایوانِ بار
مثلِ ایوانِ سلاطینِ کبار

بُت کدوں میں جا بجا بجنے لگے
نوبت و ناقوس و طنبور و ستار

گونج اُٹھا بامِ کلیسا کا جرس
خوابِ نوشین کا ہوا زائل خمار

---

[1] ۲۷ اکتوبر سنہ ۱۹۱۱ء روز جمعہ۔

صحنِ مسجد سے لگا ہونے بلند — نعرۂ "اللہ اکبر" بار بار
تھا وہ منشورِ نوید عافیت — پڑ گئی اطرافِ عالم میں پکار
نور و سایہ کی بڑھی ہمسائگی — گوئیا ہم رنگ ہیں لیل و نہار
امتزاجِ کیمیائی ہو گیا — تھی دورنگی روز و شب کی ناگوار
چاہتی تھی دیدۂ بالغ نظر — یہ نمائش گاہِ صنعِ کردگار
تھا خضوعِ دل سے مشغولِ دعا — صومعہ میں زاہدِ شب زندہ دار
چشمِ معنی یاب سے اُس نے بغور — دیکھکر یہ قدرتی نقش و نگار
دفعتہً کی جانبِ مشرق نظر — ہو چلا سب رازِ پنہاں آشکار
آمد آمد شاہِ خاور کی ہوئی — کوکبِ دُرّی لگے ہونے نثار
نُہضتِ رایاتِ شمسی کی خبر — پے بہ پے دینے لگے کرنوں کے تار
نیّرِ اعظم ہوا با تاجِ زر — جلوہ گر بالائے مینائی حصار
جگمگائے شہر کے دیوار و در — گُنبد و بام و منار و کوہسار
دور سے سب کو نظر آنے لگی — بارگاہِ قیصرِ والا تبار
ہو رہی ہیں جشن کی تیاریاں — کارفرما شوق سے مصروفِ کار
خیلِ سرہنگانِ شاہی چاق و چست — برق سے چالاک تر موٹر سوار
اپنے منصب پر کمربستہ نقیب — اپنے عُہدہ پر نگہباں چوبدار
ہیں پیادوں کی صفیں دیوارِ چیں — سدِّ اسکندر سواروں کی قطار

ہر سپاہی طغرل و الپ ارسلاں　　ہر پیادہ رستم و اسفندیار

توپ خانہ اژدرِ آتش فشاں　　سامنے جس کے دِژِ روئیں غبار

راس و چپ اعیانِ دولت کا ہجوم　　گردِ شمسِ قیصری سیارہ وار

ملکۂ دوراں و خاقانِ زماں　　مہرِ عالمتاب ماہِ نوربار

جلوہ فرمائے سریرِ سلطنت　　با شکوہ و شان و اجلال و وقار

صُفّۂ قوسی میں شہ کے روبرو　　داورانِ ذی حَشم ذی اقتدار

خیل خیلِ خان و رایان و ملوک　　جوق جوقِ سرفرازانِ دیار

نام بردارانِ طبقاتِ انام　　عامّۂ مخلوق بھی چندیں ہزار

ہند کے خِطّوں کا یک بستہ جواں　　حاضرِ خدمت قطار اندر قطار

سب نے اعلانِ شہنشاہی سُنا　　گوشِ رغبت کا بنایا گوشوار

ہو مُبارک تجھ کو اے ہندوستان　　جارجِ پنجم کا عہدِ زرنگار

رونق افروزئے شاہنشاہ نے　　تجھ کو بخشا ہے وہ عزّ و اعتبار

لعل دیہیم شہنشاہی بنا　　تا فلک پہنچی کُلاہِ اِفتخار

مُدّتوں سے سرزمینِ ہند تھی　　تشنۂ دیدِ جلوسِ تاجدار

للّٰہ الحمد آج دیکھا خلق نے　　شاہ کو گُل گونِ دولت پر سوار

چاندنی چوک آج آئیں بستہ ہے　　سال بھر سے تھا سراپا انتظار

آج درشن کا جھروکہ کُھل گیا　　خلق نے دیکھی شکوہِ تاجدار

آج بیلہ میں جما میلہ کا رنگ / ایک نظّارہ کے سب اُمّیدوار
اَرگِ سُلطانی بنا بزمِ سُرور / جس میں خاص انخاص کا ہے روزبار
ہند کی خوش قسمتی کا آفتاب / آج پہنچا تا خطِ نصف النّہار
خاکِ پاکِ حضرتِ دہلی بنی / قدر و قیمت میں زرِ کامل عیار
شاہ کے یُمنِ قدم سے بن گیا / نو عروسِ مُلک یہ کہنہ دیار
اِن دِنوں رشکِ خیابانِ اِرَم / ہے جہاں آباد کا قُرب و جوار
آج اُردوئے ہمایوں کے عَلَم / لائے ہیں جنگل میں پیغامِ بہار
روزِ روشن کا نمونہ بن گئی / نورِ برقی سے شبِ تاریک و تار
یونین جیک آج ہے سایہ فگن / کُل قلمرو پر بفضلِ کردگار
ہند کا مامن ہے اب ایک آستاں / جس کی عظمت نے مٹایا انتشار
قُلّۂ چترال سے سیلون تک / حدِّ چیں سے تا بحدِّ قندہار
مُطمئن ہیں جمیع اقوام و ملَل / بے خبر ہیں جملہ امصار و دیار
تھے بزرگ اِس قیصرِ ذی جاہ کے / گُلشنِ ہندوستاں کے آبیار
آنجہانی رحم دِل وکٹوریا / بعد ازاں اڈورڈ ہفتم صلح کار
خالقِ عالم نے سونپی تھی اُنھیں / خلقِ عالم کی زمامِ اختیار
مادرِ مشفق تھی اُن کی تربیت / اور مُلکِ ہند طفلِ شیر خوار
اِس طرح کی پاسبانی خلق کی / جس طرح کرتی ہے ماں بچوں کو پیار

عِلم و دانش کے کئے دریا رواں	ریگ زاروں کو بنایا لالہ زار
عَدل کے دستِ قوی سے ہو گئیں	امن و راحت کی بنائیں اُستوار
عرض و طولِ مُلک میں پھیلا دئے	مثلِ شریان و عصب ریل اور تار
کیا زراعت کیا تجارت کیا ہُنر	سب پھلے پھولے نکالے برگ و بار
بس کہ آئین جہاں بانی کا ہے	رہبریِ عقل و حکمت پر مدار
ہند کا ہر گوشہ سچ مُچ بن گیا	اِس مُبارک دَور میں باغ و بہار
شاعرانہ مدح سنجی یہ نہیں	واقعہ ہے بر سبیلِ اِختصار
جارج پنجم کا بھی یہ دَورِ جَدید	ہے اُنھیں ادوار کا آئینہ دار
ہے رفاہِ عام کو نشو و نُما	حال و مُستقبل بہ از پار و پرار
شاہ کے مقدم میں اے ہندوستاں	کر وفا و مہر کے گوہر نثار
کر برابر پلۂ میزان میں	شاہ کی تمکین اپنا اِنکسار
کر اطاعت میں سرِ تسلیم خَم	تو ہے احسانِ شہی کا زیر بار
کر سپاسِ نعمتِ مُنعم ادا	حق شناسی ہے اگر تیرا شعار
اِس شعارِ خاص میں اے خاکِ ہند!	کم نہیں ہے تو کسی سے زینہار
تیری خاطر عزم شاہنشاہ نے	طے کئے ہیں برّ و بحر و رودِ بار
وہ سفینہ ہے مدینہ جس کا نام	مرکب دریا نورد با وقار
عید اضحےٰ کو کنارِ بمبئی	لے کے آیا ہے مَنافع بے شُمار

ایک ازاں جملہ ورودِ قیصری لنگرِ گشتیِ امنِ روزگار
پادشاہا! مہربانا! قیصرا! آپ کا آنا رہے گا یادگار
کرلئے تیرِ نگاہِ لطف سے دل امیروں اور غریبوں کے شکار
ہے غریبوں کی دعاؤں کا ہجوم فوج سے بہتر بوقتِ کارزار
ہند کا نغمہ ہے اب باصدقِ دل "قیصرِ ما زندہ بادو کامگار"
"مہرباں قیصر کے ہاتھوں میں رہے ناقۂ اقبال و دولت کی مہار"
جشن کی تاریخ بھی سن لیجئے بیسویں ہے یہ صدی بررُوئے کار
گیارھواں سال اور مہینہ بارھواں
بارھویں تاریخ ازروئے شمار

(۱۰۳) دُرِ بے بہا

در مدح حضرت نظام دکن

اے ملک ہند سچ مچ تو لعلِ بے بہا ہے جنّت نشان تیرا صحرائے دل کُشا ہے
آن و ادا پہ تیری مفتوں ہے رُبعِ مسکوں تو ہے عروسِ گیتی یا جانِ ایشیا ہے
رُخ سے ترے عیاں ہے نقش و نگارِ قدرت رعنائیوں کا خلعت تجھ کو عطا ہوا ہے
پربت ترا ہمالہ دیوِ بلند بالا حدِّ شمال جس سے بامِ فلک نما ہے
پٹکا تری کمر میں باندھا ہے بندھیا نے وادیٔ زیر و بالا گویا جُدا جُدا ہے
آبِ اٹک سے لے کر تا سرزمینِ مشرق سیراب ندیوں سے میدانِ پرفضا ہے

اِک سطحِ مُرتفع ہے وہ خطّۂ جنوبی
جس سرزمیں پہ بہتا دریائے نربدا ہے

دو پہلوؤں میں اُس کے ہیں دو پہاڑ قائم
بحرِ محیط جن کے قدموں سے آلگا ہے

ہیں جمع تیرے اندر منظر طرح طرح کے
سو رنگ کا مُرقّع گویا تری قبا ہے

حیرت فزا ہیں تیرے میدان کوہ و دریا
گویا طلسمِ قُدرت تیرا فنا منا ہے

تو مَرغ زار بھی ہے اور ریگ زار بھی ہے
وہ دشتِ ریگ جس میں ہر و شکستہ پا ہے

تو گرم سیر بھی ہے اور سرد سیر بھی ہے
یا تُند بادِ صَرصَر یا نرم خو صَبا ہے

گلشن ہیں تیرے آباد۔ آبادیاں ہیں گُلشن
یا خانہ باغ ہے تو۔ یا بوستاں سرا ہے

ہر ذی حیات کو تو دیتا ہے آب و دانہ
خوانِ کرم میں تیرے ہر جنس کی غذا ہے

رنگین ہے سال تیرا قوسِ قزح کی صورت
برسات کا سَماں ہے۔ یا صیف۔ یا شتا ہے

پردیسیوں نے تُجھ کو اپنا وطن بنایا
تاثیرِ دل کشی میں تو مثلِ کہربا ہے

(۱۰۴) اعترافِ عنایت[1]

قید سخت اور خانۂ بے در
نکلوں کیوں کر جہان سے باہر

تنگ تر ہیں حدودِ خطّۂ خاک
نہیں دُنیا میں کوئی شکلِ گزر

سعی بے کار فکر لاحاصل
نہ دوا میں نہ کچھ دُعا میں اثر

ناشکیبا دل و پریشاں دل
پاؤں کا ہوش ہے نہ سر کی خبر

---

[1] یہ قصیدہ شیخ یعقوب علی مرحوم کی فرمائش سے ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا تھا ۱۲۔

ایسا حیراں کہ میں سمجھتا ہوں — آئنہ کو بھی سدِّ اسکندر
کبھی مثلِ سحاب ہوں گریاں — گاہ مانندِ برق ہوں مضطر
کیوں نہ شکوہ کروں نصیبوں کا — کیوں نہ افسوس آئے قسمت پر
میں ہوں شمشیر لیک زنگ آلود — کوئی مِل جائے قدرداں اگر
اُس پہ کھُل جائیں کچھ مرے اوصاف — اُس پہ ظاہر ہوں کچھ مرے جوہر
آرزوئے زماں ہوں سرتاپا — حسرتِ روزگار ہوں یکسر
اپنے جوہر دکھائیے کس کو — نہ رہی آہ قدرِ تیغ و سپر
یہ ہی الفاظ تھے زباں پر رات — کہ کہا مجھ سے عقل نے آکر
نہیں شایاں شکایتِ تقدیر — نامناسب ہے شکوۂ اختر
جتنے گذرے ہیں آگے عالی فہم — رکھتے تھے روئے خاک پر بستر
جتنے گذرے ہیں صاحبِ اوصاف — موردِ طعنِ خلق تھے اکثر
وہی ہوگا جو ہولیا پہلے — یعنی کیا چارۂ قضا و قدر
جس کو چاہے بنائے وہ گم نام — جس کو چاہے کرے وہ نام آور
رنج و محنت ہے گو زمانہ میں — ہے تجھے تو مقامِ شکر مگر
بختِ ناکام کا تجھے کیا خوف — گردشِ چرخ کا تجھے کیا ڈر
تو نہ دُنیا کے غم میں ہو پابند — تو زمانہ کا ہو نہ دست نگر
کہ ترا دست گیر ہے موجود — اور ترا سرپرست ہے سر پر

وہ سخاوت منش سخاوت کیش
وہ کرم پیشہ وہ کرم گستر
وہ شرف دوست وہ شریف نواز
وہ ہنر دوست وہ ہنر پرور
کوہ جس پر کرے تصدّق لعل
بحر جس پر کرے نثارِ گہر
وہ زمانہ میں صاحبِ شمشیر
وہ رئیسوں میں قابلِ افسر
جس کو دکھلائے اشرفی خورشید
جس کو مرّیخ نذر دے خنجر

پیش کش ہے یہ مطلعِ ثانی
کہ قلم ہے رواں بطرزِ دگر

مطلعِ ثانی

اے قمر چہرہ آفتاب افسر
اے فلک مرتبہ زمیں کشور
اے ترا فہم رونقِ تدبیر
اے تری رائے عقل کا زیور
تیرے دم سے جہاں کا باغِ امید
سبز و شاداب اور تازہ و تر
تیرے فیض کرم سے ارزانی
فقرا کو بھی دولت قیصر
بانگِ پُر قہر سے تری پیدا
ایک سنّاٹا دشت کے اندر
مژدۂ مہر سے ترے برپا
شہر میں غُلغُلِ طرب گھر گھر
جب کہ بجتی ہے تیری نوبتِ صبح
گونج اُٹھتا ہے گنبدِ بے در
ذکر انصاف کا ترے سن سُن
ظلم خود کانپتا ہے اب تھر تھر
ٹھیرے انسان ملزمِ دُزدی
گر ترے عہد میں چُرائے نظر

ہے ترے احتساب کے ڈر سے شکلِ خونناب بادۂ احمر
غیر واجب بیاں نہ تم کو پسند ظاہر آرائی کا نہ میں خوگر
مدّعا عرضِ فنِّ شعر نہیں شرحِ احوالِ واقعی ہے مگر
ہو گیا اتّفاق سے مجبور کیا میں نے جو اختیار سفر
ورنہ دوری کسے گوارا تھی مجھ سے اور چھوٹ جائے تیرا در
میں نمک خوار تو ولی نعمت میں تہی دست تو کرم گستر
ہے وہی آستاں مرا مرکز آسماں گرچہ لاکھ دے چکّر
کہ رہا بندہ وار مدّت تک اُلفتِ خاص سے ترے در پر
اب ترے التفاتِ بے حد کی یاد میں کر رہا ہوں عمر بسر
طوطیٔ ہند ہے زباں میری اور ترا ذکرِ خیر ہے شکّر
نہ مُجھے حرصِ درہم و دینار نہ مجُھے آرزوئے لعل و گُہر
چاہتا ہوں فقط یہی کہ رہے گوشۂ چشمِ التفات اِدھر
پھر یہی کہہ رہی ہے کثرتِ شوق کہ پے ہم رہوں ثنا گستر
نہ کوئی بذل میں ترا ہمتا نہ کوئی عدل میں ترا ہمسر
ہر پیادہ ترا تہمتن تن ہر سپاہی ترا مظفر فر
سرِ دشمن بنے گُلِ نیزہ خونِ اعدا ہو جوہرِ خنجر
رہے جب تک جہاں میں زیبائش رہے جب تک جہاں کو زیبِ دگر

تو ہو فرماں روائے اہلِ جہاں
اور اہلِ جہاں ہوں فرماں بر

دوستوں کو بدام عیش و نشاط
دشمنوں کو ہمیشہ خوف و خطر

(۱۰۵) خزینۂ علم[1]

رنگِ فریب سادگیِ دل میں ہے نہاں
افزائشِ یقیں نہیں بے کاہشِ گماں

دل تنگ ہے کثافتِ چار آخشیج سے
باطن میں گو لطائفِ ستّہ ہوئے رواں

ہے پردہ پوشِ دیوِ بد آموز آشکار
فرخ سروش اُٹھائے اگر بُرقع نہاں

خاطر نشاں ہے غفلتِ عیشِ معاصریں
گر دل نشیں ہے عبرتِ حالِ گزشتگاں

واں دست بردِ جہل بھی وہم آفریں نہیں
جس میکدہ میں پائے خرد ہو نہ درمیاں

آسائشِ کدورتِ باطن ہے وہ بلا
سعیِ صفائے قلب کو سمجھے بلائے جاں

دل میں ہجومِ وسوسہ پیدا کرے خطر
خاطر پہ گر سرایرِ مکتومہ ہوں عیاں

ہو تیرگیِ جسم کو یہ خاک داں فضا
زنداں ہو بہرِ روح جو یہ تیرہ خاکداں

غفلت کو ہو بقیۂ دو روزہ پر غرور
اندیشہ کو اگر ہو غمِ عمرِ رائیگاں

تھا دل میں حشر و نشرِ تخیّل یہی کہ جہل
بالیں پہ میرے بیٹھ گیا آکے ناگہاں

کہنے لگا تجھے نہ دکھاؤں گا تا بہ حشر
علم و کمال و فضل کے ثمرہ میں عزّ و شاں

---

[1] ایک پُرانے مسودے میں سے یہ چند اشعار مل گئے جو یہاں درج ہیں۔ یہ قصیدہ میرے مرحوم دوست ڈپٹی نجم الدین صاحب دہلوی کی فرمائش سے لکھا گیا تھا۔ (مرتبہ ۱۸۷۰ء)

اے خفتہ بخت طالعِ بیدار کی طرح
تجھ کو ملے نہ دولتِ بیدار کا نشاں

سُرمہ ہو یا ہو خال مگر تیرہ روزگار
تُجھ سا نہ نکلے ہند سے لے تا باصفہاں

مل جائیں خاک میں ترے افکار دور بیں
ثابت بھی گرچہ کر دے تو خرقِ آسماں

شعلہ کی طرح تجھ کو میں بے تاب ہی رکھوں
اور آگ کی مثال تہِ ظلمتِ دخاں

سینہ کو تیرے چاک کروں میں برنگِ گل
لیکن بنا کے داغِ تمنّا سے گلستاں

شبنم کی طرح تُجھ کو رولاؤں دمِ سحر
خونیں کفن بناؤں سرِ شام لالہ ساں

پایانِ کار ایسا بنے تنگِ روزگار
بیٹھے جو تو کہیں تو اُٹھے شورِ الاماں

رہ جائے ایسا بیکس و بے یار و بے دیار
ہو کوئی تیرا دوست نہ مونس نہ مہرباں

کیا تاب ہے کہ تو مرے چنگل سے چھوٹ جائے
اور چھوٹ جائے بھی تو بھلا جائے گا کہاں

اِمضا پذیر جانبِ مغرب ہے میرا حکم
مشرق میں بھی ہے سکّہ مرے نام کا رواں

سرحدِّ خاکِ چین سے اقصائے روم تک
تیغ و نگین ہے مجھ کو مُسلّم بہر زماں

میں حالتِ سکوت میں سنتا رہا بغور
اُس یاوہ گو کی ہرزہ و بے صرفہ داستاں

کافور ہو گئے وہ خیالاتِ سابقہ
چلنے لگی زباں کہ مری طبع تھی رواں

اے جہل رُوسیاہ و تبہ کار و لاف زن
گو بخت واژگونہ و بے مہر آسماں

لیکن تجھے خبر بھی ہے یہ کس کا دور ہے
ہے آج کون داورِ دارائے داوراں

اے جہل اُس کے ظلِّ حمایت میں ہوں میں آج
ہے جس سے پرچمِ علم علم زرفشاں

آسودہ زیرِ سایۂ فیضِ عمیم ہوں
وہ سایہ جس کے سامنے خورشید ہے کتاں

چمکا ہے یہ ستارۂ علم اِن دنوں کہ ہیں
جلبابِ لیل میں سبق آموزِ روشناں

کچھ روشنانِ چرخ ہی پر کیا مدار ہے
مرغانِ گلستاں میں بھی ہے درسِ بوستاں

اِک درسِ بوستاں پہ نہیں منحصر سبق
نہر الفصاحت اُن کے لئے جدولِ رواں

ہر جدولِ رواں میں ہے طغرائے دِل فریب
یعنی کہ سبزہ تازگی افزائے جسم و جاں

سبزہ سے ہیں معانیٔ بیگانہ آشکار
کیا متن گلزمیں ہے پئے مرغِ صبح خواں

لمعانِ آفتاب سے جوں رنگِ شب اُڑے
کھویا فروغِ علم نے یوں جہل کا نشاں

پیدا ہے شوقِ علم کہ کرتا ہے روز و شب
خورشید بھی مساحتِ ساحاتِ آسماں

شب گرچہ کم سواد ہے پر نورِ علم سے
اُس نے بھی ہیں مسائلِ ہیئت کیے بیاں

بہر بناتِ نعش معلّم ہے چرخِ پیر
روشن اِسی غرض سے ہے شمعِ ستارگاں

اب کر دیا ہے سیر کو اکب نے آشکار
تھا رازِ علم گنبدِ افلاک میں نہاں

اے معدلت پناہ و پناہِ جہانیاں
سرمایۂ فضیلت و علّامۂ زماں

خورشیدِ مجد و شمعِ شبستانِ مکرمت
نیسانِ جود و ابرِ بہارانِ امتناں

عزّ و جلال و جاہ میں بیدائے بے قیاس
فضل و کمال و علم میں دریائے بے کراں

ہے تیرا دستِ جود کفِ بحر سے وسیع
پائے علوئے مرتبہ بالائے فرقداں

تدبیرِ مملکت میں تری رائے معتبر
قانونِ سلطنت میں ترا فہم نکتہ داں

زیبا ہے تجھ کو طبل و علم پرچم و لِوا
شایاں ہے تجھ کو خیل و خدم لشکرِ گراں

(۱۰۶) احساساتِ قلبی[1]

دکھاؤں شاہدِ مضموں کی جبینِ پیشانی
کہ ہووے چشمۂ آئینہ غرقِ حیرانی

جو دیکھے جنبشِ لب ہائے جاں فزا اُس کی
تو فرطِ شرم سے آبِ حیات ہو پانی

چمن میں گر وہ سراپا بہار جا نکلے
تو خار خارِ چمن بھی کرے گلستانی

جمال و حسن یہی ہے تو ایک دن ہیں بھی
بُلا کے خلوتِ دل میں بہ رسمِ مہمانی

حضورِ عالی ...... خاں صاحب
کہوں کہ آج دکھا جوہرِ ثنا خوانی

کہ جس کی رائے بہ آئینِ ملکی و مالی
معینِ رسمِ جہاں داری و جہاں بانی

اب اُس کے عہدِ عدالت میں ظلم ہی نہ رہا
غلط ہے یہ کہ نہ باید ز گرگ چوپانی

سُنا جو شہرۂ انصاف و داد خود آئی
عدالت از پئے پابوس۔ ہو کے دیوانی

بوقتِ صولت و سطوت۔ نگاہِ برقِ دماں
دمِ سخا و کرم۔ ہاتھ ابرِ نیسانی

طریقِ داد میں پیدا ہے عدلِ فاروقی
امورِ دین میں ظاہر حیائے عثمانی

(۱۰۷) کس کے لئے ہے؟

تا کوئی فرخندہ پے دھوئے قدم
ہیں اسی دُھن میں رواں گنگ و جمن

تا کرے گلگشت کوئی خوش نظر
منتظر ہے رونقِ باغ و چمن

تا معطر ہو کوئی عالی دماغ
دوڑتی ہے نکہتِ مشکِ ختن

---

[1] بمقام سہارنپور ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا تھا۔

چاہتی ہے لذّتِ قند و نبات — ہو کوئی طوطی منش شکّر شکن
تا کسی نازک گلے کا ہار ہو — قعرِ دریا سے چلا دُرِّ عدن
گر تصوّر میں نہ ہو اِک جامہ زیب — کب کرے تیّار کاریگر چکن

مِل گئی گنگا میں گنگا بن گئی
جب الہ آباد میں پہونچی جمن

(۱۰۸) محبّت

محبّت ہے تیری پرتو سے روشن عالمِ فانی — جو دُھندلی ہو کرن تیری تو آبادی ہو ویرانی
جہاں مخلوق حیوانی میں چمکا فہم کا جوہر — وہاں تیری حکومت بھی تہِ دل سے گئی مانی
تیرے قانون کے تابع ہیں وحش و طیر و دام و دد — جُھکا دیتی ہے تیرے سامنے سر طبعِ انسانی
تھے بچپن کے تو مونس مادر و بابا بہن بھائی — جوانی میں بڑھا ایک اور ہمسر محرمِ جانی

پھر اُس کے بعد بُستانِ تمنّا جب پَھلا پُھولا
تو ایک غُنچہ کِھلا گلبن میں رشکِ لعلِ رُمّانی

(۹) قطعات

(۱۰۹) خوابِ راحت[1]

کل رات کی بات ہے کہ مجھ کو
جھونکا سا غنودگی کا آیا
جھٹ پٹ تکیہ پہ رکھ دیا سر
دن بھر کا تھا میں تھکا تھکایا
کچھ آنکھ جھپک گئی تھی لیکن
اِتنے میں کسی نے پھر جگایا
دیکھا تو ہُوا کا سنسنانا
کچھ اور ہی رنگ روپ لایا
رہ رہ کے تڑپ رہی ہے بجلی
اور ابر ہے آسماں پہ چھایا
پڑنے لگیں بوندیاں ٹپاٹپ
سوتے لوگوں نے غُل مچایا
ہُلڑ جو مچا۔ اُچٹ گئی نیند
جوں دھوپ سے بھاگ جائے سایا
سب سو گئے جاگتا رہا میں
تب دل میں خیال یہ سمایا
خوابِ راحت بھی ہے عجب چیز
کیا عالمِ بےخودی ہے چھایا
اے نیند! نمونۂ قیامت
تو نے ہمیں آنکھ سے دِکھایا
تو آئی۔ ہوئے حواس بیکار
کیا جانیے تو نے کیا سونگھایا
جس وقت اُتر گئی گھٹا سی
آنکھوں کا چراغ ٹمٹمایا
پھر چھوڑ گئی ہمیں جہاں میں
پھر زیست کا ذائقہ چکھایا
پایا۔ تو کہیں تجھے نہ دیکھا
دیکھا تو کہیں تجھے نہ پایا

---

[1] مرتبہ یکم اگست ۱۸۸۷ء

ہے تیری عجیب حکمرانی | دنیا کی پلٹ گئی ہے کایا
رن میں فوجوں کو جا پچھاڑا | بن میں شیروں کو جا دبایا
دہقان کو کھیت میں کیا چت | گو کھیت کو گیدڑوں نے کھایا
ریوڑ کی خبر نہیں کہاں ہے | چرواہے کو گھاس پر لٹایا
لینے کو درخت پر بسیرا | چڑیوں نے پروں میں سر چھپایا
ڈھوروں نے بھی چھوڑ دی جُگالی | چُپ ہیں نہیں کان تک ہلایا
جب چور کی آنکھ میں سمائی | اُس نے چوری سے جی چُرایا
رہزن کی بھی راہ بات ماری | رہگیر کو خوف سے بچایا
کھوٹی ہوئی راہ رو کی منزل | پھیلا کے جو پاؤں سنسنایا
ماؤں کو دیا ہے تو نے آرام | بچّوں کو تھپک تھپک سُلایا
روتے روتے جھپک گئی آنکھ | جھولے میں جھولا رہی ہے دایا
بیگم۔ ملکہ۔ غریب۔ بڑھیا | تیرا آنا سبھی کو بھایا
غم دُور ہوا ٹکڑ گدا کا | جھولی ہے نہ جھونپڑی۔ نہ سایا
بیڑی سے رُکا نہ ہتکڑی سے | محبوس کو قید سے چھُڑایا
شاہوں کی بھی کرّوفر۔ مٹا دی | نے تاج۔ نہ تخت۔ نے رعایا
زرّیں پردے نہ فرشِ مخمل | ایوان ہے گُم سجا سجایا
جب سو گئے ہو گئے برابر | کب شاہ و گدا میں فرق پایا

جج کے بھی حواس ہیں معطل — فیصل ہوئے قصۂ و قضایا
ٹھنڈا ہوا تاجروں کا بازار — سودے کا معاملہ چُکایا
ہے نقد کہاں؟ کدھر گئے نوٹ؟ — ساہوکاروں کو ٹھگ بنایا
لالہ کو نہیں رہی ذرا سُدھ — کیا ڈیوڑھا۔ اور کیا سوایا
بنیوں کا اُلٹ دیا ہے تپّڑ — روکڑ ہے نہ جنس ہے نہ مایا
بیمار کی آنکھ لگ گئی ہے — دُکھ درد کا کرب سب مٹایا
کچھ ہوش نہیں ہے ڈاکٹر کو — پُلٹس لگے زخم پر کہ پھایا
اوسان نہیں حکیم جی کو — کیا نیند نے لخلخہ سنگھایا
تبرید پلائے کہ مُسہِل — سب بھول گئے کیا کرایا
پنڈت بھی ہوئے نچنت ایسے — اشنان کیے۔ نہ جل چڑھایا
مُلّا کو بھی ہوگیا ہے نسیاں — بھولا ہے مسائلِ ہدایا
تعریف نہ کر سکے مُہندِس — کیا شکل ہے قائم الزوایا
جغرافیہ داں کی راہ گُم ہے — لنکا ہے کدھر کدھر مَلایا
کچھ یاد نہیں مورخوں کو — کیا کیا بروئے کار آیا
بھولا ہے کتاب طالبِ علم — اُلٹا تو نے سبق پڑھایا
مُطرب کی عجیب گت بنائی — کھڑاگ جہان کا بھلایا
عابد۔ زاہد۔ فقیر۔ جوگی — صوفی کا بھی ہوگیا صفایا

چونکا نہیں قافلہ تری کا
ہر چند جہاز ڈگمگایا
چیتے نہیں ریل کے مسافر
انجن نے ہزار غُل مچایا
باقی نہ رہا کوئی تردّد
جھگڑوں میں تھا جان کو کھپایا
سب مشغلے ہو گئے فراموش
اپنا ہی رہا۔ نہ کُچھ پرایا
دُنیا کی خبر۔ نہ دین کا ہوش
کیا ساغرِ بے خودی پلایا
تو نے کیا نیند کو مسلّط
قدرت ہے بڑی تری خدایا

(۱۱۰) مسلمانوں کی تعلیم

اے اخوشا وہ قوم مستقبل ہو جس کا شان دار
کَل سے بہتر آج ہو اور آج سے بہتر ہو کَل
دم بدم راہِ طلب میں کر رہی ہو دوڑ دھوپ
ایک نقطہ پر نہ ہو اُس کو توقّف ایک پل
رفتہ رفتہ بن گئی ہو علم کی کشور کشا
ہوتے ہوتے ہو گئی ہو مردِ میدانِ عمل
کیوں نہ ہو اُس قوم کی دُنیا کے ہر گوشہ میں ساکھ
جس میں اخلاقی سکت ہو اور ہو حکمت کا بَل

۳۰ر اپریل ۱۹۱۱ء کو بمقام علی گڑھ ٹیچرز کانفرنس میں پڑھا گیا۔

وقت کو دولت کو طاقت کو نہ کھوئے رائیگاں
کھو دے احیاناً تو حاصل بھی کرے نعم البدل
ہچکچاتی ہو پہاڑوں سے نہ دریا سے ڈر کے
ہمّتیں ہوں اُس کی عالی۔ عزم ہوں اُس کے اٹل
حسرتا وہ قومِ ناقابل کہ ہو ننگِ سلف
کاہلی سے دست و بازو ہو گئے ہوں جس کے شل
اُس کی طاقت کیا؟ کہ ہوں اوروں سے کم جس کے نفوس
اُس کی عزّت کیا؟ جو ہو پس ماندۂ علم و عمل
اُس کی دولت کیا؟ کہ ہوں افراد جس کے بے ہُنر
مفلسی بھی اور دماغوں میں مشیخت کا خلل
کر دیا ہے خانہ برباد آج اُسے اسراف نے
جس کو قدرت نے دئے تھے سیکڑوں سنگیں محل
خیر جو گزرا سو گزرا یہ جو ہیں تازہ نہال
فکر ان کی چاہئے شاید یہی جائیں سنبھل
ان کو بار آور بناؤ خواہ بے کار و فضول
آج جس سانچے میں ڈھالو گے انھیں جائیں گے ڈھل
کھیت میں پیدا ہوں پودے اور نہ سینچو وقت پر

ہے نتیجہ صاف ظاہر دھوپ سے جائیں گے جل
سوکھ کر جھڑ جائیں کلیاں اور نہ چیتے باغباں
ایسے ظالم باغباں کو کیا ملے گا خاک پھل
جی چرانا کام سے اور کامیابی کا یقیں
اے عزیزو! ہے خلافِ حکمِ حقِ عزّوجل
لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰے پڑھتے تو ہو
لیکن اِس پڑھنے کا اے حضرات! آخر ماحصل؟
شہد کی مکّھی کو دیکھو کس قدر مصروف ہے
چوس کر ہر پھول سے لاتی ہے بے چاری عسل
اپنے بچّوں کے لئے کرتی ہے آذوقہ تلاش
آخرش آتے ہیں بچّوں کے بھی پَر پُرزے نکل
یہ نئی تانتی ہماری کیا کرے گی بھاگ دوڑ
تنگنائے کاہلی ہیں جب بڑے جائیں پھسل
بعض کہتے ہیں بڑھو آگے کہ ہے میدان وسیع
بعض کہتے ہیں کہ ہیں یہ کہنے والے مبتذل
دیکھنا! تم ٹس سے مس ہرگز نہ ہونا ایک انچ
بڑھ گئے آگے تو آجائے گا ایماں میں خلل

اُن کا کہنا مانیے یا اِن کی خاطر کیجیے
اپنا عُقدہ کیجیے اب اپنے ہی ناخن سے حل

تیز کر اپنی توجّہ کی کرن اے آفتاب[1]!
تاکہ جائے عادتوں سے برفِ سُستی کی پگھل

تیری سرگرمی سمندر سے اُٹھائے گی بُخار
پھر ہوا میں جمع ہوں گے بادلوں کے دَل کے دَل

دشت اور کہسار پر برسیں گے ایک دن جھوم جھوم
ایک ہو جائے گا آخر دیکھنا! جل اور تھل

پھر تو ہو جائے گی یہ مُردہ زمیں باغ و بہار
پھر تو کِھل جائیں گے پژمردہ دلوں کے بھی کنول

دِل نہ ہو درد آشنا تو نظم ہے اِک دردِ سر
کیا رباعی کیا قصیدہ کیا مُخمّس کیا غزل

جُملہ ڈیلیگیٹ سے اب خیر مقدم عرض ہے
اور پریزیڈنٹ[2] کی خدمت میں شُکریہ ڈَبل

---

[1] آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بیرسٹرایٹ لا۔ علی گڑھ

[2] شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹرایٹ لا لاہور، ممبر کونسل وزیرِ ہند۔

(۱۱۱) مسلمان اور انگریزی تعلیم

ایک دِن تھا بحکمِ سرکاری — گئے اِسکول جا بجا کھولے
نہ تو کچھ فیس تھی نہ داخلہ تھا — مُفت تعلیم تھی اُسے جو لے
ہم مسلمان سب اکڑ بیٹھے — پہلے فتویٰ جواز کا ہو لے
مُنہ زبانی بھی اور لکھ کر بھی — پوچھ گچھ کی تو مولوی بولے
"ایسی تعلیم سے تو بہتر ہے — آدمی ٹوکری کہیں ڈھولے"
اُن کو تنقیصِ دین کی سوجھی — تھے تعصّب کے آنکھ میں پھولے
وہم و وسواس کے رہے چلتے — سالہا سال توپ اور گولے
اِنتظامِ اُمورِ دُنیا کو — کیا سمجھتے یہ جنّتی بھولے
جس کو ہو کچھ بھی فہم سے بہرہ — اپنے شربت میں زہر یوں گھولے!
رہ نما بے خبر تو بات کو پھر — کون میزانِ عقل میں تولے
رہے عِلمِ معاش سے کورے — شہر، قصبے، محلّے اور ٹولے
ہیں ہمارے جو اور ہمسایے — گویا بیٹھے ہی تھے وہ مُنہ کھولے
خوانِ یغما پہ جا کے ٹوٹ پڑے — بھر لئے ٹھونس ٹھونس کر جھولے
لگی ہلدی نہ پھٹکری اور مفت — خوب موتی معاش کے رولے
محکموں کی پلٹ گئی کایا — افسوں کے بدل گئے چولے
کہا سیّد نے قوم سے "ناداں! — تو بھی اُٹھ بیٹھ ہاتھ مُنہ دھولے

پیچھے اُمّیدِ جمعِ خرمن کر — پہلے کھیتوں میں بیج تو بو لے
تب ہوئی کچھ جھجک ہماری دور — اور ہم نے بھی بال و پر کھولے
مگر اِس فیس کی گرانی کے — متواتر لگے وہ ہچکولے
حوصلہ کا نکل گیا بھرکس — اور ہمّت کے ہو گئے ہولے

العرض وہ مثل ہوئی اپنی
"سر منڈاتے ہی پڑ گئے اولے"

(۱۱۲) بانگِ درا

اب[1] نہ وہ سودا نہ وہ زلفِ سخن کا پیچ و خم — اب نہ وہ مضموں، نہ اُس طرزِ بیاں کا وقت ہے،
چشمِ عبرت کھولئے اور اپنی حالت دیکھیے — ضُعف کا عالم ہے یا تاب و تواں کا وقت ہے،
عید ہو یا ہو محرّم، اپنے جی میں سوچیے — قوم کی یہ فصلِ گُل ہے یا خزاں کا وقت ہے،
بعد ازیں یہ فیصلہ فرمائیے انصاف سے — وقتِ بیداری ہے یا خوابِ گراں کا وقت ہے،
کارِ دنیا سے شغف ہم کو نہ کارِ دین سے — وقفِ بیکاری ہر اک پیر و جواں کا وقت ہے،
دیکھنا! کیا رنگ لائی ہیں ہماری غفلتیں! — پاک چکا گلزار، رہنِ آشیاں کا وقت ہے،
حضرتِ ناصح بھی چپ ہیں لیکن اس کا کیا علاج — اُن کے حجرے میں ابھی وہم و گماں کا وقت ہے،

---

[1] عید الفطر ۱۳۲۹ھ روز دوشنبہ مطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۱۱ء۔

نوٹ از مولانا ظفر علی خاں صاحب اڈیٹر اخبار زمیندار= مولانا محمد اسمٰعیل صاحب رئیس میرٹھ کی یہ بلیغ نظم ہمارے پاس ذرا دیر سے پہونچی اِسے عید نمبر میں شائع ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اب بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی اور تاخیرِ اشاعت کی تلافی اُس کی رنگینی نے کردی ہے جو سدا بہار ہے۔

"اے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش"
دورِ آزادی ہے اور امن و اماں کا وقت ہے

اولیائے دولتِ انگلش ہیں دانایانِ دہر
اُن کے عدل و داد سے نوشیرواں کا وقت ہے

لگ رہی ہیں مُلک میں علم و ہُنر کی بازیاں
روزِ عزم و کار ہے اور امتحاں کا وقت ہے

ہے ضرورت ہمّت و تدبیر و استقلال کی
گاؤزوری کا، نہ یہ سیف و سناں کا وقت ہے

بادۂ مرد آزما ہے اِن دنوں تحصیلِ علم
بادہ خوارو! بیعتِ پیرِ مُغاں کا وقت ہے

خوابِ نوشی ہو چکی، جاگو! جگاؤ! بڑھ چلو!
دوستو! بانگِ درائے کارواں کا وقت ہے

اے سوارانِ جری! لے لو پیادوں کو بھی ساتھ
خصلتِ ایثار و دستِ زرفشاں کا وقت ہے

پائے مردی کیجئے کس سوچ میں بیٹھے ہیں آپ
چارۂ بدحالئ درماندگاں کا وقت ہے

عید کی تقریب میں داد و دہش بھی چاہیئے
شُکرِ خلّاقِ زمین و آسماں کا وقت ہے

خوش دلی سے کیجئے امدادِ فرزندانِ قوم
یہ نہیں موقع نہیں کا بلکہ ہاں کا وقت ہے

(۱۱۳) سادات کی امداد

مانا[لہ] کہ بہُت شوق سے کی تعزیہ داری
مانا کہ عَلَم دھوم سے یاروں نے اُٹھائے

مانا کہ ہُوا مرثیہ خوانی میں توغّل
مانا کہ مجالس میں بہت روئے رُلائے

لیکن کبھی سادات کا احوال بھی پوچھا
غم خواری میں اُن کی کبھی دو اشک بہائے

اولادِ امامین تو ہے زندہ و موجود
صد حیف جو رحم اُن کی مُصیبت پہ نہ آئے

لہ بروز شنبہ پنجم محرّم الحرام ۱۳۲۹ھ مطابق ۷ جنوری ۱۹۱۱ء۔

اُن میں بھی تو ہے خون اُسی شیرِ خُدا کا | ہیں یہ بھی اُسی فاطمہ کی نسل کے جائے
بیچارہ و بیکس پھریں سادات کے بچّے | کوئی اُنھیں مکتب میں لکھائے نہ پڑھائے
بے علم و ہُنر تنگ ہے میدانِ معیشت | ڈر ہے کہ زمانہ اُنھیں دَر دَر نہ پھرائے

ہے کوئی جواں مرد! کہ ازراہِ مُحبّت
سادات کی تعلیم میں دے اور دلائے

(۱۱۴) تماشائے خیالی[1]

جو کچھ نہیں بے کار ہے جو کچھ ہے سو بے سود | نیرنگِ دو عالم ہے تماشائے خیالی
اپنے ہی تخیّل سے ہیں یہ جُملہ طلسمات | نے حق ہے نہ باطل ہے نہ سافل ہے نہ عالی
جب زور ہُوا وہم کا سب ہو گئے پیدا | یہ نیک ہے یہ بد۔ یہ جلالی۔ یہ جمالی
ذکر و طلب و فکر و تمنّا ہیں سب اوہام | موجود نہ معدوم مقدّم ہے نہ تالی
یاں ہے نہ وہاں ہے نہ اِدھر ہے نہ اُدھر ہے | ظاہر ہے نہ باطن ہے نہ حالی ہے نہ قالی
اِقرار نہ انکار نہ کچھ علم نہ اِدراک | ذاتی نہ صفاتی نہ حقیقی نہ خیالی
ہے روشنی سب ایک نہ تمئیز نہ تفریق | گنتی میں ہزاروں ہیں چراغانِ دِوالی
ہر چند مٹھائی کے بکثرت ہیں کھلونے | سب ایک ہیں جب ٹوٹ گئی شکلِ مثالی
ہر قسم کا منشا ہے وہی ایک حلاوت | گو مختلف اقسام سے معمور ہے تھالی

---

[1] پیر جی غلام محمدؒ صاحب مرحوم وکیل و رئیس لودھیانہ مصنّف کے برادرانِ طریقت میں سے تھے، جن کے واسطے یہ نذرانہ ۱۸۸۳ء میں ترتیب دیا گیا تھا۔

نے کشف و کرامت نہ مناصب نہ مراتب
جب کھل گئی آنکھیں تو نہ گھر پاہے نہ جالی

جو کچھ ہے کم و بیش اِسے کیجئے منظور
جاتے ہیں کہیں پیر جی نذرانہ سے خالی

(۱۱۵) نام نہاد رہنمایانِ قوم

اِن مُدعیوں سے نہ کہو دردِ دل اپنا
مرجائے بھی کوئی تو یہ ہرگز نہ کریں ہائے

جس رائے کی تائید ہو مضمونِ ریا سے
جیدّ حکما کہتے ہیں مردود ہے وہ رائے

سر پیٹ لوں یا اپنا گریباں کروں چاک
اِس درجہ کو پہنچا مرا احوال کہ اے وائے

آئے ہیں مرے زخم جگر سینے کو وہ لوگ
ناکے ہیں سوئی کے جنھیں دھاگہ نہ پرو آئے

(۱۱۶) عالمِ خیال[1]

حامد شب برات کا سامان ہے یہی
اخبار پھلجھڑی تو پٹاخا پیامِ یار

ہیں عالمِ خیال میں ہم بھی وہیں کھڑے
ترکانِ شیر دل ہیں جہاں گرمِ کارزار

بلگیریا میں ہم کبھی آئے گئے نہیں
نظروں میں ہیں مگر وہی میدان و کوہسار

پھرتا جہاں رسالہ کا سک ہے دوڑتا
اور اُن کی تاک جھانک میں سرکیشین سوار

ہم وارنہ میں دیکھتے ہیں وہ ہجومِ فوج
تھا جس کے روم و مصر سے آنے کا انتظار

اُڑتا ہوا نشانِ ہلالی نظر پڑا
پہونچا جو شوملہ پہ تصوّر کا راہوار

نوٹ[1] ۹ اکتوبر ۱۹۱۴ء۔ [2] مرتبہ ۱۸۷۷ء۔

گویا کہ دیکھ بھال کے ہم آئے ہیں ابھی
میدان اور مورچے اور خیموں کی قطار
ریحق سے آ رہی ہے دنادن کی اِک صدا
اور سسٹوا کو لوٹ رہے ہیں ستم شعار
بھاگا ہے ترنوا کو نکولاس چھوڑ کر
آتا ہے بے دھڑک جو سلیمانِ ذی وقار
آئی پلیونہ سے نویدِ ظفر ہمیں
عثمان نے کیا ہے وہاں روس کا شکار

(۱۱۷) مراسمِ بیہودہ[1]

اے شب برات عمر ہے تیری بہت بڑی
میں سن و سال تیرے کہاں تک کروں شمار
ہے ہجرتِ رسول کو یہ تیرھویں صدی
اور تو ہر ایک سال میں آتی ہے ایک بار
دیکھا ہے تو نے آنکھ سے اسلام کا عروج
تجھ کو تو خوب یاد ہے تاریخ روزگار
کرتا ہوں اِک سوال مجھے تو جواب دے
پہلے بھی تھا یہ فرقۂ اسلام کا شعار؟
کیا اُمتِ نبی کی یہی رسم و راہ تھی؟
جو ئی زمانہ نا ہے مروّج بہر دیار
بول اُٹھ جو تو نے دیکھی ہو اگلے زمانہ میں
حلوے کی چاٹ اور اناروں کی یہ بہار
ہے فرضِ عین آج پٹاخوں کا چھوڑنا
یہ مشغلہ نہ ہووے تو بچے ہیں بے قرار
حلوا نہ کھائے جو۔ وہ مسلمان ہی نہیں
چھوڑے نہ جو انار۔ وہ کاہے کا دیندار
سامان کوئی گھر میں میسّر اگر نہ ہو
حلوائی اور بنئے سے لے آتے ہیں اُدھار
بھجوائیں دے کے فاتحہ مُردوں کے واسطے
اسلام کا ہے اب تو اِسی رسم پر مدار
بولی شبِ برات کہ میں کیا جواب دوں
لوگوں کے سر پہ جب سے جہالت ہوئی سوار

---

[1] مرتبہ ۲۰ رجون ۱۸۸۳ء۔

اِسلام کے طریق سے بس ہو کے مُنحرف
کر بیٹھے ہیں مراسمِ بیہودہ اِختیار

یہ قوم آج اہلِ جہاں کی نگاہ میں
بد رسمیوں سے آپ ہے اپنی ذلیل و خوار

اِسلام میں پتا بھی نہیں جن رسوم کا
اصلِ اصولِ دیں اُنھیں کرنے لگے شمار

(۱۱۸) شُکرِ نعمت[۱]

تیس[۳] دن بھوک پیاس کو روکو
یہ ریاضت ہے آدمی کو مفید

روزہ کیا چیز ہے بتائیں تمھیں
حرص کی قید نفس کی تہدید

سب کو بھولو کرو خدا کو یاد
سب کو چھوڑو بجز خدائے وحید

دو جہاں میں اُسی کا جلوہ ہے
ہے وہی مثلِ آفتاب پدید

دل کی آنکھوں سے دیکھئے لیکن
کہ خدا را بچشم نتواں دید

وحدہٗ لا الٰہ اِلّا ہُو
کچھ نہیں ہے سوائے ربِّ مجید

تا بمقدور کیجئے تہلیل
تا بامکان چاہیے تمجید

مُعتکف خانۂ خُدا میں ہو
کچھ تو سیکھو طریقۂ تجرید

عید کرتے ہیں اِس وتیرہ پر
جو خُدا کے ہیں بندگانِ رشید

رمضاں کا مہینہ یوں گزرا
ختم روزے ہوئے تو آئی عید

عید کے دن پڑھو نماز و دُعا
عُذرِ تقصیر کی کرو تمہید

کہ خُدایا نہ ہو سکی طاعت
نہ ہوا ہم سے کوئی کارِ سعید

---

[۱] مرتبہ ۱۸۸۰ء

نہ ہوئی تیرے حکم کی تعمیل
نہ ہوئی اہلِ رُشد کی تقلید
کوئی خدمت بجا نہ لائے ہم
جنسِ عُقبیٰ کی کر سکے نہ خرید
جو ہُوا تیری مہربانی سے
ناتوانوں کی تو نے کی تائید
شُکر کی تو نے ہم کو دی توفیق
شُکر سے تیری نعمتیں ہیں مزید
شُکرِ نعمت بھی تو نے سکھلایا
ورنہ تھا ہم سے تو بہت ہی بعید

جا کے حامد سے یہ کہو محمود
اب کے عیدی لکھی گئی ہے جدید

(۱۱۹) مقامِ محترم[۱]

عیدِ قرباں یادگارِ دینِ ابراہیم ہے
کیا خوشی کا دن ہے یہ بھی ربِّ کعبہ کی قسم
شوق میں اطرافِ عالم سے چلی آتی ہے خُلق
روبسوئے کعبہ۔ دل مُشتاقِ آثارِ حرم
ساکنانِ رُبعِ مسکوں جمع ہیں مکّہ میں آج
رومی و جاوی و ہندی تُرکی و مِصری بہم
مُختلف سب کی زبانیں اور جُدا شکل و لباس
پر طوافِ کعبہ میں سب ہم خیال و ہم قدم
سرزمینِ مکّہ تھی ویرانۂ بے برگ و بار
قُدرتِ حق نے مگر بخشا اُسے جاہ و حشم
کاروانِ بحر و بر اُس کی طرف ہیں دوڑتے
مرکزِ عالم ہے الحق وہ مقامِ مُحترم
نسلِ انسانی بہم ہوتی ہے اس جا روشناس
ہے یہ میدان انتخابِ کاملانِ ذی ہِمَم

آپ کی عیدی ہے حامد یا کوئی تاریخ ہے
ایسی عُجلت میں بھلا ہوتے ہیں یہ مضموں رقم

---

[۱] مرتبہ ۱۸۸۴ء

(۱۲۰) طوافِ بیت اللہ

عازمانِ طوافِ بیت اللہ — ساکنانِ نواحِ دور و دراز
کارواں کارواں روانہ ہوئے — شوقِ حج میں کیا سفر آغاز
ناخدا نے اُٹھا دیا لنگر — لے کے نامِ خدائے بندہ نواز
کر چکے طے محیطِ اعظم کو — جا لگے ساحلِ عرب پہ جہاز
ساربان نے بٹھا دیا ناقہ — ہو گئے داخلِ حدودِ حجاز
اشتیاقِ حریم میں سب نے — باندھا احرام تا کھُلے کچھ راز
پھرتے ہیں خانۂ خُدا کے گرد — با خضوع و خشوع و عجز و نیاز
کرکے نامِ خدا پہ قربانی — ہوئے قربان عاشقِ جانباز
کرکے غُسل و وضو چلو محمودؔ — عید گہ کو پئے ادائے نماز
اب کے عیدی لکھی گئی کیسی — ہے نیا طرز اور نیا انداز

(۱۲۱) علم و حکمت اسلام کا ورثہ ہے

اے مُسلمانو! مُبارک ہو تمہیں عیدِ الضحےٰ[۲] — دین و دولت سے رکھے اللہ دائم شاد کام
ہو عطا توفیق تم کو کسبِ علم و فضل کی — قوم کے اِعزاز کا پرچم اُڑے بالائے بام
قابلیت ہر صنف میں جلد تر پیدا کرو — تا معیشت کے مَدارج تم کو حاصل ہوں تمام
ہاں تجارت اور صنعت میں رہو تم پیش پیش — جیسے تھے اَسلاف بحر و بر میں دُنیا کے امام
ہے خبر تم کو بھی یورپ کا تھا اُستاد کون؟ — آج تک مغرب میں ابنِ رُشد کا روشن ہے نام

---

[۱] مرتبہ ۱۸۸۷ء۔ [۲] ۱۲ دسمبر ۱۹۱۰ء مطابق عید الضحےٰ ۱۳۲۸ھ۔

تم نے چمکایا تھا بر فستان میں خورشیدِ علم
ہیں تمہارے فیض کے ممنون اب تک خاص و عام
کیا طبیعی کیا ریاضی کیا ادب کیا فلسفہ
تھی تمہارے ہاتھ میں کشتیٔ حکمت کی زمام
بیشتر قومیں کہ جن میں تھی ابھی وحشت کی بو
اِن کو سکھلایا سیاست اور تمدّن کا نظام
شرک اور توحید کی تحلیل کر دی صاف صاف
جس سے دُنیا میں ہوئی تمیزِ انوار و ظلام

رود بارِ غرب سے تا ساحلِ دریائے چیں
تھا تمہارے عزمِ سیّاحی کے آگے نیم گام

(۱۲۲) جہل و افلاس

جُمعہ کا دن ہے اور عیدِ قرباں
آراستہ ہیں محراب و منبر
عیش و خوشی کا ساماں ہے دونا
کیا خوب دِن ہے اللہ اکبر
خالی پڑا ہے ہر ایک مکتب
ہے بند بالکل ہر ایک دفتر
تم کو خبر کیا لڑکوں سے پوچھو
دل میں اُمنگیں آتی ہیں کیوں کر
پھرتے ہیں خوش خوش چھٹّی مناتے
اب کچھ نہیں غم اب کچھ نہیں ڈر
سبزہ بچھا ہے پیروں کے نیچے
بادل کا سایہ ہے سر کے اُوپر
سردی کا موسم ٹھنڈی ہوا ہے
تن کانپتا ہے کپڑوں میں تھر تھر
خوش قسمت ایسے ہیں اب بہت کم
جو گرم کپڑے نکلیں پہن کر
میلے کچیلے دُھلوا لئے ہیں
دو ایک پیسہ دھوبی کو دے کر
چکنی ہیں مونچھیں اور پیٹ خالی
یعنی مسلمان مُفلس ہیں اکثر

۲۰ دسمبر ۱۹۰۱ء

کاہل بہت سے جاہل بہت سے
تھوڑے ہیں لائق کم ہیں ہنرور
اے پیارے بچّو تم یاد رکھو
مکتب سے نکلو لکھ اور پڑھ کر

(۱۲۳) ترقّیٔ تدریس

کافی ہے شادمانیٔ عید الضحیٰ ہمیں
جشنِ مجوس کی نہ کبھی ریس چاہیئے
ہو جس قدر تنزّلِ اسراف خوب ہے
البتّہ اک ترقّیٔ تدریس چاہیئے
قدرِ قلیل ہی سہی لیکن خوشی کے ساتھ
کہتا ہے کون آپ سے دس بیس چاہیئے
سُن لیجئے خلاصۂ مطلب جنابِ من
اطفالِ قوم کے لئے کچھ فیس چاہیئے

(۱۲۴) فتحِ عظیم

ہاں کیوں نہ ہو دوچند ہمیں عید کی خوشی
فتحِ عظیم پائی ہے سلطانِ روم نے
سچ کہہ رہا ہوں شک ہو تو لو پانیر پڑھو
کیسی شکست کھائی ہے یونانِ شوم نے
شکرِ خدا ہر ایک مسلمان خوش ہے آج
عیدی کے شعر پڑھ کے لگے ہم بھی جھومنے

(۱۲۵) تقاضائے محبّت

بار ور ہونا شجر کے واسطے بھی ہے کمال
ہر شجر میں پھل نہیں آتا ہے مثل اُس کے کبھی
پھل سے تخم اور تخم سے ہوتا ہے پیدا نونہال
وہ نہال البتّہ رکھتا ہے شباہت اصل کی

۲۰؎ ۲۰ دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء

نخلِ اُولیٰ کو نہیں کچھ پرورش سے واسطہ
ہیل فرزندی ہے اِن میں اور نہ مہرِ مادری

ہے غرض ایسا ہی کچھ احوالِ حشرات و ہوام
پرورش کی فکر سے فارغ ہی انکی جنس بھی

طائروں کا منصب اِن دونوں سے برتر ہے کہ وہ
ہیں کفیلِ پرورش جبتک کہ ہوں بچّے قوی

اپنے بچّوں کے لئے کرتے ہیں آذوقہ تلاش
ہے محبّت کا تقاضا مانعِ تنہا خوری

(۱۲۶) علم و ہُنر[لہ]

کچھ آپ کو ہے قوم کے بچّوں کی خبر بھی
احوال پر اِن کے کبھی ڈالی ہے نظر بھی

اس نور کی تنویر کا ساماں بھی کیا کچھ
کہنے کو تو کہدیتے ہیں سب نورِ بصر بھی

تعلیم کا ایک مرحلہ دُشوار ہے ایسا
اِس رنج نے دل خوں کیا بلکہ جگر بھی

کاوش ہے یہ ایسی کہ نہیں دل سے نکلتی
خواہش ہے یہ ایسی کہ نہیں جس سے مفر بھی

جو کان میں پھونکا گیا ہنگامِ ولادت
قائم رہے تا آخرِ عمر اُس کا اثر بھی

اور دورِ زماں کا یہ تقاضا ہے یہ اعلان
روزی کے لئے چاہئے کچھ علم و ہنر بھی

یہ مدِّ نظر رکھ کے جو اسکول بنایا
مطلوب ہے اِس کے لئے اِک تودۂ زر بھی

قدرت نے عطا کی ہے جنہیں ہمّتِ عالی
اور جن کے پیالہ میں بھرا شیر و شکر بھی

واجب ہے اُنھیں آج کریں تخم فشانی
تا دیکھ لیں آنکھوں سے گُل و برگ و ثمر بھی

اور وہ جو دلِ پاک سے کر سکتے ہیں امداد
دیں دل سے دُعا شام کو اور وقتِ سحر بھی

لہ یہ نظم فیض عام ہائی اسکول کے لئے لکھی گئی تھی۔

(۱۲۷) فیضِ عام

ہو[1] مبارک آپ کو عیدِ سعید — دے ترقی آپ کو ربِّ جلیل
آپ ہی کا مدرسہ ہے فیضِ عام — آپ کی خدمت میں کرتا ہے اپیل
دیکھئے میرے مدارج کا عُروج — کیجئے میرے مصارف کی سبیل
آپ میری ہمّت افزائی کریں — قوم کے اطفال کا میں ہوں کفیل
بَارَکَ اللہ گر ہو مقدارِ کثیر — میرے سر آنکھوں پہ ہر قدرِ قلیل
التفاتِ خاص میں گر ہو نہ دیر — میری کوشش میں بھی ہوگی نہ ڈھیل

سرزمینِ مصر کب دیتی ہے پھل؟
جوش پر آتا ہے جب دریائے نیل

(۱۲۸) قوم کے بچّوں کی اعانت

آج[2] ہے روزِ سعیدِ عید اے اعیانِ قوم — موجبِ شکرِ خدا ہے یہ مسرّت آپ کو
ہے نشانِ دینِ ابراہیم قُربانی کی رسم — شرع نے بخشی ہے لیکن یہ سعادت آپ کو
قوم اِک کُنبا ہے شامل جسمیں ہیں چھوٹے بڑے — چاہئے اپنے سے چھوٹوں کی رعایت آپ کو

قوم کے بچّوں کا صدقہ ہے کہ آخر پڑ گئی
مانگنے کی خو ہمیں دینے کی عادت آپ کو

---

[1] عید الفطر ۱۳۳۲ھ۔ [2] مرتبہ ۲۸ نومبر ۱۹۱۱ء عید الضّحےٰ ۱۳۲۹ھ۔

(۱۲۹) مامنِ اطفال

آپ کو معلوم ہے مامنِ اطفالِ قوم — شہر میں صرف ایک ہے مدرسۂ فیضِ عام
اُس کی مدد کیجیے خاص توجّہ کے ساتھ — اپنی مدد آپ ہے اُس کی مدد والسّلام

(۱۳۰) عِلم اور جہل کا مقابلہ

غالباً دیکھا تو ہوگا آپ نے — عِلم کا اور جہل کا میدانِ جنگ
نام اُس میدان کا ہے فیضِ عام — لشکری دونوں طرف ہیں شوخ و شنگ
عِلم کا لشکر ہے غالب دَم بدم — جہل کی فوجوں پہ ہے اب عرصہ تنگ
مردِ میداں طالبانِ عِلم ہیں — کرتے ہیں کوشش برائے نام و ننگ
جلد تر اِن کی مدد فرمائیے — بے تکلّف بے تأمّل بے درنگ
تاکہ ہو تعلیم کا ساماں وسیع
اور اِن بچّوں کی بڑھ جائے اُمنگ

(۱۳۱) امدادِ خُدا

کرو امداد یونیورسٹی[۱] کی — کہ یہ امداد امدادِ خُدا ہے
مُہم سر ہو چُکی تھوڑی مدد اور — کنارے پر سفینہ آ لگا ہے

(۱۳۲) تہنیت سالگرہ ملکہ وکٹوریہ[۲]

سُنو حضرات! جب گوئے زمیں نے — لگائے تین سو پینسٹھ[۳۶۵] ہیں چکّر

---

[۱] یونیورسٹی سے مراد مُسلم یونیورسٹی علی گڈھ ہے۔

[۲] یہ قطعہ بہ تقریبِ تہنیت سالگرہ حضور ملکہ معظمہ قیصرِ ہند سنہ ۱۸۹۲ء میں سیّد اقبال احمد صاحب مرحوم نے پڑھا تھا۔

تو افضالِ الٰہی سے مع الخیر ہوا بارِ دگر یہ دن میسّر
کو ئین وکٹوریا کا رشتۂ عُمر جو ہتّرواں پڑا آج اُس میں گوہر
اُسی کی تہنیت کا ہے یہ جلسہ مسرّت اور خوشی ہے جلوہ گُستر
محبّت خیر خواہی حق شناسی نظر آتی ہے اِس جلسہ کے اندر
مُجسّم صورتیں مہر و وفا کی اگر ہوتیں نہ ہوتیں ہم سے بہتر
خوشی کا دن ہے اور وہ تہنیت ہے کہ جس کا جوش ہے سب میں برابر

غرض ہم سب خدا سے چاہتے ہیں
دوامِ دولت و اقبال قیصر

(۱۳۳) جشن سالگرہ ملکۂ وکٹوریہ آنجہانی

ہر چند کہ مُلکِ ہند امسال پامالِ مُصیبت و بلا ہے
ہے ایک طرف تو حملۂ قحط اور دوسری سمت میں وبا ہے
ہے قحط سے بھی وبا خطرناک اور قحط وبا کا بھی چچا ہے
دونوں کے مقابلہ کا لیکن ساماں بڑا کیا گیا ہے
حُکّام ہیں کوششوں میں مصروف بہبودِ عوام مدّعا ہے
اور قیصرِ ہند کا تو ہر آن اِس مُلک میں دِل لگا ہوا ہے
خود دی ہے مدد عطائے زر سے ایما اوروں کو بھی کیا ہے
کیا کیا ہے رعایتِ رعایا ماؤں سے زیادہ مامتا ہے

یہ سالگرہ کا اُن کی ہے جشن — اِس جشن کی خرّمی بجا ہے
زندہ رہے تا بدیر قیصر
ہر وقت خدا سے یہ دُعا ہے

(۱۳۴) قطعہ مبارکباد

ہمارے حاکم اعلیٰ جناب ہیوٹ[1] کو — نیا حضورِ شہنشاہ سے خِطاب ملا
اگر مخاطبِ والا کا ہے خِطاب بلند — خطاب کو یہ مخاطب بھی لاجواب ملا
مبارک آپ کو ہو نجمِ ہند کا الماس
ہمیں خوشی ہے دوبارہ یہ آفتاب ملا

(۱۳۵) سرسیّد احمد خان[2]

تنِ بے سر کی طرح قوم پڑی تھی بیجاں — سر جو پایا تو اُٹھی بہرِ قیام اور قعود
سر وہی (سلمہ اللہ تعالیٰ) سیّد — رہبری جس کو ہے بے راہ رَوَوں کی مقصود
قومِ بدحال کے اندیشۂ غمخواری سے — کبھی خالی نہ رہا جس کا دلِ درد آمود
نہ گئی طالبِ صادق کی تگ و تازِ عبث — کھل گیا قوم کی بہبود کا بابِ مسدود
ڈالی آخر کو دبستانِ خرد کی بنیاد — ہو گیا جلوہ نما وہ جو تھا ذہنی معہود
انقلاباتِ زماں سے ہو تحفظ کیوں کر — ناگزیر اُس کے لئے چاہئیں آئین و حدود

---

[1] سر جان ہیوٹ ۱۹۱۱ء میں یو۔پی کے لفٹنٹ گورنر اور بعد دربار شاہی جس کے وہ منتظم تھے پھر یو۔پی کی لفٹنٹ گورنری پر واپس آئے تھے۔

[2] مرتبہ ۱۸۸۰ء یہ قطعہ اُس موقعہ پر لکھا گیا تھا جب کہ قانون ٹرسٹیاں کی بابت باہم اختلاف تھا۔

پس مرتّب ہوا مجموعۂ دستورِ عمل ۔۔۔ تاکہ ہر عہد میں کام آئے پے حلّ عُقود
کثرتِ رائے سے اب پاس ہوا وہ قانون ۔۔۔ جس سے مقصود ہے کالج کا دوام اور خُلود
قوم نے فرطِ مسرّت سے سُنا یہ مژدہ ۔۔۔ سیّد القوم کا ہمکار ہے سیّد محمود
ہو گیا دُور تنِ قوم کو تھا جو خطرہ ۔۔۔ للہ الحمد۔ کہ اک اور بھی سر ہے موجود
صد و سی سال رہے زندہ ابھی پیرِ بزرگ ۔۔۔ نوح کی عمر کو پہونچے یہ جوانِ مسعود
دور بیں فہم و خرد کی ہمیں دکھلاتی ہے ۔۔۔ قوم کا نیّرِ اقبال ہے مائل بصعود
خدمتِ قوم پہ آمادہ ہوا وہ مخدوم ۔۔۔ نام کی طرح سے ہیں کام بھی جس کے محمود
کچھ مسلماں ہی نہ صرف اُس کو بھلا جانتے ہیں ۔۔۔ مانتے ہیں اُسے انگریز بھی۔ نیز اہلِ ہنود
حظِّ وافر ہے اُسے نو و کہن سے حاصل ۔۔۔ ملتقے گنگ و جمن کا ہے مگر اُس کا وجود
اُس کے سینہ میں ہیں قدرت نے ودیعت رکھے ۔۔۔ علم و حکمت کے گہر فضل و بلاغت کے نقود
یہ سلیماں ہی کرے گا اُسے اکمال ۔۔۔ جس عمارت کی بنا ڈال رہا ہے داؤد
ڈال دیں وسطہ نسیاں میں اُسے اب احباب ۔۔۔ چھڑ گئی تھی وہ جو اِک بحث بہم رنج آلود
صلح کے ساتھ اگر ذکر کریں بھی تو کریں ۔۔۔ نہ کہ آپس میں لڑیں مثل نصاریٰ و یہود
اتفاقات سے گر ہو بھی گیا کوئی نزاع ۔۔۔ بزمِ قومی میں نہ سلگاؤ اُسے صورتِ عود
ہر شرارہ سے بچو بھَق سے اُڑا دے نہ کہیں ۔۔۔ ایک مخزن ہے جہاں جس میں بھری ہے بارود
زید ہو عمر ہو۔ یا دشما۔ کوئی ہو ۔۔۔ سب کے ممنون ہو جو قوم کی چاہے بہبود
ہاں مگر ایک جو شوریدہ دِل سوختہ ہے ۔۔۔ چار سو گونجتی ہے جس کی فغانِ پُر دُود

قوم کا قیس ہے اور قیس فنا فی اللیلےٰ
نہ وہ حاسد ہے کسی کا نہ کسی کا محسود

کشتیٔ نوح کو زنہار نہ توڑو یارو!
پے کرو ناقۂ صالح کو نہ جوں قومِ ثمود

اور ہی چیز ہے وہ اُس کو نہ چھیڑو زنہار
اور ہی شخص ہے وہ اُس سے اُلجھنا بے سود

اُس سے تفضیل کا دعویٰ ہو تو دعویٰ ہے مِس
اُس کی تذلیل کی خواہش ہو تو خواہش مردود

اُس کے حالات سے واقف ہے وہ دانندۂ راز
جس کے قبضہ میں ہے کُل کارگہِ غیب و شہود

(۱۳۶) مرگِ[1] نوجوانی

الا یا ایہا الاخوان و احباب
کہ تھے ہم بھی تمھاری طرح خوش حال

بہارِ نوجوانی کا تھا آغاز
قریبِ ختم تھا بائیسواں سال

ہماری آرزو کی تھی روش اور
زمانہ چل رہا تھا اور ہی چال

یکایک صدمۂ بادِ فنا سے
نہالِ تن ہوا دم بھر میں پامال

قضارا گر سرِ مدفن گزر ہو
تو ہاں۔ اے دوستدارانِ خوش اعمال

دُعا کرنا کہ ہو سیرابِ رحمت
ریاضِ جاوداں میں جانِ اقبال

(۱۳۷) یادِ رفتگاں[2]

قصّۂ دردِ جاں گزا سُنئے
ماجرائے الم فزا کہیئے

پوچھئے نالۂ و فغاں کا سبب
موجبِ گریۂ و بُکا کہیئے

---

[1] مرتبہ ۱۸۹۳ء [2] مرتبہ ۱۸۹۷ء

کیوں سمجھئے فسادِ آب و ہوا
کیوں ستمگاریٔ وبا کہیئے

موت کو دیجئے نہ کچھ الزام
کار فرمائیٔ قضا کہیئے

عمر کو کیجئے سفینہ شمار
دہر کو لُجّۂ فنا کہیئے

ہے عبث علّت و مرض کا بیاں
ہاں فقط مرضیِ خدا کہیئے

وہ جو تھی بزمِ صحبتِ احباب
اب اُسے مجلسِ عزا کہیئے

کیجئے ماتمِ رحیم اللہ
نوحۂ رحلتِ صبا کہیئے

اکبر آباد کا ادیبِ اریب
کر گیا کوچ ہائے کیا کہیئے

فضل و دانش میں علم و حکمت میں
بے بدل فی زماننا کہیئے

عربی کے کلام کا انداز
امرء القیس دوسرا کہیئے

سُخنِ فارسی کی راہ و روش
آفریں اور مرحبا کہیئے

دیکھئے ریختہ کی آن و ادا
ثانیٔ میر و میرزا کہیئے

کیجئے شیونِ سخندانی
علم و دانش کا مرثیا کہیئے

کر کے شعر و سخن سے قطع نظر
صاحبِ صدق و باصفا کہیئے

ہاں زروئے محاسنِ اخلاق
معدنِ حلم اور حیا کہیئے

پاک دل پاک طبع۔ نیک نہاد
مخزنِ مہر اور وفا کہیئے

اے خوشا وہ! کہ نیک نام جیا
اُس کو مقبولِ کبریا کہیئے

جسم زنداں ہے روح زندانی
ہو رواں تو اسے رہا کہیئے

(۱۳۸) کوسِ رحیل

رحلتِ[1] ایڈورڈ ہفتم پیش آئی یک بیک
اس وقوعہ کا نہ تھا ہرگز کسی کو بھی خیال

ہم نہ بھولے تھے ابھی وکٹوریہ عُظمیٰ کا غم
کیونکہ گزرے تھے ابھی اس حادثہ پر چند سال

چند سالہ سلطنت میں شاہِ والا جاہ نے
کردیا سب پر عیاں اپنی لیاقت کا کمال

ملکِ افریقہ میں قومِ بور کو بخشا عروج
باوجودِ فتح مندی چھوڑ دی جنگ وجدال

کس قدر ہم عصر شاہوں سے بڑھائی آشتی
کس قدر ہمسایہ ملکوں سے نباہا اعتدال

بن گئے یارانِ مخلص پیرس و پیٹرس برگ
دُھل گئی انگلش کی جانب سے جو تھی گردِ ملال

جرمن و اسپینیر رومی و یونانی و ترک
صلح جو ایڈورڈ نے سب کی بدل دی چال ڈھال

پیس میکر برِّ اعظم میں ہوا اُس کا لقب
بڑھ گیا برطانیہ کا اور بھی عزّ وجلال

---

[1] مرتبہ ۱۰ رمئی ۱۹۱۰ء

کی تھی دورانِ ولی عہدی میں سیر اس ملک میں
تھی عنایت کی نظر ہندوستاں کے حسبِ حال
ہفتمِ ماہِ مئی کو بج گیا کوسِ رحیل
عیسوی اُنیس صدیاں اور یہ دسواں ہے سال
اب دُعا ہے جارج پنجم جانشینِ سلطنت
مدّتوں پھولے پھلے دُنیا میں یہ تازہ نہال
سب کے دل پر نقش ہیں اس خانداں کی نیکیاں
اُن کے حق میں ہے رعایا کا دُعا گو بال بال
دودمانِ شاہ کو اللہ دے صبر و سکوں
دولت و اقبال روز افزوں رہے اور مُلک و مال

(۱۳۹) فراقِ دائمی[1]

واقعہ ہے روح فرسا، دل ہے سینہ میں تپاں
اشکِ حسرت مدّتوں رُلوائے گی یہ داستاں
ایک غم ہوتا ہے شخصی ایک عالمگیر غم
ہے بجا گر ہوں سیہ پوش آج آبنائے جہاں

---

[1] شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کا مرثیہ ناتمام ہے، ترکیب بند کی صورت میں
[1] لکھا جاتا، افسوس ہے تمام نہ ہو سکا۔

حضرتِ حالی کی رحلت تھی تو امرِ ناگزیر
سال بھر سے تھی دِلوں میں یہ کھٹک سوہانِ جاں
جو سونگھا کر لخلخہ مُردوں کو لایا ہوش میں
کیوں نہ ہو اُس کا فراقِ دائمی سوہانِ جاں
بے حِسی کا رنگ چھایا تھا کچھ ایسا بزم میں
ہزل کو سمجھے ہوئے تھے شعر کی غایت یہاں
مرحبا اے فکرِ خواجہ تیری جودت نے کئے
سرزمینِ شعر میں حکمت کے سرچشمے رواں

(۱۴۰) اخبار زمیندار[1]

طبع کے آلات کی ضبطی کے ساتھ ہو گیا اخبار زمیندار بند
چُھٹنا تھا اِس چاٹ کا مُشکل مگر اب ہے کئی ہفتہ سے ناچار بند
صدق کا اور کِذب کا وہ احتمال بے خبری میں ہوا ایک بار بند
روگ ہے اخبار بھی اَفیُون بھی کردے کہیں دونوں کو سرکار بند
چاہیئے اَصطبل میں اپنے رہے خامۂ چالاک کا رہوار بند
کاسۂ سر میں رہے پیکِ خیال جیل میں جس طرح گنہگار بند
پھر تو بڑے چین سے گزرے اگر سارے زمانہ کے ہوں اخبار بند

---

[1] مولانا اخبار زمیندار کو شوق سے مطالعہ فرمایا کرتے تھے، اور جب اس کو ناگہانی حوادث پیش آتے مالی امداد بھی فرمایا کرتے تھے۔

کوئی اڈیٹر کا نہ پیشہ کرے نامہ نگاری کا ہو بازار بند
بعض کی یہ رائے ہے با این ہمہ
حضرتِ ریوٹر کے نہ ہوں تار بند

نجم الاخبار (۱۸۹۱ء)

سپاس نامۂ مُستّنا ہی بحضرتِ باری نیاز و عجز بدرگاہِ قادرِ علّام
ہزار منّت و شکر و سپاسِ حق کہ ہوا چھٹا برس بھی اِس اخبار کا بخیر تمام
بحسبِ خواہشِ خاطر ہزار شکر کہ ہے مراد و مقصد و مامول اُمید و مطلب و کام
ہو سالِ حال بھی ایسا ہی بامُراد آغاز کہ سال ہائے گذشتہ تھے جیسے نیک انجام
مُدام باعثِ رونق عنایتِ احباب ہمیشہ وجہہ ترقّی نوازشِ حُکّام
گذارشِ ہمہ مضموں پسندِ خاص خواص نگارشِ ہمہ مطلب مُفیدِ عام عوام
لطےئ راہِ رفاہِ انام یہ تاکید کہ پوبہ پو یہ چلے خامۂ گُسستہ لجام
بقطعِ وادئ نفع عوام یہ تنبیہ کہ گُذرے کِلکِ گہر ریز برسرِ ہنگام
وہ اہتمامِ خبر ہائے تازہ تازہ و گرم کہ جُھک کے کرتا ہے جس کو پیامِ تار سلام
نہ مدح و شکر ہیں یہاں چاپلوسی و الحاج نہ ذمّ و شکوہ میں یہاں مثلِ دیگراں ابرام
شیوعِ علم و ہنر ہی سے الغرض ہے غرض
اِسی میں صرف ہے بالجملہ اہتمام تمام

(۱۴۲) قرض[۱]

دامِ بلا ہے قرض پھنسے اور ہوئے شکار ہے پاسِ آبرو۔ تو رہو ہوشیار تم
کنیاتے ہی رہو گے سدا قرض خواہ سے اِس ننگ و عار کو نہ کرو اِختیار تم
دیکھو! یہ قرض وعدہ خلافی نہ دے سکھا ہو جاؤ گے جہان میں بے اعتبار تم
جب تک وبالِ جان نہ جانو گے قرض کو ہرگز نہ بن سکو گے کفایت شعار تم
گر دُرِ شاہوار ملے کوڑیوں کے مول زنہار بھول کر بھی نہ لینا اُدھار تم
مقروض ہو گئے تو پیادہ سے ہو بتر مانا کہ رکھتے ہو فرسِ راہوار تم
غالب کہ ریل پر بھی ہو قطعِ سفر محال جو قرض کے ٹکٹ سے ہوئے ہو سوار تم
کشتیٔ نوح پر بھی چڑھے گر بطورِ قرض مُجھ کو یہ خوف ہے کہ نہ پہونچو گے پار تم
مقروض کی نہیں ہے زمانہ میں آبرو یوں اپنے دِل میں بات بناؤ ہزار تم
تم جانتے ہو گرچہ بُرا سود خوار کو ہے اصل یہ کہ بن گئے بے سود۔خوار تم
وہ بندۂ درم سہی اُس کا غلام کون؟ اپنے ہی دل میں سوچ لو اپنا وقار تم

پھر ہو سکے گا کوئی بھی افسوں نہ کارگر
لقمہ کو قرض کے نہ کرو زہر مار تم

(۱۴۳) کاشتکاری

گنجِ زر خاک سے اُگلوایا کیمیا شغلِ کاشتکاری ہے
کر چکا جب کسان اپنا کام پھر خُدا سے امیدواری ہے

۱؎ مرتبہ ۱۸۹۳ء۔

آفتِ ارضی و سماوی سے ہے نگہباں۔ تو فضلِ باری ہے

نہیں حاصل پہ دسترس نہ سہی بیج بُونا تو اختیاری ہے

وقت ضائع نہ کر۔ اگیتی بو سینچ لے کھیت نہر جاری ہے

جوت۔ بو۔ سینچ۔ پھر توکّل کر نہ کیا کچھ تو شرمساری ہے

ہر سری ساگ پات کو مت جان اِس پہ تو زندگی ہماری ہے

جڑ۔ تنہ۔ ڈال۔ پات۔ پھل اور پھول دستِ قدرت کی نقش کاری ہے

اپنی قُوّت سے قُوّت حاصل کر مُفت خواری حرام خواری ہے

کاہلی سے گھٹا نہ پیداوار یہ تو بڑھیا گناہگاری ہے

اپنے اوپر ستم روا مت رکھ واجب اپنی بھی حق گزاری ہے

بیل سے پڑھ جفاکشی کا سبق کچھ اگر تجھ میں ہوشیاری ہے

کام میں کھپ رہا ہے بیچارہ ناشتا ہے نہ کچھ نہاری ہے

رات کاٹی جہاں سمائے سینگ عیش و عشرت پہ لات ماری ہے

تھک گیا تو زمیں پہ بیٹھ گیا کس قدر مشقِ خاکساری ہے

بیل ہے پر نہیں کسی کا دبیل کرتا اوروں کی غمگساری ہے

صبر و محنت کی یہ کڑی منزل اُس کو ہلکی ہے تجھ کو بھاری ہے

دیکھ چوپایہ سے نہ بازی ہار تیری ہمّت اگر کراری ہے

کچھ نہ کچھ کام کر۔ اگر تجھ کو آدمیّت کی پاسداری ہے

(۱۴۴) محنت[1] سے راحت ہے

جو تو نے غفلت میں وقت کھویا۔ نہ کھیت جوتا۔ نہ بیج بویا
تو ایسی ڈوبی ہوئی اسامی سے کوئی حاصل بٹائے گا کیا؟
رہے گا یہ کھیت ہاتھ اُس کے۔ جو ہل سے کشتی لڑیگا دن بھر
جو ہار بیٹھے گا اپنی ہمّت۔ تو وہ زمیں کو اُٹھائے گا کیا؟
خوراک و پوشاک کے ذخیرے دبے پڑے ہیں زمیں کے اندر
جو کر کے محنت نہ کھود لے گا۔ تو خاک پہنے گا۔ کھائے گا کیا؟

(۱۴۵) بخیلی[2] اور فضولی

اری بخیلی! اور اے فضولی! تمہارا دونوں کا مُنہ ہو کالا
گناہگاری کے تم ہو چشمے تمھیں سے نکلیں خرابیاں ہیں
تمھیں نے دم بھر میں سب گنوایا تمھیں نے رزق خاک میں ملایا
کمانے والوں نے جو کمایا بصد مشقّت کئی برس میں
نہ مال و دولت کے فائدوں ہی سے کر کے محروم تم نے چھوڑا
بنایا بد عہد اور بے دیں۔ کھلائیں جھوٹی ہزار قسمیں
لگا کے حرص و طمع کا پھندا۔ سکھایا خود مطلبی کا دھندا
بنایا حق تلفیوں کا بندہ۔ پھنسا کے تم نے ہوا و ہوس میں

---

[1] مرتبہ ۱۸۹۷ء۔ [2] مرتبہ ۱۸۹۳ء۔

ہوئی بخیلوں کی کیا بُری گت نہ پاس عزت نہ کچھ حمیت
نہ حوصلہ ہی رہا نہ ہمت نہیں ہے فرق اُن میں اور مگس میں
لُٹا کے دولت کو اپنی مُسرِف۔ ہوئے ہیں کیا کیا ذلیل احمق
کہ جیسے بے بال و پر کی چڑیا اسیر ہو گوشۂ قفس میں

(۱۴۶) ایک گدھا شیر بنا تھا[1]

پایا تھا اِک گدھے نے کہیں پوستینِ شیر
سوچا کہ آڑ خوب ہے کچھ کھیلئے شکار
پہنا اور آس پاس کے کھیتوں میں جا گھُسا
دیکھا جو شیر سہم گئے اُس سے کاشتکار
اِتنے میں اپنی بولی جو بولا تو کھُل گیا
ہے شیر کے لباس میں پوشیدہ اِک حمار
جب کھُل گیا فریب تو پھر مارے طیش کے
لے لے کے اپنی لاٹھیاں سب پل پڑے گنوار
چاروں طرف سے گھیر کے لی خوب ہی خبر
لوگوں نے مار پیٹ میں رکھا نہ کچھ اُدھار
مرنے میں کیا رہا تھا مگر خیر ہو گئی
بھاگا دبا کے دُم۔ تو بچی اُس کی جانِ زار

---

[1] مرتبہ ۱۸۹۳ء

چھپتی نہیں ہے بات بنائی ہوئی کبھی
آخر کو ہو کے رہتی ہے اصلیّت آشکار

بچیو سدا تکلّف و ناراستی سے تم
کرتا ہے آدمی کو یہ شیوہ ذلیل و خوار

رستے کو راستی کے نہ زنہار چھوڑنا
ہوتا ہے راستی ہی سے انسان رستگار

جو بات تھی صلاح کی وہ ہم نے دی بتا
آئندہ اپنے فعل کا ہے تم کو اختیار

(۱۴۷) جنگ یورپ[1] سنہ ۱۹۱۴ء

اے ہند کے دلاور! اے سورما سپاہی
برطانیہ سے پہونچا۔ تجھ کو پیامِ شاہی

ہتھیار سج کے تن پر۔ ہاں جلد اوچی بن
ہو برق و باد بن کر۔ میدان کی سمت راہی

اعدائے سلطنت سے کر جنگ رُستمانہ
چمکے گی تیغ بن کر۔ اب تیری خیر خواہی

خُشکی سے اور تری سے گذرے سمندِ ہمّت
تیری بہادری پر دونوں کی ہو گواہی

---

[1] یورپ کی جنگِ عظیم جو یکم اگست سنہ ۱۹۱۴ء کو شروع اور ۱۱ر نومبر سنہ ۱۹۱۸ء کو ختم ہوئی۔

(۱۴۸) سب سے زیادہ بدنصیب کون؟

اُس سے دُنیا میں نہیں کوئی زیادہ بدبخت
جو نہ دانا ہو۔ نہ داناؤں کا مانے کہنا
آج آفت سے بچی جان۔ تو کل خیر نہیں
ایسے نادان کا مشکل ہے سلامت رہنا

(۱۴۹) ہمّت

گھوڑ دوڑ میں کودائی کی بازی تھی ایک دن
تازی پہ کوئی ترکی پہ اپنے سوار تھا
جو ہچکچا کے رہ گیا سو رہ گیا اِدھر
جس نے لگائی ایڑ وہ خندق کے پار تھا

(۱۵۰) اپنے فعل پر پشیمانی

پیش آئے جو مصیبت پڑتی ہے سو بھگتنی
رہتی ہے یوں تسلّی مرضی یہی تھی رب کی
پر اپنے کوتکوں سے آتی ہے جو مُصیبت
ہوتی ہے ساتھ اُس کے شرمندگی غضب کی

(۱۵۱) معافی میں سرور ہے

نادموں کی خطا معاف کرو
ہے معافی میں لذّت اور سرُور
اپنے دل میں ذرا کرو انصاف
کون ہے جو ہے بے خطا و قصور

(۱۵۲) اِنتقام علاجِ خطا ہے

جو انتقام نہ لینے سے ہو خطا افزوں
تو یہ تمہاری خطا ہے جو انتقام نہ لو
وہ کام جس سے کہ اوروں کو فائدہ پہونچے
تم اُس کے کرنے سے زنہار ہاتھ تھام نہ لو

جو انتقام سے منظور ہو خوشی اپنی
تو ایسے کام کا تم بھول کے بھی نام نہ لو

(۱۵۳) خطا کو خطا نہ جاننا ہلاکت ہے

ہے بیمار تو۔ لیک بچنے کے قابل
گر اپنی خطا کو خطا جانتا ہے
مگر ایسے نادان کا کیا ٹھکانا
کہ جو درد ہی کو دوا جانتا ہے
بُرا مانتا ہے جو سمجھائے کوئی
بُرائی کو اپنی بھلا جانتا ہے
وہ انجام کو روئے گا سر پکڑ کر
نہیں اس میں دھوکا خُدا جانتا ہے

(۱۵۴) ہر کام میں کمال اچھا ہے

کوئی پیشہ ہو زراعت۔ یا تجارت۔ یا کہ علم
چاہیئے انسان کو پیدا کرے اُس میں کمال
کاملوں کی عُمر بڑھ جاتی ہے خود کر لو حساب
با ہُنر کا ایک دن اور بے ہُنر کا ایک سال

(۱۵۵) دور اندیشی

جنھیں دی ہے خُدا نے عقل دانا
ہے اُن کو آج ہی سے فکر کل کی
مُسافر چل پڑا جو آخرِ شب
تو ہو جاتی ہے منزل اُس کی ہلکی

(۱۵۶) بدی کے عوض میں نیکی کرنا

ہر ایک جانور کا یہی خاصّہ ہے
بدی کے عوض میں بدی کی تو کیا کی
ہے البتہ وہ شخص انسانِ کامل
جفا کے مقابل میں جس نے وفا کی

(۱۵۷) قول و فعل میں مطابقت چاہیئے

دیرینہ رسم و راہ سے قطع نظر کرو
برتاؤ آج کل کے زمانہ کے اور ہیں
دل شرق میں پڑا ہے یہ کہتے ہیں عرب کی
کھانے کے دانت اور دکھانے کے اور ہیں

(۱۵۸) دِل کی یکسوئی خلوت ہے

اگر دِل گرفتار ہے مخمصوں میں ۔۔۔ تو خلوت بھی بازار سے کم نہیں ہے
مگر جس کے دِل کو ہے یکسوئی حاصل ۔۔۔ تو وہ انجمن میں بھی خلوت نشیں ہے

(۱۵۹) غریب اور امیر

خوش ہیں غریب اپنے اُن جھونپڑوں کے اندر
جو دھوپ کی طپش سے دوزخ کی بھٹّیاں ہیں
شاکی ہیں اہلِ دولت حالاں کہ اُن کے گھر میں
پنکھا بھی کھنچ رہا ہے اور خَس کی ٹٹّیاں ہیں

(۱۶۰) پیشکش

سنگ ریزوں کا ہے لے جانا وہاں شرمندگی
تودہ تودہ ہو جہاں گنجینۂ لعل و گہر
ہے تسلّی یوں کہ پتھّر ہو گہر ہو لعل ہو
مہرِ عالمتاب کے یہ سب ہیں منظورِ نظر
گرچہ اس قابل نہیں لیکن برسمِ پیشکش
جلدِ کُلّیات ہے نذرِ جنابِ پورٹر

۷ ؍ دسمبر ۱۹۱۰ء

قطعاتِ تاریخ

(۱۶۱) حادثۂ جانکاہ

کیسی اُڑی ہے سمتِ جزائر سے یہ خبر کیا ہو گیا کہ صرصرِ غم ہے ہوائے ہند
بیٹھے بٹھائے اِس خبرِ ہولناک نے ڈالا وہ زلزلہ کہ ہلا دی بنائے ہند
کس آفتِ عظیم نے یارب کیا نزول ہوتا نہیں بیانِ غمِ ماجرائے ہند
اے مرگِ ناگہاں تجھے کیوں آ گیا پسند نوابِ ہند و حاکمِ کشور کشائے ہند
افسوس اُس کا حلقۂ ماتم میں ہے بیاں تھا بزمِ عیش ذکر سے جس کے فضائے ہند
وہ نام آج باعثِ ماتم ہے اے دریغ جس کا لقب تھا نائبِ شہ و لیسرائے ہند
کس کو کیا ہے خنجرِ بیداد نے ہلاک وہ حاکمِ مُدبّر و فرماں روائے ہند
کہتے ہیں لوگ آج قتیلِ ستم اُسے کہتے تھے جس کو مالکِ تیغ و لوائے ہند
کیا جاں گزا ہے قتلِ گورنر کا واقعہ ماتم کدہ ہی چاہیئے لکھنا بجائے ہند
واحسرتا! کہ قافلہ سالار چل دیا بے رونق و خراب ہے مہماں سرائے ہند
رُکنِ رکینِ سلطنتِ ہند اُٹھ گیا دستِ اجل نے توڑ دیا حیف پائے ہند
کیا انقلابِ دورِ زماں ہے کہ ہو گیا ہندوستاں برائے غم و غم برائے ہند
اس حادثہ سے ہے جگرِ خلق پاش پاش کیوں کر رفو پذیر ہو چاکِ قبائے ہند
کیا نحس وہ جزیرۂ دریائے شور ہے جس کے سبب سے اشکِ مصیبت بہائے ہند

اے کاش جانتے کہ یہ ہے آخری وداع | رخصت ہوئے تھے ہند سے جب وائسرائے ہند
ہاتف نے دی ندا کفِ افسوس مل کے یوں
بس دل شکن ہے آہ غمِ وائسرائے ہند
۱۸ ۶ ۷۴

(۱۶۲) سر سالار جنگ بہادر مرحوم

وہ دکن کا مُدبّرِ یکتا | رُکنِ دولت وزیرِ نیک خصال
مُلک رانی میں وہ یگانۂ عصر | کاردانی میں بے نظیر و ہمال
اہلِ کشور کا وہ محبِّ دلی | اور نظامِ دکن کا خیر سگال
یعنی سالار جنگِ نام آور | جو کہ مختارِ ملک تھا فی الحال
قوم کا مُلک کا وطن کا دوست | کارِ وقدر دانِ اہلِ کمال
سلطنت کے رموز کا اُستاد | مملکت کے عُقود کا حلّال
اُس کے عدل و کرم سے خلقت شاد | اُس کے نظم و نسق سے مُلک نہال
عام کو چین خاص کو آرام | سلطنت کا خزانہ مالامال
نہ ہوا اُس کے عہد میں زنہار | مُفسدوں کے سوا کسی کو زوال
اُمَرا اُس کے دور میں خوش وقت | غُربا اُس کے وقت میں خوش حال
نیک دل نیک خو و نیک نہاد | صاحبِ جود و لطف و بذل و نوال
اُس سے منسوب عزم اور ہمّت | اُس سے مخصوص شوکت و اجلال

خردِ اُس کی محاسبِ انجام نظر اُس کی دقیقہ سنجِ مآل
اُس کی رائے متین نے بخشا امن اور عافیت کو استقلال
اُس کی عقلِ سلیم نے بخشا شاہدِ مملکت کو حسن و جمال
چل بسا وہ وزیرِ با تدبیر اُٹھ گیا وہ امیرِ با اقبال
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ اے بسا مُدّعا کہ شُد پامال
شرق سے تا ممالکِ مغرب لے کے دکّھن سے تا حدودِ شمال
ہند سے تا بملکِ انگلستان اُس کے ماتم میں ہیں پریشاں حال
تو بھی محمودؔ[1] لکھ کوئی تاریخ جس سے ظاہر وفات کا ہو سال

آہ روشن قیاس و دانشور
آہ دانش ور و بلند خیال
ہجری ۱۳

(۱۶۳) طورِ ہدایت

تذکرۂ غوثیہ دیکھو اے اربابِ فہم و درایت
حقّ حقیقت سے نہیں خالی کوئی قصّہ کوئی حکایت
عینِ معارف سے نہیں باہر کوئی نقل اور کوئی روایت
ہے یہ اوجِ مسجدِ اقصےٰ ہے یہ موجِ بحرِ نہایت
گاہ بطورِ عیان و ظاہر گاہ بطرزِ رمز و کنایت

[1] مولانا کے فرزند اکبر محمد محمود سیفی۔

لکھ تاریخ اے فتح محمدؐ[1]

نورِ شمع طورِ ہدایت

۱۰ ہجری ۱۳

(۱۶۴) اسرارِ توحید

لکھی مولوی گل حسن نے کتاب — بیاں کیا کروں قابلِ دید ہے

بزرگوں کی ہمت کا ہے یہ اثر — خدا کی طرف سے یہ تائید ہے

لسانِ حقیقت تھے غوث علی — یہ اقوالِ حضرت کی تمہید ہے

کہیں شرحِ سرِّ بقا و فنا — کہیں رمزِ تجرید و تفرید ہے

مقامِ خوشی ہے نہ جائے ملال — کسی کو اگر فکرِ تردید ہے

جو تاریخ پوچھے کوئی انتظامؔ[2]

دُرِ دُرجِ اسرارِ توحید ہے

۱۰ ہجری ۱۳

(۱۶۵) خزینۂ معنی

سُن میری عرض ساقیِ خُم خانۂ صفا — للہ مجھ کو دے مئے معنی کا ایک جام

تا چشمِ دل سے دیکھ کے اس تذکرہ کو میں — ہوں سرِّ غیب و رمزِ حقایق سے شادکام

ہے عطرِ بوستانِ معارف کا یہ کتاب — جس کی شمیمِ روح کا تازہ کرے مشام

ہر قصہ میں تلاطمِ دریائے فیض ہے — کھلتا ہے بات بات میں یاں حال اور مقام

---

[1] مولانا کے پیر بھائی تھے۔ [2] قاضی انتظام الدین احمد مرحوم مولانا کے پیر بھائی بھی تھے اور عزیز بھی۔

ہر نکتۂ لطیف پہ ہے اہلِ دل کو وجد — تاثیر میں کلام ہے چوں تیغ بے نیام
ہر فصل میں خزینۂ معنی بھرا ہوا — ہوں جس سے طالبانِ خُدا فائز المرام
تو جانتا ہے جامع ملفوظ کون ہے — میّد ہے شیخ وقت ہے اور زُبدۂ کرام
ہے دودمانِ مُرتضوی کا وہ آفتاب — بے شک وہ سالکانِ طریقت کا ہے امام
وہ مصدرِ فیوض ہے اور منبعِ علوم — وہ مجمعِ کمال ہے اور مرجعِ اَنام
ہے وہ حُسینی و حَسنی از رہِ نسب — باغِ حسن کا گُل ہے اور گُل حسن ہے نام
جس کے ہر ایک لفظ سے راحت ہے روح کو — ہر حرف سے ہے غُنچۂ خاطر کو ابتسام
لکھوایا مجھ سے نسخۂ اوّل کتاب کا — کافی ہے میرے واسطے یہ فخر تا دوام

جب ختم کر چکا اُسے اکبر[1] نے یوں کہا
ابرِ بہارِ فیض ہے تاریخِ اختتام

۱۳ ھ ۱۰

(۱۶۶) آفتابِ حقیقت

درِ فیضِ غوثِ علی گُل حسن ہے — وہ بیت الحقیقت یہ بابِ حقیقت
یہ حضرت کا اِک مختصر تذکرہ ہے — حقیقت میں ہے یہ کتابِ حقیقت
اگر چشمِ تحقیق سے کوئی دیکھے — تو الحق کہ ہو کامیابِ حقیقت
سُنیں آن کر اہلِ حق گوشِ دل سے — نواہائے چنگ و ربابِ حقیقت
کہو احتشام[2] اس کی تاریخ کیا ہے — کہا حق نُما آفتابِ حقیقت

۱۳ ھ ۱۰

[1] حافظ محمد اکبر مرحوم۔ [2] مولوی قاضی احتشام الدین احمد مولٰنا کے پیر بھائی تھے۔

(۱۶۷) مقالاتِ طریقت

کہاں تو اور کہاں اِس تذکرہ کا وصف اے اکبر[۱]
نہ استعداد ہے اِتنی نہ اِتنی قابلیت ہے

نہ تو عابد نہ تو زاہد نہ تو مُلّا نہ تو صوفی
نہ جُبّہ ہے نہ خرقہ ہے نہ دستارِ فضیلت ہے

نہ ظاہر کی کوئی نسبت نہ باطن کی خصوصیت
نہ تجھ کو فخرِ بیعت ہے نہ دعوائے مشیخت ہے

بجا ہے یہ مگر حضرت سلامت تم نہیں واقف
کہ سیّد گل حسن سے مجھ کو روحانی ارادت ہے

میں اِس تالیف کو اُن کی شفائے جاں سمجھتا ہوں
یہی میری عبادت ہے یہی میری سعادت ہے

اگر پوچھے کوئی مجھ سے سنینِ ہجریؐ و فصلی
مقاماتِ طریقت ہے مقالاتِ طریقت ہے
۱۳۱۰ھ ۱۲۹۱ف

(۱۶۸) بہارِ دانش

جنابِ گل حسن کی دیکھ تالیف
ہے ظاہر جس سے اہلِ حق کا آئین

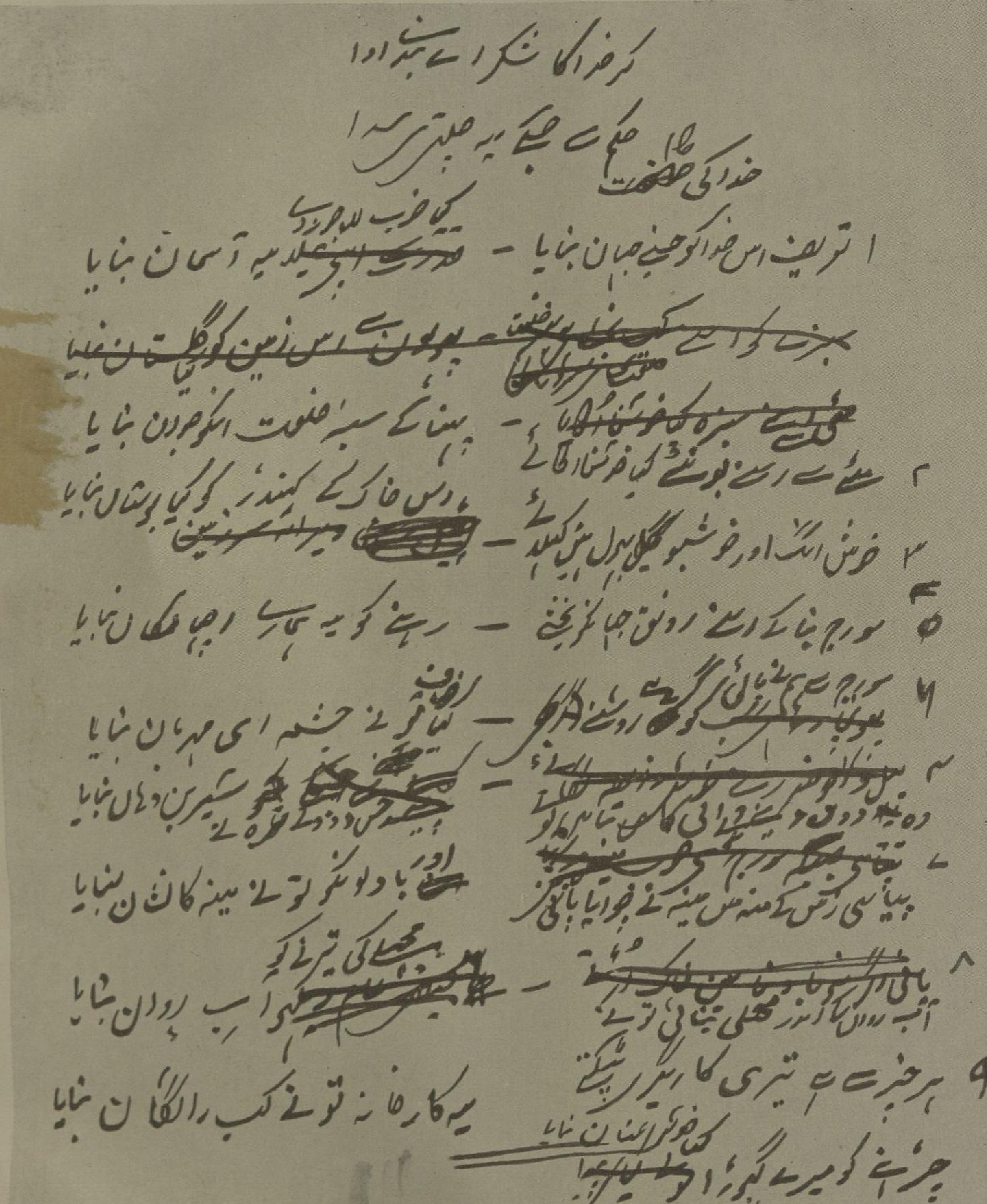
طریقِ فخریں یہ رہنما ہے
ہے اہلِ دل کو حاصل اس سے تسکین

فقط تاریخ کر تحریر حامد[۲]
نہیں کچھ حاجتِ تعریف و تحسین

بہارِ دانش اہلِ بصیرت
مُزیّن کو کب تعلیم و تلقین
۱۳۱۰ھ

---

[۱] حافظ محمد اکبر مرحوم۔ [۲] حامد سے مراد جواں مرگ فرزند مصنّف شیخ محمد حامد مرحوم ہے۔



کہ خدا کا شکر اے بندہ ادا

خدا کی صفت حکمت جسکے یہ چلتی سدا

۱ تعریف اس خدا کو جسنے جہان بنایا — کیا خوب ... یہ آسمان بنایا

مٹی سے بیل بوٹے کیا خوشنما اگائے — پہنا کے سبز خلعت انکو جوان بنایا

۳ خوش رنگ اور خوشبو گل پھول ہیں کھلائے — اس خاک کے کھنڈر کو کیا بوستاں بنایا

۵ سورج بنا کے اسنے رونق جہاں کو بخشی — رہنے کو یہ ہمارے اچھا مکان بنایا

۷ پیاسی زمیں کے منہ میں مینہ نے چوایا پانی — اور بادلوں کو تونے مینہ کا نشان بنایا

۹ ہر چیز سے ہے تیری کاریگری ٹپکتی — یہ کارخانہ تونے کب رائگان بنایا

میووں سے ڈالیوں کو سرگران بنایا

غزل۔ مولانا کی تحریر۔

مقابل صفحہ ۲۷۱

غزلیات

(الف)

(۱۶۹)

تعریف اُس خُدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمیں بنائی! کیا آسماں بنایا!

پاؤں تلے بچھایا کیا خوب فرشِ خاکی
اور سر پہ لاجوردی اِک سائباں بنایا

مٹّی سے بیل بوٹے کیا خوش نُما اُگائے!
پہنا کے سبز خلعت اُن کو جواں بنایا

خوش رنگ اور خوشبو گُل پھول ہیں کھلائے
اِس خاک کے کھنڈر کو کیا گلستاں بنایا

میوے لگائے کیا کیا خوش ذائقہ رسیلے
چکھنے سے جن کے مُجھ کو شیریں دہاں بنایا

سورج سے ہم نے پائی گرمی بھی روشنی بھی
کیا خوب چشمہ تو نے اے مہرباں بنایا

سورج بنا کے تو نے رونق جہاں کو بخشی
رہنے کو یہ ہمارے اچھّا مکاں بنایا

پیاسی زمیں کے مُنہ میں مینھ کا چوایا پانی
اور بادلوں کو تو نے مینھ کا نشاں بنایا

یہ پیاری پیاری چڑیاں پھرتی ہیں جو چہکتی
قدرت نے تیری اِن کو تسبیح خواں بنایا

تنکے اُٹھا اُٹھا کر لائیں کہاں کہاں سے
کس خوبصورتی سے پھر آشیاں بنایا

اُونچی اُڑیں ہوا میں بچّوں کو پر نہ بھولیں
اُن بے پروں کا اِن کو روزی رساں بنایا

کیا دودھ دینے والی گائیں بنائیں تو نے
چڑھنے کو میرے گھوڑا کیا خوش عناں بنایا

رحمت سے تیری کیا کیا ہیں نعمتیں مُیسّر
اِن نعمتوں کا مجھ کو ہے قدرداں بنایا

آبِ رواں کے اندر مچھلی بنائی تو نے
مچھلی کے تیرنے کو آبِ رواں بنایا

ہر چیز سے ہے تیری کاری گری ٹپکتی
یہ کارخانہ تونے کب رائیگاں بنایا

(۱۷۰)

علیک السلام اے شفیع البرایا | الوالعزم تجھ سا نہ آئے نہ آیا
علیک السلام اے امینِ الٰہی | کہا جو خدا نے وہ تونے سُنایا
علیک السلام اے رفیع المدارج | کسی نے نہیں تیرے رُتبے کو پایا
علیک السلام اے ستودہ خصائل | فدا خُلق پر تیرے اپنا پرایا
علیک السلام اے جمیل الشمائل | جواد و رؤف و کریم السجایا
علیک السلام اے امانِ دو عالم | ترا دامنِ لطف ہے سب پہ چھایا
علیک السلام اے جمالِ معانی | نہ تھا تیرے جسمِ مطہّر کا سایا
علیک السلام اے مُحبِّ غریباں | ترے حِلم نے بارِ اُمّت اُٹھایا
علیک السلام اے ترا نورِ اقدس | ہے سلطان اور جملہ عالم رعایا
علیک السلام اے تُجھے ذاتِ حق نے | جو اوّل بنایا۔ تو آخر دکھایا
علیک السلام اے شہنشاہِ وحدت | کہ توحید کا تونے سکہ بٹھایا
علیک السلام اے طبیبِ نہانی | دِلوں میں جو تھے روگ سب کو مٹایا
علیک السلام اے شِفائے مُجسّم | عجب تونے صحت کا نسخہ پلایا
علیک السلام اے سوارِ سبک رو | کسی نے تری گردِ رہ کو نہ پایا

علیک السلام اے رسالت پناہی — خُدا کا ہمیں تو نے رستہ بتایا
علیک السلام اے ہدایت کے مرکز — تجھے حق نے انسانِ کامل بنایا
درود و سلام و صلوٰۃ و تحیّت
یہ لایا ہے حامد[1] تحف اور ہدایا

(۱۷۱)

تو ہی ظہورِ کون و مکاں کا سبب ہوا — واللہ تو ہی واسطۂ عبد و رب ہوا
جب تُرکتازِ حُسن ہوا جانبِ ظہور — سالارئ جنود کو تو منتخب ہوا
ہے تو ہی خاص مظہرِ شانِ جمالِ حق — تیرا ہی خاص رحمتِ عالم لقب ہوا
تصدیق جس نے کی تری صدّیق ہو گیا — تکذیب جس نے کی تری وہ بولہب ہوا
ہر اک گدائے کوچۂ فقرِ محمّدی — فرماں روائے مُلکِ عجم اور عرب ہوا
جس دم کیا ہے آپ نے سیرِ جِناں کا عزم — رِضواں بھی محوِ غُلغلہ ہائے طرب ہوا
منظور جو ظہورِ صفاتِ کمال تھا — سو ختمِ مُرسلین پہ وہ ختم سب ہوا
تو مہرباں ہوا تو خُدا مہرباں ہوا — تیرا غضب ہوا تو خُدا کا غضب ہوا
بیشک ہے تو ہی رہبرِ کُل۔ ہادئ سُبُل — طے بے تری مدد کے نہ راہِ طلب ہوا
دل ہائے مُردہ تیری عنایت سے جی اُٹھے — خُرمائے خُشک تیرے کرم سے رُطب ہوا
تیرا ہی قول سارے جہاں میں ہے مُستند — ہر فعلِ سرسری بھی ترا مستحب ہوا

---

[1] یہ سلام محمد حامد جوان مرگ فرزند مصنّف کی فرمائش سے لکھا گیا تھا۔

حضرت ہیں ترجمانِ کلامِ خدائے پاک ختم آپ کی زبان پہ علم ادب ہوا
بالائے کوہ حضرتِ موسیٰ کو جو ملا گھر بیٹھے وہ عروج انھیں وقتِ شب ہوا

نقّارہ کوب دینِ محمدؐ کی ہے صدا
مقصودِ کائنات کا اظہار اب ہوا

(۱۷۲)

ہاں تو ہی تاج دار ہے دار السّلام کا ہے مُلکِ جاں میں سکّہ رواں تیرے نام کا
وردِ زباں جو نام ہے خیر الانام کا میں مدح سنج آپ ہوں اپنے کلام کا
طالب ہوں تجھ سے تیری مُحبّت کے جام کا تیرے سوا نہیں ہے کوئی تشنہ کام کا
عالم میں غُلغُلہ ہے محمدؐ کے نام کا آوازہ ہے بلند صلوٰۃ و سلام کا
ہے آب و گِل میں غایتِ مقصود تیری ذات ہے جان و دِل میں تو ہی خُلاصہ مرام کا
ہے نورِ حق جبینِ مُبارک سے آشکار قصّہ ہی یاں تمام ہے ماہِ تمام کا
عُقبیٰ ہے بزم گاہ ترے لُطفِ خاص کی دُنیا ہے مدرسہ تیرے ارشادِ عام کا
جی چاہتا ہے آپ کے در پر پڑا رہوں صاحب نہیں ہے اور کوئی اس غُلام کا
دوزخ تپش ہے تیری عداوت کے داغ کی کوثر ہے رشحہ تیری مُحبّت کے جام کا
اعجاز مُندرج ہیں تری بات بات میں الہام طرزِ خاص ہے تیرے کلام کا

لائی نسیم نکہتِ گیسوئے مصطفیٰؐ
ہے عرش پر دماغ ہمارے مُشام کا

(۱۷۳)

ذرّہ ذرّہ حیرتی ہے مہرِ پُر تنویر کا
بے خودی آئینہ ہے ہنگامۂ تکبیر کا

بیٹھ ہی جاتی ہے دل میں گو سمجھ میں کچھ نہ آئے
میں تو دیوانہ ہوں اُس کی دِلرُبا تقریر کا

ہے مُسلّم نازِ یکتائی اُسے ہر رنگ میں
جلوۂ نقش آفریں خاکہ ہو جس تصویر کا

توڑ اصنام ہوا اور دل کو ویرانہ بنا
ہے یہی سنگِ بنا اِس کعبہ کی تعمیر کا

حیف وہ سائل کہ کچھ دے کر جسے رخصت کیا
وائے وہ نالہ صِلہ جس کو ملا تاثیر کا

عیب پوشی کو ہمیشہ کام فرمایا کئے
کُشتۂ الطاف ہوں یارانِ بے تدبیر کا

باغباں کی کار فرمائی سے دیتا ہے خبر
گُلشنِ عالم میں چلنا صرصرِ تغیر کا

اُس کے آنے کی توقّع کر رہی ہے نفخِ روح
صُورِ اسرافیل ہے کھٹکا مجھے زنجیر کا

غایتِ ترکیبِ اعضا ہے یہی کچھ کام کر
کاہلی اے بے خبر منشا نہیں تقدیر کا

جُرم بھی اور خیرگی! یہ سیرتِ ابلیس ہے
ابنِ آدم کو ہے شایاں عُذر ہی تقصیر کا

ہے اشارہ پر قلم کے لشکروں کی صُلح و جنگ
دو گرہ کی چوب سے دم بند ہے شمشیر کا

آہ کھانا ہی پڑا داغِ فراقِ دائمی
قہر تھا ہونا کبھی اِک لمحہ کی تاخیر کا

(۱۷۴)

زمانہ تن پرستی میں گُذارا
کٹا بیہودگی میں وقت سارا

نہ باز آیا کبھی حرص و ہوا سے
یہ سرکش نفسِ دوں ہمّت ہمارا

کیا اسپ گلی پر آب و روغن — سدا اِس جسمِ خاکی کو سنوارا
ہُوا اب ضعف کی شدّت سے ناچار — گیا گذرا نکمّا ہیچ کارا
ہوئے ہیں مُضمحل بودے رگ و پے — گھٹا جوشِ جوانی کا حرارا
ہوئی غالب بدن پر ناتوانی — اَطِبّا کر سکیں کیا اس کا چارا
نہیں آتی خوشی کی بات دل میں — اگر آ بھی گئی گا ہے قضارا
تو یوں آتی ہے گویا اِتّفاقاً — نکل آیا گھٹا کی شب میں تارا
تری تقدیر میں ہے دخل کس کا — مشیّت میں ترے کس کا اِجارا
تجھے معلوم سب اَسرارِ مخفی — تُجھے سب رازِ پنہاں آشکارا
بجز تیرے نہیں کوئی ٹھکانا — سوا تیرے نہیں کُچھ بھی سہارا

"اِلٰہا! قادرا! پروردگارا!
کریما! مُنعما! آمُرزگارا!"

(۱۷۵)

تمھارے تیر میں انداز تھا نظر کا سا — ہر ایک دل کا ہے نقشہ مرے جگر کا سا
رقیب سر بھی پٹکتے تو میں نہ ہلتا کاش — ہلا نہ بخت مجھے تیرے سنگِ در کا سا
فروغِ رُخ یہ نظر میں سما گیا یک بار — کہ شام ہی سے مرا حال ہے سحر کا سا
سر اِس غبار کا دامانِ شہسوار پہ ہے — ملا فرشتہ کو رُتبہ کہاں بشر کا سا
پیامِ مرگ سے لیتا ہوں میں شگونِ وصال — گماں ہے تیر پہ بھی مُرغِ نامہ بر کا سا

کسی کی برقِ تبسّم جو دل میں کوند گئی
تو چشمِ تر کا ہوا حال ابرِ تر کا سا

(۱۷۶)[۱]

دِل گیا ہاتھ سے کیا ہاتھ سے داماں نکلا | کہ ترے پاؤں کی مانند گریباں نکلا
مر گئے دیکھ کے آثارِ سحر شامِ وصال | دشمنِ جانِ ستم کش رُخِ جاناں نکلا
دیکھ بے ہوش مجھے اشک فشاں ہیں احباب | جذبۂ شوق تو بدخواہِ عزیزاں نکلا
چارۂ جوشِ جنوں خانہ خرابی نہ ہوئی | گھر سمجھتے تھے جسے ہم سو بیاباں نکلا
کس قدر دِل میں مرے جوشِ شکستِ دل ہے | کوئی سالم نہ ترے تیر کا پیکاں نکلا
بس کہ ہے نقشِ قدم دامِ گرفتاریٔ جاں | اُن کے ہر گام پہ اِک گنجِ شہیداں نکلا
پھر گئے دل ہی بیک گردشِ چشمِ کافر | دَور میں کوئی بھی تیرے نہ مسلماں نکلا
آخری وقت کے وعدے نے کیا شادیٔ مرگ | ہمرہِ جاں دلِ مایوس کا ارماں نکلا

نکلے تم غیر کے گھر سے کہ مری جان نکلی
جس کو دشوار سمجھتے تھے وہ آساں نکلا

(۱۷۷)[۲]

تو اور عذرِ طعنِ رقیباں غضب ہوا | دل پارہ پارہ جب نہ ہُوا تھا تو اب ہوا
ڈر کر ہلاک بوالہوسِ بے ادب ہوا | اُن کو بھی میری جان شکنی سے عجب ہوا

---

۱ مرتبہ ۱۸۶۷ء۔ ۲ مرتبہ ۱۱ر مئی ۱۸۷۳ء۔

لبریز شکوہ ہائے تغافل تھا میں۔ ولے
لو شکر کا سبب گلۂ بے سبب ہوا

لیتے ہیں ترکِ عشق سکھانے کے واسطے
دل نذرِ جاں فنزائی حُسن طلب ہوا

کیا آگے اُس کے ولولۂ شوق سر اُٹھائے
سجدہ کیا تو ملزمِ ترکِ ادب ہوا

میرے سوا حریفِ ستم کوئی بھی نہ تھا
اب مہربان ہو گئے یہ کیا غضب ہوا

اُن کا نہ آستانہ سے باہر قدم بڑھا
سو بار انتظار میں میں جاں بلب ہوا

(۱۷۸)
لہ

ہے بے لب و زبان بھی غُل تیرے نام کا
محرم نہیں ہے گوش مگر اِس پیام کا

خوش ہے ملامت اہلِ خرابات کے لئے
اِس سلسلہ میں نام نہیں ننگ و نام کا

نخوت ہے جس کے کاسۂ سر میں بھری ہوئی
کب مستحق ہے محفلِ رنداں میں جام کا

جاگیرِ دردِ پر ہمیں سرکارِ عشق نے
تحریر کر دیا ہے وثیقہ دوام کا

وادیٔ عشق میں نہ مِلا کوئی ہم سفر
سُنتے تھے نام خضر علیہ السّلام کا

آسودگی نہ ڈھونڈ کہ جاتا ہے کارواں
لے مستعار برق سے وقفہ قیام کا

کھولا ہے مجھ پہ سرِّ حقیقت مجاز نے
یہ پُختگی صلہ ہے خیالاتِ خام کا

کھاتا نہیں فریبِ تمنّائے دو جہاں
خوگر نہیں ہے توسنِ ہمّت لگام کا

مت رکھ طمع سے چشمِ تمتّع۔ کہ ہے یہاں
دانہ ہر ایک مردمکِ دیدہ دام کا

پہونچا دیا حدودِ دو عالم سے بھی پرے
مُطرب نے راگ چھیڑ دیا کس مقام کا

لہ مرتبہ ۱۸۷۳ء۔

ظلمت میں کیا تمیز سفید و سیاہ کی — فرقت میں کچھ حساب نہیں صبح و شام کا
جس کی نظر ہے صنعتِ ابرو نگار پر — ہے وہ قتیلِ تیغ۔ نہ کُشتہ نیام کا
کھانے کو اے حریص غمِ عشق کم نہیں — یہ ہو تو کچھ بھی فکر نہ کر قرض و وام کا
میں بے قرارِ منزلِ مقصودِ بے نشاں — رستہ کی انتہا نہ ٹھکانا مقام کا
گر دیکھیے تو خاطرِ ناشاد شاد ہے — سچ پوچھیے تو ہے دلِ ناکام کام کا

اُٹھّے تری نقاب تو اُٹھ جائے ایک بار
سب تفرقہ یہ روز و شب و صبح و شام کا

(۱۷۹) [1]

رُسوا ہوئے بغیر نہ نازِ بُتاں اُٹھا — جب ہو گئے سُبک تو یہ بارِ گراں اُٹھا
معنی میں کر تلاشِ معاشِ دماغ و دِل — حیواں صفت نہ لذّتِ کام و دہاں اُٹھا
گر خندہ یاد آئے تو سینہ کو چاک کر — گر غمزہ یاد آئے تو زخمِ سناں اُٹھا
یا آنکھ اُٹھا کے چشمِ فسوں ساز کو نہ دیکھ — یا عُمر بھر مصائبِ دورِ زماں اُٹھا
اُس انجمن میں جائیے اب کس اُمید پر — ہم بیٹھنے نہ پائے۔ کہ وہ بدگماں اُٹھا
بے یادِ دوست عُمرِ گرامی نہ صرف کر — اِس گنجِ شائگاں کو نہ یوں رائیگاں اُٹھا
وصل و فراق وہم سہی دل لگی تو ہے — پھر ہم کہاں جو پردۂ رازِ نہاں اُٹھا

پروانہ کی تپش نے خُدا جانے کان میں
کیا کہدیا کہ شمع کے سر سے دُھواں اُٹھا

[1] مرتبہ ۱۸۷۳ء۔

(۱۸۰)

میں در پہ ترے ناصیہ سا ہو نہیں سکتا
دشمن کا بھی نقشِ کفِ پا ہو نہیں سکتا

باقی نہ رہی غیر کو اب جائے شکایت
شکرِ ستمِ یار ادا ہو نہیں سکتا

سب کچھ تو کیا ہم نے پہ کچھ بھی نہ کیا ہائے
حیران ہیں کیا جانیئے کیا ہو نہیں سکتا

اُس کوچہ میں کیوں غیر شب و روز ہیں پھرتے
گر چرخ سے جز جور و جفا ہو نہیں سکتا

اعدا سے ہوئے وہ مُقرِ وعدہ خلافی
میں مُنکرِ تاثیرِ دُعا ہو نہیں سکتا

پامال کیا بے سر و پائی نے صد افسوس
دل ہم قدم رنگِ حنا ہو نہیں سکتا

جس دل سے کدورت نہ گئی خاک ہے وہ دل
کیا آئینہ جو اہلِ صفا ہو نہیں سکتا

(۱۸۱)[۱]

وہیں سے جب کہ اشارہ ہو خود نمائی کا
عجب کہ بندہ نہ دعویٰ کرے خدائی کا

ملے جو رُتبہ ترے در کی جبہہ سائی کا
تو ایک سلسلہ ہو شاہی و گدائی کا

نہیں ہے فیض میں خسّت و لیک پیدا ہے
تفاوت آئینہ و سنگ میں صفائی کا

یہاں جو عشق ہے بے تابِ جلوۂ دیدار
وہاں بھی حُسن محرّک ہے خود نمائی کا

بُتوں کے سامنے بُت گر گھسے جبینِ نیاز
میں شیفتہ ہوں تری شانِ کبریائی کا

نہ کر کسی کی بُرائی۔ نہ بن بھلے سے بُرا
بھلا بھلا ہے بُرا کام ہے بُرائی کا

بنائیں بگڑی ہوئی کو تو ایک بات بھی ہے
بگاڑنا نہیں مشکل بنی بنائی کا

[۱] مرتبہ ۱۸۷۳ء

اُٹھا حجاب تو بس دین و دل دِیے ہی بنی
جنابِ شیخ کو دعویٰ تھا پارسائی کا

تمھارے دل سے کدورت مٹائے تو جانیں
کھُلا ہے شہر میں اِک محکمہ صفائی کا

ہوس ہے گر سر و ساماں کے جمع کرنے کی
تلاش کر سر و سامان بے نوائی کا

سوائے عشق نہیں کوئی رہبرِ چالاک
وہاں خرد کو نہیں حوصلہ رسائی کا

اُسی کا وصف ہے مقصودِ شعر خوانی سے
اُسی کا ذکر ہے منشا غزل سرائی کا

نہیں ہے اب کے زمانہ کی یہ روش نہار
میں یادگار ہوں خاقانی و سنائی کا

(۱۸۲)

آغازِ عشق عمر کا انجام ہو گیا
ناکامیوں کے غم میں مرا کام ہو گیا

تم روز و شب جو دست بدستِ عدو پھرے
میں پائمالِ گردشِ ایّام ہو گیا

میرا نشاں مٹا تو مٹا پر یہ رشک ہے
وردِ زبانِ خلق ترا نام ہو گیا

دل چاک چاک نغمۂ ناقوس نے کیا
سب پارہ پارہ جامۂ احرام ہو گیا

اب اور ڈھونڈیے کوئی جولاں گہِ جنوں
صحرا بقدرِ وسعتِ یک گام ہو گیا

دِل پیچ سے نہ طرّۂ پُرخم کے چھُٹ سکا
بالا روی سے مرغِ تہِ دام ہو گیا

اور اپنے حق میں طعنِ تغافل غضب ہوا
غیروں سے ملتفت بتِ خود کام ہو گیا

تاثیرِ جذبہ کیا ہو کہ دل اضطراب میں
تسکیں پذیرِ بوسہ بہ پیغام ہو گیا

کیا اب بھی مجھ پہ فرض نہیں دوستیٔ کفر
وہ ضد سے میری دشمنِ اسلام ہو گیا

اللہ رے بوسۂ لبِ مے گوں کی آرزو
میں خاک ہو کے دُردِ تہِ جام ہو گیا

اب تک بھی ہے نظر طرفِ بامِ ماہ وش
میں گرچہ آفتابِ لبِ بام ہو گیا

اب حرفِ ناسزا میں بھی اُن کو دریغ ہے
کیوں مجھ کو ذوقِ لذّتِ دُشنام ہو گیا

(۱۸۳)[1]

نامہربانیوں سے یوں پائمال کرنا
ہیہات! دوستوں کو دشمن خیال کرنا

روزِ جزا میں آخر۔ پوچھا نہ جائے گا کیا؟
تیرا یہ چُپ لگانا۔ میرا سوال کرنا

او شہسوار اِتنی اچھّی نہیں ہے عُجلت
ہیں چند پا شکستہ۔ اِن کا خیال کرنا

ناقص بھی کاملوں سے۔ کُچھ کم نہیں کہ اِن سے
سیکھا ہے کاملوں نے کسبِ کمال کرنا

(۱۸۴)

کام اگر حسبِ مُدّعا نہ ہوا
تیرا اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

خاک اُڑتی جو ہم خُدا ہوتے
بندگی کا بھی حق ادا نہ ہوا

سب جتایا کئے نیازِ قدیم
وہ کسی کا بھی آشنا نہ ہوا

رخشِ ایّام کو قرار کہاں
اِدھر آیا اُدھر روانہ ہوا

کیا کُھلے؟ جو کبھی نہ تھا پنہاں
کیوں ملے؟ جو کبھی جُدا نہ ہوا

سخت فتنہ جہان میں اُٹھتا
کوئی تجھ سا ترے سوا نہ ہوا

جو گدھا خوئے بد کی دلدل میں
جا پھنسا پھر کبھی رہا نہ ہوا

[1] مرتبہ ۱۸۸۰ء۔

تو نہ ہو یہ تو ہو نہیں سکتا میرا کیا تھا ہُوا ہُوا نہ ہُوا
رہ روِ مسلکِ توکّل ہے
وہ جو محتاج غیر کا نہ ہوا

(۱۸۵)

نتیجہ کیونکر اچّھا ہو نہ ہو جب تک عمل اچّھا نہیں بویا ہے تخم اچّھا تو کب پاؤ گے پھل اچّھا
کرو مت آج کل حضرت! بُرائی کو ابھی چھوڑو نہیں جو کام اچّھا۔ وہ نہ آج اچّھا نہ کل اچّھا
بُرے کو تگ بھی کرنے اور توقع نیکنامی کی دماغ اپنا سنوارو تم! نہیں ہے یہ خلل اچّھا
جو ہو جائے خطا کوئی۔ کہ آخر آدمی ہو تم تو جتنا جلد ممکن ہو کرو اُس کا بدل اچّھا
کرے جو پاؤں بدراہی تو سونا اُس کا بہتر ہے
نہ ہو جس ہاتھ سے نیکی تو ایسا ہاتھ شل اچّھا

(۱۸۶)

ذرا غم زدوں کے بھی غم خوار رہنا کریں ناز تو ناز بردار رہنا
فراخی و عُسرت میں شادی و غم میں بہر حال یاروں کے تم یار رہنا
سمجھ نردباں اپنی ناکامیوں کو کہ ہے شرطِ ہمّت طلب گار رہنا
کرو شُکر ہے یہ عنایت خدا کی بلاؤں میں اکثر گرفتار رہنا
اگر آدمی کو نہ ہو مشغلہ کچھ بہشتِ بریں میں ہو دُشوار رہنا
خبر بھی ہے آدم سے جنّت چھُٹی کیوں خلافِ جبلّت تھا بے کار رہنا

سمجھتے ہیں شیروں کو بھی نرم چارہ
غزالانِ شہری سے ہُشیار رہنا

(۱۸۷)

یاد تیری یاد ہے نام خدا
ورنہ ہم کیا؟ اور ہماری یاد کیا؟

صدر آرا تو جہاں ہو صدر ہے
آگرہ کیا اور الٰہ آباد کیا

مبداءِ فیّاض کے شاگرد کو
حاجتِ آموزشِ اُستاد کیا

اِک کسوٹی ہے ترے کردار کی
مرتبہ کیا مال کیا اولاد کیا

(۱۸۸)

نقابِ جوہرِ روپوش اِک لطفِ نہاں نکلا
وہ میرے حال پر مجھ سے بھی زیادہ مہرباں نکلا

نہ تھا بزمِ احبّا ہی میں تیرا ذکر دشمن بھی
بیاں کرتا سرِ بازار تیری داستاں نکلا

حجابِ شاہدِ مطلق نہ اُٹھّا ہے نہ اُٹھّے گا
جسے ہم لامکاں سمجھے تھے وہ بھی اِک مکاں نکلا

(۱۸۹)

جو بھلے بُرے کی اٹکل نہ مرا شعار ہوتا
نہ جزائے خیر پاتا۔ نہ گناہگار ہوتا

مئے بیخودی کا ساقی! مجھے ایک جُرعہ بس تھا
نہ کبھی نشہ اُترتا۔ نہ کبھی خُمار ہوتا

میں کبھی کا مر بھی رہتا۔ نہ غمِ فراق سہتا
اگر اپنی زندگی پر مجھے اختیار ہوتا

یہ جو عشق جانستاں ہے۔ یہ وہ بحرِ بیکراں ہے — نہ سُنا کوئی سفینہ کبھی اس سے پار ہوتا
کبھی بھُول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا — کہ جو تم سے کوئی کرتا تمھیں ناگوار ہوتا

ہے اِس انجمن میں یکساں عدم و وجود میرا
کہ جو میں یہاں نہ ہوتا یہ ہی کاروبار ہوتا

(۱۹۰)

سُنو گے مجھ سے میرا ماجرا کیا؟ — کہا کرتے ہیں افسانوں میں کیا کیا؟
نہیں تشویشِ آیندہ کہ ہو کب؟ — گزشتہ کا تحیُّر ہے کہ تھا کیا؟
نہ کر تفتیش ہے خلوت نشین کون؟ — تامّل کر کہ ہے یہ برملا کیا؟
ہے اِک آئینہ خانہ بزمِ کثرت — بتاؤں غیر کس کو؟ ماسوا کیا؟
فقط مذکور ہے اِک نسبتِ خاص — مقدّر ہے خبر کیا؟ مبتدا کیا؟
جہاں نقشِ قدم ہو روحِ قُدسی — وہاں پہونچے گی عقلِ نارسا کیا؟

لگاؤں "شَیْئًا لِلّٰہ" کی صدا کیوں
بھُلادوں "یفعل اللہ ما یشاء" کیا

(۱۹۱)

سلام

محرّم کا چاند آسماں پر جو چمکا — تو یاد آگیا واقعہ رنج و غم کا
مُصیبت کا بیداد کا بے کسی کا — غضب کا جفا کا بلا کا ستم کا

وطن سے جُدا دشتِ غربت میں جا کر — ہوا قتل کُنبہ شفیعُ الاُمم کا
یہ شیرانِ حق۔ اور وہ دُنیا کے کُتّے — لئیموں نے کاٹا سرا اہلِ کرم کا
کیا ظلم بے وجہ سلطانِ دیں پر — یہ لالچ تھا دُنیا کے جاہ و حشم کا
شہیدوں کی ہے تشنگی یاد آتی — نہ ہو چشمہ لبریز کیوں چشمِ نم کا
رضا اور تسلیم صبر و توکّل — مصیبت میں شیوہ تھا اہلِ کرم کا
یہ وہ دن ہے جس دن میں ڈھایا گیا ہے — جو کعبہ عرب کا۔ تو قبلہ عجم کا
برستی ہے دیوار و در سے اُداسی — ہے چھایا ہوا ابر رنج و الم کا
تڑپتی ہے بجلی تو روتے ہیں بادل — کہ ہے آج کا دن شہیدوں کے غم کا
کرے کوئی تحریر و تقریر کیونکر — نہ جرأت زباں کی نہ یارا قلم کا

(۱۹۲)

دم قدم سے تیرے ہی آباد یہ ویرانہ تھا — تو ہی خود مہمان تھا اور تو ہی صاحب خانہ تھا
رنگِ محفل موجبِ عبرت تھا ہنگامِ سحر — خُفتہ مطرب، شمع مُردہ، سوختہ پروانہ تھا
جان دی تو کیا ہُوا جانوں کی تھی وا کیا کمی — ہاں مگر عقدِ محبّت کے لئے بیعانہ تھا
اُس لبِ شیریں کے ہر ایک لفظ میں تھی دلکشی — وحی تھا، اِلہام تھا، افسوں تھا یا افسانہ تھا

متفرقات

سب جھوٹ ہے کوئی کیا کرے گا — ہوگا وہی جو خدا کرے گا
کرنے دو بدی کرے جو کوئی — اُس کا بھی خدا بھلا کرے گا

خواہشوں نے ڈبو دیا دِل کو — ورنہ یہ بحرِ بیکراں ہوتا

(۱۹۳)
ردیف (ب)

کیا کیا اجل نے جان چرائی تمام شب
کوئی بھی آرزو نہ بر آئی تمام شب

دل سوز کب ہوئے ہیں کہ جب خاک ہو گیا
تربت پہ میری شمع جلائی تمام شب

اے وائے تلخ کامیٔ روز بدِ فراق
ناصح نے جانِ غم زدہ کھائی تمام شب

ازبس یقینِ وعدۂ دیدار خواب تھا
کیا خوش ہوئے کہ نیند نہ آئی تمام شب

اِک آہِ دل نشیں ہیں وہ بُت منفعل ہوا
واللہ کیا ندامت اُٹھائی تمام شب

لگتے ہی آنکھ دیکھ لیا جلوۂ نہاں
پیشِ نظر تھی شانِ خدائی تمام شب

(۱۹۴)
ردیف (ر)

ابر[۱] بادل ہے اور سحاب گھٹا
جس کی ہم دیکھتے ہیں آج بہار

کس کو باراں نے تازگی بخشی
زرع کھیتی ہے اور درخت اشجار

کون سی جا ہے سیر کے قابل
باغ روضہ حدیقہ اور گل زار

اب غریبوں کو ہو گئی تسکیں
جو کہ لیتے تھے قرض وام اُدھار

قحط ہے کال اور گدائی بھیک
جس کے مینھ نے مٹا دئے آثار

جو ندی۔ آب گیر ہے تالاب
مینھ جو برسا تو بھر گئے یک بار

نرخ ہے بھاؤ۔ اور غلہ اناج
سستا ارزاں ہے سُوق ہے بازار

---

[۱] نقل از روزانہ نجم الاخبار میرٹھ۔ ۲۴ شعبان ۱۲۹۵ھ روز شنبہ ۲۴ اگست ۱۸۷۸ء۔ نصاب بابان کی سرخی سے یہ نظم چھپی تھی۔

مردم و آدمی بشر انسان — فضلِ باری کے سب ہیں شکر گزار
ہیں کشاورز کاشتکار کسان — خشک سالی سے تھے بہت ناچار
مینھ برستا رہا کئی دن رات — روز و شب صبح و شام لیل و نہار
قطرہ ہے بوند اور مینھ باراں — آب پانی ہے اور بہت بسیار
بوندا باندی یہی ترشّح ہے — جیسے ہے آج ننھی ننھی پھوار
کالی کالی گھٹا ہے ابرِ سیاہ — جو کہ برسا رہی ہے یہ بوچھار

سایہ ہے چھاؤں آفتاب ہے دھوپ
دیکھ آج دھوپ چھاؤں کی یہ بہار

ردیف (ض) (۱۹۵)

نہیں معلوم کیا واجب ہے کیا فرض — مرے مذہب میں ہے تیری رضا فرض
شعورِ ہستیٔ موہوم ہے کفر — فنا بعدِ فنا بعدِ فنا فرض
نہیں آگاہ مستِ بادۂ شوق — کہاں سنّت کدھر واجب کجا فرض
رہِ تسلیم میں از روئے فتوے — دعا واجب پہ ترکِ مدّعا فرض
نہ چھوٹے کفر میں بھی وضعِ ایماں — کہ ہر حالت میں ہے یادِ خدا فرض
نہیں دیکھا کسی نے حسنِ مستور — بقدرِ فہم لیکن کر لیا فرض
نہ مانوں گا نہ مانوں گا کبھی میں — مجھے کرتے ہیں کیوں اس سے جدا فرض
نہ کھولوں گا نہ کھولوں گا زباں کو — کہ ہے اخفائے رازِ دلربا فرض

بلا سے کوئی مانے یا نہ مانے
چلو ہم کر چکے اپنا ادا فرض

(۱۹۶)
ردیف (میم)

السلام اے شاہِ شاہاں السلام — السلام اے نورِ امکاں السلام
اے تہی دستوں کے حامی مرحبا — اے شفیعِ اہلِ عصیاں السلام
السلام اے سجدہ گاہِ قدسیاں — اے رسولِ خاصِ یزداں السلام
السلام اے رحمۃ للعالمین — رہ نمائے حق پژوہاں السلام
السلام اے بادشاہِ جن و انس — وارثِ مُلکِ سلیماں السلام
اے تری باتیں کلامِ کردگار — اے ترا دل عرشِ رحماں السلام
افتخارِ آدم و نوح و خلیل — اے عرب کے مہرِ تاباں السلام
بُت پرستی تیرے آنے سے ہٹی — قبلہ گاہِ حق پرستاں السلام
تھا جو کوہستان و ریگستان عرب — کر دیا تو نے گلستاں السلام
فتح کر ڈالے ترے خدام نے — مصر و شام و روم و یوناں السلام
ہو گئے سب تیری دعوت میں شریک — تُرک و ایران و خُراساں السلام
یا نبی السیف یا نور الہدیٰ — مسلکِ حق کے نگہباں السلام
شاہدِ انجیل و توریت و زبور — موردِ آیاتِ قرآں السلام
کشتیٔ دوراں کو ہے تجھ سے قیام — لنگرِ کشتیٔ دوراں السلام

جانِ و ایماں کو ملی تجھ سے شفا　　اے طبیبِ جان و ایماں السلام

عرضِ حامدؔ[۱] ہے یہی با صد نیاز
اے عرب کے مہرِ تاباں السلام

(۱۹۷)

ساقیٔ[۲] خُمِ حنانہ تھا جو صبح و شام　　روزِ آدینہ تھا مسجد میں اِمام

جس نے چشمِ مستِ ساقی دیکھ لی　　تا قیامت اُس پہ ہُشیاری حرام

اُس لبِ جاں بخش کی باتیں تھیں یا　　مُعجزاتِ عیسیٔ گردوں مقام

ہو گیا اُس کو قیامت کا یقیں　　جس نے دیکھا سروِ قامت کا خرام

چشمۂ آبِ بقا کی لہر تھی　　وہ عبارت وہ اشارت لا کلام

مرحبا عطرِ گریباں کی شمیم　　ہے مُعطّر جس سے روحانی مشام

تھی زباں یا قاطعِ اوہام یا　　ذوالفقارِ حیدری تھی بے نیام

جس نے دیکھا نرگسِ شہلا کا خواب　　اُس نے پایا رمزِ "قلبی لا ینام"

قَالَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ　　ہو گئیں سب خوبیاں اُس پر تمام

جس نے چاٹی عتبۂ عُلیا کی خاک　　تلخیٔ دوراں سے ہو کیوں تلخ کام

اے صبا! صحرائے جاں میں کر تلاش　　کس طرف ہیں وہ سرادق وہ خیام

خلوتِ لیلیٰ میں تو گزرے اگر　　تو یہ کہہ دینا ہمارا بھی پیام

---

[۱] یہ سلام محمد حامد جوان مرگ فرزند مصنّف کی فرمایش سے لکھا گیا تھا۔

[۲] مرتبہ ۱۹۱۰ء مقام میرٹھ۔ یہ غزل مولٰنا نے اپنے پیرو مُرشد مولانا سیّد غوث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف میں لکھی تھی۔

تشنگانِ شوق ہیں گُم کردہ راہ تو بھی چل بہرِ خدا دو چار گام
بحر میں برپا ہوا جوش و خروش حبّذا رشحاتِ کاساتِ الکرام
سونپ دی تھی دستِ قدرت نے تجھے
ناقۂ لیلائے معنی کی زمام

(۱۹۸)

خبردار ہاں اے بزرگانِ قوم کہ اُجڑا پڑا ہے گلستانِ قوم
نہ عزّت نہ دولت نہ سطوت رہی ملی خاک میں شوکت و شانِ قوم
وہی زندہ ہے جو مرے قوم پر کدھر ہیں کہاں ہیں شہیدانِ قوم
ترقّی کے میداں میں کیوں کر بڑھے کہ اُلجھا ہے کانٹوں میں دامانِ قوم
شریعت طریقت کا کس کو لحاظ سلامت نہیں بلکہ ایمانِ قوم
مگر بادِ سرمائے افلاس سے فسردہ ہوا جسمِ عُریانِ قوم
گرا قوم کے سر سے تاجِ مہی گئی ٹوٹ وہ تیغ بُرّانِ قوم
نہیں ہے کوئی آہ پُرسانِ حال نہ اَنصارِ قوم اور نہ اَعوانِ قوم
کرے کون دام و دِرم سے مدد رہے خاک میں سو کریمانِ قوم
وہ غُنچے کہ مُرجھا گئے بن کِھلے یہ ہی ہیں یہ ہی نوجوانانِ قوم
نہ ہوتے اگر جہل و بغض و نفاق
پچھڑتے نہ یوں پہلوانانِ قوم

ردیف (ن) (۱۹۹)

ظاہر تو ہے تو میں نہاں ہوں
باطن تو ہے۔ تو میں عیاں ہوں

تو ہی ظاہر ہے۔ تو ہی باطن
تو ہی تو ہے تو میں کہاں ہوں

تیرے ہوتے کہیں نہیں میں
اوّل۔ آخر۔ نہ درمیاں ہوں

تو تو میں میں نے مار ڈالا
دم بند ہے کیجئے نہ ہاں ہوں

میں ہی لیلیٰ ہوں میں ہی محمل
ناقہ بھی ہوں۔ میں ہی ساربان ہوں

ہوں کُنجِ قفس میں بند لیکن
بیرونِ زمین و آسماں ہوں

دریا کی طرح رواں ہوں لیکن
اب بھی وہیں ہوں میں جہاں ہوں

جز نام نہیں نشان میرا
سچ مچ میں بحرِ بیکراں ہوں

(۲۰۰)

وہ پیرہنِ جان میں جاں حجلۂ تن میں
ہوں وہم جدائی سے عجب رنج و محن میں

مقصود زیارت ہے اگر کعبۂ دل کی
ہو گرم سفر تا حیۂ ملکِ وطن میں

وہ قامتِ دلکش ہے عجب فتنۂ عالم
چھپتا ہی نہیں پیرہنِ نو وکہن میں

اے شمع! بہا اشک چھپا رازِ محبت
خاکسترِ پروانہ ہے بیتاب لگن میں

شورش مری بے جا ہے نہ فریاد نکمی
رونق ہے ذرا نالۂ بلبل سے چمن میں

تاثیر ہو کیا خاک جو باتوں میں گھڑت ہو
کچھ بات نکلتی ہے تو بیساختہ پن میں

کمتر ہے دد و دام سے انساں بمراتب
ہر دم جو ترقی نہ کرے چال چلن میں

۵۷ مرتبہ ۷، دسمبر ۱۸۷۳ء

ہوں میں تو وہی معتکفِ گوشۂ عزلت حالانکہ مرا ریختہ پہونچا ہے دکن میں
یہ سچ ہے کہ سودا بھی تھا اُستادِ زمانہ
میری تو مگر میر ہی تھا شعر کے فن میں

آخر یہ حسن چھپ نہ سکے گا نقاب میں (۲۰۱) شرماؤ گے تمھیں شرم و ضد حجاب میں
پامال شوخیوں میں کرو تم زمین کو ڈالوں فلک کے زلزلہ میں اضطراب میں
روشن ہے آفتاب کی نسبت چراغ سے نسبت وہی ہے آپ میں اور آفتاب میں
دل کی گرہ نہ وا ہوئی دردا شبِ وصال گزری تمام بست و کشادِ نقاب میں
رنجِ عتاب زاہدِ مسکیں کو مفت ہے یاں اتقا میں سعی وہاں اجتناب میں
جاں میں نے نامہ بر کے قدم پر نثار کی تھا پیش پا فتادہ یہ مضموں جواب میں
ہنس ہنس کے برق کو تو ذرا کیجے بے قرار رو رو کے ابر کو میں ڈبوتا ہوں آب میں
واعظ سے ڈر گئے کہ نہ شامل ہوئے ہم آج ترتیبِ محفلِ مے و چنگ و رباب میں
ساقی اِدھر تو دیکھ کہ ہم دیر مست ہیں کچھ مستیٔ نگہ بھی ملا دے شراب میں
داخل نہ دشمنوں میں نہ احباب میں شمار مدِ فضول ہوں میں تمھارے حساب میں
کس کس کے جور اُٹھائیں گے آگے کو دیکھئے دشمن ہے چرخ پیر زمانِ شباب میں
پیغام بر اشارۂ ابرو سے مر گیا
پھر جی اُٹھے گا لب بھی ہلا دو جواب میں

جہاں تیغ ہمّت علم دیکھتے ہیں (۲۰۲) محالات کا سر قلم دیکھتے ہیں

جو بیٹھے تھے یاں پابدامانِ ہستی — اُنھیں سب بجیبِ عدم دیکھتے ہیں
کمالاتِ صانع پہ جن کی نظر ہے — وہ خوبیِ مصنوع کم دیکھتے ہیں
نہیں مُبتلا جو تن آسانیوں میں — اُنھیں دم بدم تازہ دم دیکھتے ہیں
نہیں جن کو جاہ و حشم کا تکبّر — وہی لطفِ جاہ و حشم دیکھتے ہیں
شکم پروری جن کا شیوہ ہے اُن کو — اسیرِ جفائے شکم دیکھتے ہیں
بس اے رنگ و بو تو نہ کر نازِ بیجا — خُدا جانے کیا بات ہم دیکھتے ہیں

اُڑاتے ہیں جو رخشِ ہمّت کو سرپٹ
وہ منزل کو زیرِ قدم دیکھتے ہیں

(۲۰۳)

سلامت ہے سر تو سرہانے بہت ہیں — مُجھے دل لگی کے ٹھکانے بہت ہیں
جو تشریف لاؤ تو ہے کون مانع — مگر خوئے بد کو بہانے بہت ہیں
اثر کر گئی نفسِ رہزن کی دھمکی — کہ یاں مرد کم اور زنانے بہت ہیں
مُعطّل نہیں بیٹھتے شغل والے — شکار افگنوں کو نشانے بہت ہیں
کرو دل کے ویرانہ کی کنج کاوی — دبے اس کھنڈر میں خزانے بہت ہیں
نہ اے شمع رو رو کے مر شام ہی سے — ابھی تجھ کو آنسو بہانے بہت ہیں
ہُوا میری روداد پر حکمِ آخر — کہ مشہور ایسے فسانے بہت ہیں
نہیں ریل یا تار برقی پہ موقوف — چھپے قُدرتی کارخانے بہت ہیں
بچے کیونکہ بیچارہ مُرغِ گرسنہ — بکثرت ہیں دام اور دانے بہت ہیں

بس ایک آستانہ ہے سجدہ کے قابل
زمانہ میں گو آستانے بہت ہیں

(۲۰۴)

اِتنا تو جانتے ہیں کہ بندے خدا کے ہیں — آگے حواس گم خردِ نارسا کے ہیں
ممنونِ برگِ گُل ہیں نہ شرمندۂ صبا — ہم بلبل اور ہی چمنِ دلکشا کے ہیں
کیا کوہ کن کی کوہ کنی کیا جنونِ قیس — وادیٔ عشق میں یہ مقام ابتدا کے ہیں
بُنیانِ عمر سُست ہے اور مُنعمانِ دہر — مغرور اپنے کوشکِ عالی بنا کے ہیں
اپنے وجود کا ابھی عُقدہ کھلا نہیں — مصروف حلّ و عقد میں ارض و سما کے ہیں
شیخ اور برہمن میں اگر لاگ ہے تو ہو — دونوں شکارِ غمزہ اُسی دلربا کے ہیں
جن کو عنایتِ ازلی سے ہے چشم داشت — وہ معتقد دُعا کے نہ قائل دوا کے ہیں
لایا نہیں ہنوز نویدِ وصالِ دوست — ہم شکوہ سنج سُستیٔ پیکِ صبا کے ہیں
سمجھو اگر تو ہیں وہی سب سے حریص تر — طالب خدا سے جو دلِ بے مدّعا کے ہیں
اِن بددلوں نے عشق کو بدنام کر دیا — جو مرتکب شکایتِ جور و جفا کے ہیں
ہمّت ہُمائے اوجِ سعادت ہے مرد کو — اُلّو ہیں وہ جو شیفتہ ظلّ ہُما کے ہیں
ہے اشک و آہ راس ہمارے مزاج کو — یعنی پلے ہوئے اِسی آب و ہوا کے ہیں
جو باندھتے ہیں طرّۂ طرّار کا خیال — ناداں اُمیدوارِ نزولِ بلا کے ہیں
کھٹکا بھی کچھ ہُوا نہیں اور دل اُڑا لیا — یہ سارے ہتکھنڈے تری زلفِ دوتا کے ہیں
صیدِ کرشمہ اِس لئے ہوتے نہیں کہ ہم — پہلے سے زخم خوردہ فریبِ وفا کے ہیں

مارا بھی اور مار کے زندہ بھی کر دیا
یہ شعبدے تو شوخیٔ ناز و ادا کے ہیں

خلوت میں بھی روا نہیں گستاخیٔ نگاہ
پردے پڑے ہوئے ابھی شرم و حیا کے ہیں

یوں کہہ رہی ہے نرگسِ بیمار کی ادا
نسخے تو مجھ کو یاد ہزاروں شفا کے ہیں

اب تک ہے سجدہ گاہِ عزیزانِ روزگار
جس خاک پر نشان تری کفشِ پا کے ہیں

اندیشہ ہے کہ دے نہ اِدھر کی اُدھر لگا
مجھ کو تو ناپسند وتیرے صبا کے ہیں

سیرِ ورودِ قافلۂ نوبہار دیکھ
برپا خیام اوجِ ہوا میں گھٹا کے ہیں

جاتا ہے خاکِ پاکِ دکن کو یہ ریختہ
واں قدردان اِس گہرِ بے بہا کے ہیں

احباب کا کرم ہے اگر نکتہ چیں نہ ہوں
ورنہ ہم آپ معترف اپنی خطا کے ہیں

(۲۰۵)

زمانہ اُن سے کراتا ہے آج خار کشی
جو محوِ سرو و صنوبر تھے خانہ باغوں میں

اُنھیں پہ گردشِ ایام کا گرا نزلہ
سمائی بوئے گل و مُل تھی جن دماغوں میں

وہ عطرِ فتنہ سے بستا تھا جن کا پیراہن
مُیسّر اب اُنھیں روغن نہیں چراغوں میں

وہ مانگ تانگ کے پیتے ہیں اوک سے پانی
بھری تھی جن کے مئے مشکبو ایاغوں میں

(۲۰۶)

منزل دراز و دُور ہے اور ہم میں دم نہیں
ہوں ریل پر سوار تو دام و درم نہیں

میدانِ زندگی میں کریں دوڑ دھوپ کیا
ہم ایسے ناتواں ہیں کہ اُٹھتا قدم نہیں

کیا خوب ہاتھ پانو خُدا نے عطا کیے
چلتے رہیں تو حاجتِ خیل و خدم نہیں

اغیار کیوں دخیل ہیں بزمِ سرور میں
مانا کہ یار کم ہیں پر اتنے تو کم نہیں

جب تک ہے عشق و عاشق و معشوق میں تمیز
کُھلتا کسی پہ رازِ حدوث و قِدم نہیں

آدم پہ معترض ہوں فرشتے تو کیا عجب
چکّھی ہنوز چاشنیٔ زہرِ غم نہیں

اظہارِ حال کا بھی ذریعہ نہیں رہا
دِل اتنا جل گیا ہے کہ آنکھوں میں نم نہیں

تو ہی نہیں ہے رمزِ محبّت سے آشنا
ورنہ دیارِ حُسن میں رسمِ ستم نہیں

ارشادِ طبع کی نہ اگر پیروی کرے
نقّاشیٔ خیال مجالِ قلم نہیں

سَر ہی کے بل گئے ہیں سدا رہروانِ عشق
حیرت زدہ نہ بن کہ نشانِ قدم نہیں

کیسی طلب کہاں کی طلب کس لئے طلب
ہم ہیں تو وہ نہیں ہے جو وہ ہے تو ہم نہیں

(۲۰۷)

کبھی تقصیر جس نے کی ہی نہیں
ہم سے پوچھو تو آدمی ہی نہیں

مر چکے جیتے جی خوشا قسمت!
اِس سے اچھّی تو زندگی ہی نہیں

دوستی اور کسی غرض کے لئے!
وہ تجارت ہے دوستی ہی نہیں

یا وفا ہی نہ تھی زمانہ میں
یا مگر دوستوں نے کی ہی نہیں

کُچھ مری بات کیمیا تو نہ تھی
ایسی بگڑی کہ پھر بنی ہی نہیں

جس خوشی کو نہ ہو قیام و دوام
غم سے بدتر ہے وہ خوشی ہی نہیں

بندگی کا شعور ہے جب تک
بندہ پرور! وہ بندگی ہی نہیں

ایک دو گھونٹ جامِ وحدت کے
جو نہ پی لے وہ متّقی ہی نہیں

کی ہے زاہد نے آپ دُنیا ترک
یا مقدّر میں اُس کے تھی ہی نہیں

(۲۰۸)
عارضِ روشن پہ جب زُلفیں پریشاں ہو گئیں
کُفر کی گمراہیاں ہمرنگِ ایماں ہو گئیں

زُلف دیکھی اُس کی جن قوموں نے وہ کافر بنیں
رُخ نظر آیا جنھیں وہ سب مسلماں ہو گئیں

خود فروشی حُسن کو جب سے ہوئی مدِّ نظر
نرخِ دل بھی گھٹ گیا جانیں بھی ارزاں ہو گئیں

جو بنائیں تھیں کبھی ایوانِ کسریٰ کا جواب
گردشِ افلاک سے گردِ بیاباں ہو گئیں

خوفِ ناکامی ہے جب تک کامیابی ہے محال
مشکلیں جب بندھ گئی ہمّت سب آساں ہو گئیں

ہائے کس کو روئیے اور کس کی خاطر پیٹیے
کیسی کیسی صورتیں نظروں سے پنہاں ہو گئیں

کیا انھیں اندوہِ ہنگامِ سحر یاد آگیا
شام ہی سے بزم میں شمعیں جو گریاں ہو گئیں

اِک فرشتے بھی تو ہیں جن کو نہ محزن ہے نہ رنج
خواہشیں دل کی بلائے جانِ انساں ہو گئیں

کیا ہے وہ جانِ مجسّم جس کے شوقِ دید میں
جامۂ تن پھینک کر رُوحیں بھی عُریاں ہو گئیں

تھی وہ توفیقِ الٰہی میں نے سمجھا اپنا فعل
طاعتیں بھی میرے حق میں عینِ عصیاں ہو گئیں

(۲۱۰)
خاک سے افلاک تک ہے ورد تیرے نام کا
کونسی محفل ہے وہ جس میں ترا چرچا نہیں

اوّل و آخر بھی تو ہے ظاہر و باطن بھی تو
تو ہی تو ہے پر کہیں تیرا پتہ لگتا نہیں

سب سمائے تجھ میں ہیں یا تو سمایا سب میں ہے
اِس پہیلی کو کسی نے آج تک بوجھا نہیں

(۲۱۱)

حامدؔ[۱] کہاں! کہ دوڑ کے جاؤں خبر کو میں — کس آرزو پہ قطع کروں اِس سفر کو میں

مانا بُری خبر ہے پہ تیری خبر تو ہے — صبر و قرار نذر کروں نامہ بر کو میں

یہ سنگ و خشت آہ رلاتے ہیں تیری یاد — روتا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں

ہے تیری شکل یا تری آواز کا خیال — کرتا ہوں التفات یکایک جدھر کو میں

افسوس! ہائے ہائے کی آتی نہیں صدا — پوچھے تو کیا بتاؤں؟ ترے چارہ گر کو میں

کیا ہو گیا اِسے! کہ تجھے دیکھتی نہیں — جی چاہتا ہے آگ لگا دوں نظر کو میں

اچھا جو تو نے گوشۂ مرقد کیا پسند — اب اپنے حق میں گور بناؤں گا گھر کو میں

تیرے سرِ عزیز کی بالش ہو خاک سے — بالینِ غم سے اب نہ اُٹھاؤں گا سر کو میں

دیکھی نہ تھی بہار ابھی تیرے شباب کی — بھولا نہ تھا ابھی ترے عہدِ صغر کو میں

تقدیر ہی نے ہائے! نہ کی کچھ مساعدت — کیا روؤں اب دُعا و دوا کے اثر کو میں

حُکمِ خُدا یہی تھا کہ بیٹھا کیا کروں — ماتم میں تیرے اشک فشاں چشمِ تر کو میں

جز درد و داغ تو نے نہ چھوڑا نشان حیف!! — رکھوں گا میہمان اِنھیں عُمر بھر کو میں

کرنے دو آہ و نالہ کہ آخر رہوں گا بیٹھ — تسلیم کر کے حکمِ قضا و قدر کو میں

کیا فکرِ آب و نان! کہ غم کھا رہا ہے اب — موجود ہوں ضیافتِ دل اور جگر کو میں

تجھ کو جوارِ رحمتِ حق میں جگہ ملے — مانگا کروں گا اب یہ دُعا ہر سحر کو میں

حبسِ دوام تو نہیں دُنیا۔ کہ مر رہوں — کاہے کو گھر خیال کروں رہ گزر کو میں

۱؎ محمد حامد فرزند مصنف نے ۲۱ اکتوبر ۱۸۹۵ء کو انتقال کیا تھا۔ اِس جوان مرگ کے ماتم میں یہ مرثیہ بمقام آگرہ لکھا گیا۔

خود ہم سے بھی زیادہ ہو جو ہم پہ مہرباں
وہ جامِ زہر دے۔ تو نہ چکھوں شکر کو میں

وہ جانے اور اُس کی رضا جو پسند ہو
سب کام سونپتا ہوں اُسی دادگر کو میں

ہوتا نہ دل میں درد۔ تو کرتا نہ ہائے ہائے
دیتا نہ طول یوں سخنِ مختصر کو میں

(۲۱۲)

بزمِ ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں
ہے یہ تیری ہی صدا غیر کی آواز نہیں

کہہ سکے کون وہ کیا ہے؟ مگر از روئے یقیں
گل نہیں شمع نہیں سروِ سرافراز نہیں

دل ہو بے لوث تو کیا وجہ تسلّی ہو دروغ
طائرِ مُردہ مگر طعمۂ شہباز نہیں

بلبلوں کا تھا جہاں صحنِ چمن میں انبوہ
آج چڑیا بھی وہاں زمزمہ پرواز نہیں

بھاگ ویرانۂ دُنیا سے کہ اِس منزل میں
نُزلِ مہمان بجز مائدۂ آز نہیں

دلبری جذبِ محبّت کا کرشمہ ہے فقط
کچھ کرامت نہیں جادُو نہیں اعجاز نہیں

دل کی تسخیر ہے شیریں سخنی پر موقوف
کچھ کرامت نہیں جادُو نہیں اعجاز نہیں

دستِ قدرت نے مجھے آپ بنایا ہے تو پھر
کونسا کام ہے میرا کہ خُدا ساز نہیں؟

متفرقات

قُدسیوں کے بھی ہوش اُڑتے ہیں
سُن کے اِس مُشتِ خاک کی باتیں

دِل کا احوال تو خُدا جانے
ظاہرا ہیں تپاک کی باتیں

جس سے نہ انتفاع ہو ابنائے جنس کو
فرد ردی ہے دفترِ لیل و نہار میں

(۲۱۴)

ردیف (و)

وہی[1] کارواں وہی قافلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی منزل اور وہی مرحلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن

اِسے وزن کہتے ہیں شعر کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی شُکر ہے جو سپاس ہے وہ ملول ہے جو اُداس ہے
جسے شکوہ کہتے ہو ہے گلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی نقص ہے وہی کھوٹ ہے وہی ضرب ہے وہی چوٹ ہے
وہی سود ہے وہی فائدہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی ہے ندی وہی نہر ہے وہی موج ہے وہی لہر ہے
یہ حباب ہے وہی بُلبُلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی کِذب ہے وہی جھوٹ ہے وہی جُرعہ ہے وہی گھونٹ ہے
وہی جوش ہے وہی ولولہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی ساتھی ہے جو رفیق ہے وہی یار ہے جو صدیق ہے
وہی مہر ہے وہی مامتا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے بھید کہتے ہو راز ہے جسے باجا کہتے ہو ساز ہے
جسے تان کہتے ہو ہے نوا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

---

[1] یہ نصابیہ غزل ۱۸۸۰ء میں مصنّف نے اپنے بچّوں کے لیے لکھی تھی ۱۲۔

جو مُراد ہے وہی مدّعا وہی مُتّقی وہی پارسا
جو پھنسے بلا میں وہ مُبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جو کہا ہے میں نے مقال ہے جو نمونہ ہے سو مثال ہے
مری سر گزشت ہے ماجرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جو چنانچہ ہے وہی جیسا ہے جو چگونہ ہے وہی کیسا ہے
جو چُناں چُنیں ہے سو ہٰکذا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی خوار ہے جو ذلیل ہے وہی دوست ہے جو خلیل ہے
بد و نیک کیا ہے بُرا بھلا۔ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(۲۱۴)

پائے غیر اور میرا سر دیکھو ٹوٹ جائے نہ سنگِ در دیکھو
ایک عالم پڑا ہے چکّر میں گردشِ چشمِ فتنہ گر دیکھو
ہیں نظر بند غیر مدِّ نظر اپنا دِل اور مرا جگر دیکھو
چشم پُرنم ہے تن غبار آلود آن کر سیرِ بحر و بر دیکھو
فکرِ افشائے راز کیوں نہ کروں کیا حیا خیز ہے نظر دیکھو
ہے دگرگوں مریضِ غم کا حال ہو سکے تو دوا بھی کر دیکھو
غیر جھلتے ہیں اب اُنھیں پنکھا اثرِ آہِ پُر شرر دیکھو

کم نمائی و خویشتن بینی
کتنے بے دید ہو ادھر دیکھو

(۲۱۵)

ہے جانِ حزیں ایک لبِ روح فزا دو — اے کاش! کہ اِس ایک کی ہو جائیں دوا دو

تھا خارِ جگر ہجر میں تنہا غمِ دوری — ہیں آفتِ جاں وصل میں اب شرم و حیا دو

مستانہ روش کیوں نہ چلے وہ نگہِ ناز — آنکھیں ہیں کہ ہیں جامِ مئے ہوش رُبا دو

جی تنگ ہے کیا کیجئے اور جوشِ بلا یہ — دل ایک ہے کیا دیجئے اور زلفِ دوتا دو

ہے عینِ عنایت جو نشاں پوچھئے میرا — یہ بھی نہیں منظور تو اپنا ہی پتا دو

کیا دامِ فریب اُس نے بچھایا ہے دلآویز — دو آن پھنسیں اور ۔ جو ہو جائیں رہا دو

گر نازِ خود آرا کو ہے یکتائی کا دعوےٰ — کیوں آئنہ دیکھا کہ ہوئے جلوہ نما دو

بیباکی و شوخی بھی ہے اور شرم و حیا بھی — دو محرمِ اَسرار ہیں تو پردہ کشا دو

دو گیسو و دو زلفِ بلا خیز ہیں چاروں — ہاں کاکُلِ خمدار بھی ہیں اِن کے سوا دو

وہ طرز و روش ہائے! وہ انداز و ادا حیف — کیا بچتے دِل و جان ۔ کجا چار ۔ کجا دو

سیری نظر بھی نہ ہوئی ہائے میسّر
آنکھیں جو ہوئیں چار لگے تیرِ قضا دو

(۲۱۶)[لہ]

معشوقِ دل نواز اگر تند خو نہ ہو — ثابت خلوصِ عاشق و لاف و عدو نہ ہو

واں سجدۂ نیاز کی مٹّی خراب ہے — جب تک کہ آبِ دیدہ سے تازہ وضو نہ ہو

وہ جنّتِ وصال جہاں تو ہو میں نہ ہوں — وہ دوزخِ فراق جہاں میں ہوں تو نہ ہو

خمخانہ ہے کرامتِ پیرِ مغاں سے پُر — زنہار مُنکرِ مے و جام و سبو نہ ہو

بُلبُل کے دِل میں داغِ وداعِ بہار ہے — یارب! کوئی فریفتۂ رنگ و بو نہ ہو

لہ مرتبہ ۸؍ جون ۱۸۷۳ء۔

شرمِ گناہ نے تو ڈبویا ہی تھا مجھے
گر دستگیر مژدۂ لا تقنطو نہ ہو

افسانہائے شوق سُناتا ہوں میں اُسے
جو عالمِ خیال میں بھی روبرو نہ ہو

حُسنِ غیور میں ہے رشکِ یگانگی
ہو دیدِ محض اور کوئی روبرو نہ ہو

دل میں کسک نہ ہو تو سمجھئے اُسے مریض
زنہار دردِ دل کے لئے چارہ جو نہ ہو

ہے کائنات گردِ رہِ کاروانِ عشق
وہ دل ہی کیا کہ جس میں تری جستجو نہ ہو

(۲۱۷) ۵۷

کیا مانگئے جس کا کبھی چسکا نہ لگا ہو
دی راہِ خدا ہم کو بھی ساقی کا بھلا ہو

کر پیرِ خرابات سے دریوزۂ ہمّت
جا خاکِ درِ میکدہ پر ناصیہ سا ہو

بے حوصلگی ہے گلۂ تلخیٔ دوراں
جو دیں اُسے پی جائیے گو زہر ملا ہو

آنے کو ہے اب شاہدِ گُل پردہ سے باہر
آمادۂ مشّاطگی اے بادِ صبا ہو

جب ہم سے نبھے رسمِ ملاقات تو جانیں
تسلیم کیا۔ تم ہمہ تن مہر و وفا ہو

سر رشتۂ آمالِ دو عالم ہے ترے ہاتھ
پھر کا ہے کا اُلجھاؤ۔ جو تو عقدہ کُشا ہو

تنگی سے نہ دلِ تنگ ہو۔ جا شکرِ خدا کر
اے خوش وہ دلِ تنگ۔ کہ راضی بہ رضا ہو

گاہک ہی نہ ہو کوئی۔ تو ہے عرضِ ہنر ہیچ
اے وائے گُلِ تازہ جو صحرا میں کھلا ہو

اُس غنچۂ دلگیر کی تقدیر کہ زنہار
تحریکِ نسیمِ سحری سے بھی نہ وا ہو

ہمّت کے لئے عار ہے احسان اُٹھانا
وہ درد بھی اچھا جو نہ محتاجِ دوا ہو

۵۷ مرتبہ ۱۰؍ نومبر ۱۸۹۷ء۔

(۲۱۸)

بچ گنہ سے ورنہ توبہ اور استغفار کر — گھونپ جب کپڑے میں آئی چارہ کیا غیر از رفو

سنگریزہ تھا فقط گر لعل میں ہوتا نہ رنگ — کوئلے سے تھا بتر گر مشک میں ہوتی نہ بو

تائب اور معصوم میں دونوں بری پر فرق ہے — ایک بادر زاد طاہر۔ ایک بعد از شست و شو

گر نہ ہو نیکی، دماغی قوتیں برباد ہیں
بوستاں سرسبز ہوتا ہی نہیں بے آبِ جو

متفرقات

میں پٹکتا ہی رہ گیا سر کو — چل دئے وہ پیادہ پا گھر کو

دو جگہ خفتگانِ خاک مجھے — تھوڑے تھوڑے ذرا پرے سرکو

ان غفلتوں سے داغ ہوں لیکن خدا کرے — تاخیر کا سبب کوئی اس کے سوا نہ ہو

ردیف (ی)

(۲۱۹)

ناصح جو ملامت میں محابا نہیں کرتے — انصاف کریں دل میں۔ کہ وہ کیا نہیں کرتے

اظہارِ مشیخت ہے نشاں بے ہنری کا — جو اہلِ ہنر ہیں کبھی دعویٰ نہیں کرتے

کہتے بھی ہیں پھر صاف مکر جاتے ہیں کہہ کر — کیا شخص ہیں کچھ خوف خدا کا نہیں کرتے

دردِ دلِ آزردہ سے ہے جن کو خبر کچھ — آزار کسی کا بھی گوارا نہیں کرتے

جاں کاہیوں کے بعد جنھیں ملتی ہے دولت
وہ مفت میں دولت کو لٹایا نہیں کرتے

(۲۲۰)

کیا یہی ہے جس پہ ہم دیتے ہیں جاں — یا کوئی دنیائے فانی اور ہے

یوں تو ہر انسان گویا ہے مگر　　شیوۂ شیوا بیانی اور ہے
چل رہی ہے جس سے جسمانی مشین　　کوئی پوشیدہ کمانی اور ہے
دل نے پیدا کی کہاں سے یہ ترنگ　　کوئی تحریکِ نہانی اور ہے
غیر سمجھا ہے کسے اے ہم نشیں؟　　میرے دِل میں بدگمانی اور ہے
تم نے کب دیکھا ہے بے رنگی کا رنگ
بے نشانی کی نشانی اور ہے

(۲۲۱)

دھوکے میں نہ آجائیو افسونِ زباں کے　　ہر چند کہ بڑا اپنی فصاحت کی یہ ہانکے
کچھ ظلم ہے جو کرتے ہیں کرم حضرتِ ناصح　　تھے ورنہ مرے ایسے ہوا خواہ کہاں کے
وہ اُڑنے لگے مثلِ پری - دوشِ ہوا پر　　بیٹھے ہیں بھروسے پہ یہاں طبعِ رواں کے
ہے وادیٔ وحدت میں اگر نیّتِ پرواز
پر نوچ کے دے پھینک یقین اور گماں کے

(۲۲۲)

پھر کچھ کچھ اُن کے وعدہ پہ اب اعتبار ہے　　مایوسِ مرگ پھر دلِ اُمّیدوار ہے
گِن گِن کے ایک ایک گھڑی کاٹنی پڑی　　ہے یہ شبِ فراق کہ روزِ شمار ہے
سروِ رواں کو دیکھ کے خجلت سے پا بگِل　　گویا ہر ایک سروِ لبِ جوئبار ہے
چل مے کدہ کو بیٹھ نہ گوشہ میں تنگ دِل
زاہد! وسیع رحمتِ پروردگار ہے

(۲۲۳)

گر نشے میں کوئی بے فکر و تامّل باندھے　　چشمِ مے گوں کو تری جامِ پُر از مُل باندھے

ذکرِ قامت میں اگر فکر ترقّی نہ کرے — رشکِ طوبیٰ تو لکھے گو بہ تنزّل باندھے
طبع کی سلسلہ جنباں جو پریشانی ہو — گیسوئے غالیہ سا کو ترے سنبل باندھے
نالہ تو وہ ہے کہ گھبرا کے اُٹھا دے پردہ — لیک نظارہ کی ہمّت بھی تحمّل باندھے
کُچھ نہ بن آئے گی جب لوٹ مچائے گی خزاں — غنچہ ہر چند گرہ کس کے زرِ گُل باندھے
روبرو اُس کے لب عرضِ تمنّا نہ ہلے — زورِ افسونِ نظر سے گئے بالکل باندھے
ہیں ترے بندِ قبا عقدۂ دشوار مرے — کہ جو کھولے نہ کھُلے اور جو گئے کھُل باندھے
نہ بچے پر نہ بچے سیلِ فنا سے نہ بچے — گر کوئی کنگرۂ چرخ پہ بھی پُل باندھے
آنکھ کھُلنے بھی نہ پائی تھی کہ اُس نے فوراً — بندِ برقع کے باندازِ تغافل باندھے

ہائے وہ صید کہ صیاد کے پیچھے لپکے
سر کو فتراک پہ ہر دم بہ تفاول باندھے

(۲۲۴)

نکہتِ طرّۂ مشکیں جو صبا لائی ہے — کوئی آوارہ ہوا ہے کوئی سودائی ہے
بے خودی سے ہے یہاں بے خبری کا عالم — خود نمائی کو وہاں شغلِ خود آرائی ہے
اپنی ہی جلوہ گری ہے یہ کوئی اور نہیں — غور سے دیکھ اگر آنکھ میں بینائی ہے
ہے مجھے کشمکشِ سعی و طلب سے نفرت — دِل مرا ترکِ تمنّا کا تمنّائی ہے
جز دلِ پاک نہ پایا حرمِ خاص کہیں — دیر و کعبہ میں عبث ناصیہ فرسائی ہے
ناز کی جلوہ گری کے لئے منظر ہے نیاز — ناتوانی مری ہم رنگِ توانائی ہے
جب طبیعت ہی نہ حاضر ہو تو بے سود ہے فکر — شعر گوئی تو کہاں قافیہ پیمائی ہے

مُنہ پہ لاؤں تو یہ کم ظرف بہک جائیں ابھی بات جو پیرِ خرابات نے سمجھائی ہے
خود منادی و مُنادیٰ ہوں نہ غیبت نہ حضور عالمِ غیب سے یوں دِل میں ندا آئی ہے
دل یہ کہتا ہے کہ حاصل کی ہے تحصیل عبث
نہ تمنّا کوئی شے ہے نہ تمنّائی ہے

(۲۲۵)

بیخودی سی بیخودی ہے جلوۂ دیدار سے نیند آئی مجھ کو فیضِ دولتِ بیدار سے
ہے جو لطف آمیز اشارہ ابروئے خمدار سے وہ فسوں گر کاٹتا ہے دردِ سر تلوار سے
ہم نے اندازِ جنوں سیکھا ہے اِک ہشیار سے دو گھڑی کا شغل ہے اطفالِ کوئے یار سے
ابتدا سے حشر کا سُنتے چلے آتے تھے نام ہو گیا حاصل یقیں بارے تری رفتار سے
اُس کی گنجایش ہے آغوشِ تصوّر میں محال جس کا سایہ شوخ تر ہو انجمِ سیّار سے
ہے تہید ستی جہنّم اہلِ حرص و آز کو رات دن جلتے ہیں داغِ درہم و دینار سے
شوخی و غمزہ کرشمہ عشوہ انداز و ادا ہے دلِ تنہا مقابل لشکرِ جرّار سے
رہ گئی تیرے سوا شاید تمنّا اور بھی کچھ کھٹکتے ہیں ابھی پہلوئے دل میں خار سے
یار نازک طبع ہے اور داستانِ غم دراز دوستو گھبرا نجائے وہ مرے طومار سے
عشق بے تابِ وصال اور حُسن اتنا پسند کس طرح تسکینِ دل ہو وعدۂ دیدار سے
ہیں زمین و آسماں ہنگامۂ وحدت سے پُر
مجھ کو آتی ہے یہ میری ہی صدا کہسار سے

(۲۲۶)

وہ حسن لازوال ہماری نظر میں ہے شانِ کمال صورتِ ہر خیر و شر میں ہے

ہے سنگ میں شرار تو برق ابر تر میں ہے ‏ شوخی وہی ہے شان نئی بحر و بر میں ہے

بتلا دیا ہے راہ نمانے مجھے پتا ‏ دُنیا بھی اک مقام ترے رہگزر میں ہے

اسرارِ عشق بھی کہیں دیکھے ہیں واعظو! ‏ دخل آپ کو بہت کتبِ معتبر میں ہے

باطن کو بھی نہ صورتِ ظاہر پہ کر قیاس ‏ انگور میں شراب شکر نیشکر میں ہے

البتہ اُس کے فضل پہ موقوف ہے نجات ‏ کچھ زہدِ خشک میں ہے نہ دامانِ تر میں ہے

بیرونِ عرش و فرش ہے پروازِ مرغِ دل ‏ از بس ہوائے شوق بھری بال و پر میں ہے

بے رغبتی سے شب کو سحر بھی کیا تو کیا ‏ تاثیر نالۂ شب و آہِ سحر میں ہے

چل شاہراہِ دل میں اڑا توسنِ طلب ‏ وحشت کا جوش چاہیے صحرا بھی گھر میں ہے

یہ وہ مرض ہے جس سے معالج نہ بچ سکے
مجھ سے زیادہ دردِ دل چارہ گر میں ہے

(۲۲۷)

پُر حسنِ خود نما سے زمان و زمین ہے ‏ زاہد ہنوز منتظرِ حورِ عین ہے

صحرائے عشق کی بھی عجب سرزمین ہے ‏ ہمدم نہ ہم سفر نہ کوئی ہم نشین ہے

سرگشتگانِ شوق سے راہِ وصال پوچھ ‏ نے شرق و غرب ہے نہ یسار و یمین ہے

ہے توسنِ خیال تگ و تاز میں سدا ‏ اس رخش پر بندھا ہوا ہر وقت زین ہے

ہے قیدِ آب و خاک سے باہر مقامِ دل ‏ مانا خمیر مایہ مرا ماء و طین ہے

تیرے سوا اُسے نظر آتا نہیں کوئی ‏ حاصل جہان میں جسے عین الیقین ہے

احباب پھر بھی کرتے ہیں مجھ سے مطالبہ ‏ ہر چند الاخراج غزل کی زمین ہے

(۲۲۸)

کجُا [1] ہستی بتا دے تو کہاں ہے — جسے کہتے ہیں بسمل نیم جاں ہے
ہمارا گھر ہے یعنی خانۂ ماست — محل ہی کاخ ہے کوشک مکاں ہے
چچا عم ہے پسر بیٹا پدر باپ — تو کنبا خانمان و دودماں ہے
سفینہ ناؤ کشتی بان ملّاح — بہے پانی تو وہ آبِ رواں ہے
بتاؤ آگ کیا ہے نار و آتش — دھواں کیا چیز ہے دود و دخاں ہے
جسے کہتے ہو تم گردونِ گرداں — فلک چرخ و سپہر و آسماں ہے
وہی جنّت کہ جس کی آرزو ہے — نعیم و خلد و فردوس و جناں ہے
سُنا کیجے حکایت ہے کہانی — کہا کیجے فسانہ داستاں ہے
مرا سر راس ہے ماتھا جبیں ہے — مرے مُنہ میں زباں ہے جو لساں ہے
کہو تم جو ترازو ہے سو میزاں — سُنو تم آزمائش امتحاں ہے
حجر پتّھر ہے اور قرطاس کاغذ — سبک ہلکا ہے اور بھاری گراں ہے
عصا لاٹھی۔ عَلَم نیزہ۔ سناں بھال — جسے ہم قوس کہتے ہیں کماں ہے
نہان و مستتر پوشیدہ مخفی — جو بارز ہے تو ظاہر ہے عیاں ہے
اگر جانو ہو تم ریوڑ کو گلّہ — تو چرواہا بھی راعی اور شباں ہے
کہا کرتے ہیں شاعر کو سخنداں — جو بھیدی ہے تو محرم رازداں ہے
ہما نجا آدم جائے کہ ہستی — وہیں آیا ہوں میں بھی تو جہاں ہے
یہی کون و مکاں دُنیا ہے عالم — یہی گیتی ہی گیہاں ہے جہاں ہے

---

[1] غزل الصابیہ

(۲۲۹)

اُلٹی ہر ایک رسمِ جہانِ شعور ہے
سیدھی سی اِک غزل مجھے لکھنی ضرور ہے

وحدت میں اعتبارِ حدوث و قِدم نہیں
تھا جو بطون میں یہ وہی تو ظہور ہے

تارک وہی ہے جس نے کیا کل کو اختیار
یعنی حریص تر ہے وہی جو صبور ہے

مطلق یگانگی ہے تو نزدیک و دور کیا
پہنچا ہے جو قریب وہی دور دور ہے

اصلِ حیات ہے یہی کہتے ہیں جس کو موت
جینے کی آرزو ہے تو مرنا ضرور ہے

اقرارِ بندگی ہے خدائی کا اِدّعا
عجز و نیاز کیا ہے؟ کمالِ غرور ہے

اُمّید کیجئے اگر اُمّید کچھ نہیں
غم کھائیے بہت جو خیالِ سرور ہے

زلفِ سیاہ سے رخِ تاباں کا حسن ہے
کہتے ہو جس کو دیو حقیقت میں حور ہے

بے معصیت خزانۂ رحمت ہے رائیگاں
سچ پوچھئے تو جرم نہ کرنا قصور ہے

اظہارِ جانِ پاک ہے جسمِ کثیف سے
بے پردگی حجاب ہے ظلمت ہی نور ہے

بالاتفاق ہستیِ وہمی ہے نیستی
ہشیار ہے جو نشۂ غفلت میں چور ہے

اعلیٰ تھا جس کا رتبہ وہ اسفل میں ہے اسیر
صفِّ نعال موقفِ صدرُ الصدور ہے

ہے راہ کی تلاش تو کر گمرہی طلب
عاقل وہی ہے عقل میں جس کی فتور ہے

بیداریٔ وجود ہے خوابِ عدم میں غرق
لب بند ہو گئے یہی شورِ نشور ہے

ہر چند شغلِ شعر نہیں آج کل ضرور
نذرانہ پیر جی[1] کے لئے کچھ ضرور ہے

---

[1] پیر جی غلام محمد صاحب مرحوم وکیل رئیس لدھیانہ مصنّف کے برادرانِ طریقت میں سے تھے۔ جن کے لئے یہ غزل ۲۹ جولائی ۱۸۸۰ء کو لکھی گئی۔

(۲۳۰)

ہے وصف ترا محیطِ اعظم یاں تاب کسے شناوری کی
دی زندگی اور اُس کا ساماں کیا شان ہے بندہ پروری کی
شاہنشہِ وقت ہے وہ جس نے تیرے در کی گداگری کی
بدتر ہوں و لے کرم سے تیرے اُمّید قوی ہے بہتری کی
کیا آنکھ کو تِل دیا کہ جس میں وسعت ہے چرخِ چنبری کی
دیکھا تو وہی ہے راہ و رہرو پھر اُس نے ہے آپ رہبری کی
ہر شکل میں تھا وہی نمودار ہم نے ہی نگاہ سرسری کی
کیا بات ہے گر کیا ترحّم ہیہات جو تو نے داوری کی
کی بعدِ خزاں بہار پیدا سوکھی ٹہنی ہری بھری کی
جھوٹ اور مبالغہ نے افسوس عزّت کھودی سخنوری کی

لکھی تھی غزل یہ آگرہ میں
پہلی تاریخ جنوری کی

(۲۳۱)

کچھ ایسے دلفریب شگوفے کھلا گئے مشقِ خیال سے نہ بنی دل جدا کئے
دریا تو ہے وہی جو ہوا داخلِ محیط وادی میں ورنہ سیکڑوں نالے بہا کئے
ابنائے روزگار میں ایسا بھی کوئی ہے جس نے حقوقِ صحبتِ یاراں ادا کئے
ذاتِ بشر میں کوئی کرامت ضرور ہے کیوں بات بات اُس کی فرشتے لکھا کئے
انسان کی زمام ہے خصلت کے ہاتھ میں اہلِ جفا کو چین کہاں بے جفا کئے

بد قسمتی سے تو ہی نہ دوڑا وگرنہ یاں　　دن رات خوانِ نعمتِ الواں لُٹا کئے
زاروزبوں ہیں آج زمانہ کے ہاتھ سے　　غافل جو بزمِ ناز کو بیٹھے سجا کئے
شاید کوئی لطیفۂ غیبی ہو آشکار　　بیٹھے ہوئے ہیں تکیہ بفضلِ خدا کئے
شُکرِ خُدا کہ وجہ شکایت نہیں رہی　　مدّت ہوئی ہے ترکِ اُمیدِ وفا کئے
بخشا ہے اہتزاز تجھے کس نے، اے نسیم
بندِ قبائے غنچہ اگر تو نے وا کئے

(۲۳۲)

جو دل ہو تنگ تو جا شکر کر گُلوں کو دیکھ　　شگفتگی نے چمن کی ہوا نہ کھانے دی
کیا جو کبر تو شیطاں کے ہاتھ کیا آیا　　وہی عزیز ہے عزّت جسے خُدا نے دی
تری عطا ہے مری احتیاج سے سابق　　کبھی سوال کی نوبت نہ تو نے آنے دی
نہ عرضِ حال کی میں آپ کر سکا جُرأت　　نہ پوچھنے کی اجازت اُنھیں حیا نے دی
اُمید نے تو بہت دھوم دھام کی لیکن　　وفورِ یاس نے قسمت نہ آزمانے دی
کشودِ کار سے تسکینِ دل کبھی نہ ہوئی　　عجب نشاط تھی جو ترکِ مدّعا نے دی
گدا و شاہ سے یکساں معاملہ ہے وہاں
کوئی بتائے کہ مہلت کسے قضا نے دی

(۲۳۳)

غمِ مونسِ تنہائی تھا آتے ہی تمہارے　　کہتا ہے پھر آجاؤں گا جب یاد کرو گے
دلداریٔ سرکار کے بج جائیں گے ڈنکے　　دل سے دہِ ویراں کو جو آباد کرو گے
احسان کے پھندے سے چھڑائے گا مجھے کون　　مانا کہ غلامی سے تم آزاد کرو گے

عالم کے صحیفہ میں یہ قدرت کی نگارش دیکھو گے تو ہر نکتہ پہ تم صاد کرو گے
واعظ کی تو بکواس سمجھ میں نہیں آتی
یا حضرتِ دل تم بھی کچھ ارشاد کرو گے

(۲۳۴)

کس لئے پروانہ خاکستر ہوا شمع کیوں اپنی جلن میں گھل گئی
منتشر کیوں ہو گئے اوراقِ گل چیختی گلشن سے کیوں بلبل گئی
آبدیدہ ہو کے شبنم کیوں چلی دم کے دم کانٹوں میں آ کر تل گئی
سبزۂ طرفِ خیاباں کیا ہوا آہ کیوں شادابیٔ سنبل گئی
کچھ نہ تھا خوابِ پریشاں کے سوا اس تھیٹر کی حقیقت کھل گئی
راہ کے رنج و تعب کا کیا گلہ
جب کہ دل سے گردِ کلفت دھل گئی

(۲۳۵)

خارج ہے عہدِ طفلی و پیری حساب سے البتہ زندگی ہے عبارت شباب سے
ہر چند گفتگو کی نہ باقی رہے مجال لیکن زبان دراز نہ ہو کے جواب سے
ہے دعویٔ خلوص تو کانوں پہ ہاتھ رکھ بیمِ عذاب اور اُمیدِ ثواب سے
بے نورِ سینہ حفظِ سفینہ سے فائدہ معنی سے ہے کتاب نہ معنی کتاب سے
وہ اور ہی نوا ہے محرّک سرور کی باہر گلوئے مطرب و تارِ رُباب سے
کیا کہنے آدمی کے! عجب چیز ہیں جناب برتر ملائکہ سے فرو تر دواب سے
سو جھیں وہ بدعتیں کہ خدایا تری پناہ فرصت اگر ملے بھی ہمیں خور و خواب سے

(۲۳۶)

کوئی دن کا آب و دانہ اور ہے پھر چمن اور آشیانہ اور ہے

ہاں دلِ بے تاب! چندے انتظار امن و راحت کا ٹھکانا اور ہے

شمع پھیکی۔ رات کم۔ محفل اُداس اب مُغنّی کا ترانہ اور ہے

اے جوانی تو کہانی ہو گئی ہم نہیں وہ یا زمانہ اور ہے

جس کو جانِ زندگانی کہہ سکیں وہ حیاتِ جاودانہ اور ہے

جس کو سُن کر زہرۂ سنگ آب ہو آہ وہ غمگیں فسانہ اور ہے

وا اگر سمعِ رضا ہو تو کہوں ایک پندِ مشفقانہ اور ہے

اتّفاقی ہے یہاں کا ارتباط

سب ہیں بیگانے یگانہ اور ہے

(۲۳۷)

وہی سائل وہی مسئول وہی حاجت مند[۱] گر ہو مقرونِ اجابت تو سوال اچھّا ہے

ہے تری خوئے کرم تلخ نوائی کا علاج عوضِ سنگ ثمر دے وہ نہال اچھّا ہے

جُمعۂ آخر ماہِ رمضان ہے افضل یوں تو جس وقت میں ہو بذل و نوال اچھّا ہے

ہو گئی مخمصۂ قحط و گرانی میں کمی

شُکر ہے سال گُذشتہ سے یہ سال اچھّا ہے

(۲۳۹)

روشِ سادہ بیانی میری ہے یہ تیغِ صفہانی میری

ناشناسا کو نہ آئی باور داستاں اُس کی زبانی میری

میری ہستی ہے مُمیّز بہ عدم بے نشانی ہے نشانی میری

[۱] مرتبہ ۲۰ راگست ۱۹۱۴ء

رخنہ گر ہے مری آزادی میں — ہوسِ بال فشانی میری
سبقِ جہل کی تکرار پہ اب — منحصر ہے ہمہ دانی میری
دوستی وضعِ تن آسانی کی — بن گئی دشمنِ جانی میری
خاتمہ ہے مری تمہید میں درج — ہے دِل آویز کہانی میری
زیرکی دامِ فریبِ دل ہے — ہے تحیّر نگرانی میری
دل ہو ساقی لبِ دریا ساغر — سہل ہے پیاس بجھانی میری
صُبحِ طفلی ہے بڑھاپا سیرا — شامِ پیری تھی جوانی میری
ایک چکّر ہے بشکلِ گرداب — بند برپا ہے روانی میری
وجہ باقی مرے معنی کو سمجھ — صورت البتّہ ہے فانی میری

بزمِ کثرت کا تماشائی ہوں
وحدتِ صرف ہے بانی میری

(۲۳۹)

نہ ہو یادِ عنایت[1] تو زباں سے کیوں گلہ نکلے — زباں کٹوائیے بیشک جو حرفِ ناسزا نکلے
وہ اپنی ناتوانی کو توانائی سے کیوں بدلے — شکارِ ناتواں سے کام اگر صیّاد کا نکلے
کوئی پڑھتا تھا چند اشعار درد انگیز لہجہ میں — اُنھیں سُن کر بہے آنسو تو دُرِّ بے بہا نکلے
صبا یارانِ ملّت کو سلامِ شوق پہونچانا — جو تو گنجِ شہیداں کی طرف ناگاہ جا نکلے
پھر اُن کے گوشِ جاں میں یوں زبانِ قوم سے کہنا — کہ راہِ جاں نثاری میں تُم اربابِ وفا نکلے
"نہیں ہے ہوش کچھ اِن میں" یہ طعنہ زہرِ قاتل تھا — کہ اس کالی گھٹا میں برق بن کر تلملا نکلے

[1] مسجد کان پور کے واقعہ پر یہ نظم لکھی گئی تھی۔

وہ کیسا جذبِ کامل تھا کہ ترکِ خانماں کر کے
خدا کی راہ میں لیتے ہوئے نامِ خدا نکلے

وہ پیرانِ کہن جو گوشۂ عزلت کے خوگر تھے
خدا رحمت کرے اُن پر کہ باپشتِ دوتا نکلے

وہ بازی گاہِ دُنیا کے کھلاڑی چل پڑے گھر سے
نہ ماؤں سے ہوئے رُخصت نہ کھا کر ناشتا نکلے

چلے سمتِ مُصلّیٰ آہ و زاری کا عَلم لے کر
خُدا کے در پہ کرنے کو فقیرانہ صدا نکلے

کسے معلوم تھا اب جا کے پھر واپس نہ آئیں گے
گئے یوں گھر سے جیسے تن سے روحِ باصفا نکلے

تُمہیں صد آفریں اے شمعِ حقّانی کے پروانو!
تُمہارے خاک کے ذرّے سے حمیّت کی ضیا نکلے

نشانہ بن کے بندوقوں کا تم نے زندگی پائی
بقا کی سرزمیں پر تیر کر بحرِ فنا نکلے

نہ باغی تھے نہ مُفسد تھے نہ رہزن تھے نہ غارت گر
نہ سرتابی کا سودا تھا نہ ازبہرِ وغا نکلے

تقاضائے جواں مردی یہی ہے اے جواں مردو!
کہ دست و بازوئے قاتل کے حق میں بھی دُعا نکلے

کہاں تک نوحہ خوانی اور کب تک گریۂ ماتم
بلاؤں کی چھنٹے بھیڑ اور آگے راستہ نکلے

مگر اس گُتھی کو ناخنِ تدبیر سے کھولے
کوئی مردِ خُدا اُٹھے کوئی بوڑھا بڑا نکلے

وقارالملک سے کہہ دو کہ اُٹھ! اے پیرِ دانا اُٹھ!
تقاضا وقت کا یہ ہے کہ تو لیکر عصا نکلے

چلو اعلیٰ حکومت سے کرو اظہارِ دردِ دل
یقیں ہے اُس کے پہلو میں دلِ درد آشنا نکلے

کرے اس مخمصہ کا فیصلہ ایسا کہ آئندہ
نہ خود رائی رہے باقی نہ کچھ چون و چرا نکلے

توقّع تھی جنابِ ہیسٹن[1] سے داد پانے کی
مگر افسوس وہ بھی ٹائلر[2] کے ہم نوا نکلے

---

[1] سر جیمس میسٹن بعد کو لارڈ میسٹن ہوئے اُن دنوں یو۔پی کے لفٹنٹ گورنر تھے۔ [2] مسٹر ٹائلر کانپور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے جن کے حُکم سے نہتے آدمیوں پر گولی چلائی گئی تھی۔

(۲۴۰)

مریضِ علم[۱] پر رحمت خدا کی — مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کھلائی گیٹریوں کے بدلے ہاکی — تلافی کی بھی صاحب نے تو کیا کی

قیامت آئے گی فٹ بال پر بھی — کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

جو پوچھا امتحاں میں کیوں ہوئے فیل — کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

ابھی تو فیس کی یہ ابتدا ہے — خبر لایا نہ کوئی انتہا کی

نشانے پر لگی جب گیند سب نے — بجائیں تالیاں اور واہ وا کی

اڑے کاغذ تو پیپر ویٹ رکھا — نہ کچھ پیری چلی بادِ صبا کی

معاذ اللہ اس موٹر کی رفتار
حقیقت کیا سمندِ بادپا کی

(۲۴۱)

مبارک اے سرزمیں! کہ تجھ پر نئی عمارت بنا کریں گے
عمارت ایسی کہ جس میں قومی نہال پھولا پھلا کریں گے

اگرچہ ہے فیضِ خاص اب بھی ولیک خوش قسمتی سے تیری
کہیں گے سب "فیضِ عام[۲]" تجھ کو رقم یہ تیرا پتا کریں گے

اُگے گی اب تجھ میں پود ایسی کہ جس کا شیوہ ہو آدمیت
وہ تجھ کو اک اسمِ با مسمّٰی ہمیشہ ثابت کیا کریں گے

---

[۱] یہ نظم سنہ ۱۹۱۲ء میں اسلام احمد سیفی نبیرۂ مولانا کی فرمایش پر جبکہ اس کی عمر ۷ سال کی تھی لکھی گئی تھی۔

[۲] مرتبہ ۲۵ فروری سنہ ۱۹۱۴ء۔ یہ نظم اُس جلسہ میں پڑھی گئی تھی جو فیض عام ہائی اسکول میرٹھ کے سنگِ بنیاد رکھنے کے وقت مرتب کیا گیا تھا۔

جہاں ہے اب کشتِ زار تیرا اور اُس پہ شبنم کے چند قطرے
خدا نے چاہا تو اِس جگہ پر ہُنر کے موتی لُٹا کریں گے

وہ تیرے ایوان اور کمرے کہ جن کا نقشہ میں ہے نشاں اب
اُنھیں کے دیوار و در سے علم و خرد کے چشمے بہا کریں گے

ہماری سرکار نے تو امداد کی ہے دریا دلی سے ایسی
وظیفۂ شکر جس کا ہر دم بصدقِ دل ہم جپا کریں گے

ہمارے اضلاعِ مُتّصل بھی کریں گے اِس کام میں اعانت
کہ آپ اپنی ہے یہ اعانت اگر کریں تو بجا کریں گے

یہی ہے اِک مدرسہ ہمارا۔ ہے اُس کی تکمیل ہم پہ واجب
ہمارے اعیانِ قوم مِل کر درازِ دستِ سخا کریں گے

ہمارے یہ نیک دل پریسن[۱] ہماری کرتے ہیں سرپرستی
ہمارے ہمدرد ہیں تہِ دل سے ہمارے دل کی دوا کریں گے

ہمارے صوبہ کے حکمراں نے جو سنگِ بنیاد آ کے رکھّا
تو ایسی شاہانہ مہربانی کا ہم عوض کیا ادا کریں گے

مگر کہ جیمس مسٹن[۲] کی کبھی نہ بھولیں گے یہ عنایت
دوامِ دولت کی اِن کے حق میں خلوصِ دل سے دُعا کریں گے

---

[۱] مسٹر جے آر پیرسن میرٹھ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۶ء تک رہے ہیں مولانا کا بہت وقار کرتے اور ان سے نہایت مخلصانہ برتاؤ کیا کرتے تھے۔ [۲] سر جیمس مسٹن لفٹنٹ گورنر یوپی نے سنگِ بنیاد رکھنے کی رسم ادا فرمائی تھی

(۲۴۲)

راہ و رسمِ خط کتابت ہی سہی
گُل نہیں تو گُل کی نکہت ہی سہی

دل لگی کا کوئی ساماں چاہیئے
قحطِ معنی ہو تو صورت ہی سہی

بے دماغی بندہ پرور اس قدر
آپ کی سب پر حکومت ہی سہی

دوستی کا میں نے کب دعوٰی کیا
دور کی صاحب سلامت ہی سہی

بسکہ ذکر العیش نصف العیش ہے
یادِ ایّامِ فراغت ہی سہی

وقت ملنے کا معیّن کیجیے
خواہ فردائے قیامت ہی سہی

حسنِ صورت کا نہ کھا اصلا فریب
کِلکِ صنعت گر کی صنعت ہی سہی

کچُھ نہ کرنا بھی مگر اِک کام ہے
گر نہیں صحبت تو عزلت ہی سہی

(۲۴۳)

دُنیا میں تہیدست کی وقعت نہیں ہوتی
بیجا کبھی محتاجیٔ عزّت نہیں ہوتی

ممکن ہے کہ ٹل جائے جبل اپنے مقر سے
لیکن کبھی تبدیل جبلّت نہیں ہوتی

ہو جان کی جوکھوں بھی اگر راہِ طلب میں
پست اُس سے اُلوالعزم کی ہمّت نہیں ہوتی

خلوت میں بھی لاتے نہیں عاقل اُسے مُنہ پر
جو بات کہ شایستۂ جلوت نہیں ہوتی

ہم کرتے ہیں عادت کی غُلامانہ اطاعت
اصلاح پذیر اس لئے عادت نہیں ہوتی

راحت جسے کہتے ہیں وہ محنت کا صلہ ہے
راحت طلبی موجبِ راحت نہیں ہوتی

کیا گنبدِ بے درید قدرت نے بنایا
جس کی کبھی سالانہ مرمّت نہیں ہوتی

انساں کی شرافت متعلّق ہے عمل سے
میراث میں تقسیمِ شرافت نہیں ہوتی

پتّے کی طرح جو کوئی محکوم ہوا ہو
اُس شخص کی دُنیا میں کبھی ہٹ نہیں ہوتی

جو لوگ کہ ہیں دشمنیٔ نفس سے آگاہ
اُن کو تو کسی سے بھی عداوت نہیں ہوتی

ڈھاتی ہے قیامت یہی خونخوار جہاں میں
کچھ غم نہیں ہوتا جو محبّت نہیں ہوتی

رخصت ہے مری جان خدا حافظ و ناصر
ہر چند کہ سیریٔ طبیعت نہیں ہوتی

(۲۴۴)

لو جان بیچ کر بھی جو فضل و ہُنر ملے
جس سے ملے جہاں سے ملے جس قدر ملے

ملنا بُرا نہیں ہے ولیکن یہ لت بُری
جس سے ملے بہ صورتِ شیر و شکر ملے

جب چشمِ آز پھوٹ گئی سب خلش مٹی
اب سنگریزہ ہاتھ لگے یا گُہر ملے

ہے غارتِ متاع نشانِ دیارِ دوست
رہزن اگر ملے تو یہ سمجھو خضر ملے

ممکن نہیں بغیرِ قناعت فراغ بال
ہر چند تودہ تودہ تجھے سیم و زر ملے

یارانِ بزمِ دہر میں کیا کیا تپاک تھا
لیکن جب اُٹھ گئے تو نہ بارِ دگر ملے

مردِ نبردِ نفس اگر ہے تو بھاگ مت
جبتک نہ خاک و خون میں دشمن کا سر ملے

جن کو نہیں ہے درد و دوا میں کچھ امتیاز
قسمت سے اِن گنوں کے ہمیں چارہ گر ملے

(۲۴۵)

غیرِ توکّل نہیں چارا مجھے
اپنے ہی دم کا ہے سہارا مجھے

حرص و طمع نے تو ڈبویا ہی تھا
صبر و قناعت نے اُبھارا مجھے

جو وہ کہے اُس کو سزاوار ہے
چون و چرا کا نہیں یارا مجھے

بے ادبوں کی ادب آموزیاں! اُن کے بگڑنے نے سنوارا مجھے
کوششِ بے سود! مشوّش نہ کر قعر نہ بن جائے کنارا مجھے
زشتیٔ پندار دلاتا ہے یاد قصّۂ اسکندر و دارا مجھے
ننگِ مذلّت سے چھڑا لے گیا جوششِ حمیّت کا حرارا مجھے
اوجِ معالی پہ اُڑا لے گیا توسنِ ہمّت کا طرارا مجھے
آہ! نہیں رخصتِ افشائے راز قصّہ تو معلوم ہے سارا مجھے

فرصتِ اوقات ہے بس مغتنم
یہ نہیں ملنے کی دوبارا مجھے

(۲۴۶)

نکلے چلے آتے ہیں تہِ خاک سے کھانے یہ خوانِ کرم کس نے بچھایا ہے؟ خدا نے
جو دل میں ہے مُنہ پھوڑ کے بر رو نہیں کہتے مارا مجھے یاروں کی درست اور بجا نے
غفلت میں ہیں سرمست بدلتے نہیں کروٹ گو سر پہ اُٹھالی ہے زمیں شورِ درا نے
اسراف نے اربابِ تموّل کو ڈبویا عالم کو تفاخر نے تو زاہد کو ریا نے
مرد اُس کو سمجھتے نہ کیا ہو جسے بدمست ایّامِ جوانی کی مے ہوش رُبا نے
بااین ہمہ درماندگی انساں کے یہ دعوے کیا ذاتِ شریف اُن کو بنایا ہے خدا نے

جلوت کا بھروسہ ہے نہ خلوت کی توقّع
سب وہم تھا یاروں نے جو تاکے تھے ٹھکانے

(۲۴۷)

ہو رائگاں جو قطرہ سے قطرہ جُدا چلے مل جُل گئے تو فیض کے دریا بہا چلے

یہ دل کا حوصلہ ہے کہ میدانِ عشق میں
تیرے سمندِ ناز کے پیچھے لگا چلے

ہے آج رُخ ہوا کا موافق تو چل نکل
گُل کی کسے خبر ہے کدھر کی ہَوا چلے

کرتی ہے پست صف شکنوں کے بھی حوصلے
وہ رزم گاہ جس میں کہ تیغِ ادا چلے

قدسی بھی ہیں خموش نہیبِ جلال سے
اُس کوُ میں کیا مجال کہ پیکِ صبا چلے

جی ہی نہ چاہتا ہو تو ملنے سے فائدہ
آئے تو مُنہ بنائے چلے تو خفا چلے

(۲۴۸)

تبلیغِ پیام ہو گئی ہے
حجّت بھی تمام ہو گئی ہے

جب موجِ صبا اُدھر سے آئی
تفریحِ مشام ہو گئی ہے

کتنی بودی ہے طبعِ انسان
عادت کی غلام ہو گئی ہے

خواہش کہ تھی آدمی کو لازم
بڑھکر الزام ہو گئی ہے

تمہیدِ پیام ہی میں اپنی
تقریر تمام ہو گئی ہے

بچنا کہ وبائے صحبتِ بد
اِس دَور میں عام ہو گئی ہے

حلقہ میں قلندروں کے آکر
تحقیق تمام ہو گئی ہے

جرگہ میں لقندروں کے جاکر
حکمت بدنام ہو گئی ہے

شیریں دہنوں کی طرزِ گفتار
مقبولِ انام ہو گئی ہے

بیجا بھی نکل گئی ہے جو بات
تحسینِ کلام ہو گئی ہے

نامرد کے ہاتھ میں پہنچ کر
شمشیرِ نیام ہو گئی ہے

تکفیرِ برادرانِ دیں بھی شرطِ اسلام ہوگئی ہے

کیا شعر کہیں کہ شاعری کی
ٹُرکی ہی تمام ہوگئی ہے

(۲۴۹)

شبِ زندگانی سحر ہوگئی بہر کیف اچھّی بسر ہوگئی
نہ سمجھے کہ شب کیوں سحر ہوگئی اِدھر کی زمیں سب اُدھر ہوگئی
زمانے کی بگڑی کُچھ ایسی ہوا کہ بے غیرتی بھی ہُنر ہوگئی
عمائد نے کی وضع جو اختیار وہی سب کو مدِّنظر ہوگئی
گئے جو نکل دامِ تزویر سے ہزیمت ہی اُن کی ظفر ہوگئی
زمیں منقلب آسماں چرخ زن اقامت بھی ہم کو سفر ہوگئی
مٹا ڈالئے لوحِ دل سے غبار کسی سے خطا بھی اگر ہوگئی
براہِ کرم اس کو طے کیجیٔے جو اَن بن کسی بات پر ہوگئی
نہ کرنا تھا بالضد مداوائے غم بڑی چوک اے چارہ گر ہوگئی

یہ ہنگامہ آرا ہیں سب بے خبر
وہ چُپ ہیں جنھیں کُچھ خبر ہوگئی

(۲۵۰)

میں اگر وہ ہوں جو ہونا چاہیٔے میں ہی میں ہوں پھر مُجھے کیا چاہیٔے
غرقِ خُم ہونا مُیسّر ہو تو بس چاہیٔے ساغر نہ مینا چاہیٔے
منحصر مرنے پہ ہے فتح و شکست کھیل مردانہ ہے کھیلا چاہیٔے

بے تکلّف پھر تو کھیوا پار ہے موج زن قطرہ میں دریا چاہیئے
تیز غیروں پر نہ کر تیغ و تبر آپ اپنے سے تبرّا چاہیئے
ہو دمِ عرضِ تجلّی پاش پاش سینہ مثلِ طورِ سینا چاہیئے
حُسن کی کیا ابتدا کیا انتہا شیفتہ بھی بے سر و پا چاہیئے
پارسا بن! اگر نہیں رندوں میں بار کُچھ تو بے کاری میں کرنا چاہیئے

کُفر ہے ساقی پہ خِسّت کا گُماں
تشنہ سرگرمِ تقاضا چاہیئے

(۲۵۱)

عیش کے جلسے ہجومِ آلام کے شعبدے ہیں گردشِ ایّام کے
ہمّتِ مردانہ تُجھکو آفریں کر کے چھوڑا سر ہوئی جس کام کے
صبح کے بھولے تو آئے شام کو دیکھیئے کب آئیں بھُولے شام کے
تو ہی کر تکلیف او پیکِ صبا! منتظر ہیں وہ مرے پیغام کے
حاشا للہ میکدہ کے کاسہ لیس معتقد ہوں زاہدِ علّام کے
مٹ گئی ہے دِل سے آزادی کی یاد کتنے خوگر ہو گئے ہم دام کے

اَب تو چرچے جا بجا ہونے لگے
واعظوں کی بانگِ بے ہنگام کے

(۲۵۲)

درد سے لبریز سینہ چاہیئے چشمِ پرخوں جائے مینا چاہیئے
ایسے بد افعال پر لاحول پڑھ آدمی کو بغض و کینہ چاہیئے؟

گھُٹ کے مرجانا بھی ہے دوں ہمتی چارو ناچار اور جینا چاہیئے
بحر ہو تو بحرِ طوفاں خیز ہو اور بے لنگر سفینہ چاہیئے
ہے رگِ ہر برگ میں رنگِ بہار
دیکھنے کو چشمِ بینا چاہیئے

(۲۵۳)
مہربانی بھی ہے عتاب بھی ہے کچھ تسلّی کچھ اضطراب بھی ہے
ہے تو اغیار سے خطاب مگر میری ہر بات کا جواب بھی ہے
واں برابر ہے خلوت و جلوت اُس کی بے پردگی حجاب بھی ہے
ہو قناعت تو ہے جہاں دریا حرص غالب ہو تو سُراب بھی ہے
وہ تبختر کہاں؟ تپاک کہاں؟
گرم و روشن تو آفتاب بھی ہے

(۲۵۴)
بنتی نہیں بات گفتگو کی چلتی نہیں چال جستجو کی
تھی چھیڑ اُسی طرف سے ورنہ میں اور مجال آرزو کی
اُس کی طلب اور مقام و منزل
احباب کی ہائے بد سلو کی

(۲۵۵)
واں زیرکی پسند نہ ادراک چاہیئے عجز و نیاز دیدۂ نم ناک چاہیئے
آئینہ بن کہ شاہد و مشہود ایک ہے اُس روئے پاک کو نظر پاک چاہیئے
سیر و سلوکِ جاں نہیں بے جذبۂ نہاں اِس راہ میں تو سنِ چالاک چاہیئے

گزرے اُمید و بیم سے یہ حوصلہ کسے؟ رندِ خراب و عارفِ بے باک چاہیئے
ہر چشمہ آئنہ ہے رُخِ آفتاب کا ہاں سطحِ آب بے خس و خاشاک چاہیئے
نشو و نمائے سبزہ و گُل میں نہیں درنگ ابرِ کرم کو تشنگیِ خاک چاہیئے
اصلاحِ حالِ عاشقِ دل خستہ ہے ضرور معشوق جور پیشہ و سفّاک چاہیئے
جو عینِ نائے نوش ہو اُس بادہ نوش کو جام و سبو نہ خمکدہ و تاک چاہیئے

صیاد کے اثر پہ رواں ہو تو صید ہے
وہ صید ہی نہیں جسے فتراک چاہیئے

متفرقات

دید وا دید کی رخصت ہی سہی میرے حصّہ کی قیامت ہی سہی
مہربانی بھی تو کچھ عیب نہیں دشمنی شرطِ محبّت ہی سہی

نعمتِ خلد تھی بشر کے لئے خاک چاٹی نظر گزر کے لئے

جب غنچہ کو واشد ہوئی تحریکِ صبا سے بلبل سے عجب کیا جو کرے نغمہ سرائی

عجب شورش دلِ غمناک میں ہے مگر در پردہ وہ بھی تاک میں ہے

رباعیات

(۲۵۶) قُرب

مکشوف ہوا کہ دید حیرانی ہے
معلوم ہوا کہ علم نادانی ہے
ڈالا ہے تلاشِ قرب نے دوری میں
مشکل ہے بڑی یہی کہ آسانی ہے

(۲۵۷) بے نشانی

بندہ ہوں تو اک خدا بناؤں اپنا
خالق ہوں تو اِک جہاں دکھاؤں اپنا
ہے بندگی وہم اور خدائی پندار
میں وہ ہوں کہ خود پتا نہ پاؤں اپنا

(۲۵۸) آزادگی

کافر کو ہے بندگی بتوں کی غم خوار
مومن کے لئے بھی ہے خدائے غفّار
سب سہل ہے یہ ولیک ہونا دشوار
آزادہ و بے نیاز و بیکس بے کار

(۲۵۹) تعین

آیا ہوں میں جانبِ عدم ہستی سے
پیدا ہے بلند پائگی پستی سے
عجز اپنا بزور کر رہا ہوں ثابت
مجبور ہوا ہوں میں زبردستی سے

(۲۶۰) عبودیت حجابِ ربوبیت

ڈھونڈا کرے کوئی لاکھ کیا ملتا ہے؟
دن کا کہیں رات کو پتا ملتا ہے؟
جب تک کہ ہے بندگی خدائی کا حجاب
بندہ کو بھلا کہیں خدا ملتا ہے؟

(۲۶۱) مقصودِ حقیقی

جو چاہیئے وہ تو ہے ازل سے موجود حاصل ہے مراد اور مُہیّا مقصود
کیا بات ہے اہتمامِ جہد و طاعات کیا چیز ہے امتیازِ عبد و معبود

(۲۶۲) ذاتِ باری منزّہ ہے

تقریر سے وہ فزوں بیان سے باہر ادراک سے وہ بری گمان سے باہر
اندر باہر ہے وہ نہ پیدا پنہاں سرحدِّ مکان و لامکان سے باہر

(۲۶۳) غیرِ حق نہیں

حق ہے تو کہاں ہے پھر مجالِ باطل حق ہے تو عبث ہے احتمالِ باطل
ناحق نہیں کوئی چیز راہِ حق میں باطل کا خیال۔ ہے خیالِ باطل

(۲۶۴) تصوّف

ساقی وہی میکش وہی مینا بھی وہی گویا وہی شنوا وہی بینا بھی وہی
آدم وہی بندہ وہی مولا بھی وہی ہے بھی وہی تھا بھی وہی ہوگا بھی وہی

(۲۶۵) لاموجود الا اللہ

ساقی و شراب و جام و پیمانہ کیا؟ شمع و گل و عندلیب و پروانہ کیا؟
نیک و بد و خانقاہ و مے خانہ کیا؟ ہے راہِ یگانگی میں بیگانہ کیا؟

(۲۶۶) مظاہر

مجموعۂ خار و گُل ہے زیبِ گلزار نیکی و بدی ہے جلوہ گاہِ اظہار

ہے مخمصہ اختیارِ حق و باطل ہے وسوسہ اعتبارِ یار و اغیار

(۲۶۷) عجز ادراک

ہر خواہش و عرض و التجا سے توبہ ہر فکر سے ذکر سے دُعا سے توبہ
ازبس کہ محال ہے سمجھنا اُس کا جو آئے سمجھ میں اُس خدا سے توبہ

(۲۶۸) اعترافِ عجز

عاجز ہے خیال اور تفکّر حیراں بے سود یقیں ہے اور بیہودہ گماں
کھُلتا نہیں عُقدہ کھولنے سے کوئی بنتی نہیں بات کچھ بنائے سے یہاں

(۲۶۹) ترکِ فضولی

دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا ہرگز ڈھونڈا تو کہیں پتا نہ پایا ہرگز
کھونا۔ پانا۔ ہے سب فضولی اپنی یہ خبط نہ ہو مجھے خدایا ہرگز

(۲۷۰) اختلاف خیالی ہے

دراصل کہاں ہے اختلافِ احوال کچھ رنج نہ راحت نہ مسرّت نہ ملال
قربت ہے نہ بُعد ہے نہ فرقت نہ وصال یہ بھی ہے خیال اور وہ بھی ہے خیال

(۲۷۱) فاعلِ حقیقی حق ہے

شیطان کرتا ہے کب کسی کو گمراہ اِس راز سے ہے خدائے غالب آگاہ
ہے کام کسی کا اور کسی پر الزام لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ

(۲۷۲) ذات کو تغیّر نہیں

پُر شور الست کی ندا ہے اب بھی
جو تھی وہی آن اور ادا ہے اب بھی
ہوتی نہیں سُنتِ الٰہی تبدیل
جس شان میں ہے وہی خدا ہے اب بھی

(۲۷۳) وجود و عدم

کہتے ہیں جو اہلِ عقل ہیں دور اندیش
مخلوق کو ہے عدم کا رستہ درپیش
مخلوق بھلا عدم سے نکلی کب تھی
موجود تو ہے وہی جو کم ہو نے بیش

(۲۷۴) تجلیات حجاب ہیں

اِخفا کے لئے ہے اِس قدر جوش و خروش
یاں ہوش کا مقتضا ہے بننا مدہوش
حُسنِ ازلی تو ہے ازل سے ظاہر
یعنی ہے تجلّیوں میں اپنی روپوش

(۲۷۵) جادۂ توحید

توحید کی راہ میں ہے ویرانہ سخت
آزادی و بے تعلقی ہے یک لخت
دُنیا ہے نہ دین ہے نہ دوزخ نہ بہشت
تکیہ نہ سرائے ہے نہ چشمہ نہ درخت

(۲۷۶) مشاہدہ

اے بارِ خدا یہ شور و غوغا کیا ہے؟
کیا چیز طلب ہے اور تمنّا کیا ہے؟
ہے کم نظری سے اشتیاقِ دیدار
جو کچھ ہے نظر میں یہ تماشا کیا ہے؟

(۲۷۷) کسی خاص کیف کی پابندی غلط ہے

افسردگی اور گرم جوشی بھی غلط
گم گشتگی اور خود فروشی بھی غلط
کچھ کہیے اگر تو گفتگو ہے بے جا
چُپ رہیے اگر تو ہے خموشی بھی غلط

(۲۷۸) شہودِ حق میں غیر معدوم

الحق کہ نہیں ہے غیر ہرگز موجود جب تک کہ ہے وہم غیر-حق ہے مفقود
حق یہ ہے کہ وہم کا بھی ہونا حق ہے حق ہے تو ہر اک طرح سے حق ہے مشہود

(۲۷۹) فقر

کیفیت و ذوق اور ذکر و اوراد دین و اسلام اور کفر و الحاد
ہر رنگ ہے محو۔ ہر تعلّق برباد ہے فقر تمام علّتوں سے آزاد

(۲۸۰) وحدت

نقّاش سے ممکن ہے کہ ہو نقش خلاف ہیں نقش میں جلوہ گر اُسی کے اوصاف
ہر شے میں عیاں ہے آفتابِ وحدت گر وہم دوئی نہ ہو تو ہے مطلع صاف

(۲۸۱) غفلت

اِک عالمِ خواب خلق پر طاری ہے یہ خواب میں کارخانہ سب جاری ہے
یہ خواب نہیں یہی سمجھنا ہے خواب گر خواب کا علم ہے تو بیداری ہے

(۲۸۲) راہِ خدا کی انتہا نہیں

جو تیز قدم تھے وہ گئے دور نکل دیکھے بھالے بہت مقامات و محل
اِس راہ کا پر کہیں نہ پایا انجام یعنی ہے وہی ہنوز روزِ اوّل

(۲۸۳) خود شناسی

اکثر نے ہے آخرت کی کھیتی بوئی اکثر نے ہے عمر جستجو میں کھوئی

آخر کو اگر پتا ملا تو یہ ہی ملا
ملنے کا نہیں سوائے اپنے کوئی

(۲۸۴) مظہر

بدلا نہیں کوئی بھیس ناچاری سے
ہر رنگ ہے اختیارِ سرکاری سے
بندہ شاہد ہے اور طاعت زیور
یہ سانگ بھرا گیا ہے عیّاری سے

(۲۸۵) کثرت لازمِ وحدت ہے

ہے عشق سے حسن کی صفائی ظاہر
رندی سے ہوئی ہے پارسائی ظاہر
وحدت کا ثبوت ہے ظہورِ کثرت
بندہ ہی کے دم سے ہے خدائی ظاہر

(۲۸۶) طلب بے نشانی

یارب کوئی نقشِ مدّعا بھی نہ رہے
اور دل میں خیالِ ماسوا بھی نہ رہے
رہ جائے تو صرف بے نشانی باقی
جو وہم میں ہے سو وہ خدا بھی نہ رہے

(۲۸۷) کیدُ عظیمٌ

بااین ہمہ سادگی ہے پُرکاری بھی
شوخی بھی ہے اس میں عیّاری بھی
چُھپ چُھپ کے ہے تاک جھانک اپنی کرتا
اُس سے کوئی سیکھ جائے مکّاری بھی

(۲۸۸) ہستی واحد ہے

ہم عالمِ خواب میں ہیں یا ہم ہیں خواب
ہم خود سائل ہیں خود سوال اور جواب
آئی نہیں کوئی شے کہیں باہر سے
ہم خود ہیں مسبّب اور خود ہیں اسباب

نام و نشان

کہتے ہیں سبھی مُدام اللہ اللہ
کرتے ہیں برائے نام اللہ اللہ
یہ نام و نشان بھی نقابِ رُخ ہیں
کیا خوب ہے انتظام اللہ اللہ

(۲۹۰) ہر شان میں حق متجلّی ہے

ہے شُکر درست اور شکایت زیبا
ہے کفر درست اور ہدایت زیبا
گیسوئے سیاہ اور جبینِ روشن
دونوں کی بہار ہے نہایت زیبا

(۲۹۱) تنزیہہ

مقصود ہے قیدِ جستجو سے باہر
وہ گُل ہے دلیلِ رنگ و بو سے باہر
اندر باہر کا سب تعیّن ہے غلط
مطلب ہے کلام و گفتگو سے باہر

(۲۹۲) علم حجاب الاکبر ہے

معلوم کا نام ہے نشاں ہے نہ اثر
گنجایشِ علم ہے بیاں ہے نہ خبر
علم اور معلوم میں دوئی کی بو ہے
اِس واسطے علم ہے حجاب الاکبر

(۲۹۳) ترکِ ذکر و فکر

ہوتی نہیں فکر سے کوئی افزایش
چُپکے رہنے میں ہے بڑی آسایش
کہنا سُننا تو ہے نہایت آساں
کہنے سُننے کی ہو اگر گنجایش

(۲۹۴) ترکِ خودی

بُرہان و دلیل عین گمراہی ہے
نفی و اثبات محض جاں کاہی ہے
اِس رہ میں عبارت و اشارت ہے گُم
یاں ترکِ خودی اُصولِ آگاہی ہے

(۲۹۵) نقش برآب

انکار نہ اقرار نہ تصدیق نہ ایجاب
اعمال نہ افعال نہ سنّت نہ کتاب
خود ہے نہ خدا ہے نہ خودی ہے نہ خدائی
توحید کے دریا میں ہیں سب نقش برآب

(۲۹۶) توحید

چکّھی بھی ہے تو نے دُردِ جامِ توحید
یا سُن ہی لیا ہے صرف نامِ توحید
ہے کفرِ حقیقی کا نتیجہ ایماں
ترکِ توحید ہے مقامِ توحید

(۲۹۷) ذاتِ واحد

خاکِ نمناک اور تابندہ نجوم
ہیں ایک ہی قانون کے یکسر محکوم
یکسانیِ قانون کہے دیتی ہے
لاریب کہ ہے ایک ہی ربِّ قیّوم

(۲۹۸) طلب

گر جور و جفا کرے تو انعام سمجھ
جس کام سے وہ خوش ہو اُسے کام سمجھ
گر کفر کی راہ سے رسائی ہو وہاں
اُس کُفر کو تو جانِ اِسلام سمجھ

(۲۹۹) ذاتِ الٰہی تغیّر سے بَری ہے

جب گوئے زمیں نے اُس پہ ڈالا سایہ
تو ماہِ شبِ چار دَہُم گہنایا
اللہ کی ذات ہے تغیّر سے بَری
شمس اور قمر کا ہے فروتر پایا

(۳۰۰) خدا پر سب کا بھروسہ ہے

اے بارِ خدا کہ عالم آرا تو ہے
دانائے نہان و آشکارا تو ہے

ہر شخص کو ہے تیرے کرم کی اُمید
ہر قوم کا آسرا سہارا تو ہے

(۳۰۱) تحقیقِ حق

واحد مُتکلّم کا ہو جو مُنکر
وہ صَرف کی اصطلاح میں ہے کافر
کی ہے تحقیق صَرفیانِ حق نے
حاضر غائب ہے اور غائب حاضر

(۳۰۲) فنا عین وصال ہے

کس طور سے کس طرح سے کیونکر پایا
دل نذر کیا سُراغِ دلبر پایا
باقی رہا مدّعا نہ دعویٰ نہ دلیل
کھوئے گئے آپ ہی تو سب بھر پایا

(۳۰۳) خلقت نورِ محمدؐ باعثِ تخلیق کائنات ہے

احمد کا مقام ہے مقامِ محمود
ہے مرجعِ حمد اور شایانِ دُرود
لَولاکَ لَما خلقتُ الافلاک ہے ہیچ
شاہد ہے محمّدؐ اور عالم مشہود

(۳۰۴) انسان مظہرِ الٰہی ہے

کرتا ہوں سدا میں اپنی شانیں تبدیل
طوفان میں تھا نوح تو آتش میں خلیل
فی الحال ہوں ظاہر میں اگر اسمٰعیل
ہوں عالمِ باطن میں وہی ربِّ جلیل

(۳۰۵) مقصود عالم انسان ہے

یہ مسئلہ دقیق سُنئے ہم سے
آدم ہے مرادِ ہستیِ عالم سے
ہم اصل ہیں اور یہ ہمارا سایہ
عالم کا وجود ہے ہمارے دم سے

(۳۰۶) روح پابندِ تعین ہے

گر رُوح نہ پابندِ تعیُّن ہوتی
یوں دردِ فراق سے نہ ہر دم روتی
جب تک کہ ہے درمیاں صدف کا پردہ
دریا میں بھی دریا سے جُدا ہے موتی

(۳۰۷) نفسِ دنی سے بچو

دُنیا کا نہ کھا فریب ویران ہے یہ
راحت سے نہ دل لگا کہ مہماں ہے یہ
بچ نفسِ دَنی سے ہے بڑا ہی کافر
کر روح کی پرورش مُسلماں ہے یہ

(۳۰۸) مردِ خُدا کی صحبت بڑی نعمت ہے

دُنیا کو نہ تو قبلۂ حاجات سمجھ
جُز ذکرِ خُدا سب کو خُرافات سمجھ
اِک لمحہ کسی مردِ خدا کی صحبت
آجائے مُیسّر تو بڑی بات سمجھ

(۳۰۹) نیچر انسان کی محکوم ہے

فطرت کے مطابق اگر انساں لے کام
حیوان تو حیوان۔ جمادات ہوں رام
مٹّی۔ پانی۔ ہوا۔ حرارت۔ بجلی
دانشمندوں کے ہیں مطیعِ احکام

(۳۱۰) ہمّت

تاریک ہے رات اور دریا زخّار
طوفان بپا ہے اور کشتی بے کار
گھبرائیو مت کہ ہے مددگار خدا
ہمّت ہے تو جا لگا و کھیوا اُس پار

(۳۱۱) مشکلات جُرأت کی محرک ہوتی ہیں

جس درجہ ہو مشکلات کی طغیانی
ہو اہلِ ہمم کو اور بھی آسانی
تیراک اپنا ہنر دکھاتا ہے خوب
ہوتا ہے جب اُس کے سر سے اونچا پانی

(۳۱۲) جہد طلب

انسان کو چاہیئے نہ ہمّت ہارے
میدانِ طلب میں ہاتھ بڑھ کر مارے
جو علم و ہنر میں لے گئے ہیں بازی
ہر کام میں ہیں اُنھیں کے وارے نیارے

(۳۱۳) استقلال

تیزی نہیں منجملۂ اوصافِ کمال
کچھ عیب نہیں اگر چلو دھیمی چال
خرگوش سے لے گیا ہے کچھوا بازی
ہاں راہِ طلب میں شرط ہے استقلال

(۳۱۴) دین و دُنیا

دین اور دُنیا کا تفرقہ ہے مہمل
نیّت ہی پہ موقوف ہے تنقیحِ عمل
دنیا داری بھی عین دیں داری ہے
مرکوز ہو گر رضائے حق عزّ و جل

(۳۱۵) حُبِّ دنیا نشانِ خامی ہے

یہ قول کسی بزرگ کا سچّا ہے
ڈالی سے جُدا نہ ہو تو پھل کچّا ہے
چھوڑی نہیں جس نے حُبِّ دنیا دل سے
گو ریش سفید ہو مگر بچّا ہے

(۳۱۶) اسلاف پر فخر بیجا

اَسلاف کا حصّہ تھا اگر نام و نمود
پڑھتے پھرو اب اُن کے مزاروں پہ درود
کچُھ ہاتھ میں نقدِ رائج الوقت بھی ہے
یا اِتنی ہی پونجی "پدرم سلطاں بود"

(۳۱۷) بدنام کنندۂ نکونامے چند

جو صاحبِ مکرمت تھے اور دانش مند
وہ لوگ تو ہو گئے زمیں کے پیوند

پوچھو نہ اُنھیں جو رہ گئے ہیں باقی
بدنام کنندۂ نکو نامے چند

(۳۱۸) دُنیا پرست دیندار

دُنیا کے لئے ہیں سب ہمارے دھندے
ظاہر طاہر ہیں اور باطن گندے
ہیں صرف زبان سے خُدا کے قائل
دِل کی پوچھو تو خواہشوں کے بندے

(۳۱۹) جھوٹی نفرت

لاکھوں چیزیں بنا کے بھیجیں انگریز
سب کرتے ہیں دندانِ ہوس اُن پر تیز
چڑتے ہیں مگر علومِ انگریزی سے
گُڑ کھاتے ہیں اور گُلگُلوں سے پرہیز

(۳۲۰) ہر کام کا نتیجہ اپنے لئے ہے

گر نیک دلی سے کچُھ بھلائی کی ہے
یا بدمنشی سے کچُھ بُرائی کی ہے
اپنے ہی لئے ہے سب نہ اوروں کے لئے
اپنے ہاتھوں نے جو کمائی کی ہے

(۳۲۱) وقت رائیگاں نہیں کرنا چاہیئے

بے کار نہ وقت کو گزارو یارو
یوں سُست پڑے پڑے نہ ہمّت ہارو
برسات کی فصل میں ہے ورزش لازم
کچُھ بھی نہ کرو تو مکھّیاں ہی مارو

(۳۲۲) اتّفاق میں کامیابی ہے اور نااتّفاقی میں تباہی

جب تک کہ سبق ملاپ کا یاد رہا
بستی میں ہر ایک شخص دلشاد رہا
جب رشک و حسد نے پھوٹ اُن میں ڈالی
دونوں میں سے ایک بھی نہ آباد رہا

(۳۲۳) اسراف باعثِ بربادی ہے

اسراف سے احتراز اگر فرماتے کیوں گردشِ ایّام کی سیلی کھاتے
انگشت نُما تھی کج کُلاہی جن کی وہ پھرتے ہیں آج جوتیاں چٹخاتے

(۳۲۴) مراسم میں فضولی

اب قوم کی جو رسم ہے سو اوّل جلول فاسد ہوئے قاعدے تو بگڑے معمول
ہے عید مہذب۔ نہ محرم معقول ہنسنا محمود ہے نہ رونا مقبول

(۳۲۵) اصلاحِ قوم دشوار ہے

پانی میں ہے آگ کا لگانا دشوار بہتے دریا کو پھیر لانا دشوار
دشوار سہی، مگر نہ اِتنا جتنا بگڑی ہوئی قوم کو بنانا دشوار

(۳۲۶) مسلمانوں کی تعلیم

قلّاش ہے قوم تو پڑھے گی کیوں کر پس ماندہ ہے اب تو پھر بڑھے گی کیوں کر
بچّوں کے لئے نہیں ہے اِسکول کی فیس یہ بیل کھو منڈھے چڑھے گی کیوں کر

(۳۲۷) جھوٹ بولنے والے کا اعتبار جاتا رہتا ہے

کاٹھ کی ہنڈیا چڑھی کب بار بار کھو دیا جھوٹے نے اپنا اعتبار
بات جھوٹی جو زباں پر لائے گا سچ بھی اُس کا جھوٹ سمجھا جائیگا

(۳۲۸) اپنا عیب نظر نہیں آتا

احول سے کہا کسی نے اے نیک شعار تو ایک کو دو دیکھ رہا ہے ناچار
بولا کہ اگر عیب یہ ہوتا مجھ میں دو چاند جو ہیں۔ صاف نظر آتے چار

(۳۲۹) غیروں سے زیادہ اپنے تکلیف پہونچاتے ہیں

اپنے ہی دِل اپنوں کا دُکھاتے ہیں بہت
ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں بناتے ہیں بہت
ہر چند کہ ہیں دانت نہایت ہمدرد
لیکن جب ہِل گئے ستاتے ہیں بہت

(۳۳۰) حاصِلِ کتاب تحصیلِ علم ہے

چوپائے کی طرح تو کتابوں سے نہ لد
حاصل ہے کتاب کا فقط علم و خرد
کیڑوں نے ہزارہا کتابیں کھالیں
پائی نہ مگر کبھی فضیلت کی سند

(۳۳۱) خوابِ غفلت سے ہوشیار ہو

اے بے خبری کی نیند سونے والو
راحت طلبی میں وقت کھونے والو
کچھ اپنے بچاؤ کی بھی سوچی تدبیر
اے ڈوبتی ناؤ کے ڈبونے والو

(۳۳۲) تعلیمِ قومی

عید قرباں ہے آج اے اہلِ ہِمم
ایسی عیدیں ہزار دیکھو پیہم
قومی تعلیم کہہ رہی ہے بہ ادب
صاحب کچھ اِدھر بھی گوشۂ چشمِ کرم

(۳۳۴) ادائے تہنیت

عیدِ رمضاں ہے آج با عیش و سرور
ہم کو بھی ادائے تہنیت ہے منظور
اِس عیدِ سعید کی خوشی میں حضرت
قومی بچّوں کو یاد رکھئے گا ضرور

(۳۳۵) منتہائے زوال

تھا رنگِ بہار بے نوائی کہ نہ تھا
ظاہر تھا زوال انتہائی کہ نہ تھا

کہہ دو ایمان سے عیدگہ کے اندر گردش میں تھا کاسۂ گدائی کہ نہ تھا

(۳۳۵) خدا کا نیلام

کیا کہتے ہیں اس میں مفتیانِ اسلام؟ جب بیعِ مساجد سے نہیں چلتا کام
تو وجہِ کفاف کے لئے مومن کو جائز بھی ہے یا نہیں خدا کا نیلام؟

(۳۳۶) تقریظ

حقّا کہ بلند ہے مقامِ اکبر توقیعِ سخن ہے اب بنامِ اکبر
دیواں ہے لطائف و حکم سے معمور اکبر[1] کا کلام ہے کلامِ اکبر

---

[1] جناب خان بہادر سیّد اکبر حسین اکبرآبادی کے کلام پر تقریظ ہے۔

(۱۳) نظم بے قافیہ

(۳۳۷) تاروں بھری رات

ارے چھوٹے چھوٹے تارو　　کہ چمک دمک رہے ہو
تمھیں دیکھ کر نہ ہووے　　مجھے کس طرح تحیّر
کہ تم اونچے آسماں پر　　جو ہے کُل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے　　کہ کسی نے جڑ دئے ہیں
گہر اور لعل گویا

جو ہیں آفتاب تاباں　　نے چھپایا اپنا چہرہ
وہیں جلوہ گر ہوئے تم　　یہ تمھاری جگمگاہٹ
ہے مسافروں کے حق میں　　بڑی نعمت اور راحت
اگر اتنی روشنی بھی　　نہ میسّر آتی اُن کو
تو غریب جنگلوں میں　　یونہیں بھولتے بھٹکتے
نہ تمیز راس وچپ کی　　نہ طرف کی ہوتی اٹکل
نہ نشانِ راہ پاتے

وہ غریب کھیت والے　　وہ اُمّید وار دہقاں
کہ کھڑی ہے جن کی کھیتی　　کہیں کھیت کٹ رہا ہے

کہیں گھر رہا ہے جنّ ومن — نہیں آنکھ اُن کی جھپکی
یونہیں شام سے سحر تک — ہیں تمام رات جاگے
نہ گھڑی ہے واں نہ گھنٹہ — نہ شمار وقت و ساعت
مگر اے چمکنے والو — ہو تمھیں اُنھیں سُجھاتے
کہ گئی ہے رات اِتنی

وہ جہاز جن کے آگے — ہے وسیع بحرِ اعظم
اُنھیں ہولناک موجوں — سے مقابلہ ہے کرنا
کوئی ہے چلا وطن سے — کوئی آرہا ہے واپس
اُنھیں کچھ خبر نہیں ہے — کہ کدھر ہے اُن کی منزل
نہ تو مرحلہ نہ چوکی — نہ سُراغ راہ کا ہے
نہ کوئی دلیل و رہبر — مگر اے فلک کے تارو
تمھیں اُن کے رہنما ہو

(۳۳۸) چڑیا کے بچّے

دو تین چھوٹے بچّے چڑیا کے گھونسلے میں — چُپ چاپ لگ رہے ہیں سینہ سے اپنی ماں کے
چڑیا نے مامتا سے پھیلا کے دونو بازو — اپنے پروں کے اندر بچّوں کو ڈھک لیا ہے
اِس طرح روزمرّہ کرتی ہے ماں حفاظت — سردی سے اور ہوا سے رکھتی ہے گرم اُن کو
لیکن چڑا گیا ہے چُگّا تلاش کرنے — دانہ کہیں کہیں سے چونٹے میں اپنے بھر کر

جب لائے گا۔ تو بچّے مُنہ کھول دیں گے جھٹ پٹ
اُن کو بھرائے گا وہ۔ ماں اور باپ دونوں

بچّوں کی پرورش میں مصروف ہیں برابر
اور چھوٹے بچّے خوش ہیں تکلیف کچھ نہیں ہے

اے چھوٹے چھوٹے بچّو۔ تم اونچے گھونسلے سے
ہرگز نہیں گروگے۔ پَر اور پُرزے اب تک

نکلے نہیں تمہارے اِس واسطے ابھی تم
اُونچے نہ اُڑ سکو گے۔ ہاں جب تمہارے بازو

اور پَر دُرست ہونگے تو دن کی روشنی میں
سیکھو گے تم بھی اُڑنا۔ کرتے پھروگے چیں چیں

اُڑتے پھروگے پھُر پھُر اے چھوٹے بچّو لیکن
کوّا بُری بلا ہے اُس سے خدا بچائے

(۱۴) متفرّقات

(۳۳۹) نیند

اب نیند کا خُمار سمایا ہے آنکھ میں
عالم کچُھ اور ہی نظر آیا ہے آنکھ میں
آرام کا ہے وقت نہ کھٹکا کرے کوئی
محنت کے بعد سوئے نہ تو کیا کرے کوئی
سونے کے وقت سونا عبادت سے کم نہیں
بے کار ہوش ہو گئے اور گُم حواس ہیں
اُن کی بھی کچُھ خبر نہیں جو آس پاس ہیں
اب مہر و ماہ ہیں نہ زمیں ہے نہ آسماں
دن ہے نہ رات ہے نہ وطن ہے نہ یہ مکاں
اے نیند تو نے سب کو ٹھکانے لگا دیا
دُنیا کے کارخانہ کو دل سے بھُلا دیا
راحت عجیب بخشی ہے تو نے ہر ایک کو
سلطاں کو بارگاہ میں دہقاں کو کھیت میں
مفلس کو جھونپڑے میں مسافر کو ریت میں
بچّہ کو ماں کی گود میں قیدی کو جیل میں
چڑیا کو گھونسلہ میں کھلاڑی کو کھیل میں

(۱۵) ابیات

(۳۴۰) اچھّی بات

جو بات کہو صاف ہو۔ ستھری ہو بھلی ہو
کڑوی نہ ہو کھٹّی نہ ہو۔ مصری کی ڈلی ہو

(۳۴۱) وقت سے کام لو

وقت میں تنگی فراخی دونوں ہیں جیسے ربڑ
کھینچنے سے بڑھتی ہے چھوڑے سے جاتی ہے سکڑ

(۳۴۲) بُری صحبت سے بچو

بد کی صحبت میں مت بیٹھو اِس کا ہے انجام بُرا
بد نہ بنے تو بد کہلائے بد اچھّا بدنام بُرا

(۳۴۳) خیالِ محال

کیا کیا خیال باندھے ناداں نے اپنے دل میں
پر اونٹ کی سمائی کب ہو چوہے کے بِل میں

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیّت
(۳۴۴) نہیں کام آتی دلیل اور حجّت

(۳۴۵) اعتدالِ خیال

نہ حلوا بن کہ چٹ کر جائیں بھوکے
نہ کڑوا بن۔ کہ جو چکھے سو تھوکے

(۳۴۶) اعتدالِ غذا

نہ کھاؤ اتنا زیادہ کہ ڈال دے بیمار
نہ اتنا کم ہو کہ ناطاقتی ہی ڈالے مار

(۳۴۷) راستی

راستی سیدھی سڑک ہے جس میں کچھ کھٹکا نہیں
کوئی رہرو آج تک اِس راہ میں بھٹکا نہیں

(۳۴۸)

گلستانِ جہاں میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی
مگر جو گُل کے جویا ہیں اُنھیں کیا خار کا کھٹکا

(۳۴۹) اپنی حفاظت

جب کہ دو موذیوں میں ہو کھٹ پٹ اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

(۳۵۰)

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانہ کی خاک

(۳۵۱)

تُم نہ چوکو کبھی نکوئی سے کرنے دو گر خطا کرے کوئی

(۳۵۲)

ہر چند اُس کے مال سے کچھ واسطہ نہ ہو پھر بھی بُرا ہی کہتی ہے خلقت بخیل کو

(۳۵۳)

ساغرِ زرّیں ہو یا مٹّی کا ہو اِک ٹھیکرا تو نظر کر اُس پہ جو کچھ اُس کے اندر ہے بھرا

(۳۵۴)

خبر لو وقت کی اپنے خبر لو اُڑا جاتا ہے جو کرنا ہے کر لو

(۳۵۵)

کہوں میں رازِ دل کس سے نہیں دردآشنا کوئی
مگر مل جائے میخانے میں کافر ماجرا کوئی

منظومات فارسی

مثنویات

(۱) دورِ آخر[۱]

اے نسیمِ صبحِ ایّامِ بہار — در حریمِ کعبۂ جاں کن گزار
روئے خود بر خاکِ پانی پت بسائے — شمّۂ احوالِ آنجا بر گشائے
فصلے از غوغائے محشر کن بیاں — کوسِ رحلت کوفت آں شاہِ شہاں
غوثِ ما را وقتِ رحلت در رسید — رفت در غیب آں شہنشاہِ رشید
شاہبازِ قُدس پرّید از چمن — شد نوردیدہ بساطِ انجمن
باز گو از زائرانِ کوئے او — باز گو از بیدلانِ روئے او
باز گو رمزے ازاں دریاے راز — موجۂ دریا بدریا رفت باز
کُن حدیثِ بحرِ ناپیدا کنار — باز گو زاں موجہائے نور بار
باز گو از بزمِ آں شاہِ وحید — شہ سوارِ فردو سلطانِ مجید

نوٹ [۱] وقتیکہ استماعِ حادثۂ ہائلۂ رحلت فرمودن جناب و قبلہ مرشدنا و مولانا سیّد غوث علی شاہ پانی پتی کہ بروز دوشنبہ بست و ششم شہر ربیع الاولی ۱۲۹۷ھ ہجری مطابق ششم ماہ مارچ ۱۸۸۰ء بوقوع پیوستہ سامعہ سوزِ یارانِ طریقت گردید خاصہ منشی نجم الدین دہلوی (رحمۃ اللہ تعالیٰ) را دامنِ شکیب از دست رفتہ بود و دل بگرداب اضطراب افتادہ و جوے اشک از چشمہاے چشم کشادہ باین خاکسار ایماے رفت تا بیتے چند باندازِ مثنوی رنگ تسوید پذیرفتہ دراں ایّام خواندن و شنیدنِ آن موجبِ مشغولی طبایع محزون و دلہائے پرخون شد۔ (اسمٰعیل)

ای تو خوانِ غیب را خوش میزباں ای تو خضرِ راہِ ما گم گشتگاں
اے جہانِ معرفت را آفتاب از رخِ روشن بر افگندی نقاب
در نگر آوارگانِ خویش را چارہ کن بیچارگانِ خویش را
گوشۂ چشمے بمہجوراں بکن یک نگہ بر حالتِ دوراں بکن
بشنو! اے سلطانِ ایوانِ بلند مرد و زن ہا آہ و زاری می کنند
ہے! چہ گفتم از غم و بگریستن ہست و ہم این مردن و این زیستن
تو بری از اقتران و افتراق از خیالات است این ہجر و فراق
وہم ہستی شد مجالِ اشتیاق ہیچ باشد ماتمِ درد و فراق
بلبل و گل ہیچ و بستاں نیز ہم ذوق و شوق و علم و عرفاں نیز ہم
جذر و مدِّ بحر و ہم موج و حباب گر بسنجی جملہ یک آب ست آب
وسوسہ بگذار بحر و موج کو بے نشانی را حضیض و اوج کو
موج خواند قصّۂ ہجر و وصال بحر مستغنی ست از نقص و کمال
بحر اگر ساکن بود امواج لاست بے تموّج بحر را شرحے کجاست
جوششے زد بحر و موج آمد پدید شد نمایاں آں قدیم اندر جدید
جوش و بحر و موج می خوانیش نام ورنہ یک ہستی است بیروں از کلام
نیست مردانِ خدا را ہیچ بند برتر ست از جسم و جاں بیچون و چند
مردگاں را خوف مردن درخورست زندگاں را مرگِ تن جاں پرورست

زندہ را ممتنع باشد ممات　　مردہ را خود روا نبود حیات
این حیات و این ممات از شرک ہست　　وحدتِ مطلق بود در خویش مست
آنکہ او زندہ است حی و قائم است　　لایموت و لایزال و دائم ست
دائم ست و قائم ست و زندہ است　　لایزال و لم یزل پائندہ است
زندگی بے نہایت بے زوال　　برتر آمد از تگاپوے خیال
خود تو بودی خود تو باشی تا دوام　　اے بروں از گفتگوہا و کلام
تو دُرِ دریائے وحدت بودۂ　　ہم چناں کہ بودۂ آسودۂ
جانِ تو جانِ جانِ زندگی ست　　از تو خرّم بوستانِ زندگی ست
سالہا گردیدۂ در بحر و بر　　ہم تو خود مقصود بودی از سفر
سالہا ارشاد را بُردی بکار　　ہم تو خود صیّاد بودی خود شکار
از برونِ در بگفتی ما و من　　وز دروں خود گوش بودی خود سخن
از حقایق و ز معارف و ز یقین　　نغز تر گفتی بوقتِ واپسین

"چیست توحید آنکہ از غیرِ خدا
فرد آئی در خلا و در ملا"

بحرِ توحیدِ الٰہی خود توئی　　بے تعیّن بے تشخّص بے دوئی
مستیٔ صہبائے تو چوں جوش زد　　کے شود شورِ من و تو گوش زد
بیخودی بزمِ خودی آراستہ است　　نعرہ ہا از خاموشی برخاستہ است

اے ندیمِ الشمس نجم الدیں بیا　　نعرۂ دیگر بزن لب بر کشا

نعرۂ دیگر بزن اے انجمِ دیں　　ہائے و ہوئے تست معنی آفریں

دیدہ چوں بر دیدِ تو شیدا شود　　در درونِ بحر رہ پیدا شود

کاروانِ بحر در شب ہائے تار　　بر کفت بنہد زمامِ اختیار

باز بنشیں در خراباتِ سخن　　معنی اندر شیشۂ الفاظ کُن

باز گو حرفے ز سلطانِ جلیل　　تا نہ گردد قصّۂ ہجراں طویل

اے درخشاں کوکبِ نورِ قدیم　　از کجا جوئیم انفاسِ کریم

از کجا جوئیم آں شام و سحر　　چوں فتد در حضرتِ پاکت گذر

از کجا جوئیم گلبانگِ سرور　　از کجا یابیم آں انسِ حضور

از کجا جوئیم قربِ اختصاص　　اے درِ تو قبلہ گاہِ عام و خاص

از کجا جوئیم آں خوش حالہا　　کز دلِ پاکت بروں زد سالہا

پرتوِ حالِ خوشت چوں سر زند　　مرغِ اندوہ و الم کے پر زند

پرتوِ حالِ خوشت چوں کوہسار　　ہست در عرصاتِ جاں بر یک قرار

حسرت و اندوہ زائد از خیال　　نے بہ بیشِ پرتوِ خورشیدِ حال

پرتوِ حالِ تو پاک از بیش و کم　　تاخت بیروں از وجود و از عدم

پرتوِ حالِ تو پاک از نیک و بد　　بر زدہ نقشِ ازل را بر ابد

پرتوِ حالِ تو پاک ست از عمل　　اُستوار و پائدار و بے خلل

پرتوِ حالِ تو پاک از فہمِ عام ہست لاشرقی و لاغربی مدام
پرتوِ حالِ تو اے سلطانِ حال ہست بالاتر ز پروازِ خیال
ذاتِ تو پاک ست از حال و مقام شہپرِ عنقائے تو بشکست دام
کشفِ ہر حالے ز تو یابد کشود ہر مقامے از تو می گیرد وجود
نقدِ حالِ تست ذاتِ پاکِ تو ذاتِ پاکِ تست در ادراکِ تو
در میانِ گردشِ لیل و نہار ہم چو تو کم دیدہ باشد روزگار
خضرِ ربّانی و فردِ کاملے عارفِ بے باک و مردِ کاملے
پاک و بے باک و مجرّد از علل شاہبازِ اوجِ افلاکِ ازل
زندۂ جاوید و پاک از جسم و جاں شہ سوارِ عرصہ ہائے بے نشاں
بے نشانی را شناسا ور توئی ہم شناسا و شناسا گر توئی
بے نشانی را نشاں آمد ز تو بحر و کاں گوہر فشاں آمد ز تو
لا و الّا ہر دو پیشت چیست لا ما و تو گم گشت باقی کیست لا
ہر چہ می گوئیم قولِ ماست ایں گفت گو ہا محو شد دریاست ایں
محو را ہم محو کن اے چارہ ساز ہست فرق از بے نیازی تا نیاز
نیست جائے گفت و تشبیہ و مثال لیس شیئٌ مثلہٗ کم کن خیال
گر بگویم ور نہ گویم شانِ تست ہم خیال و بے خیالی آنِ تست
اے بری از مرگ و ہم از زندگی نے خدائی زیبدت نے بندگی

ہم خدائے بندگانی اے خدا ‏ بندہ ہستی یا خدا یا خود جدا

خود جدائی خود تو وصلی خود توئی ‏ اے منزّہ از یکی و از دوئی

اے بری از حدِّ اعداد و شمار ‏ با وجودت نیست کس را اعتبار

با وجودت نیست چیزے معتبر ‏ عقل تیرہ گشت و خیرہ شد نظر

ہم چو کافر بادم بت خانۂ ‏ تا ز تو گویم بتو افسانۂ

خویش را ثابت کنم تا خوانمت ‏ سر بنا دانی دہم تا دانمت

بت تراشم گر ترا یاد آورم ‏ آذرم من گر ترا طاعت برم

کافرم من گر ترا آرم سجود ‏ من چہ باشم تا نہم خود را وجود

دامن از گردِ حدوث افشاندۂ ‏ در جہانِ غیب مرکب راندۂ

کشورِ تن را فرو بگذاشتی ‏ آئینہ از پیشِ ما برداشتی

گفتگوہا از پسِ آئینہ بود ‏ گفتگو را غیر ازیں آئیں نہ بود

گفتگو برجاست ناگردیدہ فوت ‏ لیک بیروں از لباسِ حرف و صوت

پردۂ صورت ز رو انداختی ‏ معنیٔ معنی نمایاں ساختی

جانِ جاں بودی و جانِ جاں شدی ‏ ہر چہ بودی ہر چہ ہستی آں شدی

بر شکستی ساغر و مینائے ما ‏ اے غنی الطبع بے پروائے ما

بزمِ اُنسِ بیدلاں برہم زدی ‏ پشتِ پا بر ہستیٔ عالم زدی

بزمِ اُنسِ بیدلاں دادی بباد ‏ اے ز رویت انجمن خالی مباد

اے ز تو خالی مبادا جائے تو   منظرِ حق روئے جاں افزائے تو

اے دریغا کاروانِ شہرِ جاں   رخت بربست و بزد طبلِ گراں

اے دریغا روزگارِ وصل شد   جلوہ کرد و بہارِ وصل شد

اے امیر الشرق نجم الدّین بیا   نعرہ میزن شور مے کن بے ندا

مشرقِ جان و دلِ ویرانِ ماست   بے سر و سامانیت سامانِ ماست

نعرۂ تو دل بجنباند ہمے   شورِ تو جانہا بشوراند ہمے

ہمّتِ والا بما ہمراہ کن   رو بسوئے بارگاہِ شاہ کن

شاہِ ما پاکست از مرگ و ہلاک   گر فنا گردد دو عالم نیست باک

زندگی و مرگ نبود جز فریب   نیست کس را سود و سرمایہ بجیب

ہر کہ دارد مایۂ بے مایہ اوست   وانکہ اندر فقر شد بے سایہ اوست

ہر کہ جاں داری کند بے جاں ترست   وانکہ ساماں یافت بے ساماں ترست

سود و سرمایہ خیالے بیش نیست   مایۂ درویش جز درویش نیست

نقدِ درویشاں تہیدستی بود   دستمزدِ شاں ہمیں مستی بود

چیست گنجِ خوش دلی کیسہ تہی   اصلِ دانش ہا بود نا آگہی

ہستیٔ مطلق سراسر نیستی ست   اصلِ ہستی نیستی در نیستی ست

زندگی را ترکِ جاں بخشد وجود   خود توئی گر بے خودی گیرد نمود

بیخودی و باخودی ہم ناروا ست   بے نشانی حضرتِ سلطانِ ماست

حضرتِ سلطاں نگردد بیش و کم — نے مثالش نے وجودش نے عدم
حضرتِ سلطاں ندارد ما سوا — راست برجائے خود است ایں ماجرا
حضرتِ سلطاں بسویش بار نیست — سالکانش را سر و دستار نیست
حضرتِ سلطاں نمی گنجد بگفت — در سخن کس دُرِّ ایں معنی نسفت
من ندانم حضرتِ سلطاں کجاست — دل کجا و تن کجا و جاں کجاست
حضرتِ سلطاں ندارد بوے غیر — ہست خود بر گردِ خود در دور و سیر
حضرتِ سلطاں چہ باشد لب بہ بند — قاصر آمد نردبانہا و کمند
ہوش را بفروش و حیرت دام کُن — قطرۂ از بےخودی در جام کُن
با کہ گویم کُن تو خود کن یا مکن — اعتبارِ قطرہ در دریا مکن
قطرہ گشتی و سوے دریا شدی — راہ بنمودی و رہ پیما شدی
قطرگی گم گشت دریا موج زد — وہمِ پستی محو شد بر اوج زد
وہم را بشکن کہ برخیزد دوئی — تا توئی گردے برانگیزد دوئی
از دو بینی ہست ایں مرگ و ہلاک — حضرتِ سلطانِ ما پاک است پاک
پاک را کے مرگ آید در خیال — زندہ را مُردن بود امرِ محال
وصلِ او دائم بود با زندگی — ذاتِ او را زندۂ گویا زندگی
زندۂ را حلقۂ ماتم چرا است — از پےِ گنجِ مسرّت غم چرا است
زندۂ در زندگی بےپردہ شد — مردگاں را دل چرا آزردہ شد

زنده را بزمِ طرب آراستند | مردگاں بہرِ عزا برخاستند
زنده گرد از دامنِ جاں برفشاند | مردگاں را صبر و آرامش نماند
مرده آں باشد که وہمش زندگی ست | پیشِ وہمِ خویش اندر بندگی ست
مرده پندارد که ما خود زنده ایم | زندگی را لائق و ارزنده ایم
زنده آں باشد که از ہستی برست | نیست اندر نیست اندر نیست ست
زنده آں باشد که مردن جانِ اوست | خانه ویراں ساختن سامانِ اوست
زنده آں باشد که بالِ جاں کشاد | نیست گشت و محو گشت و نامراد
زنده آں باشد که پیش از مرگ مرد | مرده گشت و تن به بحرِ جاں سپرد
مرگِ او جاں داد و جانش زنده شد | در جہانِ خوشدلی تا زنده شد
او ز وہمِ زندگی آگاه نیست | مرگ را ہم سوے ذاتش راه نیست
شمسِ ربّانی توئی اے انجمِ دیں | برفرازِ منبرِ جاں برنشیں
ہاں بیا و نعرۂ دیگر بزن | خامشئ تست سرجوشِ سخن
ہوش را بر درگہِ شہ کُن نثار | ہائے ہوئے برفگن دیوانه وار
من کجا بودم تو خود بودی مدام | تہمتے بر بافتی از ننگ و نام
طوقِ ما کردی زنیکی و بدی | راه بنمودی و راهِ ما زدی
مرده گشتم تا مرا دادی حیات | گم شدم چوں یافتم راهِ نجات
از دمِ پُرعشوه ہا و پُرفریب | بے سبب کردی تو ما را ناشکیب

اتحادِ تو مرا بیگانہ ساخت عقل و ہوشِ تو مرا دیوانہ ساخت

از نزولِ ذاتِ تو پست آمدم تو کشیدی جام و من مست آمدم

خوے آزادِ تو در دامم کشید تو شدی پنہاں مرا کردی پدید

از غنائے تو شدم من مستمند علمِ تو ما را بنادانی فگند

وصلِ تو ما را بہ ہجراں در سپرد حی و قائم تو شدی ما خورد و مرد

عدلِ تو ما را بظلم آگندہ جہل مشکلِ ما جملہ پیشِ تست سہل

تا تو کردی خندہ من گریاں شدم تو شدی روپوش و من عریاں شدم

تو بیاسودی شدم من پائمال من بہ ہجر افتادم و تو در وصال

من شدم سرگشتہ تو برجا ستے من شدم تنہا تو بزم آراستے

تو گرفتی جائے و من رفتم ز جائے سر کشیدی تو من افتادم ز پائے

تو شدی گنجے و من ویرانہ ام عقلِ کُل ہستی تو من دیوانہ ام

تو خرامیدی و من رفتم ز دست تو شدی بت آفریں من بت پرست

تو ز من گشتی و من گشتم ز تو تو ز من بگذر کہ بگذشتم ز تو

گر نماند ایں من و تو درمیاں نے ترا سود ست نے ما را زیاں

چوں تو خود ہستی نمیری زینہار نیستم من پس کجا گیرم قرار

انجمِ دیں اے مطلعِ انوارِ جاں نعرۂ دیگر بزن بے ایں و آں

خود مخاطب باش و خود می کن خطاب خود توئی اصلِ سوال و ہم جواب

خود ز خود با خود بکن گفت و شنید / نعرۂ از قعرِ جاں باید کشید
رمزِ خود بیخویشتن آغاز کن / نعرہ ہائے بے سر و بُن ساز کن
انچہ ناید بر زباں گفتارِ تست / انچہ مخفی ماند آں اظہارِ تست
من نگویم بُلبُل و پروانۂ / ہاں براہِ سوختن مردانۂ
بے تبِ ہجراں و بے ذوقِ وصال / خود بسوز و خود بساز و خود بنال
از خزاں و از بہاراں درگذر / وز گدایاں قصّہ پیشِ شہ ببر
اے شہِ والا کہ در رہ آمدی / خود گدا گشتی و خود شہ آمدی
در حریمِ خاص در سیرے شدی / خود یگانہ بودی و غیرے شدی
بازئ نیرنگِ خوش در باختی / اسپ و فرزیں پیل و بیذق تاختی
بر کشادی پاے رفتارِ ہمہ / فرق پیدا گشت در کارِ ہمہ
لیک در معنی بغیر ذات نیست / اندریں بازی تراشہ مات نیست
ذاتِ تو پاکست کے گردد بدل / اے بری از رنج و آفات و خلل
ہر چہ داری نے کم آید نے فزوں / نے بہ حیثیت فرقِ بیرون و دروں
نے بہ حیثیت جسم و جانہا را وجود / نے مکان و نے زماں دارد نمود
نے بہ حیثیت ظاہر و باطن دو چیز / نے بہ حیثیت اندک و بسیار نیز
نے بہ پیشِ تو فنا و نے بقا / نے بہ حیثیت ابتدا و انتہا
نے بہ حیثیت آسمانہا و زمین / نے شریعت نے حقیقت نے یقین

نے بہ حیثیت نامہا و نے نشاں — نے بہ حیثیت کفر و دیں نے این و آں
نے بہ پیشِ تو وجود ست و عدم — نے بہ پیشِ تو حدوث و نے قِدم
پیشِ تو تعلیل و توجیہات نیست — پیشِ تو امثال و تشبیہات نیست
نیستی ہم پیشِ تو گردید نیست — غرقۂ توحید جز توحید نیست

"چیست توحید آنکہ از غیرِ خدا
فرد آئی در خلا و در ملا"

خود تو گفتی خود تو بشنودی ز خویش — خود تو رفتی آمدی خود پیش پیش
من چہ گویم من چہ باشم من کیم — خود تو بودی خود تو ہستی من نیم
چوں تو بودی چوں تو خود ہستی بیا — من کجا یم من کجا یم من کجا
انچہ باشی باش من باشم نہ تو — خود بہ بیں و خود بدان و خود بگو
خواہ پنہاں باش و خواہی آشکار — بیدلاں را با فضولیہا چہ کار
من ندانم تو نہانی یا عیاں — نے بگنجی در یقیں نے در گماں
گر توئی از من نمے آید خبر — در ہمہ از تو نمے یابم اثر
بے من و تو کار نکشاید بگفت — رمزِ وحدت خود نمے آید بگفت
ایں عبارات و اشارات و خیال — گشتہ پیشِ سرِّ وحدت پائمال
پس چہ باشد زندگانی چیست مرگ — ذاتِ تو قایم بود بے ہیچ برگ
ذاتِ تو لاریب پاکست و صمد — نے ازل گردِ تو گردد نے ابد

ہم ازل مستغرقِ تو ہم ابد — امر کردی قُل ہو اللہ احد

قال را بگزار و حالِ خود بجو — کہ بمیرد غرقۂ دریائے ہو

حال و قال از تفرقہ ظاہر شود — کیست تا از اصلِ خود ماہر شود

جمع و تفریقے ہمے گردد عیاں — اصلِ ایں ہر دو نیاید در بیاں

آگہی از سرِّ مطلق کے بود — انچہ در فہمِ تو آید شے بود

راست نبود ہرچہ گوئی زیں نمط — "خود غلط انشا غلط املا غلط"

از صحیح و از غلط ہم دور باش — ہرچہ خواہی گو بخود مسرور باش

نے غلط کردی نیاوردی صحیح — نے حسن پیداست اینجا نے قبیح

نے قبیح و نے حسن نے خوب و زشت — نیست کعبہ نیست دیر و نے کنشت

علم و عرفاں نیست گشت و فرق شد — زورق اندر بحرِ وحدت غرق شد

غرقہ را نبود مقام و منزلے — غیرِ دریا نیست او را حاصلے

بارگاہِ اوست بے جا و مقام — نے نشانے باشدش نے ہیچ نام

ہر کجا سر برزند خود جائے اوست — بے سر و سامانیش ماوائے اوست

ہست آزادہ ندارد پائے بند — نے اسیرِ وقت و نے در جائے بند

ہم زمان و ہم مکاں خیزد ازو — اعتبارِ جسم و جاں خیزد ازو

نامرادی ہم ازو مقصود ہم — عبد ازو پیدا شود معبود ہم

ہرچہ می خیزد نہ بیرونش بود — ہرچہ غیرست آں نہ مادونش بود

ہیچ گردد نے خود ست و نے خدا | اتّحادی نے حلولی نے جدا
پاک از ناپاک و پاک از پاک ہم | اصلِ نور و اصلِ نار و خاک ہم
گفتہ و ناگفتہ یکساں پیشِ اوست | دیدہ شد نادیدہ چہ دشمن چہ دوست
ہست خود تنہا و ہم خود انجمن | گاہ نو مے گردد و گاہے کہن
معنیش واحد عبارت ہا بسے | نیست نقصاں گر نمے فہمد کسے
از عبارت تا بمعنی فرق نیست | گر بدانی ظاہر و باطن یکے ست
شد عبارت روئے معنی را حجاب | معنی آمد در عبارت آفتاب
ہم عبارت گشت معنی را شہود | در عدم معنی عبارت در وجود
ور بسنجی ایں مثالِ پیچ پیچ | غیرِ معنی نیست خود موجود ہیچ
معنیٔ آزاد خود پابست شد | نیست شد معنی عبارت ہست شد
آں عبارت نیست خود معنی ست آں | در نہاں معنی عبارت در عیاں
نیست معنی و عبارت جز مثال | جملہ وہم ست و گماں ست و خیال
از عبارت وز معانی پاک شو | خاکِ مردانِ خدا را خاک شو
از بیان و گفتگو لب بستہ بہ | خامہ گر جنبش کند بشکستہ بہ
ذکر و فکر و فہم و ادراک و قیاس | ایں ہمہ بگذار و ویراں کن اساس

کار دارد سوختن نے ساختن
ہست کار انجا سپر انداختن

(۲) آفتاب عالم تاب

صبح شد خواہد بر آمد آفتاب
دیدہ می مال و بیفگن رختِ خواب

خیز و در جائے بلندے کُن قیام
بر فرازِ کوہے یا طرفِ بام

کُن نگہ در گنبدِ نیلوفری
تا تماشائے غریبے بنگری

رو بمشرق ساعتے اِستادہ باش
جلوۂ خورشید را آمادہ باش

اوّلاً یک گوئے زرّیں سر زند
بعد ازاں خطِّ شعاعی در زند

اندک اندک پُر ضیا گردد جہاں
بَرّ و بحر و کوہ و دشت و آسماں

لطفہا بر خاکِ ظلمانی کند
روشنی و گرمی ارزانی کند

گلبن و زرع و نخیل و مرغزار
ہر یکے از فیضِ او پُر برگ و بار

گر نتابد آفتابِ پُر ضیا
نے پرِ کاہے بیابی نے گیا

بسکہ اُفتادہ ست از ما دور تر
قُرصِ خور کوچک نماید در نظر

چوں زمیں طوفے کند بر گردِ آں
عرصۂ سالے ہمی گردد عیاں

چرخ دیگر می زند بر خود زمیں
تا پدید آید شب و روزے چنیں

تو ہمی بینی کہ پوید آفتاب
فہم کُن خود واژ گونست ایں حساب

(۳) باد و آفتاب

باد با آفتاب عربدہ جُست
کہ زما ہر دو کیست چابک و چُست

کیست پُر فن کدام بے ہنر ست
از من و تو کہ زورمند تر ست

باید از بہرِ امتحاں محکّے تا نماند دگر مجالِ شکّے

در بیاباں مسافرے دیدند از برائے نشانہ بگزیدند

شرط کردند تا بقوّتِ خویش بکَنَد ہر کہ جامۂ درویش

لب بدعوی فضل بکشاید ورنہ بیہودہ ژاژ کم خاید

بادِ صحرا ابداں غریب آویخت صرصرِ تند گشت و گرد انگیخت

مرد چوں موجِ تیزِ صرصر دید دامن و آستیں سُنبک برچید

بہ برو دوش چُست کرد عبا گشت ایمن ز صرصر و ز صبا

باد چنداں کہ شور و شر افگند نتوانست جامہ اش برکند

رفت چوں جد و جہد باد بہ باد سر بصحرا نہاد و باز استاد

آفتاب آمد بہ نوبتِ کار کرد آغاز تافتن بہ وقار

اندک اندک حرارتے افزود مرد ناچار بندِ جامہ کشود

از بُنِ موے خوے بجوش آمد تا عبایش وبالِ دوش آمد

پس بجود تابِ آفتاب نیافت جامہ افگند و زیرِ سایہ شتافت

بعد ازاں آفتاب با تب و تاب نیز با بادِ تند کرد خطاب

کہ بآہستگی بر آید کام نہ بہ تندی و تیزی و ابرام

(۴) ابر و باراں

بسوے سقفِ نیلی کُن نگاہے کہ آمد لکّۂ ابرِ سیاہے

باندک روز گردد ابر افزوں
فراگیرد فضائے سطحِ گردوں
نقابے افگند بر روئے خورشید
بروز اندر شبِ تارے تواں دید
بغرّد کوسِ رعد و برجہد برق
بریزد آب و صحرا ہا شود غرق
زمینِ تشنہ گردد زود سیراب
کہ راحت ہا رسد بعد از تب و تاب
بیارد از ہوا چوں یک دو باراں
بروید سبزہ اندر مرغزاراں
بگردد زندہ خاکِ مردۂ و خشک
بخندد اندگل و بیروں دہد مشک
وزد بادِ خنک تا غنچہ خندد
سموم جانگزا گو رخت بندد
نسیمِ معتدل آید سبک پا
صبا غلتد بروئے فرشِ خضرا
بجوشد آبِ صافی از تگِ چاہ
گیا در کشت بالد حسبِ دلخواہ
شود باراں چو با فرخندہ حالی
نماید پرّ طوطی زرعِ شالی
بہندستاں اگر باراں نہ بارد
زمینِ مزرعہ حاصل نیارد

(۵) مناظرۂ میداں با کوہ

شنیدم کہ میداں سخن ساز کرد
بکوہے درِ گفتگو باز کرد
کہ اے کوہِ با رفعت و فرّ و جاہ
توئی از بزرگانِ ایں کارگاہ
سرت بر فرازِ ہوا بردۂ
بہ زیرِ زمیں پائے افشردۂ
نہیب آورد سرفرازئ تو
بہ حیرت درم از درازئ تو
ترا قُلّہ از ابر بالاتر ست
مُدامت کلاہِ مہی بر سر ست

ولے فکرِ تم در تو حیرانی ست | که آخر چه سود از تو ارزانی ست
یکے تودۂ سنگ بالائے سنگ | شدست از وجودِ تو بس عرصہ تنگ
بدیں پیکرِ سخت و پہن و گراں | چه نفعے رسد از تو با دیگراں
چه داری جز ایں درّہ و سنگلاخ | نشیب و فراز و بلند و فراخ
صدا باز گردید از کوهسار | نخست انچه سرمایه داری بیار
بگو پیشِ من از ہنرہائے خویش | که دانندہ تر ہست دانائے خویش
بگفتا نه بینی که تقدیرِ پاک | ودیعت نہادست در زیرِ خاک
گُل و سبزہ و غلہ ہا و شکر | غذاہائے مرغوبِ ہر جانور
بسا خوردنیہا و پوشیدنی | شراب و عرقہائے نوشیدنی
کشاورز یابد ز من دست رنج | و ہم مایۂ زندگی گنج گنج
صلا دادہ ام از پئے خاص و عام | ز خوانم رُبایند آب و طعام
خر و اسپ و گاوان و آہو و میش | کنند از گیاہم پُر انبانِ خویش
چرد گلّۂ گوسفند و برہ | علفہائے شیرین و برگِ ترہ
اگر بلبل و طوطی و فاختہ ست | ہم از دانہ ام طعمہ ساختہ ست
سپہرم بسر سائباں می تند | ہوا بارد و برق نوبت زند
ز بحرِ محیط ابر آید دواں | کند رود و جوہا بر ویم رواں
بسے چشمہ سار و بسے آبگیر | کشادہ بسیرابیم جوئے شیر

همی نفع خیزد ز آب و گلم
ذخیرہ نہد ہر کسے حاصلم

برند آدمی غلّہ خروارہا
کشد کشتی از خرمنم بارہا

چہ می پُرسی اے کوہ از سودِ من
جہانیست پُر مایہ از جودِ من

اگر دیدہ بینندہ بودے ترا
چو خورشید سودم نمودے ترا

جبل داد پاسخ بہ حلم و وقار
جدل مہتراں را بود ننگ و عار

کہ اے سادہ میداں براہِ ستیز
سمندِ تفاخر مراں تُند و تیز

متاعے کہ اینک بدامانِ تُست
الا تا نگوئی کہ از آنِ تُست

رسد ار مغانم ز دریاے ژرف
کنم اندک اندک ازاں بر تو صرف

نہ بینی کہ بر گردِ من سال و ماہ
زند خیمہ بارندہ ابرِ سیاہ

ز ہر جانبے رو کند سوے من
ہجوم آورد پشت و پہلوے من

گہے ژالہ بارد گہے آبِ پاک
گہے برف ریزد بغار و مغاک

زند از درونِ دلم چشمہ جوش
ز دیبائے خضرم کند سبزہ پوش

برسمِ کریمانہ پیش از سُوال
بہ پستی کنم نفقہ آبِ زلال

نمِ جود و لطفم بہ ہر جا رسد
بسے سیلہا تا بصحرا رسد

بسے رود خانہ بسے آبداں
ز رشحاتِ فیضم شود تر دہاں

ہر آں نہر و جدول کہ سقّائے تُست
ہر آں حوض و چاہے کہ در پائے تُست

دہد آبت از آبیاریِ من
بیا و ببیں خیرِ جاریِ من

مرا کار ہموارہ بخشندگی ست — وجودم ترا مایۂ زندگی ست
گر از من نہ بذل و نوالت رسد — زیانِ عظیمے بحالت رسد
بمانی یکے دشت ویرانۂ — نہ یک پرِ کاہے نہ یک دانۂ
اگر من نمانم بمانی خراب — نہ یک شاخ سبزے نہ یک جوئے آب
نہ خندد بہ دامانِ تو یک گلے — نہ خواند بہ بستانِ تو بلبلے
نہ یک قرصِ ناں خیزد از کشتِ تو — نہ بیند کسے طلعتِ زشتِ تو
نہ دیّار بینی تو از بحر داں — مگر بینی آوارہ خیلِ دواں
تو در کُنہِ قدرت مبیں سرسری — کُند ذرّہ با ذرّہ یاریگری
نہ تنہا ترا ہست با من نیاز — مرا ہست از دیگراں برگ و ساز
اگر ماہ و مہر اند و بحر و بر اند — ہمانا کہ محتاجِ یکدیگر اند
مکن نفیِ حکمت پس اے خود پرست — کہ نقّاشِ نقشے بباطل نہ بست

(۶) بدی و نیکی

باید ازیں سہ بگریزی جد — فکرِ بد و قولِ بد و فعلِ بد
فکرِ بد و زشت کہ در دل بود — آں بمثل زہرِ ہلاہل بود
زہر کہ ماند بدرونت مقیم — تا چہ دہد؟ جز کہ زیانِ عظیم
زخم زند گر سگِ دیوانۂ — یا بگزد مار بہ ویرانۂ
بہ کہ بدل فکرِ بدے جا کند — دغدغہ در جانِ تو پیدا کند

دیو کمیں کردہ تو چالاک باش ساحتِ دل پاک کن و پاک باش

جوے ز افکارِ بد آزادگی تا بتوانی مکن افتادگی

جہد کن و جنگِ دلیرانہ کن تا بکنی فکرِ بد از بیخ و بن

قولِ بد آید ہمہ از فکرِ زشت ایں پدر ست آں پسرِ بدسرشت

خبثِ دروں زشتیٔ گفتار شد موجبِ صد کلفت و آزار شد

از درِ گوش آمد و در دل خزید مارِ سیاہے ست کہ جاں را گزید

با ہمہ نیرو کہ تو داری بکوش تا سخنِ بد نہ در آید بگوش

ہاں بہ بد و نیک بکن امتیاز چند نشینی سرِ بول و براز

پس بہ یقیں صورتِ کردارِ بد ہست ز فکرِ بد و گفتارِ بد

فکرِ بد از دل چو بروں داشتی با تو زباں نیز کند آشتی

قلب و زبانت چو بود در پناہ دست نجنبد بہ بدی ہیچ گاہ

وسوسۂ بد کہ فروشد بہ دل زود بروں کن بدرونش مہل

شعلۂ اول کہ بکشتی بہ فن خانہ نگہداشتی از سوختن

ہر کہ دلش را ز پلیدی بشست خود ہمہ کردارِ وی آید درست

جنبشِ نیکو کہ ز دل خاستہ است صورتِ افعال بیاراستہ است

ہر عملِ خیر کہ آید ز تو
نیست مگر زادۂ فکرِ نکو

(۷) خجالت بر گناہ

شہے بود با مہر و عاجز نواز | کہ رفتے بزنداں پے کشفِ راز
بحالِ اسیراں نظر داشتے | ہم از ماجرا شاں خبر داشتے
جہاندار روزے بزنداں رسید | در آنجائے بد پنج کس تازہ دید
بخواند و زیک یک بپرسید حال | کہ چوں او فتادند اندر وبال
یکے گفت شاہا گناہم نبود | گواہم بنا راستی لب کشود
دوم گفت قاضی عدوے من ست | سوم گفت ظنے بسوئے من ست
چہارم چنیں گفت کائے شہریار | دگر کس خطا کرد و من زیر بار
سخن چوں بحجت بیارا ستند | رہائی ز بندِ گراں خواستند
چو نوبت بعاصئ پنجم فتاد | ز شرمِ گنہ مُہر بر لب نہاد
بصد رنج و افسوس گفتا کہ شاہ | یکے کیسۂ زر بدزدیدم آہ!
نگویم کہ ہستم سزائے کرم | بباطل نرفت ایں جفا بر سرم
بفرمود سلطاں بداں شرمسار | توئی دزد و اینہا امانت شعار
نباشد بفہم و درایت قریں | بدیں بے گناہاں شوی ہمنشیں
بروزود ازینجا کہ کردم رہا
تو قابل نۂ صحبتِ نیک را

(۸) محمود غزنوی

بگویند محمودِ فرخندہ خو — بہ طفلی بیارا ست باغِ نکو
بہ پرداخت بستاں سرائے عجیب — کہ بینندہ را بردے از دل شکیب
پدر را یکے روز مہماں بخواند — زبہرِ تماشائے ایواں بخواند
برفت و بدید و پسندید و گفت — کہ اے مُلک و دولت ترا باد مفت
بدینسا نہ زیبد کُنی فخر و ناز — ترا بر مگسہا زند شاہباز
چنیں کوشک و روضۂ دلپذیر — تواند بنا کرد ہر یک امیر
تو پیرائے باغے بسرو سمن — کہ مشکل تواں مثلِ آں ساختن
تو آں قصرِ خُرّم بنا کُن بہ دہر — کزاں عاجز آیند میرانِ شہر
بپرسید آخر کدامست آں — منم بندہ فرمانِ شاہِ زمان
بگفتا کہ آں روضۂ خوش ثمر — دلِ اہلِ علم ست و اہلِ ہنر
تو گر علم و فضل و ہنر پروری — در اقصائے عالم کُنی سروری
پدر ہرچہ از نصح گوہر فشاند — براں بود محمود تا ملک راند
عطا داد و بنواخت اہلِ ہنر — در آفاق شد نامِ نیکش سمر
خردمند مردم ز ہر مرز و بوم — در آوردہ پائے سریرش ہجوم
شد القصہ غزنیں عروس البلاد — دراں بود از ہر فنے اوستاد
نہ سلطاں بماند نہ سلطانیش — مگر قصہائے جہانبانیش

(۹) بیرام وقاسم

چو اقبال روز از ہمایوں بتافت — ز ہندوستاں سوے ایراں شتافت

پریشاں شدش کار و ساماں تباہ — فرو کوفت طبلِ شہی شیر شاہ

پراگندہ گشتند یارانِ او — مگر جمعے از جاں نثارانِ او

خیالِ رفاقت بسر داشتند — پئے شاہِ معزول بر داشتند

ازاں جملہ بیرام و قاسم دو مرد — کہ بودند در وضعِ اخلاص فرد

بر آقائے دیرینہ دل شاں طپید — وفا ہمچو پیکاں بہ پہلو خلید

شبے راست کردند عزمِ گریز — نشستند بر بارگیہائے تیز

جدا گشتہ از مخیمِ شیر شاہ — بایراں زمیں باز جستند راہ

ولے نیمہ رہ شیر شاہی سفیر — نمود ایں گریزندگاں را اسیر

چو قاسم نکو فربہ اندام بود — بصورت قوی تر ز بیرام بود

گماں برد بیرام بندش نہاد — بروں جست بیرام چوں برق و باد

ولے کرد اندیشہ در بینِ راہ — کہ بنود بمردی بتر زیں گناہ

کہ یارے شود فدیۂ خونِ من — تفو بر من و ہمّتِ دونِ من

پشیماں شد و شرمگیں از فرار — عناں باز پیچید و گفت آشکار

منم خانِ بیرام اے مردماں — نہ آں مرد بیچارۂ خستہ جاں

خدا را ز بندش رہائی دہید — ہماں بند بر دست و پایم نہید

چو قاسم دلیریٔ بیرام دید — بہ احوالِ او لب بدنداں گزید
چرا آمد ایں یارِ بگریختہ — مبادا کہ خونش شود ریختہ
گر ایں بازِ پرّاں در افتد بدام — مرا جانِ شیریں شود تلخ کام
نمودند بارے ازو کشفِ راز — کہ از رازِ سربستہ بر گوئے باز
بگفتا کہ ایں خادمِ باوفا — نخواہد کہ بر من نہ بیند جفا
دلش سوخت بر حالتِ زارِ من — کہ بودست وقتے نمکخوارِ من
ز روئے وفاداری آمد دواں — کہ تا فدیۂ من شود ایں جواں
وگرنہ منم خانِ بیرام و بس — نجویم رہائی بہ امدادِ کس
دریں طرفہ دعویٔ مرد آزمائے — پژوہندہ را خیرہ شد عقل و رائے
مگر قولِ بیرام باور نداشت — نہ ایں را گرفت و نہ آنرا گذاشت
زجاں رفت قاسم دریں داوری — فرو ماند بیرام از یاوری
بزرگاں کہ بر تر نشیں بودہ اند — براہِ فتوّت چنیں بودہ اند

(۱۰) اورنگ زیب

بگویند سلطانِ اورنگ زیب — کہ مردانہ خو بود و صاحب شکیب
در ایّامِ شہزادگی ناگہاں — بہ پیش آمدش مست پیلے دماں
دواں در پیش پیلباں نعرہ زن — اَلا مردماں پیلِ مردم فگن
زہوشش ہیاہو بمردم فتاد — پریدند چوں برگ از تُند باد

بکنجِ فرار رفت ہر کس کہ بود   کہ با دیو پیکار نتواں نمود

ولے شاہزادہ بیفشرد گام   بہیبت بر آورد تیغ از نیام

چناں زد بجز طومِ آں ژندہ پیل   کہ ہستیِ او شد بہش مستحیل

بلرزید از زخمِ ضربِ درشت   بر آورد فریاد و بنمود پشت

ہم از منظرے دید شاہِ جہاں   دلیرئ شہزادۂ نوجواں

بخواند بگفتش کہ جانِ پدر   تہوّر نہ نیکوست با جانور

نہ از عقل باشد کہ با پیلِ مست   در افتی و شمشیر تنہا بدست

ز روئے ادب گفت کاے شہریار   خدایم ندادست پائے فرار

مرا نیز شاہا چنیں ست رائے   ولے پائے ہمت نہ جنبد ز جائے

بپائے کہ جویم ز میداں گریز   مگر قطع بادا بشمشیرِ تیز

(۱۱) طفلکے و مادرش

طفلکے بر کنارِ حوض رسید   آبِ صافی درونِ حوض بدید

موجہا دید از وزیدنِ باد   جائے خوش بود خاطرش بکشاد

خواست با سنگریزہا بازد   یک یک آں روئے آب اندازد

نوبتِ اوّلیں کہ دست کشاد   سنگریزہ میانِ آب اُفتاد

در عجب ماند از تماشائے   کہ ندیدہ ست پیش ازیں جائے

سنگریزہ کہ خورد ساحتِ آب   دائرہ زد چو ہالۂ مہتاب

رفتہ رفتہ فراخ تر گشتہ — عاقبت غائب از نظر گشتہ
جمع آوردہ سنگریزۂ چند — ہم چنیں روئے آب می افگند
مادرش کرد ہم بحوض گزر — ماجرا باز گفت با مادر
جنبشے کاں بچشم بے قدرست — اثرش بیں چہا بزرگ ترست
طرفہ نقشے بر آب پیدا کرد — نقطۂ را محیط پہنا کرد
گفت مادر کہ ہمچنیں ہر کار — اولش اندک آخرش بسیار
بس بدیدم کہ کمتریں عملے — کردہ پیدا اعظیم تر خللے
اے بسا ذرۂ نکوئی خاست — آفتابے شد و جہاں آراست
جانِ مادر بہ لہو و بازی نیز — عبرتے ہست بہرِ اہلِ تمیز

(۱۲) شیر

شیر بگوید کہ منم پادشاہ — نیست مرا حاجتِ تاج و کلاہ
ناخن و سرپنجہ و دندانِ من — بس بود ایں دبدبۂ شانِ من
بانگ زنم شُند چو بردام و دد — زلزلہ در کوہ و بیاباں فتد
بر سرِ صیدے کہ کنم پنجہ تیز — پوست بدرّم کُنمش ریز ریز
چوں بزنم بر سرِ پیلِ دماں — رو بگریز آورد از بیمِ جاں
چوں بشکارے بکشایم کمیں — برقِ جہندہ شوم از خشم و کیں
وائے بر آہو کہ در آید بہ پیش — روئے زمیں افگنمش سینہ ریش

پنجہ زنم در بنِ غارش برم — میکُشم و میدرم و می خورم
حیف بریں خوئے تو اے شرزہ شیر — از چہ بخونِ دگرانی دلیر
چو نتو نخواہم کہ شوم پادشاہ — پادشہِ ظالم و کم خیر خواہ
پادشہِ مُلک اگر بودمے — برہمہ مخلوق بہ بخشودمے
جملہ بخوف اند ز آئینِ تو — لب بکُشایند بہ نفرینِ تو
جور و جفائے تو شدہ ست آشکار — شاہِ نکونام نۂ زینہار

(۱۳۱) شیرے و موشے

موشکے در حضورِ شیر افتاد — شیر از بہرِ صید پنجہ کشاد
گفت از روئے عجز موشِ ذلیل — اے شہِ باوقار شیرِ جلیل
نتوانم رسانمت آزار — کمتریں بندہ ام مرا بگذار
گر رود التفات بر سخنم — گاہ باشد کہ خدمتے بکنم
شیر را عجزِ وے پسند آمد — رحم بر حالِ مستمند آمد
پس اماں جوئے را اماں بخشید — مردمی کرد و پنجہ باز کشید
شد بریں قصہ چند روزے دیر — تا گرفتارِ دام شد آں شیر
دام زاں گونہ بر تنش پیچید — کہ بنوعے رہِ خلاص نہ دید
لاجرم شیر آہ و زاری کرد — موش بشنید و عزمِ یاری کرد
کہ مبادا رسد گزند و زیاں — بکشندش گروہِ آدمیاں

آمد و خادمانہ داد سلام پس بدنداں بُرید رشتۂ دام
رخنۂ زد فراخ و کار بساخت بند بگسست و شیر بیروں تاخت

(۱۴۷) گُرگے

گُرگے لبِ جوئے رفت و شد سیر می خورد برہ بجانبِ زیر
تا خواست کہ حیلہ پیش آرد وانگاہ گلوئے او فشارد
دیدش بنگاہِ خشم آلود کائے برۂ نابکار و مردود
شرمت ناید ازیں و تیشر کردی ہمہ آب خورد تیرہ
گفتا بہ ادب جنابِ والا من زیر ترم شما ببالا
بالا رود آب کے ز پستی برمن مکنید چیرہ دستی
چوں گرگ بحجّتش فرو ماند شرمندہ بہ پہلوے دگر راند
ہاں! پار کہ یادِ من نمودی دشنامِ غلیظ دادہ بودی
ایں بار اگر خطا نہفتی ہاں پار بدم چرا بگفتی؟
گفتا ہے ہے!! انیم خطاکار شش ماہہ چہ بد بگویدت پار
من پار کہ خود نزادہ بودم دشنام چگونہ دادہ بودم
زیں گونہ کہ حجّتِ قوی گفت گرگ از سرِ خیرگی بر آشفت
گفتا تو اگر نگفتۂ بد شاید پدرِ تو گفتہ باشد
ایں گفت و بکشت و خورد او را حجّت نہ برد بدیِ خورا

(۱۵) سگے

بدریا سگے اُستخواں در دہاں | شنا کرد و از عکس شد در گماں
کہ دارد سگے اُستخواں زیرِ آب | چو من در شنامی نماید شتاب
بدید آں تماشا و از روئے آز | فرو شد باآب و دہن کرد باز
کہ تا در رُباید زسگ اُستخواں | ولے از سگ و اُستخواں کو نشاں
خود آں اُستخوانش تہِ آب شد | خجل باز گردید و بے تاب شد
بدل ہست ہر مردِ طامع قرار | بگیر آں دگر ایں یکے را بدار
ولے آں رود ایں نیاید بکف | طمع می کند ایں و آں را تلف
غنیمت شمار انچہ آمد بدست | خوش آں کو بکنجِ قناعت نشست
بکار آورش انچہ دریافتی | خزف یافتی ور گہر یافتی

(۱۶) روباہے بے دُم

روبہے در دامِ صیّادے فتاد | جاں بہ بُرد و گفت دُم را خیرباد
چند روزے در غمِ دُم خستہ بود | زانکہ بر زیبائیش دل بستہ بود
برگزیدہ خلوتے با درد و سوز | نے بشب بیروں خرامیدے نہ روز
جوعِ زور آور دتا پایانِ کار | شد زکُنجِ خانہ را با صد اضطرار
زندہ را گر دُم نباشد گو مباش | لیک نتواں زیست بے وجہِ معاش
اندکے خورد و زجورِ فاقہ رست | پس خیالِ باطلے در دل بہ بست

گفت باخود بایدم افسوں دمید — وز غم و اندُہ بحیلت وارہید
بانگ برزد کرد دعوت قوم را — ہاں بیائید اے عزیزان الصّلا!
روبہاں گرد آمدند از ہر کنار — ہم ز ہند و سند و از بنگ و بہار
شکر گفت و رفت برجائے بلند — گفت دارم باشما ہا حرفِ چند
بسکہ دُم را دوست دارد قومِ ما — ہست ایں رسمِ قبیح و ناسزا
گر سلف دلدادۂ دُم بودہ اند — خود ز رشد و راستی گم بودہ اند
من نگویم پند از روئے قیاس — ہست برہانِ قوی آنرا اساس
امتحاں را دُم ز تن انداختم — بہرِ نفعِ قوم بازی باختم
تا ز دُم فارغ نشستم در جہاں — راحتے دیدم کہ ناید در بیاں
بے دُمی عیشے ست بے مثل و نظیر — بر شما اظہار کردم گزیر
ہر کہ دارد عقلِ صالح در دماغ — بایدش جُستن ز بارِ دُم فراغ
ھدیۂ از حکمت آوردم بکف — گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف
روبہے گفت از میانِ انجمن — ہست افسوں ایہا القوم ایں سخن
ناصحِ ما باز اگر دم یافتے — زیں مواعظ پیشِ ما کم بافتے

ایں ہمہ مکر و فن و حیلت گری ست
عصمتِ بی بی ہم از بے چادری ست

(۱۷) طاؤس

نہ بینی کہ طاؤسِ گردن فراز کشاید ہمے بال و پر ہا بناز
زقوسِ قزح رنگہایش فزوں تو گوئی کہ از جنّت آمد بروں
ولے بانگِ ناخوش کند متصل چو شب بشنوم ہولم آید بدل
سخن برگزیدم ازیں جانور کہ دانش بہ است از قباہائے زر
شرف آدمی را نہ بخشد لباس چہ دیبائے مُعلَم چہ کہنہ پلاس
برواز ادب جامہ ترتیب کُن ترقی بہ تکمیل و تہذیب کُن
زخود بینی و عجب کبر و غرور نہ راحت میسّر شود نے سرور
مبادا ایں کہ من نیز طاؤس وار بر عنائیِ خود کنم افتخار
مرا زیب و زینت ہمیں قدر بس کہ یاراں کنند آفریں یک نفس

(۱۸) کشفے و خرگوشے

مثلے گویم ار کنی در گوش کشفے گوئے بردہ از خرگوش
سبک از جائے خود بروں جستند بدویدن ہمے گرو بستند
دور تر نقطۂ نشاں دادند رو بآں نقطہ ہر دو افتادہ
کشف آہستہ تر قدم بہ قدم بے درنگے ہمے رود پیہم
باز خرگوش تند گشتہ رواں تیز تر ہم چو باد و برق دواں
سیر و گردش کناں بمین و یسار باز گردید بر خطِ رفتار

یک دو میداں دویدن در نفسے | خویشتن را ہمے ستودن بسے
خندہ بر سستیٔ حریف زدن | طعن و تشنیع بر ضعیف زدن
چوں حریفش بگردِ او نرسید | پا ز رفتار باز پس بکشید
گفت حالا دمے بیاسایم | خود چرا زود راہ پیمایم
ہمہ راہ و روشش بداد از یاد | دیدہ بربست و سر بخواب نہاد
سنگ پشت از عقب رسید و گذشت | خفتہ خرگوشش را بدید و گذشت
رہ بریدن بزحمتِ بسیار | پیشتر آمدہ بجائے قرار
خود بدانید تا کہ بُرد وکہ باخت | رخشِ فرزانگی ببایدتاخت

(۱۹) گوزنے

گوزنے تشنہ از سوئے بیاباں | کنارِ جوئے باز آمد شتاباں
بخورد آب و میانش روئے خود دید | نظر بر شاخہا کرد و بنازید
کہ دارم شاخہائے بس دلآویز | بلند و استوار و سخت و سر تیز
مرا اے کاشکے بودے جملہ اعضا | بسانِ شاخہایم خوب و زیبا
ہنم از شاخہا سرخیلِ حیواں | ولے پاہا مرا کردن پشیماں
چناں لاغر کہ بارِ تن کشیدن | بود دشوار ہنگامِ دویدن
مرا انداخت پاہایم بزشتی | وگرنہ ہستم آہوئے بہشتی
بیک ناگہ سگاں کردند آواز | شنید و کرد آغازِ تگ و تاز

سبک برجست و حالا کرد باور | کہ عضوے نیست جز پاہاش یاور
ولیکن زود شاخِ دل پسندش | نمودہ مبتلائے قید و بندش
بہ پیچیدند در شاخِ درختے | فرو ماند اندریں خلجان بختے
تگا پو را درنگ اُفتاد چنداں | گرفتندش سگانِ تیز دنداں
دواں آمد زپس صیادِ خوشدل | بکردش زود تر با دشنہ بسمل
بسا چیزے کہ در چشمت بد آید | ولے آخر درِ شادی کشاید
بسا چیزے کہ آنرا دوست داری | کہ پایانش نہ بینی غیر خواری
بسا کسہا کہ پنداریش ناکس | برد گوئے سعادت از بسا کس

(۲۰) پیر جلّاب و خرش

پیر مردے بود و ہمراہش پسر | سوئے نخّاسے ہمے بردند خر
خود پیادہ ہر دو اُفتادہ براہ | خر سبک میرفت و میخورد گیاہ
آں یکے دید و بگفت ایں ابلہاں | خویشتن در رنجِ راہ و خر جہاں
پیر بشنید و چو خر در گل بماند | زود پشتِ خر پسر را بر نشاند
پیشتر رفتند زانجا اندکے | بانگ بر زد از کنارِ رہ یکے
ہے! چرا شد خر سوارہ ایں پسر | پیر بیچارہ پیادہ رہ سپر
نوجواں آرام و پیرے در تعب | نیست ایں معنی زہنجارِ ادب
پیر چوں ایں طعن و شنعتہا شنود | طفل را آورد از مرکب فرود

خود بہ پشتِ خر نشستہ شد رواں — طفل بیچارہ زپیش و پس دواں

بانگ برزد رہ روے کاے پیرِ دوں — برگزیدی از چہ ایں طورِ زبوں

میدوانی طفل و گشتہ استی سوار — تو زبے مہری نداری ننگ و عار

ایں سخن بشنید چوں پیرِ ضعیف — کرد حالا طفل را با خود ردیف

دیگرے دید و بگفت اے مردِ کار — خر زآنِ تست یا خود مستعار

پیر گفت آرے خر از ملکِ من ست — گفت نے نے کذب تو خود روشن است

چوں خرِ مسکیں کشد بارِ دو مرد — حیف مالک گر دلش ناید بدرد

می نہ زیبد خر کشد بارِ شما — خرکشی باشد سزاوارِ شما

ایں شنیدہ زود تر زیر آمدند — از سواری ہر دو تن سیر آمدند

خر بہ بستند و کشیدندش بدوش — تا برند آں روے پل بہرِ فروش

ایں تماشا کس ندیدہ در جہاں — مردماں انگشتِ حیرت در دہاں

پس بدادند از سرِ آں پُل عبور — خر ز قید و بند گشتہ ناصبور

دست و پا ہا زد رسن را پارہ کرد — پیر نتوانست ہیچک چارہ کرد

خر بدریا اُفتادہ شد تلف — بر زیانش پیر می مالید کف

گفت با خود ایں سزاے آنکہ من — ہر کسے خوشنود خواہم ساختن

ہر کہ می جوید رضائے ہر کسے

در جہاں جور و زیاں بیند بسے

(۲۱) کاخِ ویرانہ

بگشتیم روزے بویرانۂ کہ بودہ ست ایوانِ شاہانۂ
ندا آمد از تودۂ سنگ و خشت کہ بودیم وقتے چو خرّم بہشت
مہیّا ز ہر گونہ سازِ نشاط حریریں سراپردہ قالیں بساط
بزرگانِ با شوکت و ارجمند نشستہ دریں بارگاہِ بلند
بیک ناگہاں گردشِ روزگار ببرد از چمن رونقِ نوبہار
ز دیّارِ ایں بقعہ یک تن نماند شب آمد و لے شمع روشن نماند
زمانہ چو آں عقد بگسیختہ شد ایں قصر پاشیدہ ریختہ
ز باراں و سرما و از آفتاب بگردید بُنیانِ محکم خراب
بجاہائے ایوانِ آراستہ گیا رُستہ و خاربُن خاستہ
ز ویرانۂ بزمِ خنیاگراں نمی خیزد الّا نہیقِ خراں
دریغا ازیں کاخِ با فرّ و جاہ کہ بر گردِ آں ایستادے سپاہ
تو گوئی کہ خود طاق و ایواں نداشت نشیمن نبود و شبستاں نداشت
ز دیوار و در ہا نشانے نماند بریں ماجرا نوحہ خوانے نماند
مگر روبہاں مسکنے ساختند شغالاں ہیاہو درانداختند
ازاں کد خدایانِ با نام و ننگ مبیں تودہائے گل و خشت و سنگ
نکو یادگارے کہ عدل ست و داد ازایشاں ہمی خلق دارد بیاد

(۲۲) دو جوئے

دو جو گشتہ از کوہسارے رواں | بوادیِ زیریں پئے ہم رواں
یکے خامش و سُست و کم آب تر | دگر تُند و موّاج و بیتاب تر
بگفت ایں بداں اے کہ سستی کنی | کجا کارِ خود بادرستی کنی
بدیں کاہلی ہا کہ تو می روی | بترسم کہ در خاکِ رہ گم شوی
ازیں بیش کاہی بہ پہلوئے من | سفینہ تردد کند روئے من
بہر گوشہ دولت فشاں بگزرم | خراجے بدریائے اعظم برم
تو می باش قانع زروئے نیاز | فراتر روم من براہِ دراز
ولے جوئے خاموش پاسخ نداد | بہ آہستگی سر بصحرا انہاد
ہر آں جوئے کوچک کہ در راہ دید | بہمراہیِ خود ورا برگزید
ہمی رفت تا گشت پہن و طویل | چو جیحون و سیحون و دریائے نیل
تواضع نمودش وسیع و عمیق | زہر جانبے جُست با خود رفیق
ولے جوئے مغرور برعکسِ آں | بہ تنہا خرامید دامن کشاں
بجوہائے دیگر نکرد التفات | فراہم نیاورد آب از جہات

بہ آخر دراں رود مدخل بجُست
کہ کم مایہ میدیدش اندر نخُست

(۲۲۳) چوبکے میانِ سیلاب

زکوہستاں رواں شد سیلِ بیباک — کہ موجش چاک میزد سینۂ چاک
بہ تندی سنگ را بر سنگ سودہ — درختانِ کہن را در ربودہ
میانِ موج او چوبے سبکسار — ہمی رفت و ہمی زد لافِ بسیار
کہ میرانم من ایں آبِ رواں را — منم سالارِ خیلِ کارواں را
بساحل گفت کائے ساحل ندانی — کہ از من سیل را آید روانی
نمی بینی کہ ہست اندر کفِ من — زمامِ رفتن استادن دویدن
دریں اندیشہ بود آں چوبکِ ہیچ — کہ آب اُفتاد در راہِ کج و پیچ
رواں بگذشت آب از نائے تنگے — ولے در ماند چوبک زیرِ سنگے
بگفتا ہیں مرا بگذار اے سنگ — بگستاخی مزن در دامنم چنگ
کہ جز من آب را یاور کہ باشد — چو من بگذارمش رہبر کہ باشد
منم از راہ و رسمِ منزل آگاہ — مبادا آب بے من گم کند راہ
بگفتا عرض کن در پیشِ ساحل — کہ دریا راست او میرِ مراحل
بگفت و گفت ساحل لب فروبند — کہ بسیارے زدند ایں لاف و رفتند
نہ بے آنہا تفاوت کرد دریا — بسے برد و بسے آورد دریا
نہ از آنہا بدریا در نشان ست — ولے موّاجیٔ دریا ہمان ست
پس از تو ہمچنیں آیند بسیار — روند آخر دریں ورطہ نگونسار

(۲۴) آبگیرے و رودے

آبگیرے بہ رودِ ہمسایہ
گفت کاے گرم رو تنک مایہ

بے محابا کہ خرجِ آب کنی
خانۂ خود ہمے خراب کنی

ایں قدر تند میروی شب و روز
ہے! نداری خطر ز حرِّ تموز

زود باشد کہ تیر ماہ رسد
مہرِ تاباں بگرم گاہ رسد

باید آنگہ کشید رنجِ دراز
کابِ رفتہ بجو نیاید باز

رود گفتش جواب از سرِ ہوش
آبگیرا! خموش باش و مجوش

خوش ہمی آیدم رواں بودن
نے بخیلانہ سرگراں بودن

زاں طرف گیرم ایں طرف بدہم
حیف باشد گرش بہ بند نہم

دائما در افاضہ باید بود
مرگ خوشتر کہ زیستن بے سود

عاقبت آفتابِ تیر بتافت
بر سرِ رود آبگیر بتافت

تا نشانے ز آبگیر نماند
رودِ فیّاض ہمچناں میراند

سبزہ و گل دمیدہ اطرافش
شکر گویاں زعینِ الطافش

مست و محوِ صدائے آب شدہ
ایمن از تابِ آفتاب شدہ

(۲۵) پنبہ[۱] دانہ

روزے مشتے ز پنبہ دانہ
دہقاں بہ گرفت و شد ز خانہ

ہر دانہ جدا بہر کنارے
بنشاند بخاکِ کشت زارے

دود از دلِ دانہا بر آمد
ہیہات زمانِ ما سر آمد

یک یک بر حالِ خویش بگریست
در خاک چگونہ می تواں زیست

فریاد زدند و لب کشودند
پیشِ دہقاں فغاں نمودند

آخر چہ گناہ و جرم دیدی
کز مسکنِ ما بروں کشیدی

بودیم ترا ز خانہ زداں
در گوشۂ کلبۂ تو شاداں

از حضرتِ خود چرا براندی
ویں خاک بہ فرقِ ما فشاندی

گفتا بکنید صبر یک چند
خود ہست کشایشے دریں بند

رازے کہ بدیدہ ام ز آغاز
در قلبِ شما نگنجد آں راز

بعد از دو سہ روز تخمِ نمناک
بر شکلِ گیا بر آمد از خاک

ہم خاک بفرِّ خیش برداشت
ہم آب بحالِ وے نظر داشت

خورشید بچشمِ لطف دیدش
با ناز و نعیم پروریدش

ہم بادِ صبا موافقت کرد
ہم ابرِ مطیر سایہ گسترد

بالید بکشت روز تا روز
تا گشت نہالِ خاطر افروز

---

[۱] مرتبہ ۱۸۹۳ء بمقام آگرہ۔

بر سر ز شگوفہ زد کلاہے — بر بست ثمر ز بعدِ ماہے
پس گفت کہ عیش و کامرانی — زیں بہ نبود بہ زندگانی
دورانِ بقا مرا بکام ست — ایں راحت و خوشدلی تمام است
مصئون ز غمِ زوال گشتم — دانہ بودم نہال گشتم
دہقاں گفتش کہ حرف کم زن — زیں مرتبہ بیشتر قدم زن
بسیار سفر ہنوز باقی ست — صبح تو دمید و روز باقی ست
ہاں باز مکش عنانِ یکراں — میزن جرس و فراترک راں
مکشائے بہ نیمہ راہِ بارت — اے چشم براہِ انتظارت
باید عدم و وجود دیدن — تلخی و خوشی بسے چشیدن
البتہ بریخت برگ و ہم بار — وز حاصلِ پنبہ گشت انبار
بازرگانش بچار سو بُرد — در زیرِ شکنجہ اش بفیشرد
دستہ دستہ بریسمانش — بربست و کشید کاروانش
ندّاف کماں زد و صفا داد — در چرخہ بدورِ دیگر اُفتاد
بودش پسِ ہر نزول معراج — تا رفت بکارگاہِ نسّاج
شد پارچۂ گراں بہائے — باریک و نفیس و باصفائے
پس جامۂ خوب ازاں بُریدند — سلطان و گدا بہ برکشیدند
گفتا کہ خوش ست صحبتِ من — فارغ شدم از نہال بودن

بارے زغرور سر گراں شد — غافل زخیالِ امتحاں شد
تا ژندۂ و کہنہ گشت پارہ — از کلفت و غم ندید چارہ
در صفِّ نعال رفتہ از صدر — بر مزبلہ ہا فتادہ بے قدر
بازش گرد آورید کنّاس — بسپرد بکارگاہِ قرطاس
کاغذ سازاں بہم نشستند — تار و پودش زہم گسستند
برہم بزدند و کوفتندش — افتاد جدا زبند بندش
ریشہ ریشہ بہ آب در شد — حالا غفلت زسر بدر شد
میگفت شکیب و صبر باید — باشد کہ درِ دگر کشاید
تا جلوہ بہ پیکرِ دگر کرد — پیراہنِ کاغذیں بہ بر کرد
پھنا و دراز و باصفا شد — کاغذ گشت و ہزار تا شد
راحت ہا دید بعدِ دردے — آمودہ گہر بہر نوردے
از ہر علمے و ہر کمالے — در وے شدہ مرتسم مثالے
بر صفحہ نگار بست خامہ — صد نسخہ زہر کتاب و نامہ
جا یافت بمکتب و بدیواں — آمد مقبولِ پاک طبعاں
صد بابِ خرد ازاں شدہ باز — بکشاد بسے خزینۂ راز
بنمود زرفتگاں نشانہا — شد بدرقہ بہرِ کاردانہا
شرحے زاوامر و نواہی — برخواند بہ بندگانِ شاہی

توقیع شد و مثال و منشور | طومار و صحیفہ ہائے مسطور
ہم آخرِ کار گشت باطل | از کار شد و نشست عاطل
پس گفت بہ حالتِ تحیّر | دیدم بجہاں بسے تغیّر
قدرت بخشید نفع و سودم | بہ زاں کہ اُمید بستہ بودم
بودم گلے تازۂ بہ کِشتے | پنداشتہ کِشت را بہشتے
زاں روز بہر مقام و ہر حال | بردند مرا با وجِ اقبال
تا آنکہ شدم کتابِ پُر مغز | حمّالِ نکات و معنیٔ نغز
اکنوں ہم اُمیدِ لطف دارم | کز جیبِ خزاں دمد بہارم
القصّہ گرفت شعلہ در وے | شد منزلِ آخرینِ او طے
از ساحتِ خاک رخت بربست | بر شد بہ ہوا بمہر پیوست

(۲۶) خاتمہ

تنقید مثنوی قران السّعدین

(از خاکسار مقدّمہ نگار یعنی مولانا محمد اسمٰعیل رح)

مثنویٔ چند جز ایں مثنوی | ہست نگارِ قلمِ خسروی رح
خرّم و خنداں چو گلِ بوستاں | تحفۂ نغز ست پئے دوستاں
ہاں! مگر ایں نامہ کہ دانش نام | یافت ازاں جملہ فراتر مقام
چشمِ ہنر بیں شدہ حیرانِ او | ریختہ نیرنگ زالوانِ او

دیدۂ بینندہ کہ دیدنش — سیر نگر دیدہ ز گل چیدنش

ہر چہ فزوں دید۔ فزوں شد ہوس — کرد ثناہا خردِ نکتہ رس

بیتِ قصیدہ جو مغے در گذشت — ہر غزلے ہمچو غزالِ بہشت

موج زناں نظم چو آبِ رواں — از نفسِ طوطئ عذب البیاں

دادِ نواسنجئ آں نغز گو — تا بدہد۔ بلبلِ شیراز کو؟

طوطئ ہند ار بنوا آمدے — بلبل از ایراں بہ ثنا آمدے

من کہ ندانم روشِ پارسی — بے خبرِ ہندیم ار وارسی

من زکجا۔ نقدِ سخن از کجا؟ — کاسہ تہی و عمل از کیمیا!

گر ز کجی ساز خطا می زنم — بانگِ کرم زن کہ کجا می زنم

ور قلم افتادہ دریں باب راست — راستیش حضرتِ نواب[1] راست

خانِ فضائل حشم اسحٰق خاں[2] — آئینۂ حسرتی[3] نکتہ داں

پر حذرم از سرِ سودا و سود — دارم دلم خاطرِ والاش بود

تاختہ ام ہرزہ براہِ دراز — بر اثرِ حکم۔ نہ از روئے آز

نوبتِ پیری و منم طفلِ راہ — عاجزم و عاجزیم عذر خواہ

خوش مثلے گفتہ و در سفتہ اند — "پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند"

نیز سپاسے بجنابِ بشیرؔ[1] | خُلق وے آمیختہ شکّر بہ شیر
یاوریٔ او کہ بسے کار کرد | از کتبِ خواستہ انبار کرد
خامہ زنِ من کہ حسن چشتیؔ[2] ست | رہروِ آہیم و خطش کشتی ست
ہر ورقے نقشِ نو انگیختن | لعل و دُر از نوکِ قلم ریختن
گر زلکِ او بُرِ رُخ کاغذ رواں | لیک نہ بینی ز ستردن نشاں
عارضِ کاغذ کہ سمن زار بود | گشتہ کنوں سُرخ و سیاہ و کبود
لاجرم آں کاغذِ زار و حزیں | شد ہمہ تن پیرہنِ کاغذیں
از خمِ شاں خامہ کہ دُردِ کش ست | یادِ بزرگاں نہ دروِ دے خوش ست
شعرِ تو اے خسروِؔ شیریں بیاں | زندۂ جاوید۔ تو ہم زندہ ماں
خضر توئی و سخن آبِ حیات | نوشِ تو بادا سخن از عینِ ذات
شعرِ تو پروردۂ درد ست و سوز | شعلۂ او سرد نگشتہ ہنوز
گرچہ گزشتہ است ازیشِ صد فزوں | لیک نہ کم شد تفِ سوزِ دروں
تا دمِ گرمِ تو فغاں بر کشید | آتشِ سوزندہ زباں در کشید

شاد بماں خسروِؔ جنّت نشیں
باد بجانِ تو ز حق آفریں

---

[1] شیخ بشیر الدین صاحب رئیس لال کُرتی و آنریری مجسٹریٹ میرٹھ - ۱۲
[2] ایس ایم حسن چشتی اندر کوٹ مشائخان میرٹھ سٹی - ۱۲

(۲) قصائد

(۲۷) تشبیب

نماند تابِ فراقِ تو بیش ازیں مارا — بیار جام کہ خالی کنیم مینارا
بقطعِ وادیٔ عشقِ تو در نخستیں گام — زپا فگند جنوں عقلِ دستِ بالارا
ز تو گسستنِ پیماں زما درستیٔ عہد — بیا کہ قاعدہ برہم زنیم دنیارا
اگر تو مے ندہی دادِ تشنہ کامیٔ من — باٰبِ دیدہ بگیرم عیونِ دریارا
مدارِ چرخ بہ آہے ز ہم نمے پاشد — چساں ز دائرہ غم بروں کشم پارا
مرادلے ست کہ از ننگ پارہ پارہ شود — بقامتم چو بدوزند حُلّۂ خارا
نہیمِ از تفِ دل داغ بر دلِ آتش — بہ تندِ صرصرِ آہے دہیم صحرارا
بترس ازیں کہ توانم من از تپیدنِ دل — کہ پا برہنہ برآرم بدشتِ لیلیٰ را

یک امشب است بیادِ تو ہم چو روزِ شمار
بگو چہ قدر نہی وعدہ ہائے فردارا

(۲۸) سراپا

اے بہ نقابِ رخت مہرِ قیامت نہاں — قامتِ موزونِ تو فتنۂ آخر زماں
عارضِ مستورِ تو بتکدہ ہا را چراغ — نرگسِ مخمورِ تو میکدہ ہا را مغاں
ہندوے زلفِ ترا حاصلِ مُلکِ خطا — مردمِ چشمِ ترا کسوتِ عبّاسیاں

در خمِ ابروئے تو تیغِ اجل معتکف — کاوشِ مژگانِ تو قبلۂ نوکِ سناں
جنبشِ بازوئے تو خونِ جہانے بریخت — لعلِ دل آویزِ تو کرد اشارت کہ ہاں
وصفِ تنِ نازکت گر بزباں نہ افتد — ہیچ کس از جانِ خویش باز نجوید نشاں
ابر ز جوشِ ہوس قطرہ چکاند بہ بحر — مہر ز داغِ حسد لمعہ فروشد بکاں
غیرتِ دندانِ تو آب کند آں یکے — واں دگرے با لبت سنگ بود ہمچناں
حکمِ جمالِ تو در شش جہت امضا پزیر — سکّۂ حسنِ تو در ہفت قلم رو رواں
حیرتیٔ روئے تو آئینہ دارد بہ پیش — حسرتیٔ وصلِ تو سیر بر آید ز جاں
طرزِ تو غارت گرِ دانشِ خاکِ فرنگ — نازِ تو برہم زنِ حکمتِ یونانیاں
شاہدِ خوئے ترا رنگِ حیا ہم نشیں — لیلیٔ حسنِ ترا ناز و ادا ساربان
عشوۂ تو بر درد پردۂ زہد و ورع — غمزۂ تو بشکند حوصلۂ قدسیاں
زہرہ چو یک رہ کند در تو ز شوخی نظر — سحرِ ادایت فرود آورد ش موکشاں
گر تو کنی غمزہ را تیز بہ رسمِ ستم — مہر نماید دگر ہر ستمِ آسماں
گر ز سراپردہ خویش پائے بر آری بروں — پا نہ رسد بر زمیں بسکہ سر آید براں
نازِ کمر بستنت رنگِ امیدم شکست — زاں کہ نہ گنجد ہمی گشتنِ من درمیاں

بیہشیٔ اہلِ دید ہست حدیثِ کلیم
چوں تو کنی در نظر جلوہ بیک ناگہاں

(۲۹) قصیدہ در مدح پیر و مرشد

سرورِ روحانیاں آمد پدید — جنبشے در جسم و جاں آمد پدید
شد منوّر عرصۂ کون و مکاں — کوکبِ کون و مکاں آمد پدید
بوستانِ جاں بہار از سر گرفت — نو بہارِ بوستاں آمد پدید
کاروانِ غیب آمد در شہود — یوسفے در کارواں آمد پدید
ہست ہر دورِ زماں را صاحبے — صاحبِ دورِ زماں آمد پدید
کشتیٔ طوفانیٔ ہست ایں جہاں — نوحِ کشتیٔ جہاں آمد پدید
علمِ حق میراثِ پیغمبر بود — وارثِ پیغمبراں آمد پدید
ذاتِ پاکش دودماں را افتخار — افتخارِ دودماں آمد پدید
از برائے صیدِ مرغانِ مکاں — شاہبازِ لامکاں آمد پدید
آستانش قبلہ گاہِ قدسیاں — قبلہ گاہِ قدسیاں آمد پدید
زد صلائے کُنتُ کَنزاً مَخفِیاً — مالکِ گنجِ نہاں آمد پدید
میزبانِ خوانِ حق مردِ خدا ست — خوانِ حق را میزباں آمد پدید
صورتِ بختِ جواں فضلِ خدا ست — صاحبِ بختِ جواں آمد پدید
خود ظہور و ظاہر و مظہر یکے ست — از ظہورِ حق ہماں آمد پدید

بوالحسن غوثِ علی سلطانِ جان
اے حسن[1] سلطانِ جاں آمد پدید

---

[1] مولانا سید گل حسنؒ مولانا کے پیر بھائی تھے اس نظم میں اُن کا نام ڈالدیا ہے۔

(۳) قطعات

(۳۰) دو کیسہ داریم

دو کیسہ پُر از عیب داریم ما
یکے پیشِ روے و یکے پشتِ سَر

دراں نقصِ ہمسائگاں ست و عیب
دریں زشتیٔ نفسِ ما ہست و شر

ازاں ہر چہ بینیم بر کف نہیم
وزیں خود نداریم علم و خبر

دراں فکرت و ہوشِ ما تیز و چست
دریں دیدہ و گوشِ ما کور و کر

اگر ہست ہمسایہ ہشیار دل
نہ کوبد درِ جنگ با ما مگر

کند چارۂ عیب و نقصانِ خویش
ز بد بینیٔ ما بگیرد ہنر

شود کیسہ اش از بدیہا تہی
پُر د کیسۂ ما ز عیبِ دگر

چنین ست احوالِ ما را طریق
کہ فردا ز امروز آید بتر

نہ پیچیدہ در باطنِ دیگراں
نہ پوشیدہ از ظاہرِ خود نظر

نشستہ چناں فارغ از حالِ خویش
تو گوئی نداریم سمع و بصر

مدام این چنین آں چناں فکرِ ماست
نہ با نیک رغبت نہ از بد حذر

اگر گوش داری نصیحت نیوش
کُن آوازۂ گوشِ جان این گہر

مکن قصّہ از عیبِ ہمسائگاں
بکن چارۂ خویش المختصر

(۳۱) گلِ معنی

خیز و یک دم بیا بروضۂ اُنس
وز نخیلِ رضا رطب برچیں

خوش بنہ پا بجادۂ تسلیم
باز بر صُفّۂ صفا بنشیں

اے بسا میوہ ہائے عنبر بوئے
اے بسا ثمرہ ہائے مشک آگیں

اے بسا ناروائے بسا نارنج
اے بسا خوشہ ہائے چوں پرویں

کہ بیابی دریں نعیم مقیم
کہ بہ بینی دریں قرار مکیں

برفشان و بجوز بگیر و بلن
ہرچہ یابی زعلم و عین و یقیں

بسحا تشنگانِ بادیہ را
برساں بر غدیرِ ماءِ مُعیں

دست واماندگاں گرفتہ بر
بر فرازِ رواقِ علیّیں

بکنایت سخن دقیق شود
می تواں گفت سہل تر ہم ازیں

ہاں بیا و ببیں کتابِ حَسَن
کہ نمودست رازہا تدویں

مرحبا رازہا چو مہرِ منیر
حبّذا نکتہا چو ماہِ مُبیں

مژدہ اے طالباں کہ بہرِ شماست
ایں حصارِ بلند و حصنِ حصیں

تیرِ باراں کنند اگر خطرات
اینک ای سالکاں دِژِ روئیں

واصلان راست قلعۂ محکم
عارفاں راست بارۂ سنگیں

اہلِ حق راست عُروۂ وُثقےٰ
اہلِ توفیق راست حبلِ متیں

ناقصاں راست کم ز سنگ و خزف
کاملاں راست بہ ز دُرِّ ثمیں

ہمہ گفتارِ شاہِ غوث علی است | آنکہ از فقر داشت تاج و نگیں
از پسِ عُمرہا طُلوع کند | آفتابے چناں بروئے زمیں
کردہ بود شس خدائے عزّوجل | قبلۂ عزّ و کعبۂ تمکیں
زدہ بودند سکّہ بر نامش | در حدودِ ہدایت و تلقیں
دولتِ پائے بوسِ آں سلطان | شدہ چندے نصیبِ ایں مسکیں
باز گردم بسوئے وصفِ کتاب | کہ خزینہ ست از علومِ یقیں
رہروِ وادئے حقیقت را | از تگاپوہے دہد تسکیں
در فضائے معانئ پاکش | نورہا بینی از یسار و یمیں
گر بہ اسرارِ او رسی، نکنی | نظرے بر جمالِ حوار العیں
سیّدی گُل حسنؒ گُل افشاندہ | گُلِ معنی نہ سوسن و نسریں
رنگ و بو دارد از حقیقتِ حق | تا نہ بینی بچشمِ ظاہر بیں
بزمِ اسرار و معرفتؒ خوانم | بحقیقت نہ در حسابِ سنیں
کنزِ توحید و معرفت دائم | نہ بتاریخ بل زراہِ یقیں
نورِ چشمِ بصیرت ار گویم | مدح و توصیفِ شاعرانہ مبیں
نہ مرا گفتہ است مُلہمِ غیب | نہ خبر دادہ جبرئیلِ اَمیں

بزبانم برفت اے محمود[1]
اُنچہ فرمودہ است نجم الدّیں

---

[1] محمد محمود سیفی فرزندِ اکبر مصنّف اُن کے نام سے یہ نظم لکھی گئی تھی ۱۲۔

(۳۲) بانگِ جرس

این نہ افسانہ ست دل خوش کن — کہ در آئی بخندہ یک دو نفس
خفتگان را ہمی کند بیدار — این حدیثے ست ہمچو بانگِ جرس
حاصل آن ست عبرتے برگیر — نہ ہمیں لفظ قصہ خوانی و بس
تا نگردی اسیرِ دامِ بلا — ہاں مشو غرہ بر خوشامدِ کس
مدح گویاں چو عنکبوتا نند — وانکہ مغرور گشت ہست مگس

(۴) قطعاتِ تاریخ

(۳۳) خضرِ راہ

شد آں غوثِ علی سلطانِ ذیشان — کہ مارا قبلۂ دنیا و دیں بود
مآبِ خلقِ عالم بارگاہش — تو گوئی آسمانے بر زمیں بود
بشرِ فقر و فنا دریائے توحید — ورائے عرصۂ علم و یقیں بود
فریدے بے حجابے راست گوئے — بہ عرفان و حقیقت دور بیں بود
زہر گونہ کمالش بہرہ خاص — نشانِ اوّلین و آخریں بود
دلش تفسیرِ لاخوفٌ علیھم — کہ فارغ از غمِ دنیا و دیں بود
بہ ہمّت پیش رو فردِ جریدہ — بہ کنجِ خوش دلی عزلت گزیں بود
بہ توحید و توکّل یک سوارہ — بترکِ دونِ حق خلوت نشیں بود

به ایثار و کرم ابرِ گُہر بار | ظہورِ شانِ ربّ العالمیں بود
سخن ہائے بلند و ارجمندش | مذاقِ اہلِ حق را انگبیں بود
کلامش ہر یکے صد بابِ حکمت | نکاتش طالباں را دل نشیں بود
براتِ قسمتِ خود ہر کسے یافت | جہانے خرمنش را خوشہ چیں بود
بجیب اندر محیطِ سرمدی داشت | رموزِ وحدتش در آستیں بود
خراباتِ حقیقت را قلندر | شریعت را امام المتقیں بود
ز آب و گِل مُنزّہ ذاتِ پاکش | اگرچہ درمیانِ ما و طیں بود
کلیدے بود اسرارِ ازل را | نقودِ گنجِ غیبی را امیں بود
ہمش حق الحقیقت بود بیہیم | ہمش مُلکِ صفا زیرِ نگیں بود
ندانم من چہ بود آں بحرِ موّاج | نہ خود بود و نہ آں نہ بود و ایں بود
بروں از بود و نابود ست بودش | چرا گویم چناں بود و چنیں بود

به بحرِ غیب چوں کشتی فرو برد
خرد گفتا کہ خضرِ راہ بیں بود
۸۰ ۶ ۱۸

(۳۴) سُلطانِ طریقت

شد غوثِ علی شہِ زمانہ | سُلطانِ حقیقت و طریقت
تاریخِ وصال گفت ہاتف | او بود شہنشہِ حقیقت
۹۷ ۵ ۱۲

(۳۵) سر سالار جنگ

بود دستورِ دکن نام آورے مختارِ ملک
در مہمّاتِ اُمورِ سلطنت با ہوش و ہنگ

ہمچو او دستورِ دانائے ندارد کس بیاد
پاسبانِ امن و صلح و مال و دولت نام و ننگ

نیّرِ بختِ رعایا تافت بر اوجِ شرف
تا زمامِ ملک و دولت دادہ بودندش بچنگ

فہمش آئینِ ریاست را ابنائے خوش نہاد
نظمش از آئینۂ نظم و سیاست بُرد زنگ

بود رائے محکمش اعضائے دولت را اسپر
فتنہ ہائے ملک را تدبیرِ والایش خدنگ

فخرِ قوم و فخرِ ملک و حرزِ بازوئے دکن
بوستانِ خُلق و احسان و سخا را آب و رنگ

عدل را نوشیروانے بخت را اسکندرے
ضیغمِ صحرائے بینش بحرِ دانش را نہنگ

بیکساں را دستگیرے خستگاں را مرہمے
نیّتش آں بود در دورش دلے ناید بہ تنگ

موجِ فیضانش گرفتہ چار دانگِ ہند را
از لبِ رودِ کرشنا تا سرِ دریائے گنگ

لوحۂ دل پُر نگار از شکرِ نعمت ہائے او
درسگاہِ قوم را طُغرائے نامش نقشِ سنگ

مختصر گویم ز اوصافش کہ ارزانیش بود
تن ز ہند و دیں ز یثرب دانش از ملکِ فرنگ

شور و فریادِ رعایا سدِّ راہِ او شدے
عرصۂ عمرِ معیّن گر پذیرفتے درنگ

تا بکے ایں نالہا محمود[1] تاریخش بگوے
پیکرِ آں پاک گوہر شد نہاں در خاک و سنگ

گفت ہاتف حسرتا صد حیف و ہیہات آہ آہ
وائے دانشمند و نازک فہم سر سالار جنگ

۱۳۰۰ھ ۱۳۰۰ھ

لہ بفرمائش محمد محمود فرزندِ اکبر مصنّف۔

(۳۶) نورِ عرفان

دوش گوئی کہ در نشیمنِ قدس | خیلِ رُوحانیاں خرامان ست
زدہ انداز نشاط انجمنے | طوبیٰ و سلسبیل و رضوان ست
طوطیانند بال و پر از نور | سایہ و شاخسار و ریحان ست
بُلبُلانند نغمہ شاں تحمید | چمن و گلشن و خیابان ست
قُمریانند نعرہ شاں تہلیل | سرو شمشاد و طرفِ بستان ست
آہوانند از سرشتِ صفا | سبزہ و جوئبار و میدان ست
ماہیانند از خمیرِ ہُدیٰ | خضر و ساقی و آبِ حیوان ست
اخترانند از جلال و جمال | آسمان و زمین زایقان ست
ہمہ از رحمت احترازِ نسیم | ہمہ از فیض ابر و باران ست
خُم ز تفرید و ساغر از تجرید | طرفہ اجماعِ بادہ خواران ست
نعرہ لآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ | از دلِ ہر کہ ہست جوشان ست
ہر کہ با من بدعوائے آویزد | گویم آرے دلیل و برہان ست
نہ روم بر طریقِ استدلال | گر ترا نیز نقدِ ایمان ست
ورقے زیں کتابِ پاک بہ بر | کہ ہمانا ز عالمِ جان ست
بہ ہوائے طوافِ مضمونش | مُرغِ اندیشہ بال افشان ست
ہر کہ بر فہمِ معنیش پے بُرد | دلش از وجد پائے کوبان ست

فہمِ معنی کہ ہست فوزِ عظیم — نہ ز سعی ست بل ز وجدان ست
بودیعت دریں جریدۂ راز — گوہر و لعل و دُرّ و مرجان ست
دُرّ و مرجان ولے نہ از دریا — لعل امّا نہ از بدخشان ست
دُرّ و مرجانش از لطائفِ غیب — لعلِ رخشاں ز سرِّ اعیان ست
دیدبانِ شواہدِ اکواں — ترجمانِ مظاہرِ شان ست
بہ تعجّب مبیں در اوصافش — کہ ز ملفوظِ شاہِ شاہان ست
آنکہ در پیشِ ہمّتش لاشے — ہرچہ از اعتبارِ امکان ست
آنکہ در ظلِّ رایتِ فقرش — مامنِ رند و پارسایان ست
آنکہ در اوجِ عظمت و شانش — سعیِ اندیشہ ہم ز نسیان ست
آنکہ اندر فضائے مدحتِ او — رخشِ فکرت بہ ترکِ جولان ست
طورِ تحقیق را کلیم اللہ — مُلکِ توحید را سلیمان ست
خرد اندیشد و زباں گوید — شرحِ اوصافِ او نہ چنداں ست
دو سہ بیتے دگر کنم انشا — گرچہ ایں کار ہم نہ آساں ست
یعنی در وصفِ جامعِ ملفوظ — کہ مرآں شاہ رازِ خاصان ست
راشد و مُرشد ست و آلِ رسول — لمعۂ آفتابِ تابان ست
آنچہ بعد از نبی بہ امت ماند — آلِ پاکِ وے ست و قرآن ست
قبلہ گاہش بظاہر و باطن — شاہِ مردان و شیرِ یزدان ست

خرقۂ او حسینی الحسنی ست | رقعۂ حلّۂ شہیدان ست
ہم بہ حکمِ طریق و ہم بہ نسب | جدِّ والاش قطبِ گیلان ست
اصلِ پاکش ز یثرب و بطحاست | مولدش خطّۂ خراسان ست
او فتادست در دیارِ غریب | چند روزے بہ ہند مہمان ست
ایں لآلی کہ در کتاب کشید | خوانِ یغما برائے اخوان ست
چند گویم بہ لہجۂ فارس | خاکِ میرٹھ نہ یزد و طہران ست

گفت محمود[1] سالِ ختمِ کتاب
بحرِ توحید و نورِ عرفان ست
۱۳ ہ ب ا

(۳۷) ملفوظاتِ مرشد

حسن[2] بنوشت ملفوظاتِ مرشد | بدل ہا ریختہ انوارِ توحید
کتابے مستطابے لاجوابے | ہمانا ابرِ گوہر بارِ توحید
بہ بیں در ہر اشارت می زند جوش | محیطِ اعظمِ زخّارِ توحید
قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید | چرائی بو العجب در کارِ توحید

چو از توحید دیدم شرحِ اسرار
بگفتم آیتِ اسرارِ توحید
۱۳ ہجری ۱ ۰

---

[1] بفرمایشِ محمد محمود فرزند اکبر مصنّف ۱۲ [2] مولانا سیّد گل حسن صاحب ۱۲۔

(۳۷) محیطِ اعظم

مردِ حق عریاں بگوید راز را — راز داں خود در جہاں پیدا کم است
فاش گفتن نیز باشد مصلحت — دور باشی از پے نامحرم است
چیست ملفوظاتِ مولٰنا ست ایں — کاہلِ حق را بوستانِ خرّم ست
گر بہ پرسی از قمر[1] تاریخِ او
عینِ مطلوب و محیطِ اعظم ست
۱۳ ہجری

(۵) غزلیات

(۳۸)

رخِ تمثیل ہم در آئینہ نا دیدۂ گویا — بخلوت گاہِ ناز آرے ز خود پوشیدۂ گویا
تو در کنعانِ جسمانی و مصرِ جاں پُر از غوغا — ز پیراہانِ یوسف شمّۂ نشنیدۂ گویا
پئے دُنیا کہ از طولِ امل بر بافتی دامے — بسانِ عنکبوتے بر مگس پیچیدۂ گویا
لبِ ناں ار بدست آریم دو شاب از جگر باشد — کفافِ ما ز اقطاعِ محن بخشیدۂ گویا
بیائے لُطف گشتِ بوستاں فرمائے تا ہر گل
بجائے خویش پندار دہمش بوئیدۂ گویا

(۳۹)

اللہ اللہ اصطلاحِ کہنہ از بر کردہ اند — وز تقاضائے خرد حرفے مکرّر کردہ اند
بر گمانِ آں لبِ شیریں کہ جز در وہم نیست — طوطیاں منقار اندر تنگِ شکّر کردہ اند

[1] بفرمائش شیخ قمر الدین رسالدار مرحوم۔ ۱۲

از شمیمِ زلفِ او نشنیدہ کس بوئے ہنوز — تودۂ از مشک و انبارے ز عنبر کردہ اند
مے گساراں گردشِ چشمش ندیدہ یک نگاہ — بر تصوّر نُقلِ بادام مُقشّر کردہ اند
در تنزّہ گفت نتواں از قد و بالائے او — حیف تشبیہے کہ با سرو و صنوبر کردہ اند
نقشِ ہستی چوں سراسر ہست نیرنگِ خیال — عاقبت سر بر زند وہمے کہ در سر کردہ اند
بیش و کم ہرگز نہ گردد ہر چہ ہست از نیک و بد — زانکہ پیش از ما براتِ ما مقدّر کردہ اند
از غلط کاریِ عقلِ ایں جہاں ہرگز مپرس — تہمتِ ہر نیک و بد بر چرخ و اختر کردہ اند
عابداں وقتِ عبادت نقشِ معبودے زنند — آشکارا شرکتے با ذاتِ داور کردہ اند
در حریمِ ذات او رہ نیست کس را اے عجب — قصّہ بسیار از مقام و راہ و رہبر کردہ اند
صوفیاں را غیرِ حق تصفیۂ دل میکنند — غیرِ حق را خود چرا در دل مقرر کردہ اند
ہر کسے را اعتمادے ہست بر حُسنِ عمل — از سعادت ہائے خود ترتیبِ محضر کردہ اند
در بُت و بتخانہ رو آوردہ قومے بر خیال — قومِ دیگر تکیہ بر محراب و منبر کردہ اند
عاشقاں را نیست حاصل ما یہ جز بے حاصلی — زاہداں را دست اندر سبحہ گوہر کردہ اند
آں یکے را دادہ اند اوصافِ اخلاق و ادب — واں یکے را رند و سر مست و قلندر کردہ اند
آں یکے بر آتشِ دوزخ کبابے میزند — واں یکے را مشربے از آبِ کوثر کردہ اند
کیست کو رہوار تا سر منزلِ تحقیق راند — ہر یکے را مسلکے بر نوعِ دیگر کردہ اند
بارگاہِ وحدتش را کو نشان و کو مقام — در حقیقت خود غلط بود انچہ باور کردہ اند
نجم ذاتِ واحد ست اما اسامی در مقال — ماہ و پروین و سُہا و مہرِ انور کردہ اند

(۴۰)

سراپائے[1] من پائے تا سر بہ لرزد | کہ مجرم بدیوانِ داور بہ لرزد
زلطفت نئے خامہ گوہر فشاند | زقہرِ تو در تیغ جوہر بہ لرزد
چناں لرزد از بیمِ جاہِ تو حاسد | کہ در دورِ اسلام کافر بہ لرزد
مگر دیدن انوارِ قلبِ منیرت | کہ ہر صبح دم مہرِ خاور بہ لرزد
مرا دل بہ لرزد ز بے برگی و سازی | چناں کز سخائے تو گوہر بہ لرزد
نیا سایم از جنبش و نیست جنبش | کہ پا ماندہ بر جائے و پیکر بہ لرزد
ہمے لرزم از دستِ سرمائے ناخوش | کہ دل دادہ از شوخِ دلبر بہ لرزد
چناں حرف لرزد بہ پیشِ نگاہم | کہ اندر کفِ مست ساغر بہ لرزد
نہ سرمائے دی کس نہ لرزد بسانم | مگر شاخِ عریاں ز صرصر بہ لرزد

چنین است حالم بہ ماہِ نومبر
دلِ من ز بیمِ دسمبر بہ لرزد

(۴۱)

باز بہار[2] ید ابر باز بیامد بہار | باز نوا ساز کرد مرغ سرِ شاخسار
باد وزیدن گرفت سبزہ چمیدن گرفت | جلوۂ صد رنگِ گل جوش زد از ہر کنار
باز پرندِ سحاب دامنِ گوہر فشاند | ہم بسرِ شہر و دہ ہم بسرِ کوہسار
غنچہ دہن باز کرد بہرِ سپاسِ خدائے | برگ ورقہا نوشت در صفتِ کردگار
تاک فتادہ ہمے مست بطرفِ چمن | سروِ سہی سر بلند گشتہ لبِ جوئبار

---

[1] بفرمائش عزیزے نوشتہ شد مقام سہارنپور سنہ ۱۸۶۸ء۔ [2] بمقام سہارنپور بتاریخ ۱۵ر جولائی سنہ ۱۸۶۸ء نوشتہ شد۔ ۱۲

سنبلِ پیچاں فگند طرّہ فرو تر ز دوش نرگسِ شہلا کشاد دیدہ بروے بہار
بسکہ طرب عام شد کام روائی گرفت سبزۂ بیگانہ ہم یافت دریں بزم بار
ساقی و ساغر بدست مطرب و شعرے بلب
زمزمۂ عود و چنگ جام و کفِ مے گسار

(۴۲)
تا کے بہ عدو زنم درِ صلح اے شوخِ ستیزہ کار برخیز
ناچار شدم ز شورِ ناصح اے تہمتِ اختیار برخیز
بہ نشست غبار بر دلِ او اے دیدۂ اشکبار برخیز
برخاست دلِ من از سرِ جاں اے دلبرِ جاں شکار برخیز
اے بلبلِ نالہ مست مے نال شد فصلِ گل و بہار برخیز
خلقے شدہ منکرِ قیامت اے فتنۂ روزگار برخیز
من بندِ نقاب مے کشایم اے طرّۂ مشکبار برخیز
تا پردہ فتد ز کفر و ایماں
اے برقعِ روئے یار برخیز

(۴۳)
ہاں[1] بیا ای مگسِ سیم تن و زرّیں پر ای قبائے تو ز دیبا و ترا تاج بسر
ہاں بیا بر سر و بر دیدۂ من پا بنہ ای کہ چشمِ تو درخشندہ تر از لعل و گہر
ہاں بیا روشنیِ خانۂ ویرانۂ من ای کہ روے تو دلاویز تر از شمس و قمر
ہاں بیا باز بیا و سخن آغاز بکن ای کہ داری ز شکر نیز دہاں شیریں تر

[1] مولانا کی فارسی ریڈرس سے نقل کی گئی ہے جس طرح عنکبوت نے مگس کی تعریف طامع لوگ اہل دول کی ثناو صفت اسی اصول پر کیا کرتے ہیں، بالآخر خوشامد کے جال میں انھیں پھنسا لیتے ہیں۔ ۱۲

ہاں بیا و کرمے بر منِ مسکیں فرمائے — اے کہ شاہی و شہاں را بگدا ہست نظر
ہاں بیا و سحر و شام نشیں بر سرِ خواں — اے کہ بے تو نہ مرا شام خوش آید نہ سحر

ہاں بیا کامدنت موجب خورسندیہاست
چشم دارم کہ تو خورسند کنی بارِ دگر

(۴۴)

اے روئے تو بے نقاب تا کے — بر خود تپد آفتاب تا کے
بشکن سرِ زلفِ تابدارت — دلہا ہمہ پیچ و تاب تا کے
در روزِ شمار کس ہپرسم — گیرم ز غمت حساب تا کے
حسنِ تو نقاب بر نتابد — شوخیِ تو در حجاب تا کے
صد قفل زدم درِ تمنّا — دل بستۂ فتح باب تا کے
زاہد بہ نوائے خارج آہنگ — دل بر کنی از رباب تا کے
آخر نہ کہ واژگونہ نجستم — تشویش ز انقلاب تا کے
ناگفتہ ہزار حرف خوں شد — باغیرہ کنی خطاب تا کے
من تشنہ جگر ترم ز تیغت — یکبار بکُش عتاب تا کے

ساقی نہیم ار سزائے جامے
دوراں کندم خراب تا کے

(۴۵)

بے نشان و بے صفت در عینِ آثار آمدی — گردِ خود در دور و گردش ہم چو پرکار آمدی
یوسفِ مصرِ جمالی و زلیخائے طلب — خود شدی جنسِ عزیز و خود خریدار آمدی

دعوتِ دیں کردی و خود برزدی بانگِ ابا
وحیِ منزل گشتی و ہم خود باقرار آمدی

حسن چوں بے پردہ شد غوغائے عشق آمد پدید
طالبانِ خویش را ہم خود طلبگار آمدی

چوں بہ بے رنگی رسیدی خار و گل را سوختی
چوں برنگ و بو فتادی عینِ گلزار آمدی

چوں حجابِ خود شدی بزمِ شہود آراستی
خویشتن را غیر بنمودی باظہار آمدی

بہرِ اظہارِ شفا خود را مریضے ساختی
چارہ گر گشتی و بر بالینِ بیمار آمدی

عالم اندر رقص آمد تا خرامیدی بناز
شور در جاں ہا فتادہ تا بگفتار آمدی

ہر چہ اندیشم نہ با ایں ہمہ غیرِ تو نیست
بحرِ مواج و حباب و دُرِّ شہوار آمدی

ناقہ را لیلائے حُسنت چوں بہ صحرا سر نہاد
کسوتِ مجنوں بہ بر کردی و ہشیار آمدی

علم گشتی و شدی مستور اندر چینِ کفر
رند و گمراہ و قلندر مست و سرشار آمدی

(۴۶۶)

ہر چند مرا نیست بتو ہیچ کلامے
ہر دم ز تو صد بار پیامے و سلامے

گفتم بتو از لب نہ بروں آمدہ حرفے
رفتم بتو از جائے نہ برداشتہ گامے

آنگاہ کہ ناگاہ بہ بیگاہ رسیدیم
سالیست نہ ماہیست نہ صبحیست نہ شامے

منزل گہِ ما را نہ سلوکیست نہ رسمے
نے ہمسفرے ہست نہ میلے نہ مقامے

آں مے کہ بخوردیم نہ در خوردِ عوام است
خمخانۂ ما را نہ خُمے ہست نہ جامے

صد فتنہ برانگیختہ ناکردہ نگاہے
صد مرحلہ طے ساختہ ناکردہ خرامے

(۶) رُباعیات

(۴۸) ارشاداتِ قلندری

یک دم بنشیں ببزمِ زندانِ زمن | صد غلغلہ افگنند از پیرِ کہن
از سینہ چو در سفینہ ریزند سخن | ارشاداتِ قلندری گویم من
۱۳ ۰۰ ۱

(۴۹) بوستانِ تقدیس

جوئی بجہاں اگر نشانِ تقدیس | این ست ورائے کاروانِ تقدیس
تکلیف کنی اگر برائے تاریخ | گویم بہارِ بوستانِ تقدیس
۱۳ ۰۰ ۱

(۷) متفرقات

(۵۰) مثنویات

بدریا و کان ہست گوہر بسے | نیابد بہا تا نگیرد کسے
بزیرِ زمیں ہست خرمن ہزار | از آن کسے نیست بے کشت و کار
اگر نفع اندک دہی رائیگاں | بطمعِ زیادت ز روے گماں
ندانند ت اہلِ خرد باہنر | کہ آں نفع اندک نیابی دگر
کہ داند کہ بسیار مقسوم تست | چرا امید ہی انچہ معلوم تست

(۵۱)

تنازع مبر پیشِ دیوانیاں | کہ بسیار خواہد شد اندک زیاں
تحمل کن اندک زیانے بمال | کہ خود مالِ ناقص بہ از پائمال

(۵۲)

جواناں جوانی مکن رائگاں | کہ پیری ہمے آید از پے دواں
گر امروز تدبیرِ فردا کنی | بسر منزلِ عافیت جا کنی
ور امروز کارت بساماں نشد | دریغا کہ خود ایں شد و آں نشد

(۵۳)

لبِ نانے با امن و آزادی | بہ ز حلوائے خوف و ناشادی
جائے تنگے کہ بے ضرر باشد | بہ ز ایواں کہ پُر خطر باشد

(۵۴)

خرے[۱] با عندلیبے گفت روزے | شنیدستم کہ مے نالی بسوزے
بہر طرفے فتادہ بر زبانہا | ز خوشِ الحانیِ تو داستانہا
ولے خواہم بگوشِ خود شنیدن | بدادِ نغمہ ہایت وا رسیدن
در آمد بلبُل گویا باواز | بصد آئیں ترنّم کرد آغاز
بزیر و بم چناں آہنگ ہا کرد | کہ صحنِ بوستاں را پُر نوا کرد
بوجد آورد مرغانِ چمن را | نہ تنہا مرغ بل سرو و سمن را

(۵۵) قطعات

مکن زور آوری بر زیر دستاں | کہ زورت را نمے بینم بقائے
بترس از انقلابِ دہر زنہار | مکن در حقِّ مسکیناں جفائے

(۵۶)

در وطن و در سفر و در حضر | گر بودت یارِ وفادار بہ
یار کہ بگذاشت ترا در بلا | مار یقیناً ز چنیں یار بہ

[۱] ناتمام۔

پشتیٔ ہم جنس کند دام و دد　　دام و دد از مردمِ غدّار بہ

(۵۷)

تواں بہ رفق و مدارا بشادمانی زیست　　دلے زعربدہ خیزد نکال و بدبختی
ہر آنکہ صلح بہ ابنائے جنس پیش گرفت　　بروزگار نہ بیند مصیبت و سختی

(۵۸)

اے ترا دست نارسیدہ بتاک　　ترش انگور را چرا گوئی
تو زخود کردۂ نہ ترکِ ہوس　　شرم بادت کہ حیلہ می جوئی

(۵۹)

دوستاں را کہ جنگ و فتنہ بخاست　　دگر انجام نیک امید مدار
ہیچ سودے حسود را زحسد　　نیست الّا کشیدنِ آزار

(۶۰)

ہر آنکہ رنج و مشقّت کشد ز جبّاراں　　بر انقلابِ زماں چوں کند غم و شادی
بدست ہر کہ فتد سر بہ پیش او بنہد　　ازآں کہ قطع شد او را امیدِ آزادی

ابیات (۸)

(۶۱)

دوں ہمت است و ناکس و نامرد و بدنہاد
آں کو بمکر و حیلہ بدست آورد مراد

(۶۲)

زحرص و طمع دور باش اے سلیم
طمع خر سس را میسنماید گلیم

(۶۳)

چو تیغ راستی داری توانی لشکرے کشتن
ولیکن تیغ فولادی نہ ہر جائے بکار آید

(۶۴)

تو بینا نۂ کے کنی قطع راہ
ز مردانِ دانا بصیرت بخواہ

(۶۵)

ہمانا کہ مغرور گردد ہلاک
کشف وار روزے در افتد بخاک

(۶۶)

جانِ بابا برو نکوئی کُن
کہ نکوئی بلا بگرداند

(۶۷)

بخاکِ مذلت نشاند دروغ
دروغ آدمی را کند بے فروغ

(۶۸)

بوزنہ نقلِ مرداں بکند
گر تو بد کردۂ ہماں بکند

(۶۹)

دیدیم صد ہزار پئے دیگراں حکَم
امّا حکَم بدیدیم از بہرِ خویش کم

(۷۰)

خرگوش صفت گر تو دریں خواب بمانی
ترسیم کہ خود را بسرِ منزل نہ رسانی

Masood Faisal Jhandir Library

(۷۱)

بدست آوردنِ دُنیا ہنر نیست یکے را گر توانی دل بدست آر

(۷۲)

تنہا نہ ز اہلِ وعظ و نصیحت شنیدہ ایم

انجامِ لاف غیرِ فضیحت نہ دیدہ ایم

(۷۳)

بوقتِ امن و سلامت مزن ز مردی لاف

کہ تو بخواب ندیدی ہنوز روزِ مصاف

(۷۴)

اے بسا کس کہ در زیانِ دگر خویشتن را ہمی بباد دہد

(۷۵)

چنانکہ نغمۂ بلبل بگوشِ خر ہیچ است بچشمِ بے ہنراں ہمچنیں ہنر ہیچ است

(۷۶)

بامیدِ نفع کردن بحقِ بداں نکوئی مگر ایں مثال دارد کہ شب آفتاب جوئی

(۷۷)

زود بینی کہ مردِ سایہ پرست در سرِ سایہ شے دہد از دست

تمّت